1513

دِلّی والے

سیمینار (جلد دوم)

مرتبہ

ڈاکٹر صلاح الدّین

اُردو اکادمی، دہلی

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

Marfat.com

سلسلۂ مطبوعات — اردو اکادمی ۲۶

جملہ حقوق محفوظ

تحقیقی و اشاعتی کمیٹی کے اراکین

جناب غلام ربانی تاباں (کنوینر)

ڈاکٹر خلیق انجم (ممبر) 129531

ڈاکٹر شمیم حنفی (ممبر)

جناب جوگیندر پال (ممبر)

جناب سید شریف الحسن نقوی (ممبر)

جناب بی۔ایس۔گیرا (ممبر)

پروفیسر اشتیاق عابدی (کوآرڈی نیٹر)

DILLI WALE Vol. II
Ed. DR. SALAHUDDIN
PRICE : RS. [redacted]

سنِ اشاعت : ۱۹۹۲ء

قیمت : [redacted] روپے

بہ اہتمام : ڈاکٹر انتظار مرزا

طباعت : ثمر آفسیٹ پریس۔ کلاں محل نئی دہلی ۲

ناشر و تقسیم کار : اردو اکادمی، دہلی۔ گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ISBN 81—7121—032—5—(Set)
ISBN 81—7121—033—3—(Vol. II)

Marfat.com

فہرست

	حرفِ آغاز	سکریٹری	۹
	پیش لفظ	خلیق انجم	۱۱
	اپنی بات	صلاح الدین	۱۵
	شخصیات	خاکہ نگار	
۱	پنڈت جی (جواہر لال نہرو)	خواجہ احمد فاروقی	۲۰
۲	بسمل سعیدی	نثار احمد فاروقی	۲۸
۳	(لالہ) سری رام	محمد حسن	۴۰
۴	ساغر نظامی	خلیق انجم	۴۷
۵	تاجور سامری	قمر رئیس	۵۵
۶	شفیع الدین نیّر	صدیق الرحمٰن قدوائی	۶۳
۷	فرقت کاکوروی	صلاح الدین	۶۹
۸	(حضرت) شاہ ابوالخیر دہلوی	مولانا امداد صابری	۸۱
۹	آکا بھائی (فخرالدین علی احمد)	بیگم حمیدہ سلطان	۱۰۰
۱۰	(مولانا) محمد یوسف	محمد ذاکر	۱۰۸
۱۱	(مولانا) شرف الحق دہلوی	تنویر احمد علوی	۱۱۵
۱۲	(مرزا) سہراب شاہ مجیؔ	خواجہ حسن ثانی نظامی	۱۲۵
۱۳	چچی	اسلم پرویز	۱۳۴

۱۴	ذاکر صاحب (ڈاکٹر ذاکر حسین)	مغیث الدین فریدی	۱۴۶
۱۵	مخمورؔ دہلوی	کامل قریشی	۱۵۶
۱۶	(خلیفہ) نوّرو	سیّد ضمیر حسن دہلوی	۱۸۸
۱۷	(ڈاکٹر) سیّد محمود	سیّد غلام سمنانیؔ	۱۹۸
۱۸	(مولوی) بشیر الدین احمد دہلوی	محمد مُسلِم دہلوی	۲۱۷
۱۹	(دیوان) آنند کمار	سرور تونسوی	۲۳۲
۲۰	(مرزا) احمد علی	محمد صابرین	۲۴۱
۲۱	بہوا ماں	نور جہاں ثروتؔ	۲۵۴
۲۲	بھائی جُمّا	محمد شفیق	۲۵۹
۲۳	(بیگم) تیمور جہاں	طیبّہ خاتون	۲۶۴
۲۴	(مولانا) حفظ الرحمٰن	شریف حسین قاسمی	۲۷۵
۲۵	(حکیم) خلیل الرحمٰن نارؔ	خالد رشید صدیقی	۲۸۱
۲۶	(پنڈت) دینا ناتھ زُتشی	خارؔ دہلوی	۲۸۶
۲۷	راجیندر منچندا بانیؔ	معین اعجاز	۲۹۲
۲۸	(مولانا) زبیر قریشی	مجیب الاسلام	۲۹۹
۲۹	(حاجی) زین العابدین	فاروق بخشی	۳۱۳
۳۰	(مرزا) سُلطان بیگ دہلوی	حاجی انیس دہلوی	۳۲۲
۳۱	(مولوی) سمیع اللہ	سراج انور	۳۲۹
۳۲	(مولوی) سیّد محمد سلیمان عباس	سید تحسین حیدر	۳۴۲
۳۳	(مرزا) فرحت اللہ بیگ	شریف احمد	۳۵۸
۳۴	میر باقر علی (داستان گو)	محمد فیروز دہلوی	۳۶۶
۳۵	ایم ایم زیدی	سید حسن مہدی	۳۷۸
۳۶	محمد شفیع (پیتل والے)	اسرار احمد	۳۹۱

Marfat.com

۳۷	(حافظ) یوسف دہلوی	فیاض رفعت	۳۹۸
۳۸	(حکیم) محمد شریف	مظفر حسین سید	۴۰۴
۳۹	گوپی ناتھ امن	دھرمیندر ناتھ	۴۲۰
۴۰	(مولانا) عبدالباقی	پروانہ ردولوی	۴۴۱
۴۱	(صوفی) عزیز الرحمٰن	افسر جمشید	۴۴۸
۴۲	ظفر ادیب	شمس الحق عثمانی	۴۵۶
۴۳	(مولوی) عبدالغفار دہلوی	سید امان الرحمٰن	۴۶۷
۴۴	(حاجی) ظہور الدین دہلوی	غلام احمد علمی	۴۷۷
۴۵	(مولانا) عبدالوحید صدیقی	م۔ا۔ فضل	۴۹۰
۴۶	(بیگم) صدیقہ قدوائی	شمیمہ بیگم	۴۹۸

Marfat.com

Marfat.com

حرفِ آغاز

دہلی ہندوستان کا دل ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شہر اپنی تہذیبی روح، ثقافتی رنگا رنگی اور تاریخی کردار کے اعتبار سے ایک چھوٹا سا ہندوستان ہے۔ دہلی کلچر کے فروغ میں اُردو نے ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے اور آج بھی یہ زبان اُس کی ادبی و تہذیبی شناخت کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ اُردو کی کلچرل اہمیت اور دہلی کی ثقافتی زندگی سے اس کے گہرے رشتہ کے پیشِ نظر آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی، سابق وزیر اعظم مرکزی حکومتِ ہند کے ایما پر ۱۹۸۱ء میں اُردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا۔
اکادمی کا اپنا ایک انتظامی ڈھانچہ اور طے شدہ دستور العمل ہے۔ دہلی کے لفٹننٹ گورنر اس کے صدر نشین (چیئرمین) ہیں اور اکادمی کے اراکین کو دو سال کے لیے نامزد کرتے ہیں۔ ان اراکین میں ممتاز اہلِ قلم، ادیب، نقاد، صحافی، معلّم اور محقق شامل ہیں۔ اکادمی دہلی اور بیرون دہلی دوسرے علمی، ادبی، تہذیبی اور تعلیمی حلقوں سے بھی رابطہ قائم کیے ہوتے ہے اور اپنی سرگرمیوں میں اُن کے تعاون اور مشوروں کو خوش آمدید کہتی ہے۔

ہمیں احساس ہے کہ کتاب انسان کی بہترین ساتھی ہے اور کتاب کا مطالعہ اس کا شریف ترین مشغلہ، کتاب ماضی کو حال اور حال کو مستقبل سے جوڑنے کا سب سے عمدہ وسیلہ ہے۔ اپنے اس بیش بہا ورثہ کو محفوظ کرنا اُسے خوب تر اور مفید تر بنانا

Marfat.com

ہمارے تہذیبی فرائض کا سب سے اہم حصّہ ہے۔ یہ گویا ادبی روشنیوں کو عام کرنا اور علمی خوشبوؤں کو پھیلانا ہے۔

اکادمی نے نہایت اہم موضوعات پر اچھی کتابوں کی اشاعت کا جو منصوبہ بنایا ہے اُسی کے تحت مذاکرے، سیمینار ورکشاپ منعقد کیے اور ان میں پیش کیے جانے والے مقالات کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ "دِلّی والے" اِسی سلسلۂ پیش کش کا حصّہ دوم ہے۔ یہ سہ روزہ سیمینار اردو اکادمی، دہلی کے ہال میں ۲۹، ۳۰، ۳۱ مارچ ۱۹۸۶ء کو منعقد ہوا۔ اس کے لیے ہم اس کے فاضل مرتب کی علمی کاوشوں کے ممنون ہیں۔ اور اس تعاون کے بھی جو اشاعتی کمیٹی کے ارکان کی طرف سے ہمیں میسر آتا ہے اور ہمارے لیے روشنی ورہنمائی کا باعث بنتا ہے۔ اس کے علاوہ دہلی کی تاریخ وادبیات سے متعلق کچھ ایسی اہم کتابیں بھی شائع کی ہیں جو کمیاب بلکہ نایاب ہو چکی تھیں ایسی مزید کچھ کتابیں ترتیب واشاعت کے مراحل سے گزر رہی ہیں۔

ہم اپنے موجودہ سرپرست اور اکادمی کے صدر نشیں جناب مارکنڈے سنگھ صاحب لیفٹننٹ گورنر دہلی کی عنایات اور توجہات کے بے حد ممنون ہیں۔ نائب صدر نشیں جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی عنایات کا بھی اعتراف ہے اور ان کی رہنمائی کے لیے بھی شکر گزار ہیں۔

سیّد اشتیاق عابدی
سکریٹری
اردو اکادمی، دہلی

Marfat.com

پیش لفظ

۱۹۸۵ء میں اُردو اکادمی، دلّی نے ادبی موضوعات پر سیمیناروں کا سلسلہ شروع کیا تو مرزا داغ دہلوی، دلّی کی تہذیب، مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے موضوعات پر سیمینار منعقد کیے گئے۔ اردو اکادمی کے ایک معزز رکن ڈاکٹر صلاح الدین کی جدّت پسند طبیعت نے ایک ایسا موضوع تجویز کیا، جو سب کو پسند آیا۔ وہ موضوع تھا، "دلّی والے"۔ صلاح الدین صاحب نے اپنی تجویز کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ خاکے اُن دلّی والوں کے لکھوائے جائیں، جنھوں نے دلّی کی تہذیبی، ادبی، سیاسی اور سماجی زندگی میں اہم رول ادا کیا ہو۔ مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ دلّی والا کون ہے۔ اگر صرف اُن لوگوں کو دلّی والے تسلیم کیا جائے جو دلّی میں پیدا ہوئے تو اُن بے شمار لوگوں کا کیا ہوگا جو دوسرے صوبوں سے دلّی آئے، یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی اور دلّی کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی جان بن گئے۔ بہت سوچ بچار کے بعد طے ہوا کہ جو شخص دس سال سے دلّی میں ہے، یا دس سال تک اِس شہر میں رہا، اُسے دلّی والا تسلیم کیا جائے۔

اکادمی نے نہ صرف ڈاکٹر صلاح الدین کی تجویز منظور کرلی بلکہ پوری ذمے داری سونپتے ہوئے انھیں سمینار کا ڈائرکٹر بنا دیا۔ صلاح الدین صاحب نے اُن لوگوں کے انتخاب میں، جن کے خاکے لکھوائے جانے تھے اور جن سے لکھوائے جانے تھے، بڑی دقّتِ نظر اور محنت سے کام لیا۔ جب یہ فہرست مکمّل ہوگئی تو انھوں نے خطوط لکھے، بار بار یاددہانی کی

اور بیشتر خاکہ نگاروں سے ذاتی ملاقاتیں کر کے چونتیس خاکے لکھوانے میں کامیاب ہو گئے۔ مارچ ۱۹۸۵ء میں سہ روزہ سمینار منعقد ہوا، جس میں یہ خاکے پڑھے گئے۔ سمینار میں شریک لوگوں نے خاکوں کو بہت پسند کیا، اردو، انگریزی اور ہندی کے قومی پریس نے سمینار اور اس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر صلاح الدین کی بہت تعریف کی۔ مہینوں تک دلّی کی ادبی محفلوں میں اس سمینار کا چرچا رہا۔

اکادمی کے سکریٹری سیّد شریف الحسن نقوی صاحب سے لوگوں نے فرمائش کی کہ ان خاکوں کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ اکادمی نے یہ اہم کام بھی صلاح الدین صاحب ہی کو سونپ دیا۔ انھوں نے بڑے سلیقے سے یہ خاکے کتابی صورت میں مرتب کیے اور سیّد شریف الحسن نقوی صاحب نے اسے بہت خوب صورت چھاپنے کا انتظام کیا۔ ۸۶ ۱۹ء میں "دلّی والے" کے نام سے چونتیس خاکوں پر مشتمل یہ کتاب شائع ہو گئی۔ کتاب کے شروع میں صلاح الدین صاحب نے ایک مقدمہ لکھا، جس میں دلّی کی تہذیب اور خاکہ نگاری کے فن پر بھرپور روشنی ڈالی۔

ان خاکوں کی مقبولیت کے پیش نظر اکادمی نے طے کیا کہ "دلّی والے" کے نام سے اس وقت تک سمینار منعقد ہوتے رہیں گے، جب تک اس کی تمام اہم شخصیتوں کا احاطہ نہ کر لیا جائے۔ چنانچہ اگلے سال یعنی ۸۶ ۱۹ء میں پھر اس سمینار کی ذمے داری ڈاکٹر صلاح الدین کو سونپی گئی اور انھوں نے پہلے کی طرح اب پھر سمینار میں غیر معمولی دل چسپی لی۔ بھاگ دوڑ کر چھیالیس خاکے لکھوائے۔ مارچ ۸۶ ۱۹ء میں منعقد ہونے والے سہ روزہ سمینار میں یہ خاکے پڑھے گئے۔ اس دفعہ بھی سامعین نے یہ خاکے بہت پسند کیے اور اکادمی کی تحقیقی وطباعتی کمیٹی نے انھیں کتابی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ خاکے کسی ایک فرد کے محض سوانح یا اس کے کارناموں ہی پر روشنی نہیں ڈالتے، بلکہ بیسویں صدی دلّی کی ادبی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کی تاریخ ہیں۔ مستقبل کے محقق اور مورخ کے لیے یہ خاکے اہم ترین مآخذ کا کام دیں گے۔

Marfat.com

ایک بات یہ ہے کہ اس محفل میں (خاکوں کے دونوں مجموعوں میں) مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا آصف علی اور محترمہ اندرا گاندھی جیسے صفِ اوّل کے سیاست داں بھی موجود ہیں اور مولانا احمد سعید، بے خود دہلوی، خواجہ حسن نظامی، سائل دہلوی، زار دہلوی، مرزا محمود بیگ، سید سجّاد ظہیر اور ساغر نظامی جیسے صفِ اول کے ادیب بھی۔ اور بھائی جما، پچی، خلیفہ نورو اور سہراب شاہ مجّی جیسے لوگ بھی براجمان ہیں، جنھیں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ لیکن دلّی کی تہذیب میں اُن کا اہم رول رہا ہے۔

میں ڈاکٹر صلاح الدین کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے بیسویں صدی کی دلّی کی اہم شخصیتوں کو تاریخ کے صفحات پر محفوظ کر دیا ہے۔

خلیق انجم

Marfat.com

Marfat.com

صلاح الدین

اپنی بات

بفضلِ تعالیٰ، خاکوں پر مشتمل (دِلّی والے) سیمنار کی یہ دوسری جلد بھی شائع ہوکر منظرِ عام پر آگئی ہے۔ یوں تو اِس سیمنار کے حوالے سے پہلی جِلد کے مقدمہ میں تفصیلی طور پر مذکور ہو چکا ہے لیکن پھر بھی چند اُمور کے بارے میں مزید وضاحت ضروری ہے۔

اوّل یہ کہ اِس سیمنار کا بنیادی مقصد اُن دِلّی والوں پر خاکے لکھوانا ہے جو اب ہمارے درمیان نہیں رہے ہیں، یہ جِلد بھی اِسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ کیونکہ یہ مقصد براری ایک یا دو سیمنار سے تکمیل نہیں پا سکتی اِس لیے دہلی اردو اکادمی نے اِس سیمنار کو کئی سالوں میں منقسم کر دیا ہے۔ تاکہ ہر سال چالیس اور پچاس کی تعداد میں خاکے لکھوا کر اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکے۔

اردو میں خاکہ نگاری کا سلسلہ یوں تو خاصہ قدیم ہے۔ ہمارے مشاہیر ادب نے بہت سے افراد پر خاکے لکھے ہیں۔ پھر کچھ رسائل کے شخصیات نمبر بھی شائع ہوئے ہیں۔ لیکن باقاعدہ اور سلسلہ وار خاکوں پر سیمنار منعقد کرا کے خاکے پڑھوانا اور شائع کرانے کی ایسی کوئی نظیر ہمارے ادب میں اس سے پیشتر موجود نہیں۔ یہ ایک تجربہ تھا جسے نیک مقصد کے حصول کے لیے شروع کیا گیا۔ مسرّت کا مقام ہے کہ ادبی حلقوں میں اسے پسندیدگی کی نظروں سے

Marfat.com

دیکھا گیا اور ملک کے نہ صرف اردو روزناموں نے بلکہ ہندی اور انگریزی روزناموں نے بھی پذیرائی کرتے ہوئے اپنے کالموں میں معقول جگہ دی۔

دوسری وضاحت اس سیمنار کے عنوان کے تعلق سے ہے۔ چونکہ اس سیمنار کا مستقل عنوان " دِلّی والے " ہے اور اِس کے تعلق سے بھی پہلی جلد میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے لہٰذا اِس تعلق سے یہاں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ چونکہ دہلی اُردو اکادمی، دہلی انتظامیہ ہی کی ایک باڈی ہے اس لیے یہ بھی دہلی انتظامیہ کے Domocile Law یا قانونِ شہریت کے اطلاق کی پابند ہے۔ اور دہلی انتظامیہ کے قانونِ شہریت کی رو سے دہلی اردو اکادمی کے لیے ہر وہ شخص دلّی والا ہے جو یہاں دس سالوں سے رہتا ہو۔ یہ ہی وجہ ہے کہ اکادمی کی طرف سے دیئے جانے والے مختلف ایوارڈز اور پینشن بھی اس قانون کے مطابق دیے جاتے ہیں۔ ویسے مختلف اشخاص ' دِلّی والے ' کی مختلف توجیہات پیش کرتے رہے ہیں جن سے کچھ لوگوں کو اتفاق ہو سکتا ہے اور کچھ کو اختلاف، لیکن اس حقیقت میں اختلاف کسی کو نہیں ہو سکتا کہ دہلی شہر پورے ملک کا سو دوسو سال سے نہیں بلکہ سینکڑوں سال سے آنکھوں کا تارا اور دِل کا پیارا شہر رہا ہے۔ بقول شخصے " دلّی میں اتنی کشش اور جاذبیت ہے کہ جو یہاں آیا بس یہیں کا ہو رہا " دِلّی ہر کسی کا دل لیتی ہے، جبھی تو اِس کا نام دل لی ہے " اسی خیال کی تائید کرتے ہوئے پروفیسر نورالحسن نے لکھا ہے کہ " میری طرح بہت سے لوگ ہندوستان کے کونوں کونوں سے آکر یہاں بس گئے اور اب دلّی کی گلیاں چھوڑ کر باہر جانے کو جی نہیں چاہتا " دلّی کی یہ ہی وہ خوبی ہے جس کی وجہ سے یہاں ہر مذہب، ہر فرقے اور ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ ملک کے کونے کونے سے آکر اِس ہنگامہ گرم کُن شہر میں بستے رہے ہیں اور یہ سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ ہنگامہ گرم کُن ہونے کے علاوہ دِلّی وہ شہر بھی ہے جسے بائیس خواجگان کی چوکھٹ ہونے کا

شرف بھی حاصل ہے اور شہرِ سعادت کہلانے کا افتخار بھی حاصل ہے۔ اسی لیے ملک کے جس حصّے کے لوگ بھی یہاں آکر بسے اِس شہرِ سعادت کی سعادت سے فیضیاب بھی ہوئے اور اپنی سعادت مندی سے اِسے فیضیاب بھی کیا۔ اس شہر کی تہذیبی اور ثقافتی آبیاری میں سینکڑوں سال کا وہ تاریخی عمل شامل رہا ہے جسے ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں سب ہی نے جلا بخشی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہندوستانی مشترکہ تہذیب کا سب سے مسلّم اور مستند شہر کہلاتا ہے۔ اِس شہر کا یہ مخصوص کریکٹر کل بھی تھا، آج بھی ہے اور مستقبل میں بھی باقی رہے گا۔

مہاتما گاندھی کا مشہور مقولہ ہے کہ ہر جھوٹ میں سچائی تاریکی میں روشنی اور موت میں زندگی کی رمق باقی رہتی ہے سو دلّی بھی بیسیوں بار اجڑی اور پھر بسی تو ایسی کہ اگلی رونقوں کو بھی مات کر دیا۔ سُنا ہے غدر میں کوئی فقیر صدا لگاتا تھا " سات دلّی، آٹھ باولی، قلعہ وزیر آباد" اس وقت تو مجذُوب کی یہ بڑ کسی کی سمجھ میں نہ آتی ہوگی، مگر آج دلّی کی حدُود کا پھیلاؤ دیکھ کر فقیر کی بات کا مطلب واضح ہو گیا ہے۔ درحقیقت دلّی عہدِ وسطیٰ میں ہی ایک بین الاقوامی شہر بن گیا تھا اور دُنیا کی ثقافت اِس آبگینے میں سمٹ آئی تھی۔ پھر دلّی خدانخواستہ تنگ دل تو ہے نہیں کہ دوسروں سے اپنا دامن سمیٹ لے، جن آنکھوں سے لیا تھا۔ اُنھیں آنکھوں سے دیا بھی بہت کچھ اور یوں چار دانگ یہاں کا رہن سہن رومتہ الکبریٰ کی تہذیب کی طرح پھیل گیا جس طرح پرانے رئیس نئے رئیسوں کو دیر تک تسلیم نہیں کرتے اُسی طرح ٹھیٹھ دِلّی والوں اور نئے بسنے والوں میں بھی تادیر چپقلش چلتی رہی اور جب نفاق کے بادل چھٹ گئے تو پتہ چلا کہ جنھیں اختلافی صورتیں سمجھا جاتا تھا وہ حقیقت میں باہم ایک ہیں سارے مناظرے، بحث مباحثے، مزا میری کے لیے تھے۔ چونچیں لڑیں اور پالی تھرّا اُٹھی تو یار لوگوں نے یوں مزا لیے جیسے آج ڈسکو ڈانس کی سنسنی خیزی کا مزہ لیتے ہیں۔

Marfat.com

خیر اب اگلے واقعات کا ذکر کیا ؟ رات گئی بات گئی۔ دلی آج بھی ہندوستان کا دل مانی جاتی ہے۔ ہزاروں لوگ، سورج کی پہلی کرن سے انتم کرن تک، یہاں وارد ہوتے ہیں۔ کچھ اور ہو نہ ہو دِلی کی زیارت کا شرف تو بہر حال انھیں حاصل ہوتا ہی ہے۔ پھر کچھ لوگ یہاں رہتے ہیں۔ صدق دل سے یہاں کی زندگی کو اپناتے ہیں اُنھیں دلی کیوں کر نہ اپنا کہے! یہ بے مروتی دلی کے مزاج سے دور ہے اور یہی وہ نقطۂ نظر ہے جس کے پس منظر میں اِس سیمنار کے انعقاد کرنے کا خیال دل میں پیدا ہوا۔ اور پھر اس بات کی کوشش کی گئی کہ اس سیمنار میں ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے نیز ٹھیٹھ دِلی والے اور گزشتہ برسوں میں یہاں آکر بسنے والوں پر بھی خاکے لکھوائے جائیں تاکہ بدلے ہوئے نئے حالات کے تناظر میں دِلی اور دلی والوں کا تعارف ہو سکے۔

اسلاف کو یاد کرنے کا عمل تہذیبؑ کے استمرار کی علامت ہے۔ جو لوگ اپنے ماضی کو بھول جاتے ہیں۔ اپنے اسلاف کو بھلا دیتے ہیں وہ آدھے ادھورے رہ جاتے ہیں۔ دلی کی مقامی فضیلت کے ساتھ ساتھ دِلی کی اعیانی حثیت بھی مسلّم ہے۔ سورج کی کرنوں کو یا ہوا کی روانی کو قید نہیں کیا جا سکتا۔ جو شے جتنی زیادہ قیمتی ہے اُسے ؛؛ ع انسانی کے لیے اُتنا ہی ارزاں بھی رکھا گیا ہے۔ دلی کی اقدار بڑھ بولوں کی مشیحت کا سہارا نہیں ہے اچھی اور وضع دار زندگی کا وسیلہ ہیں۔ اُنھیں دُور دُور تک پھیلانے کے لیے تعصّبات سے پرہیز کرنا چاہیئے اور الحمدللہ دِلی والوں کی موجودہ نسل اس رمز سے واقف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سیمنار کے لیے اصحاب دلی کا انتخاب دلی کی اسی وسیع المشربی کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے۔

جن لوگوں پر خاکے لکھوائے گئے ہیں وہ یادگار زمانہ لوگ ہیں، خاکے کیسے ہیں اس کا فیصلہ آپ لوگ خاکے پڑھ کر کریں گے۔ مگر اصحابِ خاکہ کیسے

Marfat.com

تھے اس پر مجھے شہادت دینی ہے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایسے لوگ فلک کی سینکڑوں گردشوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے مرنے کی ماتم داری یا بعد مُردن یاد آوری کا مشغلہ یا سلسلہ ہر ذی حس کے لیے شرف اور نیک نامی کا باعث ہے۔

سب کہاں کچھ، لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

آخر میں اس سیمنار کو خوش اسلوبی سے منعقد کرانے کے لیے اور پھر اسے شائع کر کے اردو حلقے تک پہنچانے کے لیے میں سکریٹری اردو اکادمی اور اکادمی کے دیگر اربابِ حل و عقد کا صمیمِ قلب سے شکر گزار ہوں کہ جن کے تعاون کے بنا یہ کام محال نہیں ناممکن تھا۔ میں تمام خاکہ نگار حضرات کا بھی ممنون ہوں کہ جنھوں نے میری ادنا سی درخواست پر سیمنار میں شرکت کر کے اسے کامیابی سے ہمکنار کیا۔

صلاح الدین

Marfat.com

خواجہ احمد فاروقی

پنڈت جی

پنڈت جی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۶ء میں ہوئی جب میں میرٹھ کالج میں بی اے کا طالب علم تھا۔ وہ الکشن میں مصروف تھے اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے انھوں نے ملک کا کونہ کونہ بلوچستان سے کرناٹک تک چھان مارا تھا۔ موٹر کار۔ ہوائی جہاز۔ ریل اسٹیمر بیل گاڑی۔ اونٹ۔ ہاتھی۔ گھوڑا۔ چپو کی کشتی۔ ڈونگی۔ بائیسکل۔ پیدل۔ غرض کوئی ذریعہ سفر کا، انھوں نے چھوڑا نہیں تھا۔ سفر کا یہ سلسلہ صبح سویرے شروع ہوتا تھا اور رات گئے تک جاری رہتا تھا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ پہلا جلسہ صبح کے آٹھ بجے شروع ہوا ہے اور آخری صبح کے چار بجے ختم ہوا ہے۔ کبھی دن ۲۳ گھنٹے کا ہوگیا ہے اور اگلے گھنٹہ سے فوراً ہی دوسرے دن کا پروگرام شروع ہوگیا ہے۔ اس درمیان نہ کھانے کا ہوش، نہ سونے کی فرصت۔ یہ سب چیزیں غیر ضروری معلوم ہوتی تھیں۔ الکشن کیا تھا۔ عوام کے دلوں میں آزادی کی چنگاری روشن کرنا تھی یہ جدوجہد ہندوستان کے عوام کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے مظلوم عوام کے لیے تھی۔ اِن جلسوں میں چھوٹے بڑے۔ بوڑھے اور جوان،

Marfat.com

عورتیں اور بچے سب ہی موسم کی سختی اور راستہ کی ناہمواری کے باوجود پہنچتے تھے اور آخر وقت تک وہاں سے ہلنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ کبھی کبھی دیہاتوں اور شہروں کی پوری پوری آبادیاں پنڈت جی کی زیارت کرنے اور تقریر سننے کے لیے ٹوٹ پڑتی تھیں۔ آزادی کی لگن نے اُن کے اندر بے پناہ قوت پیدا کر دی تھی اور ان کے عزم اور حوصلہ کو بڑھا دیا تھا ؎

چوں شمعِ سربلندیٔ عشاق مفت نیست ؎ آخر بقدرِ سوختن است آبروے ما

میں اِس زمانہ میں صوبائی اسٹوڈنٹس کانگریس کی مجلس عاملہ کا ممبر اور نائب صدر تھا۔ ان صحبتوں نے مردہ رگوں میں نیا خونِ زندگی دوڑا دیا تھا۔ دل میں عجیب قسم کا ولولہ تھا۔ "خودی" بہت بڑھ گئی تھی اور "یزداں بکمند آور" سے کم طبیعت کسی چیز پر راضی نہیں ہوتی تھی۔ نہ معلوم اتراہٹ تھی یا بڑے بننے کا شوق، یا کسی مرشد کی تلاش یا یہ جذبہ کہ ان بڑوں کی چھوٹ ہم پر بھی پڑ جائے۔ شاید ہی دلّی اور میرٹھ میں کوئی ایسا اہم جلسہ ہوتا جہاں میں نہ پہنچتا ہوں دہلی میں خالدہ ادیب خانم آئیں اور میں صفوں کو چیرتا ہوا پہلی قطار تک پہنچ گیا۔ ٹیگور، میرٹھ آئے۔ میں نے جب تک ان کو قریب سے نہ دیکھ لیا۔ چین نہیں آیا۔ پنڈت جواہر لال مسز ارونا آصف علی کے ساتھ میرٹھ آئے۔ میں نہ صرف ان کے پاس پہنچ گیا بلکہ کالج یونین کا دعوت نامہ بھی پیش کر دیا: "پنڈت جی ہمارے کالج میں لکچر دیجیے"

پنڈت جی جیسے بھرے بیٹھے ہوں "جی نہیں۔ میں الکشن کے لیے آیا ہوں۔ الکشن کو اپنے دماغ سے Switch off نہیں کر سکتا کیسا کالج میں ہرگز نہیں جاؤں گا"

شمشیر کی یہ عریانی دیکھنے کے قابل تھی!

Marfat.com

میں نے مودبانہ عرض کیا اِس الکشن کی اہمیت ہی پر کالج میں تقریر کردیجیے۔"

میری توقع کے خلاف اتنی دیر میں ان کا غصہ فرو ہو چکا تھا۔ اور اب وہ سراپا لطف وکرم تھے۔ فرمایا: "عقلمند تم نے مجھے پہلے سے کیوں نہ لکھ دیا۔ اب تو ایک ایک منٹ بندھا ہوا ہے۔ تم لڑکوں کو میری طرف سے دعوت دے دو۔ وہ یہاں آجائیں ورنہ میرے اوپر بوجھ رہے گا"

"وہ تو بغیر آپ کے بلائے بھی آئیں گے۔ آپ فرماتے ہیں تو ان سے کہہ بھی دوں گا"

"تم خفا تو نہیں ہوئے میں اس کی پھر تلافی کردوں گا"

"آپ سے اور خفگی — اول تو یہ خفگی نہیں اور اگر ہے تو اس پر ہزار محبتیں قربان ہیں۔"

پنڈت جی کے چہرے پر جو "عشق" کی سرمستی تھی اور جس سے ان کا پورا پیکر گل تاب ناک تھا، مجھے آج تک یاد ہے۔ اِس الکشن کی مصروفیت میں جب بلفظہٖ زمین کی طنابیں کھچ گئی تھیں اور انھوں نے بیل گاڑی سے لے کر ہوائی جہاز تک ہر ممکن ذریعے سے سفر کرکے ہندوستان کی ساری زمین کو طے کرڈالا تھا۔ اِس عالم میں انھیں ایک معمولی طالب علم کی دلداری کا خیال رہے اور وہ اس کی پیشانی سے محرومی کی سلوٹیں صاف کریں۔ اس سے پوچھیں تم آزردہ تو نہیں ہوئے۔ معمولی بات نہیں ہے۔

پنڈت جی سے دوسری ملاقات ۴۶ء میں ہوئی جب وہ احمد نگر جیل سے رہا ہو چکے تھے۔ اور ان کی معرکتہ الآرا کتاب "تلاش ہند" جو زندانی ادب میں گلِ سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے۔ شائع ہو چکی تھی۔ جامعہ ملیہ کی جوبلی ہو رہی تھی اور چاروں طرف فرقہ وارانہ فسادات کا بازار گرم تھا۔ وحشت اور بربریت کے اس طوفان میں ہماری شریف

12953

Marfat.com

قدریں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی تھیں اور ہر طرف نفرت، تعصب اور تنگ نظری کا اندھیرا چھایا ہوا تھا اس موقع پر معلموں اور ذہنی قائدوں کا کام کتنا اہم اور ضروری تھا، جامعہ کی جوبلی اس کی غمازی کر رہی تھی۔
اِس موقع پر ذاکر صاحب نے ایک عجیب و غریب تقریر کی جس میں انھوں نے ان چراغوں کی طرف اشارہ کیا جو جامعہ نے آندھیوں میں روشن کیے تھے۔ اس تقریر کی سحر آفرینی کا یہ عالم تھا کہ مجمع میں ہر شخص کی آنکھیں اشکبار تھیں اور بعض تو سسکیاں لے رہے تھے۔ جب جلسہ ختم ہو گیا تو سید اسد اللہ کاظمی مجھے پکڑے ہوئے پنڈت جی کے پاس لے گئے اور ان سے میرا تعارف کرایا "پنڈت جی! یہ فاروقی صاحب ہیں آپ کے پرستاروں میں سے ہیں۔ یہ بھی ہوا کے رستے میں چراغ جلانا چاہتے ہیں اور جامعہ کے لیے حافظ محمدؐ صدیق سے اینٹھ کر ۲۵ ہزار روپئے کا چک لائے ہیں"۔

پنڈت جی کے ریشمی ہاتھوں کا لمس مجھے اب تک یاد ہے۔ کوئی ڈیڑھ منٹ تک وہ بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ پکڑے رہے۔ میں نے انھیں دیکھا اور انھوں نے مجھے۔ دونوں کی آنکھیں فارغ از گریہ تھیں لیکن نہ انھوں نے کچھ کہا اور نہ میں نے ؎

امروز کہ چشمِ من و عرفی بہم افتاد ٭ باہم نگریستیم و گریستیم و گزشتیم

تیسری ملاقات اُس وقت ہوئی جب پنڈت جی وزیر اعظم ہو چکے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں۔ میں اُس وقت دہلی کالج کے شعبۂ اردو کا صدر تھا۔ یہ ادارہ قدیم دلّی کالج کی اولادِ معنوی ہے۔ سب سے پہلے میں نے اِس ادارہ کی اردو خدمات کو اجاگر کرنے اور اپنے اندر ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرنے کے لیے کالج میگزین کا قدیم دلّی کالج نمبر نکالا جس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں اور اب بھی آکسفرڈ اور کیمبرج اور ہند و پاک

کی یونیورسٹیوں سے اس کی فرمائشیں آتی رہتی ہیں پروفیسر حامد حسن قادری نے اس خصوصی نمبر کی عجیب وغریب تاریخ نکالی تھی۔ وہ ایک خط میں مجھے تحریر فرماتے ہیں:

" دہلی کالج نمبر موصول ہوا۔ کیا خوب یادگار قایم کی ہے۔ مضامین، ترتیب سلیقہ۔ سب کچھ اعلیٰ سے اعلیٰ۔ بڑی مسرت ہوئی۔ ڈپٹی نذیر احمدؒ اور مولوی ذکاءُاللہ وغیرہ سب ارواح کی طرف سے جزاک اللہ ؎

تری ایک ایک سطر، ایک ایک پیرا بڑی ہے یادگار دلّی کالج
جزاک اللہُ فی الدارین خیرا " دلِ دلّی " سے یہ تاریخ نکلی

---

۷۸ ۱۲۹۴ + ۷۸ = ۱۳۷۲ھ

اِس کالج کے در و دیوار مجھ سے سرگوشیاں کرتے تھے کہ یہاں پھر ملاپ کا وہی کام ہونا چاہیئے جو پہلے ماسٹر رام چندر اور بعد میں مولانا حالیؔ نے کیا تھا۔ میں اردو زبان وادب کے دائرے میں یہی کر سکتا تھا کہ ہند آریائی اور دراوڑی زبانوں کے ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کردوں اور ایک سمپوزیم کی طرح ڈالوں جس میں رام دھاری سنگھ دنکر، آل احمد سرور، من متھ ناتھ گپت، پربھاکر ماچوے، چندر کانت بھٹ، لکشمی راگھون اور وات سائن جیسے ادیب شریک ہوں اور وہ مختلف زبانوں کے نمایندے کی حیثیت سے ہندوستانی ادبیات میں وطن دوستی کے تصور پر بحث کریں۔

اِس سمپوزیم کا ذکر ایک بزرگ کے سامنے آیا جو آج بھی اپنا نام ظاہر کرنے کے لیے تیار نہیں۔ انھوں نے فرمایا " یہ کام تو اِس لائق ہے کہ پنڈت جی کو دعوت دی جائے۔ تمہاری ملاقات ہے ؟ "

میں نے عرض کیا: صاحب آپ بھولتے ہیں۔ چندہ کے ایک ادارے میں اردو کا معلّم ہوں۔ ملاقات ہے لیکن بہت سرسری۔ دو دفعہ ملا ہوں۔ اب تو بھول بھی گئے ہوں گے۔"

فرمایا "نہیں جی۔ کیا فضول بچہرایونی باتیں کرتے ہو۔ ٹیلی فون کرو۔ وقت مقرر کرو (پھر میرے پس و پیش کو دیکھ کر فرمایا) اچھا میں خود ٹیلی فون کرتا ہوں۔ تم خط بھیجو اور ابھی میرے سامنے لکھو"

میں نے خط میں لکھا تھا کہ "ہندوستان میں مختلف زبانوں کا ہونا ہماری ہمہ رنگ تہذیب کے حق میں برا نہیں ہے۔ الفاظ کا اختلاف اتنا اہم نہیں۔ جتنے وہ خیالات اور اُن کی یکسانی اہم ہے جو ان الفاظ کے پیچھے نظر آتی ہے"

فوراً وقت مقرر ہوگیا اور خط کا جواب بھی معاً آگیا۔

سردیوں کا زمانہ تھا اور صبح کا وقت۔ پنڈت جی ٹھیک آٹھ بجے ڈرائنگ روم میں تشریف لے آئے۔ گلِ ارمنی شیروانی، اُس میں سرخ گلاب کی کلی لگی ہوئی، چہرہ گلاب سے زیادہ شگفتہ، جسم میں وہ چستی جس پر نوجوانوں کو رشک آئے۔ چال، کڑی کمان کا تیر۔ بہت گھل کے ملے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میرے آنے سے غیر معمولی طور پر خوش ہوں، جیسے اس مجمع میں صرف مجھ ہی سے تعلقات ہوں۔ کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی ہی شفقت سے کہنے لگے "فاروقی صاحب آپ نے بہت اچھے کام کی ابتدا کی ہے۔ میرا بڑا ہی جی خوش ہوا۔ یہ کام تو ایسا ہے کہ ایک اکیڈمی کی طرف سے باقاعدہ اور مستقل طور پر کیا جاتے۔ یہ کام بھی ضرور کیا جائے گا۔ آپ کو معلوم ہے مجھے اس کام سے کتنی دل چسپی ہے لیکن میں ابھی چین سے آیا ہوں اور اب پاکستان جانا ہے۔ معلوم نہیں کونسی تاریخ مقرر ہو اس لیے شاید سمپوزیم میں نہ آسکوں لاچاری ہے لیکن اگر

Marfat.com

میں دہلی میں ہوا تو ضرور حاضر ہوں گا"

اِس انکار میں "اقرار" کا سارا لطف تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرا قد اونچا ہوگیا ہو۔ جیسے مجھے بڑی دولت مل گئی ہو۔ جہاں کہیں ان کو کوئی تعمیری جذبہ نظر آتا تھا اُس کی وہ دل و جان سے قدر کرتے تھے۔

پنڈت جی سے چوتھی ملاقات لندن میں ہوئی۔ یہ واقعہ ۵ر جولائی ۱۹۵۷ء کا ہے۔ میں راک فلر ریسرچ فیلو کی حیثیت سے مغربی یورپ کا سفر کر رہا تھا اور اس زمانے میں لندن میں مقیم تھا۔ پنڈت جی نے ہندوستانی طلبا کو مخاطب کیا اور بڑی پاکیزہ تقریر کی۔ اس کا ایک جملہ اب تک میرے دل پر نقش ہے۔

"اگر ہم ان مسائل کو سامنے رکھیں جن سے ہم ان دس برسوں میں دو چار ہوئے ہیں تو معلوم ہوگا کہ ہماری ترقی کی رفتار غیر اطمینان بخش نہیں رہی بقول شاعر ؎

اِس طرح طے کی ہیں ہم نے منزلیں گر پڑے، گر گر اٹھے، اٹھ کر چلے

اس کے بعد ایک ایک طالب علم سے ملے اور اس کے کام کے متعلق دریافت کیا مجھ سے فرمایا "آپ کو یہاں کے کتب خانے بھی پسند آئے؟"

میں نے عرض کیا انڈیا آفس کا کتب خانہ تو اتنا اچھا ہے کہ بس نہیں چلتا کہ اس میں پہیے لگ جائیں اور میں اسے ہندوستان لے جاؤں۔"

فرمایا: "خیر اپنی ضرورت کے عکس لے لیجیے گا۔" وہیں نے حاصل کیے اور ان کو دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی طرف سے حواشی اور تعلیقات کے ساتھ شائع کیا تاکہ تاریخ اور تہذیب کے سمجھنے میں مدد ملے۔ اس سلسلہ کی پہلی دو کتابیں فضلی کی کربل کتھا اور نواب اعظم الدولہ سرور کا عمدہ منتخبہ پنڈت جی کے نام معنون کی گئیں اس لیے کہ ان کی ذات گرامی ہندوستان کی بہترین تہذیبی اقدار کی محرم اور محافظ رہی ہے۔

پنڈت جی اِن دو کتابوں کو لینے کے لیے یکم اپریل ۱۹۶۱ء کو بہ نفس نفیس دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تشریف لائے اور انھوں نے تین گھنٹے ہمارے اساتذہ اور طلبا کے ساتھ صرف کرکے ہماری ہمتوں کو بڑھایا اور ہمارے چھوٹے سے تہذیبی کام کو دیکھ کر خوشنودی کا اظہار فرمایا۔

پنڈت جی کے یُمنِ قدم سے ہمارے اندر کام کا ایک نیا حوصلہ پیدا ہوگیا اور یہ ننھا سا شعبہ ترقی کرتے کرتے ایک حقیقت بسیط بن گیا۔

پنڈت جی ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور تہذیب و ترقی کی علامت تھے۔ انھوں نے تاریخی تصانیف کا گراں قدر ذخیرہ چھوڑا ہے اور اپنے ادبی ذوق، جودتِ فکر، سائنسی مزاج اور نفسیاتی بصیرت سے فکرِ انسانی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے تاریخ کو واقعات کی کھتونی نہیں بنایا بلکہ اسے قومی حافظہ کی بازیافت کا ذریعہ بنایا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ وہ بڑے درجہ کے سیاست داں تھے یا مورخ یا ادیب۔ سچ یہ ہے کہ وہ اِن تمام حیثیتوں کے جامع تھے لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اعلا درجہ کے دیدہ ور انسان تھے جن کی دل نوازی اور دردمندی کی مثال مشکل سے ملے گی:

عالم ہیں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں

نثار احمد فاروقی

بسمل سعیدی ٹونکی

ابھی کل تک بسمل سعیدی میرے لیے ایک ایسی حقیقت تھے کہ لوگ ہمیں ایک دوسرے کا "جزوِ تکمیلی" کہا کرتے تھے۔ آج ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو سب کچھ خواب وخیال سا معلوم ہوتا ہے۔ بقول بسمل:

ان کی صورت کا تصور ہے اب اتنا مبہم
جیسے دیکھا نہ ہو آنکھوں نے سنا ہو ان کو

کم وبیش ۲۵ سال تک مجھے بسمل صاحب کی رفاقت میسّر رہی۔ میں یونیورسٹی سے روزانہ شام کو ۷ بجے تک اردو بازار میں پہنچ جاتا تھا۔ کتب خانہ عزیزیہ کے سامنے آثار قدیمہ کی یادگار ایک بنچ پڑی ہوئی تھی اس کے بائیں کونے پر بیٹھے ہوئے بسمل سعیدی دور سے نظر آجاتے تھے۔ پہلے ایک دوسرے کی خیر صلا پوچھتے پھر کسی چائے خانے کا رخ کیا جاتا۔ ابتدا میں بن کا چائے خانہ دلّی کے شاعروں کا ٹھکانا تھا، پھر جامع مسجد کی مشرقی سیڑھیوں پر ایک اور ڈھابا کھل گیا تھا جسے ہم "چنڈو خانہ" کہا کرتے تھے، کبھی سلیمان ٹی اسٹال پر ڈیرا ڈال دیتے اور کبھی کبھار جواہر ہوٹل یا آزاد ہند ہوٹل میں نشست ہو جاتی تھی۔ چائے پیتے، شعر سنتے، ان پر تنقید وتبصرہ کرتے، برجستہ پیروڈی کرتے، کبھی

Marfat.com

پرانی یادیں تازہ کرتے، کبھی جامع مسجد کے چوک پر یو ہیں بے مقصد گشت لگاتے، گھومتے گھامتے ساڑھے آٹھ نو بجے تک بلیماران پہنچ جاتے، حافظ ہوٹل میں کھانا کھا کر بسم اللہ ہوٹل میں آ بیٹھتے، یہاں پھر چائے کا دور چلتا تھا۔ یہاں کی نشست میں ہمارے ساتھ شریک ہونے والوں کا حلقہ دوسرا تھا' اس میں کبھی مانی جائسی مرحوم' حیات لکھنوی یا مولانا عبدالخالق نقوی یا مولانا عبدالرحمٰن شاکر مرحوم بھی ہوتے تھے۔

یہاں کھلے آنگن میں ایک مستطیل چبوترہ بنا ہوا تھا جس کے اطراف میں بنچیں پڑی تھیں' یہ گویا میز کرسیاں تھیں۔ یہاں سے رات کو گیارہ ساڑھے گیارہ بجے برخاست ہوتے اور بسمل صاحب کو کبھی فراش خانہ تک اور کبھی قطب روڈ کے چوراہے تک رخصت کرنے جاتے اس طرح رات کے بارہ ایک بجے کا عمل ہو جاتا تھا۔ اگر کبھی مولانا عبدالخالق نقوی مل جاتے تو وہ دور سے ہی بڑا طویل اور ممدود سلام کرتے تھے جس کا مطلب ہم یہ سمجھ لیتے تھے کہ آج باتوں میں وقت کا پتہ ہی نہیں چلے گا۔

مولانا کو باتیں کرنے کا شوق تھا، ہر موضوع پر دل چسپ گفتگو کرتے تھے اور ان کا مخاطب کبھی بور نہیں ہوتا تھا۔ کھڑے کھڑے تھک جاتے تو کسی دکان کے تختے پر خیمہ زن ہو جاتے تھے۔ رخصت ہوتے وقت معلوم ہوتا تھا کہ رات کے دو بج چکے ہیں۔

یہ ہمارا تقریباً روز کا معمول ہو گیا تھا۔ ایک آدھ بار ایسا ہوا کہ میں کسی سبب سے جامع مسجد نہ جا سکا اور سیدھا اپنے کمرہ پر آ گیا، یہ چاہا کہ کچھ کام کر لوں، مگر طبیعت میں عجب طرح کی وحشت پائی اور جب تک جامع مسجد جا کر مٹر گشت نہیں کر لی کسی کام میں دل نہیں لگا۔

بسمل صاحب سے میرا تعارف ۱۹۰۲ء میں ہوا تھا۔ ہمارے دوست نصیر خاں صاحب نے اُن کا ایک شعر سنایا:

Marfat.com

خود جس قدر بلند ہیں اپنی نگاہ میں
اتنا نہ کر سکیں گے تمہاری نظر سے ہم

مجھے یہ شعر بہت پسند آیا اور بسمل سے ملنے کی خواہش ہوئی۔ نصیر خاں ہی نے ایک دن بسمل صاحب سے ملاقات کرائی، شروع میں کچھ رسمی سا ربط رہا، مگر بسمل کی محبت پہلے ہی دن سے دل میں گھر کر گئی تھی۔ ۱۹۰۴ء سے تعلقات میں استواری آنی شروع ہوئی اور ان کے آخری زمانے تک یہ رشتۂ محبت قائم رہا۔ مجھے یہ سوچ کر خود بھی حیرت ہوتی ہے کہ اتنے طویل عرصہ میں بسمل صاحب سے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی نہ کبھی کوئی ادنا سی تلخی یا بدمزگی ہوئی، حالانکہ میر کی طرح میری "بیدماغی" بھی اشتہار یافتہ ہے، اسی سے بسمل صاحب کی طبیعت کی نرمی، تحمل اور ان کے قلب کی وسعت کا اندازہ کر لیجئے۔ صرف ایک بار بسمل صاحب مجھ سے رنجیدہ ہوئے تھے اور اس میں واقعی سراسر میری غلطی تھی۔ ہوا یہ کہ جوش ملیح آبادی نے اپنے پاکستان جانے کے چند ماہ بعد بسمل صاحب کو ایک خط لکھا، خاصا طویل خط شاید دو صفحوں پر تھا اس سے اور باتوں کے علاوہ یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ جوش پاکستان جاکر خوش نہیں ہیں اور پچھتا رہے ہیں۔ بسمل صاحب نے وہ خط مجھے پڑھنے کے لیے دیا، میں اس زمانہ میں ایک رسالہ کا "بھوت ایڈیٹر" تھا، میں نے بسمل صاحب سے اجازت لیے بغیر وہ خط چھاپ دیا۔ اس سے بسمل صاحب بہت رنجیدہ ہوئے ان کا کہنا یہ تھا اور بجا تھا کہ جوش صاحب کے علم میں آئے گا تو وہ سمجھیں گے کہ بسمل نے قصداً وعمداً اسے شائع کرایا ہے۔ خیر میں نے بسمل صاحب سے عذر خواہی کی اور ان کا دل صاف ہو گیا۔ اس کے سوا کبھی کوئی واقعہ ہمارے درمیان بدمزگی پیدا کرنے والا رونما نہیں ہوا۔

بسمل صاحب نے ڈگریوں والی تعلیم حاصل نہیں کی تھی ان کی تعلیم پرانے

Marfat.com

انداز سے گھر پر ہی ہوئی تھی، مگر اُن کا علم ایسا پختہ اور منجھا ہوا تھا کہ ان کی تحریر و تقریر میں کبھی جھول نہیں دیکھا۔ وہ ایک ایک لفظ کے معنی پر ہی نہیں اس کے مزاج پر بھی غور کرتے تھے اور لفظوں کے استعمال کو بھی ایک بہت لطیف صناعی جانتے تھے جس میں چابک دستی اور پرکاری کی اہمیت ہے۔ دوسروں کی نثر و نظم سنتے یا پڑھتے تو انھیں صحیح جگہ پر کھٹکا ہوتا تھا اور کبھی کبھی تو ایسا منھ بناتے تھے جیسے کسی بہت ہی متعفّن اور غلیظ شے کا سامنا ہو گیا ہو۔ انھیں مطالعہ کرنے کا موقع کم ہی ملتا تھا جو کچھ تھا پرانا پڑھا ہوا تھا، یا مجلسی اور سماعی علم تھا لیکن اردو شاعری سے ہی نہیں کلاسیکی فارسی شاعری سے بھی ان کی واقفیت بہت اچھی تھی۔ اردو اور فارسی کے اساتذہ متقدمین کے بہترین اشعار انھیں یاد تھے اور انھیں برمحل سناتے تھے۔ اچھا شعر خواہ جدید شاعر کا ہو یا کسی قدیم استاد کا وہ سن کر خوش ہوتے تھے اور ان کے معیار سے اس میں کچھ جھول ہوتا تو خواہ کتنا ہی بڑا اور مانا ہوا شاعر ہو، بسمل صاحب منھ بنانے اور تنقید کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اچھا شعر کہنا ایسا ہے جیسے کلس تک تاج محل بنانا، اگر تاج محل تو پورا بن جائے مگر کلس میں کچھ کمی رہ جائے تب بھی اسے نقص ہی کہا جائے گا۔ لفظوں کی خوبی بندش اور سلیقہ کی مثال میں خود بسمل کے سیکڑوں اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں۔ بسمل صاحب کے معاملہ میں اپنے سوا کسی اور کے ذوق یا معیار نقد و نظر کے مشکل ہی سے قائل ہوتے تھے مگر یہ کوئی ہٹ دھرمی یا "انا" نہیں تھی، اگر وہ کسی سے بھی کوئی اچھی یا نکتہ رسی کی بات سنتے تھے تو کھلے دل سے داد بھی دیتے تھے، کوئی معقول اعتراض ہوتا تو اسے قبول بھی کرتے تھے، قبول نہ بھی کریں تو حجت نہیں کرتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میں نے ان کے کسی شعر میں جھول نکال دیا یا کوئی بہتر لفظ تجویز کر دیا تو انھوں نے اسے خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔

بسمل صاحب مجھے "علامہ" کہا کرتے تھے شروع میں اس پر

میں نے احتجاج بھی کیا برُا بھی مانا، جھلّایا بھی، مگر بسمل صاحب نے اس کی ذرا پروانہ کی۔ خلوت میں، جلوت میں، مذاق میں، سنجیدگی میں "علامہ" ہی کہا کرتے، آخر میں پیرانداز ہوگیا۔ وہ شعر کے مفہوم پر بعد میں غور کرتے تھے پہلے اس کا تانا بانا دیکھتے تھے اور کہتے تھے: "علامہ، آج کل لوگ اس طرح شعر کہتے ہیں کہ ردیف تک یہ پتا نہیں چلتا کہ قافیہ کیا آئے گا!" کوئی شعر اگر کلاسیکی روایت کے مطابق نک سک سے درست اور بندش میں چست ہوتا تو اس کی خوب تعریف کرتے تھے۔ میں نے قدیم طرز کے شاعروں میں دو ہی حضرات کو دیکھا جو شعر کے ظاہر و باطن پر گہری نگاہ رکھتے تھے ایک نواب مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی، دوسرے بسمل سعیدی ٹونکی، بسمل صاحب اثر لکھنوی کی طرح وسیع المطالعہ نہیں تھے مگر ان کی نگاہِ نہ رس شعر کے ساتویں طبقے تک اتر جاتی ہے۔ ایک بار چیمسفورڈ کلب میں مشاعرہ ہو رہا تھا، شمیم کرہانی مرحوم نے غزل پڑھی جس کے ایک شعر میں کچھ ایسے الفاظ تھے کہ "شیخ حرم زادہ ہے" بسمل صاحب نے بڑی سنجیدگی سے داد دیتے ہوئے کہا: "شمیم صاحب، غزل میں منقبت کہنا آپ ہی کا حصہ ہے" شمیم صاحب فوراً سمجھ گئے اسی وقت اپنا شعر قلم زد کر دیا، دونوں ہاتھوں سے بسمل صاحب کے گھٹنے دبا دبا کر معذرت خواہی کے انداز میں بار بار کہتے رہے کہ آپ نے خوب توجہ دلائی شمیم صاحب نے تو شیخ اور حرم کی رعایت سے "حرم زادہ" لکھ دیا تھا مگر بسمل صاحب نے نہایت لطیف انداز میں انھیں یاد دلایا کہ حضرت علی کے سوا کوئی حرم میں پیدا نہیں ہوا۔

بسمل صاحب نہایت حساس آدمی تھے، بہت دکھی رہتے تھے، ان کے پھیپھڑے بھی تب دق سے متاثر تھے، اپنا ہی نہیں دوسروں کا دکھ بھی انھیں بیکل کر دیتا تھا، خود ضرورت مند ہوتے ہوئے بھی اپنی بساط اور حیثیت سے زیادہ دوسروں کی مدد کر دیتے تھے۔ ایک بار میں نے مبہم لفظوں میں اپنی

Marfat.com

کسی پریشانی کا تذکرہ کیا تو کہنے لگے: " علّامہ میرا تجربہ یہ ہے کہ مبہم لفظوں میں اپنی پریشانی بیان کرو تو لوگ اُسے زیادہ سے زیادہ مالی احتیاج کا اظہار سمجھ لیتے ہیں۔" آخر تک ان کا یہ معمول رہا کہ کو لہنے کراہنے باڑہ ہندوراؤ سے جامع مسجد آتے، پھر بلیماران، کبھی چھٹی کے دن میرے مکان پر آجاتے اور گھنٹوں ساتھ رہتے، دن میں حیات جاوید صاحب کی دکان پر یا ڈاکٹر پریم لال شفا کے مطب میں یا باڑہ ہندوراؤ کے صدیقی دواخانہ میں جا بیٹھتے تھے، کوئی مخاطب صحیح مل گیا تو اس سے باتیں کرتے تھے، اجنبی، احمق یا نامعقول آدمی سے انھیں بے حد وحشت ہوتی تھی۔ بسمل صاحب کی بعض ادائیں بچوں کی سی تھیں مثلاً گھوڑا تانگا ابھی آدھا فرلانگ دور ہوتا تھا کہ وہ اس سے بچنا شروع کر دیتے تھے۔ ایک دن میں نے کہا کہ آپ تانگے سے اتنا کیوں ڈرتے ہیں؟ کہنے لگے: " علّامہ اس میں دو جانور ہوتے ہیں اور کھینچنے والا جانور ہانکنے والے سے زیادہ سمجھ دار ہوتا ہے۔"

ایسا غموں کا مارا دکھوں کا پچھاڑا ہوا انسان کتنا ظریف، نکتہ رس، نکتہ سنج تھا اور کیسی من موہنی باتیں کر سکتا تھا افسوس میں اس کی مثالیں بھی نہیں لکھ سکتا آئے دن کوئی نہ کوئی لطیفہ ہوتا رہتا تھا۔ وہ کہیں مروت یا متانت کے سبب سے دم سادھ لیں تو دوسری بات ہے ورنہ ترکی بہ ترکی جواب دینے میں کہیں بند نہ تھے۔ ایک صاحب کے گھر پر مخصوص شعری نشست ہو رہی تھی جوش اور فراق بھی موجود تھے، بسمل نے اپنی یہ غزل پڑھی:

بچا جاتے ہیں نظریں خاک کے ذروں سے ہم لیکن
ہمیں افلاک پر نقد و نظر کرنا بھی آنا ہے

فراق کی رگ ظرافت پھڑکی تو کہنے لگے: بسمل ردیف اچھّی ہے بسمل صاحب نے برجستہ کہا: فراق صاحب قافیہ بھی ملاحظہ طلب ہے" جو لوگ سمجھ گئے وہ دیر تک لطف لیتے رہے۔

Marfat.com

بسمل صاحب نے ایک واقعہ سنایا تھا کہ نواب مکرم علی خاں آف پھاسو کی کوٹھی پر کوئی گانے والی آئی تھی، بسمل صاحب اس کے ساتھ موٹر میں کہیں جا رہے تھے پچھلی نشست پر وہ بسمل کے ساتھ بیٹھی تھی اور آگے ڈرائیور کے ساتھ ٹونک کے میر جواد علی تھے، ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی، فلم "پکار" نئی نئی چلی تھی اس مغنیہ نے اسی فلم کی غزل گانی شروع کی:

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے
بج رہا ہے اور بے آواز ہے

تھوڑی دیر کے بعد میر جواد علی نے مڑ کر دیکھا، کھیسین نکال کر منھ بنا کر بولے: "عیسی میاں اس شاعر سے پوچھو کہ جب وہ بے آواز ہے تو "بج" کیا رہا ہے؟

اب جہاں کسی شعر پر کوئی اعتراض کرنا ہوتا تو میں بسمل صاحب سے کہتا کہ "میر جواد علی یوں فرماتے ہیں" یا "میر صاحب کا خط آیا ہے" بسمل صاحب بھی اپنے اشعار سناتے یا دوسروں کا کلام سنتے وقت کنکھیوں سے میری طرف دیکھتے اور مسکرا کر دریافت کرتے: "علامہ میر صاحب کا خط نہیں آیا؟" دوسرے لوگ ہمارے اِن اشاروں کو سمجھ ہی نہ پاتے تھے۔

زاہد کسی کی بات جو کہہ جائے بزم میں
تیرے فرشتہ خاں کو بھی اُس کی خبر نہ ہو

بسمل صاحب کو حکومت ہند سے ادبی وظیفہ ملتا تھا بس یہی ان کی مستقل آمدنی سمجھ لیجیے، مشاعروں میں کم جاتے تھے لیکن تھوڑی بہت یافت اس مد سے بھی ہو جاتی تھی کہیں سے کبھی کبھار کلام شائع ہونے کا تھوڑا سا معاوضہ مل جاتا تھا، خلاصہ یہ کہ بہت محدود و مختصر آمدنی والے انسان تھے مگر ایسے فیاض اور دریا دل کہ میں نے اُنھیں کبھی خرچ کرنے سے ذرہ بھر ہچکچاتے نہیں دیکھا، جو کچھ جیب میں ہوتا اُسے وہ بے تکلف کسی بھی مد میں خرچ

کر سکتے تھے۔ کئی برس تو یہ حال رہا کہ میری اور بسمل صاحب کی جیب میں کوئی فرق نہیں تھا ہمیں کبھی یہ خیال ہی نہ ہوتا تھا کہ کون خرچ کر رہا ہے' اُن کی کشادہ دستی کی بنا پر یقیناً ان کی جیب پر زیادہ بوجھ پڑتا ہوگا۔ آخری زمانہ میں جب چل چلاؤ قریب تھا' ایک دن خزانہ سے اپنی پنشن وصول کر کے سیدھے میرے مکان پر آئے اور کبھی مجھ سے کچھ لیا ہوگا وہ نہایت اصرار کر کے واپس کیا، دس دس روپیہ میرے بچوں کو دیے' میں نے ہر چند روکا، نہیں مانے، کہنے لگے میری خوشی اسی میں ہے۔ میرے غریب خانہ پر وہ ان کی آخری آمد تھی۔

جب میں دلّی کالج ہاسٹل میں رہتا تھا تو بسمل صاحب روز دوسرے روز وہاں تشریف لاتے تھے، کمرہ اندر سے بند ہوتا تو کھٹکا نہیں کرتے تھے باہر کرسی پر بیٹھے انتظار کیا کرتے' میں ان کی آہٹ سن کر دروازہ کھول دیتا تھا، دو چار منٹ خاموش بیٹھ کر سانس درست کرتے' پھر بات چیت کا آغاز ہوتا، چائے کا دور چلتا' میرے لیے کچھ نہ کچھ سوغات لاتے رہتے تھے' ایک بار اپنی پانوں کی ڈبیا ہی عنایت کر دی۔ ٹونک سے بہت خوب صورت تراش کے نفاست سے سلے ہوئے بٹوے لے کر آتے تھے' تین چار مجھے دیتے باقی دوسرے ملنے والوں کو عطا کرتے۔ ایک بار ٹونک سے آئے تو بٹوے دیتے ہوئے کہا: "علامہ اب ایسے بٹوے نہ مل سکیں گے جو شخص ان کے بنانے کا ماہر تھا افسوس ہے اس کا انتقال ہو گیا" تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد انھوں نے اپنی تازہ غزل سنائی جس کے بعض اشعار مجھے ڈھیلے محسوس ہوئے میں نے کہا: بسمل صاحب ٹونک میں جو آپ کے بٹوے بناتے تھے کیا شعر بھی وہی کہہ کر دیا کرتے تھے؟"

ایک دن بسمل صاحب نئی دلّی میں کوئی سرکاری مشاعرہ پڑھ کر آئے، اس وقت ایک خاصی قبول صورت خاتون وزیر ہوا کرتی تھیں ان کی صدارت

Marfat.com

میں مشاعرہ تھا، خاتون وزیر نے "اپنا" کلام بھی سنایا، بسمل صاحب مجھ سے بڑی حیرت اور استعجاب کے ساتھ کہنے لگے "علّامہ وہ تو شعر کہتی ہے اور بہت اچھا کہتی ہے، رات اس نے اپنی غزل بھی سنائی، بسمل صاحب نے ایک شعر نقل کیا، میں نے کہا: "بسمل صاحب، حد ہوگئی، آپ کی مت بھی ماری گئی؟ یہ تو داغ کا شعر ہے، آپ کیسے غچّا کھا گئے؛ بسمل صاحب کو فوراً احساس ہوا، کچھ جھینپ گئے اور کھسیانے ہوکر کہنے لگے: "مگر علّامہ اگر وہ یہ بھی کہتی کہ قرآن شریف میں نے لکھا ہے تب بھی کس کی مجال تھی جو تردید کرتا۔"

بسمل صاحب ایک ایسے خاندان علم وفضل سے تعلّق رکھتے تھے جسے ہند اسلامی ثقافت کی تاریخ میں خاص امتیاز حاصل رہا ہے مگر انھوں نے کبھی اپنے خاندان کا کسی سے تذکرہ نہیں کیا، کہا تو یہ کہ:

بسمل اب ختم ہے ذلّت پہ مری سلسلہ عزّتِ آبائی کا

اسی روایت کا اثر تھا کہ اپنی ساری رندی و آزادہ روی کے باوجود وہ ایک مذہبی ذہن کے انسان تھے، اعلا اخلاقی و مذہبی اقدار کو دل وجان سے عزیز رکھتے تھے اور ان کے سوچنے کے انداز میں بھی کوئی ٹیڑھ میڑھ نہیں تھی۔ شراب سے وہ کبھی کبھار شغل ضرور کرتے تھے اور بڑے اہتمام سے جام و مینا کی صف بندی کرکے بیٹھتے تھے مگر اتنی طویل مدت میں کبھی میں نے اُن کو بہکتے ہوئے نہیں دیکھا، میرے مکان پر بھی وہ عالم سرور میں شاید ایک دو بار ہی آئے ہوں۔ آخری زمانہ میں بالکل ترک کردی تھی۔

بسمل صاحب کے شاگردوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ شاید اس زمانہ میں دلّی میں کسی اور شاعر سے اتنا فیض نہ اٹھایا گیا ہوگا، مگر ان شاگردوں کے بھی طبقات ہیں کچھ تو ان کے باقاعدہ و باضابطہ شاگرد ہیں جیسے مخمور سعیدی اور مراد سعیدی وغیرہ، کچھ ان سے مشورہ تو کرتے تھے مگر باقاعدہ شاگرد

Marfat.com

شمار نہیں ہوتے جیسے ڈاکٹر اسلم پرویز۔ کئی شاعر ایسے ہیں جن کے مجموعہ ہائے کلام پر بسمل نے الف سے یا تک نظرِ ثانی و اصلاح کا کام کیا اور جا بجا اصلاحیں دے کر اُسے " بلاغت نظام " بنا دیا مگر ان حضرات نے بسمل صاحب کی اس خدمت کا اعتراف کرنے کو بھی کسرِ شان سمجھا جو شاگرد ان کی خدمت کرنا چاہتے تھے وہ بے بضاعت رہے اور جو کر سکتے تھے وہ بے توفیق تھے۔ انھیں ایک پیالی چائے اور دو بسکٹ کھلا پلا کر اپنے دل کو مطمئن کر لیتے تھے کہ استاد کی " خدمت " کر دی۔ ایک بھاری بھرکم سے شاعر تھے شریف حسین صابریؔ دریا گنج میں واقع حضرت شاہ صابر بخش کی درگاہ سے ان کا تعلق تھا۔ انھیں شاعری کا ذوق ہوا تو پہلے استاد رفیق احمد رسا دہلوی کے شاگرد ہوئے، پیسے والے آدمی تھے خوب کھلاتے پلاتے لگے مگر کچھ دنوں میں انھیں اندازہ ہو گیا کہ بسمل سعیدی سے مشورۂ سخن کرنے میں زیادہ فائدہ ہے اب وہ استاد رسا کی چھتری سے اڑ کر بسمل سعیدی کی چھت پر آن بیٹھے اور " تبسم سعیدی " ہو گئے۔ اپنی تازہ غزل لے کر آتے اور کسی چائے خانے میں بیٹھ کر اس کی نوک پلک درست کراتے، چائے، بسکٹ، مکھن وغیرہ کے آرڈر چلنے لگتے۔ استاد رسا نے ایک دو دن یہ تماشا دیکھا کہ ان کا پٹھّا دوسرے پہلوان کے اکھاڑہ میں اُتر گیا ہے، ایک دن ضبط نہ ہو سکا شریف صاحب کو راستہ میں روک کر کہنے لگے: " میاں یہ وہ لوگ ہیں جو ریاستیں چٹ کر گئے ریاستیں، تمہارا باپ تو دو قبریں تمھیں دے گیا ہے تم انھیں کب تک کھلاؤ گے؟

اس زمانہ میں کئی شاعر پابندی سے جامع مسجد آتے تھے کچھ تو وہ تھے جو تازہ غزل کہہ کر سنانے کے لیے بے چین ہو جاتے تو اردو بازار کی طرف بھاگتے تھے، بعض اپنے کلام پر اصلاح لینے کو آتے تھے بسمل صاحب کا وقت اسی شغل میں گزرتا تھا کسی کا کلام سن رہے ہیں کسی کو اصلاح دے رہے ہیں۔

Marfat.com

شاعر ملتا تو چائے پلانے کی پیش کش کرتا اس کا مطلب ہماری لغت میں یہی تھا کہ تازہ غزل کہہ کر لایا ہے۔ بسمل صاحب ہاتھ منہ دھو کر رومال سے پونچھ کر اور رومال اپنی گود میں بچھا کر ایسے خشوع و خضوع سے کلام سننے اور چائے پینے کو بیٹھتے جیسے کوئی جلالی وظیفہ پڑھنے کی تیاری ہے، کلام شروع ہوتا تو میں کان میں کہتا کہ بسمل صاحب خالی چائے کی پیالی پر تو بس کلام سنا ہی جا سکتا ہے داد دینے کی نہیں بدی ہے اب شاعر کچھ کیک بسکٹ نذر کرتا یا اُن پر مکھن لگ جاتا تو داد میں بھی جان پڑ جاتی تھی۔ ایسے شاعروں کو ہم نے دور سے پہچاننا شروع کر دیا تھا، وہ چوراہے پر ہوتا تو ہم "شاعران دی ہٹی" پر بیٹھے ہوئے اس کو تاڑ لیتے تھے، بسمل صاحب چونک کر کہتے: "علامہ۔ موذی" یہ اشارہ "قتل موذی قبلِ ایذا" کی طرف تھا، اور یہ بھی کوڈ ورڈ بن گیا تھا، اب بجائے "موذی" کے صرف "میم" کہنے پر اکتفا کیا جاتا اور کوئی موٹی اسامی ہوئی تو اسے "میم میم" یعنی موٹا موذی کہتے تھے اور اس کے قریب آنے تک اس کی ہلاکت کا پلان تیار ہو جاتا تھا۔

ایک دن ایک صاحب اپنی رباعیاں برائے اخذ اصلاح سنا رہے تھے انھوں نے "عنادل" دال پر زبر کے ساتھ پڑھا، مجھے شوخی سوجھی تو برجستہ دو رباعیاں کہہ لیں اور بسمل صاحب کے سامنے اصلاح کے لیے رکھ دیں:

بلبل کو پکارتے ہیں بلبل ہم لوگ ۔۔۔ کہتے ہیں عنادل کو عنادل ہم لوگ
ہیں حضرت بسمل کے تلامیذِ رشید ۔۔۔ واللہ کہ ہیں تابع مہمل ہم لوگ

میدان سخن کہ کھلاڑی ہم لوگ ۔۔۔ دیکھیں نہ اکاری نہ بھاری ہم لوگ
ہر فن میں ہوئے طاق بفیض بسمل ۔۔۔ اک شعر میں رہ گئے اناری ہم لوگ

نریش کمار شاد بیسوی صدی میں "سرخ حاشیے" لکھا کرتے تھے انھوں نے یہ دونوں رباعیاں اس میں چھاپ لیں کسی نے بسمل صاحب سے کہا کہ علامہ نے

آپ کو مہمل بنا دیا بسمل صاحب نے مجھ سے کہا: "علاّمہ تو ہم مہمل ہیں؟ میں نے کہا بسمل صاحب تابع مہمل ہیں اضافتِ توصیفی ہے یعنی وہ تابع جو مہمل ہو جیسے پانی وانی میں وانی مہمل ہے پانی نہیں بسمل صاحب مطمئن ہو گئے۔

اللہ اللہ کیا وقت تھا، کیا زمانہ تھا، فراغ تو خیر نہ تھا، افکار اور پریشانیاں بھی کم نہ تھیں، پراگندہ دلی بھی تھی اور ایک بے نام سا غم بھی ہمزاد کی طرح ساتھ رہتا تھا، مگر کیسی شعر خوانیاں ہو گئیں، کیا کیا لطیفے پیدا ہوئے، کیسے کیسے لوگوں سے ملنا جلنا، روٹھنا منانا ہوا، اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب کچھ نہ تھا تو سب کچھ تھا، اب سب کچھ ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔

کیسے کیسے کھلونے ٹوٹ گئے
جن کو دیکھوں تو پھر مچل جاؤں

Marfat.com

محمد حسن

لالہ سری رام

شہروں اور انسانوں کے رشتے بھی عجیب ہیں۔ شہر انسانوں سے رونق پاتے ہیں جنگل ہو یا بیاباں جہاں جاتے ہیں خیمے گاڑتے ہیں بارگاہیں سجاتے اور بستیاں بساتے ہیں ویرانوں کے نصیبے سنوارتے ہیں اور راستے شاہراہیں بنتی ہیں سنسان فضائیں قہقہوں سے اور درد و داغ وجستجو و آرزو سے معمور ہو جاتی ہیں۔ پھر ان بستیوں کے نام مشہور ہو جاتے ہیں ان کی تہذیب دوسروں کے لیے سند ٹھہرتی ہے اور کھانے پینے کے طور طریقہ پہننے اوڑھنے کا سلیقہ اٹھنے بیٹھنے کے آداب۔ بات چیت کا قرینہ ان بستیوں سے سیکھا جانے لگتا ہے اور لوگ شہروں اور بستیوں کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔

دلی بھی ایسی ایک بستی تھی اس کی تہذیب صدیوں کی کمائی تھی اور جن لوگوں نے پرانے زمانے میں اپنے کو دلی والا کہا اور دلی سے نسبت پر فخر کیا وہ ایسی ہی تہذیبی امانتوں کے امانت دار تھے۔ ویسے یہ پتہ چلانا خاصہ دشوار ہے کہ کون ٹھیٹھ دلی والا ہے اور کون صرف نام کا دلی والا ہے اس کا پتہ شاید شجروں سے زیادہ شائستگی سے چل سکتا ہے۔ تہذیبیں ادب اور سائنس کی طرح کسی ایک دور یا کسی ایک ملک کی نہیں ہوتیں پوری انسانیت کی

Marfat.com

ہوتی ہیں اور ان کی دین ان کے زمانے ہی کو نہیں ہوتی سبھی زمانوں کو ہوتی ہے۔ ہوائی جہاز پر سفر کرتے وقت کون سوچتا ہے کہ اسے ایجاد کرنے والا کس قوم، کس مذہب اور کس ملک کا تھا اسی طرح ہر تہذیب کبھی عالمی تہذیب ہی کا حصہ ہوتی ہے جسے سب اپنا لیتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہندوستان میں تہذیبوں کی بھی تقسیم ہوتی آئی ہے کبھی ان کو ہندو اور مسلمان تہذیبوں میں بانٹا گیا کبھی قدیم، متوسط اور جدید میں تقسیم کیا گیا لیکن ہر تہذیب کے ماننے اور برتنے والوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے آئے ہیں جو ان بناوٹی بٹواروں کے قابل نہیں رہے اور اپنی تہذیب کے رنگ میں رنگ گئے۔ لالہ سری رام بھی انہی میں سے تھے۔

سری رام ۵ ر دسمبر ۱۸۷۵ء کو پیدا ہوئے اور ان کا انتقال ۲۵ ر مارچ ۱۹۳۰ء کو ہوا گویا زمانہ وہ تھا جب ہندوستان میں بیک وقت قوم پرستی اور فرقہ پرستی پروان چڑھی دلّی نے اسی زمانے میں محبتوں اور نفرتوں کے اتار چڑھاؤ دیکھے یہی وہ زمانہ تھا جب سوامی شردھانند جی نے جامع مسجد دہلی میں مجمع کو خطاب کیا اور یہی وہ زمانہ تھا جب شدھی سنگٹھن کی تحریکیں چلیں اور فرقہ وارانہ نفرتوں نے زندگی کے تقریباً سبھی شعبوں میں زہر گھول دیا تہذیب فرقہ پرستی کے نام پر بٹ گئی ہندوستان کی تاریخ مذہبی وفاداریوں کے مطابق تقسیم بھی ہوئی مسخ بھی ہوئی دلّی کی تہذیب کا بھی یہی حال ہوا۔ اندر پرستھ کی تہذیب ہندوؤں کے حصے میں آگئی اور شاہجہان آباد والی تہذیب مسلمانوں کی ملکیت سمجھی جانے لگی۔ کیسی بے تکی بات ہے مگر اس زمانے میں تو ریلوے پلیٹ فارم پر پلایا جاتے والا پانی تک ہندو اور مسلمان ہوا کرتا تھا اور آج بھی یہ پانی کچھ اس طرح ہمارا جزو بدن ہوا ہے کہ پوری فضا کو زہر آلود کیے ہوئے ہے۔

سری رام اس دور میں ٹھیٹھ دلّی والے تھے اور دلّی والے

Marfat.com

رہے۔ نفرتوں کے اس طوفان میں بھی ان کی جڑیں اپنی تہذیبی سرزمین پر مضبوطی سے گڑی رہیں۔ آج بھی ان کی پہچان ہے تو یا تو دلّی والے کی حیثیت سے ہے یا پھر اردو کے ضخیم ترین تذکرے 'خم کانۂ جاوید' کے مرتب کی حیثیت سے۔

دلّی سے ان کا رشتہ شاہجہاں آباد بسانے والے شاہجہاں بادشاہ سے زیادہ پرانا ہے کہ وہ اکبر بادشاہ کے نورتن اور مشہور زمانہ وزیر مال راجہ ٹوڈرمل کے خاندان سے تھے جب مغلیہ سلطنت کی راجدھانی آگرے سے دہلی منتقل ہوئی ہوگی تو یہ خاندان بھی دلّی آیا ہوگا۔ شاہجہاں آباد بسایا شاہجہاں نے مگر سجایا محمدؐ شاہ نے جسے رنگیلا کہہ کر زمانے کے ستم ظریفوں نے اس کے کارناموں پر پانی پھیر دیا محمدؐ شاہ کے وزیروں میں بھی اسی خاندان کے بزرگ شامل تھے۔ چنانچہ اس خاندان کی وراثت ہندوستان کی ملواں تہذیب کی وراثت تھی اور لالہ سری رام نے ان وراثتوں کو خوبی سے نبھایا۔ زمانے کی ہوا بدلی اور انگریزوں نے دلّی پر قبضہ کیا۔ مغربی تعلیم کا چلن ہوا تو اس خاندان میں بھی تبدیلیاں آئیں لالہ سری رام کے والد لالہ مدن گوپال نے ایم اے کیا اور بیرسٹری کی ڈگریاں حاصل کیں اور اپنے زمانے کے کامیاب وکیل ہوئے۔ ان کے تایا پیارے لال ٹنڈن نے دہلی میں نئے طرز کی ادبی انجمن قایم کی جو انجمن پنجاب کے انداز کی تھی ٹنڈن جی لاہور میں بھی رہے تھے اور پنجاب میں اردو کی ترویج واشاعت میں سرگرم کار تھے۔

اسی لیے منشی نراین پرشاد مہرؔ شاگرد داغؔ نے لکھا ہے کہ:

" لالہ سری رام یونیورسٹی کے کوئی معمولی ڈگری یافتہ یا ٹٹ پونجیا امیر نہیں ہیں بلکہ ایک قدیمی علم دوست خاندان کے رکن پوتڑوں کے رئیس ہیں ان کے مورث اعلا دربار اکبری کے رکن رکینی موتمن الدولہ

عمدۃ الملک راجہ ٹوڈر مل رکھتے، اور جس طرح ٹوڈر مل نے
"بے آئین ملک کی ارضی پیمائش کرکے مالی آئین باندھا تھا...
اسی طرح (لالہ سری رام) نے ملک سخن کی برسوں جانچ پڑتال
کے بعد یہ تذکرہ بہ نام تاریخی 'خم خانۂ جاوید' لکھ کر مردہ شاعروں
کو زندگی' جاوید اور زندہ سخن وروں کو بقائے دوام کا پٹہ لکھ
دیا ہے" خم خانۂ جاوید جلد سوم صفحہ ۴۶

لالہ سری رام کا آبائی مکان چاندنی چوک میں اس جگہ تھا جہاں اب
بپٹسٹ گرجا ہے Baptist Church یہیں ان کی پیدائش ہوئی تعلیم پہلے
دہلی میں اور پھر لاہور میں حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ۱۸۹۵ء
میں ایم اے کیا اور دہلی میں ۱۹۰۴ء تک منصف رہے مگر قانون سے زیادہ
ادب سے دل چسپی تھی ۱۹۰۴ء میں منصفی کو خیرباد کہا اس کے بعد آخر وقت
تک کوئی دوسری ملازمت نہ کی۔

خود شاعر نہ تھے مگر شعر و شاعری سے گہری دل چسپی تھی شعرا کے دیوان
اور کلیات جمع کرنے کا شوق تھا نثر میں ان کے چند مضامین اس دور کے
اہم اردو رسالوں مثلاً مخزن لاہور اور زمانہ کانپور میں شائع ہوئے تھے۔
قدیم کتابوں اور دواوین کا خاصہ بڑا ذخیرہ ان کے پاس تھا کہا جاتا ہے کہ
حسرت موہانی نے انتخاب مائل لالہ سری رام ہی کے مرتب کردہ مرزا محمد تقی
مائل کے مجموعۂ کلام ہی سے منتخب کیا تھا۔ لالہ سری رام نے انور دہلوی کا
دیوان اپنی طالب علمی کے زمانے میں ہی چھپوایا تھا اور یادگار داغ اور
ضمیمہ یادگار داغ بھی انھوں ہی نے شائع کیے۔ ان کے انتقال کے بعد
کتابیں ان کی وصیت کے مطابق بنارس ہندو یونیورسٹی کو
دے دی گئیں۔

ادب میں ان کی یادگار اردو کا خم

Marfat.com

پانچ جلدوں کا یہ تذکرہ سیکڑوں اردو شاعروں کا مرقع ہے پانچ میں سے
چار جلدیں ان کی زندگی میں شائع ہوئیں پانچویں جلد ان کی وفات کے بعد
پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے مرتب کرکے شائع کی گو اس کا بیشتر
حصہ خود سری رام کا مرتب کردہ ہے یا کم سے کم اس کے لیے معلومات ان
کی فراہم کردہ ہے۔ یہ تذکرہ بیس برس میں مرتب ہوا تھا اور پہلی جلد ۱۹۰۸ء
میں شائع ہوئی تھی جلد اول میں ان تذکروں کی فہرست بھی شامل ہیں۔ جن
سے خم خانۂ جاوید کی تدوین میں مدد لی گئی تھی۔

خم خانۂ جاوید کی مختلف جلدوں کا یہ بھی ایک امتیاز ہے کہ اس کی تقریظ
لکھنے والوں میں اس دور کے اہم ترین ادبی اور علمی شخصیتیں شامل ہیں۔ حالی
نے خاصی طویل تقریظ لکھی اور تذکرے کی بعض فروگذاشتوں کا بھی ذکر کیا۔
سرگزشت ۱۸۵۷ غدر لکھنے والے ظہیر دہلوی کی تقریظ جلد اول میں شامل ہے
مولوی ذکاء اللہ دہلوی اردو کے مشہور مورخ اور انشا پرداز ہیں اور خود
ٹھیٹھ دلی والے ہیں تذکرۂ خم خانۂ جاوید کے تقریظ نگاروں میں شامل ہیں
سید احمد دہلوی صاحب فرہنگ آصفیہ کی تقریظ میں شریک اشاعت ہے۔ یہی
نہیں اس دور کے سب سے اہم شاعروں میں سے بعض نے خم خانۂ جاوید
کی اشاعت پر قطعات تاریخ کہے یا نظم میں خراج تحسین پیش کیا ان میں
امیر اور داغ کے ہم پلہ معاصر ضامن علی جلال لکھنوی بھی شامل ہیں ان کے
صاحبزادے حکیم سید محمد مہدی کمال ہیں داغ دہلوی کے دونوں مشہور اور
چہیتے شاگرد نواب سراج الدین احمد خاں سایل دہلوی نبیرۂ نواب ضیاء الدین
بہادر نیر درخشاں اور سید وحید الدین احمد بیخود دہلوی ہیں اور اس دور کی
اہم ادبی شخصیت حامد علی خاں بیرسٹر ہیں۔

دیگر اہم تقریظ نگاروں کے ناموں پر ایک نظر۔ اردو ادب کے
مشہور مورخ حامد حسن قادری "بچھراؤنی مقیم رام پور"۔ جو بی۔ایس سنیٹ جانس

Marfat.com

کالج آگرہ کے صدر شعبہ ہوئے اور داستان تاریخ اردو کے مصنف ہیں۔ آغا شاعر دہلوی۔ نوح ناروی شاگرد داغ دہلوی۔ افضل حسین ثابت لکھنوی خواجہ فخرالدین راقم دہلوی خلف صاحب داستان۔ خواجہ امان دہلوی منشی دیانرائن نگم مدیر زمانہ کان پور۔ اکبر الہ آبادی اور مرزا ہادی "حسن چغتائی" رسوا۔ منشی احمد علی شوق قدوائی لکھنوی شاگرد آسیر۔ میرزا رضا علی وحشت کلکتوی اور مشہور زمانہ ادبی علمی سیاسی اور ماہر تعلیم حکیم اجمل خاں۔ ناٹک ساگر کے مصنفین محمد عمر اور انورالہٰی صاحبان اور ریاست حیدر آباد کے وزیر اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد۔

ان ناموں سے اندازہ ہوگا کہ لالہ سری رام کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی اور اس دور کے علمی اور ادبی مشاہیر نے ان کے کام کو کس طرح سراہا تھا۔

لالہ سری رام کے دیکھنے والے اب ناپید ہیں ان کے وارثین میں ایسی کھنہ اور جی سی کھنہ اب بھی دہلی میں علی پور روڈ پر رہتے تھے جی سی کھنہ کی کوٹھی E.C. Charge Store کے قریب ہے دونوں صاحب حیثیت اور متمول ہیں لیکن ان سے لالہ سری رام کی شخصیت کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہ ہوسکیں البتہ برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے خم خانۂ جاوید کی پانچویں جلد کے دیباچے میں ان کی شخصیت اور اخلاق و عادات کے بارے میں اتنا لکھا ہے:

> "(لالہ سری رام) بے تعصب، ادب پرور رئیس تھے کثیرالاحباب تھے دوستوں پر فدا رہتے تھے مگر دوستوں سے بھی محبت کے سلوک کے طالب رہتے۔ غریب امیر کوئی بھی با صلاحیت شخص ان کی عنایتوں سے محروم نہ رہتا۔"

غرض سری رام پرانے دلّی والوں کی مروتوں اور محبتوں کا مجسمہ تھے اپنے

Marfat.com

دور کی دلی اور اس کے ذوق سلیم کے سانچے میں ڈھلے تھے انھیں دلّی کی تہذیب و تمدن کی وہ سبھی باتیں عزیز تھیں جو اس تہذیب کو یادگار زمانہ بنا گئیں پریس فوٹو گرافر اپنے دور کے مشاہیر کی تصویریں کھینچتا ہے مگر اس کی تصویر کون کھینچتا ہے یہی حال لالہ سری رام کا بھی تھا خم خانۂ جاوید کے مرتب کی حیثیت سے انھوں نے لاتعداد شاعروں کے احوال اور ان کے کلام کے نمونے محفوظ کیے لیکن خود ان کا حال احوال ابھی تک قلم بند نہ ہوا۔ ایسے لوگ جو اپنے دور کی تہذیب کی تصویر اور اس تہذیب کی آواز بن جائیں یقیناً قدر اور تحسین کی نظر سے دیکھے جانے کے لائق ہیں کہ وہ اپنے دور کے محض پروردہ ہی نہیں اگلی شرافتوں کے لیے نشانِ راہ بھی ہوتے ہیں اور آنے والی نسلیں کبھی کبھی ان کی شخصیتوں پر نظر کرتی ہیں اور سوچتی ہیں۔

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

Marfat.com

خلیق انجم

ساغر صاحب

ادب کے طالبِ علم کی حیثیت سے میں ساغر صاحب سے واقف تھا، ان کا کلام بھی پڑھا تھا۔ خاصی تعداد میں اُن کے اشعار بھی یاد تھے، لیکن میں نے انھیں کبھی دیکھا نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ میں نے جس زمانے میں ہوش سنبھالا اور مجھ میں ادبی شعور پیدا ہونا شروع ہوا تو وہ بمبئی میں تھے۔ پہلی بار میں نے انھیں دہلی کے ایک مشاعرے میں دیکھا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب ساغر صاحب بمبئی چھوڑ کر آل انڈیا ریڈیو پر پروڈیوسر کی حیثیت سے آ گئے تھے۔ اس مشاعرے میں ایک دل چسپ لطیفہ ہوا تھا، آپ بھی سن لیجیے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب مشاعرے کی نظامت کر رہے تھے۔ انھوں نے تعارف کراتے ہوئے ساغر صاحب کو "قوم کا قوال" کہہ دیا۔ ساغر صاحب کو نہ جانے کیوں یہ بات بہت ناگوار گزری۔ ممکن ہے کنور صاحب کی اس بات کا کوئی پس منظر ہو۔ مائیک پر آکر ساغر صاحب بہت ناراض ہوئے اور کہنے لگے۔" جب سے یہ شیر دلّی آیا ہے دلّی کی لومڑیوں میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔

گلزار دہلوی صاحب اسٹیج پر بیٹھے ہوتے تھے اُن کی رگِ ظرافت پھڑکی، گھٹنوں کے بل نیم استادہ ہوئے اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے" حضور یہ لومڑیاں بھی

Marfat.com

جب دلی آئی تھیں تو خود کو شیر کہتی تھیں" گلزار صاحب کے اس فقرے سے مشاعرے میں اتنے زور کا قہقہہ بلند ہوا کہ سب تلخی ختم ہوگئی یہ تو دور کا جلوہ تھا۔ ساغر صاحب سے پہلی ملاقات ۱۹۵۷ء میں ہوئی۔ ۱۹۵۷ء کی بات ہے، میں دلّی یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کر رہا تھا۔ میرے استادِ محترم پروفیسر خواجہ احمد فاروقی میرے حال پر بہت کرم فرماتے تھے۔ ایک دن انھوں نے کہا کہ بھئی آپ ریڈیو کے لیے کیوں نہیں لکھتے۔ میں نے سیدھا سا جواب دے دیا" ہم سے کوئی لکھواتا ہی نہیں۔ مقصد یہ تھا کہ ریڈیو تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا۔ خواجہ صاحب نے اس وقت ساغر صاحب کے نام سفارشی خط لکھا اور میں دوسرے ہی دن صبح دس بجنے سے کچھ دیر پہلے وہ خط لے کر آل انڈیا ریڈیو میں ساغر صاحب کے پاس چلا گیا۔ ساغر صاحب ابھی آئے نہیں تھے میں ان کے کمرے کے باہر ٹہلنے لگا۔ ٹھیک دس بجے ساغر صاحب آئے۔ وہ ہلکی نیلے رنگ کی شیروانی پہنے ہوئے تھے، سفید چوڑی دار پاجامہ، سر پر بالوں دار ٹوپی۔ کالا چمکتا ہوا جوتا۔ ساغر صاحب کے لباس کی یہ تفصیل مجھے اس لیے یاد ہے کہ اتنے قریب سے میں نے انھیں پہلی بار دیکھا تھا اور ان کی شخصیت، چہرے کی متانت اور سنجیدگی، مردانہ حسن اور لباس کے سلیقے نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ بہر حال اس سے پہلے کہ ساغر صاحب کمرے میں داخل ہوں، میں نے سلام کرکے انھیں خواجہ صاحب کا خط دے دیا۔ لفافے کے کونے پر پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا نام اور میرا حلیہ دیکھ کر انھوں نے اندازا لگایا کہ سوالی ہے اور سفارشی خط لے کر آیا ہے۔ خط کھولے بغیر وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ اپنی کرسی پر بیٹھے اور مجھے سامنے بیٹھنے کے لیے کہا۔ خواجہ صاحب کا خط میز پر رکھ دیا میز کی دراز کھول کر کپڑا نکالا اور میز کی صفائی شروع کردی۔ حالاں کہ اس وقت بھی ان کی میز عام سرکاری

Marfat.com

میزوں سے کہیں زیادہ صاف تھی۔ پوری میز کپڑے سے صاف کرکے ٹیلی فون قلم دان، پیپرویٹ وغیرہ چمکائے جب میز کی ہر چیز چمکائی جا چکی تو کپڑا میز کی دراز میں رکھ دیا دوسری دراز کھول کر ایک اور کپڑا نکالا کرسی ذرا پیچھے کھسکائی اور جوتے صاف کیے۔ یہ کپڑا بھی دراز میں واپس رکھ دیا۔ اب جیب میں سے رومال نکالا اور کافی دیر تک چشمہ صاف کیا۔ چشمہ صاف ہو گیا تو جیب سے دو فاؤنٹن پین نکال کر ان کی رگڑائی شروع ہو گئی۔ اس دوران وہ بہت شفقت آمیز گفتگو کرتے رہے۔ انھوں نے میری تعلیم، دل چسپیوں اور ذاتی زندگی کے بارے میں بہت سے سوال کیے۔ جب ہر چیز کی صفائی ہو چکی تو انھوں نے خواجہ صاحب کا خط کھول کر پڑھا۔ مضمون وہی تھا، جس کی انھیں توقع تھی۔ خط پڑھ کر کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر فرمانے لگے آپ "اردو شاعری میں ناصح" پر ایک گفتگو لکھیے۔ ریڈیو پر آپ کے دوسرے ساتھی ہوں گے۔ طالب دہلوی، ہاں، کمرے میں داخل ہوتے وقت ساغر صاحب نے چپڑاسی سے کافی لانے کے لیے کہا تھا۔ اب وہ کافی لے آیا۔ ساغر صاحب نے اپنے ہاتھ سے چینی ڈالی اور مجھے کافی عنایت فرمائی۔ ہم لوگ کافی پیتے رہے اور ساغر صاحب "اردو شاعری میں ناصح" کے موضوع کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے رہے۔ ان کی گفتگو ایسی تھی جیسے دو ہم عمر لوگ بات کر رہے ہیں۔ انھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی مجھ پر اپنی شخصیت کا اثر ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ میں تقریباً آدھے گھنٹے ان کے ساتھ رہا آج تک اس ملاقات اور ساغر صاحب کی بزرگانہ شخصیت کی یاد کے نقوش میرے دل و دماغ میں محفوظ ہیں۔ یہ میری ساغر صاحب سے پہلی ملاقات اور ریڈیو پر میری پہلی ٹاک تھی۔

صمد یار خاں یعنی ہمارے ساغر نظامی کی زندگی بہت دل چسپ اور رنگا رنگ تھی۔ وہ شاعر تھے، نثر نگار تھے، ادبی صحافی تھے، کتابوں کے

Marfat.com

ناشر تھے، جنگِ آزادی کے مجاہد تھے، فلموں کے کہانی کار، مکالمہ نگار اور گیت نگار تھے۔ پھر چوں کہ خود صفِ اول کے شاعر تھے، اس لیے اپنے عہد کے صفِ اول کے شاعروں اور ادیبوں سے اُن کے گہرے مراسم تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد پنڈت جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، سید محمود جیسے سیاست داں ساغر صاحب کے قدر دانوں میں تھے۔ اگر ساغر صاحب کی زندگی کے حالات تفصیل سے لکھے جائیں تو کئی جلدوں میں سمائیں گے۔ لیکن انتہائی مختصر الفاظ میں صمد یار خاں کے والد ڈاکٹر احمد یار خاں میونسپل کمیٹی کے محکمۂ صحت میں چیچک کے شعبے سے منسلک تھے۔ ساغر صاحب کی والدۂ محترمہ صغرا بیگم علی گڑھ کے مولوی حسن رضا خاں کی صاحبزادی تھیں۔ ساغر صاحب علی گڑھ میں ۲۱ دسمبر ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ساغر صاحب ۱۹۰۰ء سے پہلے پیدا ہوئے تھے۔ خود ساغر صاحب کو اصل تاریخ یاد نہیں تھی۔ میں نے جو تاریخ ولادت لکھی ہے، وہ مالک رام صاحب کی لکھی ہوئی ہے، اس لیے اس کے غلط ہونے کا امکان کم ہے۔

اکثر بزرگوں سے سنا ہے کہ ساغر صاحب جوانی میں بہت خوبصورت بلکہ گلفام تھے۔ وہ نوجوان لڑکوں کا آئیڈل اور نوجوان لڑکیوں کا خواب تھے۔ چوں کہ شعر میں فارسی اور عربی کے موٹے موٹے الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرنے کی بجائے سیدھی سادی زبان استعمال کرتے تھے اس لیے مشاعروں میں ان کے کلام پر عوام اور خواص دونوں ہی جھومتے تھے۔ ساغر صاحب کو اپنے عہد میں قابلِ رشک مقبولیت حاصل ہوئی تھی اس حقیقت سے انکار نہیں کہ جوش بڑے شاعر تھے۔ لیکن ایک زمانہ وہ تھا جب مشاعروں میں ساغر صاحب کے مقابلے میں انھیں کم داد ملتی تھی۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو اُن کی زبان مشکل ہوتی تھی اور دوسرے

Marfat.com

وہ تحت میں پڑھتے تھے۔ جوش صاحب نے بہت دل چسپ اور رنگین رباعیاں کہہ کر یہ کمی پوری کی۔ وہ اپنا کلام سنانے سے پہلے دو چار رباعیاں سنا کر مشاعرے کی فضا سازگار کیا کرتے تھے۔

۱۹۷۵ء میں کچھ لوگوں نے غالب میموریل کوآپریٹو گروپ ہاؤسنگ سوسائٹی بنائی۔ ہندوستان میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی سوسائٹی ہے جس کے ممبران میں بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے، جو ہندوستان کی کسی بھی زبان کے ادیب اور شاعر ہیں۔ اس کے ابتدائی ممبروں میں میرے علاوہ پنڈت آنند موہن گلزار زتشی، ضامن علی خاں ضامن، شمیم احمد صاحب، ڈاکٹر یوگندر بہل تشنہ اور ایم۔ بی۔ مغل تھے۔ اس زمانے میں سوسائٹیوں کے رجسٹریشن پر پابندی تھی۔ اس لیے اس کے لیے ہمیں ایک بزرگ شاعر یا ادیب کی ضرورت تھی، جس کا نام لے کر دہلی کی حکومت پر دباؤ ڈالا جا سکتا ہو، ہماری نظر ساغر صاحب پر پڑی۔ کیونکہ سرکاری افسران ساغر صاحب سے بخوبی واقف تھے اور پھر چوں کہ ساغر صاحب پدم بھوشن تھے اس لیے ہمارا خیال تھا کہ جو لوگ ساغر صاحب سے واقف نہیں ہوں گے انھیں "پدم بھوشن" کے خطاب سے مرعوب کر لیں گے چنانچہ ساغر صاحب سے درخواست کی گئی کہ اس سوسائٹی کے نہ صرف رکن بنیں بلکہ صدارت قبول فرمائیں، ساغر صاحب راضی ہو گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ ساغر صاحب شاعر ہیں سوسائٹی کا کام وام تو کیا کریں گے ہم سرکاری دفتروں میں اُن کے نام کا فائدہ اٹھا کر اپنا کام نکال لیں گے۔ لیکن دل چسپ بات یہ ہوئی کہ پہلے ہی دن سے ساغر صاحب نے سوسائٹی میں عملی دل چسپی لینی شروع کر دی۔ انھوں نے بے شمار سوالات کر کے سوسائٹی کے بارے میں پوری معلومات حاصل کیں۔ اور پھر کچھ دن کے بعد سے سوسائٹی کا جو کام شروع کیا تو صاحبِ فراش ہونے تک سوسائٹی کے کاموں میں مصروف رہے۔

ساغر صاحب کو اپنی عزت اور وقار نہیں بلکہ سوسائٹی کا مفاد عزیز اور

مقدم تھا وہ ہم سب کے ساتھ مرکزی وزیروں، لفٹیننٹ گورنر اور دوسرے اعلا عہدیداروں کے پاس بھی جاتے اور معمولی معمولی کلرکوں کی میز پر بھی گھنٹوں بیٹھتے۔ جن لوگوں کی محنت اور اثر و رسوخ کی وجہ سے یہ سوسائٹی رجسٹرڈ ہوئی، اسے زمین ملی اور مکان بننے شروع ہوئے۔ اُن میں ساغر صاحب کا نام سرِ فہرست ہے۔ ساغر صاحب کو تعمیر کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لیکن غیر معمولی کوشش کر کے، انھوں نے اس فن میں اتنی مہارت ضرور حاصل کر لی تھی کہ ٹھیکدار آسانی سے انھیں بے وقوف نہیں بنا سکتا تھا۔ ساغر صاحب کو شوق تھا کہ ان مکانات کی باہری دیواروں پر محرابیں بنائی جائیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے بڑی تعداد میں مسلم فنِ تعمیر پر کتابیں منگائیں، بہت سے چھوٹے بڑے آرکی ٹیکٹوں سے مشورہ کیا۔ وہ شاعر تھے، اُن کے ذہن میں ایسی محرابیں تھیں، جنھیں کوئی آرکی ٹیکٹ کاغذ پر سے منتقل نہیں کر سکا۔

ساغر صاحب نے ادبی محاذ پر نئی نسل سے سمجھوتہ کر لیا تھا انھیں اپنے بعض معاصرین سے ضرور شکایتیں تھیں جن کا وہ کبھی کبھی تفصیل سے ذکر کرتے، لیکن نئی نسل کی وہ پذیرائی کرتے۔ اس کی حوصلہ افزائی کرتے اور اُس کے کاموں کی تعریفیں کرتے۔ آل انڈیا ریڈیو کے پروڈیوسر کی حیثیت سے ساغر صاحب نے نئی نسل کے فنکاروں کی جس طرح سرپرستی اور رہنمائی کی تھی، وہ یقیناً کسی اور بزرگ شاعر یا ادیب نے نہیں کی اور ریٹائر ہونے کے بعد بھی ان کا یہی رویہ قائم رہا وہ نوجوان شاعروں کا اچھا کلام پسند کرتے اور بُرے کلام کو نظر انداز کر دیتے۔

ساغر صاحب کے پاس اچھی خاصی تعداد میں رسالے آتے وہ کہانیوں کے علاوہ اس کا ایک ایک لفظ پڑھتے۔ جب بھی کوئی اچھی چیز پڑھتے، تو مجھ سے اس کا تفصیلی ذکر کرتے اور تعریفیں کرتے۔ ایک دن میں نے کہا "ساغر صاحب

Marfat.com

آپ صرف ان مضامین اور اُس شاعری کی تعریف کرتے ہیں، جو آپ کو پسند آتی ہے، ایسی بھی تو چیزیں ہیں جو آپ کو پسند نہیں آتی ہونگی، ان کا آپ ذکر کیوں نہیں کرتے؟" ساغر صاحب نے مسکراکر جواب دیا۔

"آپ نے اب تک جو کچھ لکھا ہے کیا وہ سب قابلِ تعریف ہے کیا اس میں دوسرے اور تیسرے درجے کی چیزیں نہیں ہیں۔ میری شاعری ہو یا آپ کی نثر۔ سب میں ہر درجے کی چیزیں ہوتی ہیں۔ جن لوگوں کا کلام آج آپ کو پسند نہیں آتا، اُن ہی میں کچھ لوگ کل بہت اچھا شعر بھی کہیں گے اور اردو ادب کی آبرو بنیں گے۔"

عام سماجی زندگی میں بھی ساغر صاحب کا یہی روّیہ تھا، وہ غالب سوسائٹی کے ہر عہدیدار سے ادب اور احترام سے ملتے تھے چاہے وہ عمر میں اُن سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ ہم ان کے گھر دن میں ایک بار جائے یا دس بار۔ ذکیہ بھابی چائے ضرور لاتیں اور میز پر بسکٹ ضرور رکھتیں۔ ساغر صاحب بہت محبت سے گفتگو کرتے اور دروازے تک ضرور چھوڑنے آتے۔

ایک واقعہ اور سن لیجیے۔

ساغر صاحب غالب میموریل گروپ ہاؤسنگ سوسائٹی کے صدر اور میں نائب صدر تھا۔ سوسائٹی کے ایک عہدیدار سے میرا اختلاف ہوا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں نے ساغر صاحب کو اپنا استعفیٰ بھیج دیا۔ میرا استعفیٰ ملتے ہی ساغر صاحب نے مجھے فون کرکے کہا کہ آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں، شام کو آجائیے۔ میں دفتر سے اٹھ کر ساغر صاحب کے پاس گیا رسمی دعا سلام کے بعد ساغر صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ آپ کا مجھ سے کیا رشتہ ہے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ میرے بزرگ اور میرے بڑے بھائی ۔۔۔۔ ساغر صاحب کا پیمانۂ

Marfat.com

صبر لبریز ہو گیا ناراض ہو کر فرمانے لگے، اگر میں آپ کا بڑا بھائی ہوں تو آپ نے کس سے پوچھ کر استعفیٰ دیا۔ اگر آپ استعفیٰ دینا چاہتے ہیں تو میں بھی مستعفی ہو جاتا ہوں۔ ساغر صاحب ناراض ہوتے رہے میں خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ جب انھوں نے ذرا سانس لیا تو میں نے اپنے حالات کی تفصیل بیان کرنی شروع کی۔ ساغر صاحب فرمانے لگے آپ کے ان حالات کی تفصیل میں آپ سے زیادہ ہی جانتا ہوں۔ انھوں نے ایک ہی سانس میں دو تین واقعات ایسے سنا دیے کہ مجھے حیرت ہوئی کہ انھیں ان واقعات کا کیسے علم ہوا، میں جانتا ہوں فلاں صاحب زیادتی کر رہے ہیں مجھے دوسرے ذرائع سے واقعات کا علم ہوتا رہا ہے۔ چوں کہ آپ نے اپنی زبان سے کبھی کچھ نہیں کہا تو میں اس غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ آپ بالغ ہیں اور آپ کے فکر و شعور میں پختگی ہے۔ آج استعفیٰ ملا تو علم ہوا کہ آپ تو چھوٹے بچے ہیں۔ لیجیے یہ استعفیٰ پھاڑ ڈالیے۔ ساغر صاحب نے اتنا کچھ کہا تھا کہ میں خاموش بیٹھا رہا۔ انھوں نے استعفیٰ پھاڑ ڈالا۔ فرمانے لگے اس طرح کے کاموں میں "اپنی عزت سے زیادہ کام اور مقصد سے پیار کرنا ہوتا ہے"۔ ساغر صاحب نے سب کچھ اتنی محبت اور خلوص سے کہا تھا کہ میرے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ ہی نہیں تھا کہ اپنی اس حرکت کی ساغر صاحب سے معافی مانگوں۔ میری معافی مانگنے پر ساغر صاحب بے انتہا خوش ہوئے۔ اس خوشی میں وہ ہمیں ریستوراں لے گئے۔ اور بہت مزے کا کھانا کھلایا۔

ساغر صاحب ۲۷ فروری ۱۹۸۴ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے، وہ ہم میں نہیں رہے لیکن تاریخ ادب اردو میں ایک شاعر اور نثر نگار کی حیثیت سے ان کا نام اور ہمارے دلوں میں ایک عظیم انسان کی حیثیت سے اُن کی یاد ہمیشہ باقی رہے گی۔

Marfat.com

قمر رئیس

تاجور سامری، ایک باغی قلندر

تاجور سامری کا اصل نام سادھو رام تھا جو ان کے ماں باپ نے رکھا تھا اور ماں ہمیشہ ان کو سادھو کہہ کر پکارتی رہی۔ اس طرح گویا وہ اپنی ابتدا ہی سے درویشی و قلندری کی طرف مائل تھے۔ قلندر کی ایک صفت یہ بھی کہی گئی ہے کہ وہ دین و دنیا دونوں سے آزاد ہوتا ہے۔ تاجور سامری کی دین سے بیگانگی تو مسلّم ہے البتہ دنیا سے ان کی بیگانگی اس انداز کی نہیں رہی جیسی کہ سکہ بند قلندروں کی ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ وہ جو رموز جانتے تھے اور جن کی تبلیغ کرتے تھے ان کو رموز قلندری کہنا بھی مشکل ہوگا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ جب اور جہاں دکھائی دیتے تھے ان کے چہرہ اور جسم پر بھبوت یا گرد کی ایک تہ ضرور ہوتی تھی لیکن بڑے درویشوں کے برعکس اسے وہ ملبوس قیصری' کے بجائے لباس مجبوری قرار دیتے تھے۔ شاید اس سے ان کی شناخت کے قیام میں مدد ملتی تھی اور ہندوستان کے کمزوروں خاک بسر انسانوں سے ان کی دوستی مستحکم ہوتی تھی۔

زمانۂ طالب علمی میں میں نے تاجور سامری کی بعض کتابیں مثلاً ' جب بندھن ٹوٹے' اور ' دھرتی کے تیور' پڑھی تھیں جو پہلی بار ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی تھیں۔ وہ آزادی کے بعد ابھرنے والے ترقی پسند

ادیبوں کی صف میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں غضب کا جوش واضطراب تھا۔ بے چینی اور برہمی تھی۔ یہ ناآسودگی اور سرکشی وہ اپنے پڑھنے والوں میں بھی منتقل کر دیتے تھے۔ میں بھی ان کی سادہ لیکن حوصلہ مندانہ تحریروں سے متاثر تھا۔ ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۵ء میں دِلّی کے کسی ادبی جلسہ میں انھیں دور سے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور کسی نے بتایا کہ یہ تاجور سامری ہیں تو یقین نہیں آیا۔ ایک دھچکا سا لگا۔ ایک انقلابی ادیب کو ایسی روکھی پھیکی اجاڑ صورت میں دیکھنے کے لیے میں تیار نہیں تھا۔ میرے شوق پر اوس پڑ گئی اور میں نے ان سے متعارف ہونے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔

یہ ۱۹۶۷ء کی بات ہے۔ میں ماڈل ٹاؤن میں رہتا تھا۔ ایک اتوار کی صبح کو دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے تاجور سامری کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک پرانی سی سائیکل تھی جو پطرس بخاری کی خریدی ہوئی مشہور زمانہ سائیکل سے کچھ ملتی جلتی لگتی تھی۔ وہ میری گزارش پر سائیکل سامنے کی دیوار سے لگا کر اندر آنے لگے تو میں نے کہا کہ سائیکل کو تالا لگا دیجیے۔ ایک سکنڈ کو رکے۔ مسکرائے پھر بولے " دراصل یہ سائیکل میرے علاوہ کوئی چلا ہی نہیں سکتا ہے۔ اس لیے اگر چور اسے لے کر بھاگے گا تو اس کے لیے ایک مصیبت ہو جائے گی۔

اس دن تاجور سامری سے میری دوستی ہو گئی۔ انھوں نے اپنے پرچہ 'ہمایوں' کے بہت سے شمارے دے کر مجھے اس کا خریدار بنا لیا۔ ان کی شخصیت ظاہر میں جتنی بے رنگ بے ڈھنگی اور میلی تھی اندر سے اتنی ہی دلچسپ دلکش اُجلی اور شفاف نظر آتی، تصنّع اور خودستائی سے ان کا دور دور تک واسطہ نہ تھا۔ میں نے ان کی کتابوں کا ذکر کیا تو خوش ہوئے لیکن خود ہی ان کی کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا۔ مجھے ان کی گفتگو کا واقعیت پسندانہ انداز اور عقلی استدلال بے حد پسند آیا۔ جب تک میں ماڈل ٹاؤن میں رہا وہ

Marfat.com

مہینہ میں دو تین بار ضرور آجاتے۔ کبھی کبھی گھنٹوں باتیں کرتے۔

تاجور سامری کا قد چھوٹا تھا۔ رنگ سانولا۔ لیکن چہرہ کے تیکھے نقوش ایک خاص کشش رکھتے تھے۔ وہ جب ہنستے تو چہرہ پر بچوں جیسا بھولپن پیدا ہو جاتا۔ اختلاف ان کی طبیعت کو راس نہیں آتا تھا۔ اور اکثر اُس میں ایک شعلہ سا لپک جاتا تھا۔

ان کے بنیادی عقائد سے کوئی اختلاف کرتا تو ایک مہذب آدمی کی طرح وہ پہلے تو ضبط کرتے۔ جس سے ان کا چہرہ تمتما جاتا اور سانولا رنگ کچھ اور سانولا ہو جاتا۔ پھر اپنے عقیدہ کے دفاع میں کچھ دلیلیں ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتے۔ اس کے بعد یا تو بھڑک اٹھتے یا روٹھ کر چل دیتے اور جاتے جاتے اپنے حریف کو کج بحثی یا کم فہمی کا سرٹیفکٹ بھی عطا کر جاتے۔ ان کی سیاسی اور ادبی تحریروں میں جو تجزیاتی انداز اور استدلال ہوتا تھا ان کی تقریر اس سے خالی ہوتی۔

تاجور سامری کیمونسٹ تھے۔ لیکن چونکہ وہ برہمن نژاد تھے اور وُسشٹھ گوتر کے برہمن تھے اس لیے اپنے عقائد میں وہ ایک برہمن یا مولوی کی طرح کٹر تھے۔ قوم پرستانہ افکار کی تنگنائے سے نکل کر کس طرح وہ اشتراکی فکر و اقدار کی وسیع دنیا میں آئے اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنی کتاب "روشنیوں کا شہر" میں لکھتے ہیں:

"ذہن کے سارے دھندلکے چھٹ گئے۔ اچانک جیسے ایک روشنی کا ہجوم میرے سامنے آموجود ہوا۔ میں نے ایک دم ایک جست کی اور زندگی کی روشنی میں آپہنچا۔ جیسے کوئی پرندہ صبح ہونے پر اپنے گھونسلے کے تاریک کونے کو چھوڑ کر روشنی اور زندگی کی پہنائیوں میں پرواز کرنے لگتا ہے۔" صفحہ ۷

Marfat.com

جہاں تک اشتراکی نظریات کی تفہیم و تعبیر کا تعلق ہے۔ وہ ان کی اپنی تھی۔ اور اس میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا تعلق بھی کسی خاص کمیونسٹ پارٹی کی دستاویزات سے نہیں ان کی اپنی ذات سے تھا۔ اس لیے وہ نہ صرف دوسرے اشتراکی لوگوں کو بلکہ اکثر کمیونسٹ پارٹیوں کو بھی گمراہ سمجھتے تھے۔ وہ اپنے مادیت پرستانہ اشتراکی خیالات کی تبلیغ عورتوں اور بچوں پر نہایت کارگر ڈھنگ سے کرتے تھے۔ اس کا صحیح علم مجھے اس وقت ہوا جب پتہ چلا کہ میری بیوی جو تین سال روس میں رہ کر اشتراکی خیالات سے بالکل بے بہرہ رہی تھیں تاجور سامری کے اثر میں آکر دو ڈھائی مہینے میں خاصی ترقی یافتہ اشتراکی بن گئیں۔ یہاں تک کہ چیزوں کی گرانی میں انھیں طبقاتی نظام اور حاکم طبقہ کی سازشوں کا ہاتھ صاف نظر آنے لگا۔ تب پتہ چلا کہ سامری صاحب میری عدم موجودگی میں بھی تبلیغ فرمانے آتے رہے ہیں۔ اپنی بیوی سے میں نے جب سامری صاحب کی اس جادوگری کا راز پوچھا تو بولیں "وہ پہلے کمیونسٹ ہیں جو نہ شراب پیتے ہیں نہ چائے پیتے ہیں۔ نہ سگریٹ پیتے ہیں نہ پان کھاتے ہیں۔ اس لیے ان کی باتوں میں کوئی آلودگی نہیں بلکہ اثر ہے۔"

ان کی اس بات میں کچھ وزن ضرور تھا۔ تاجور سامری واقعی ان مکروہات دنیوی سے بہت دور تھے۔ ایک شام وہ دوستوں کی ایسی محفل میں پہنچ گئے جہاں دور چل رہا تھا۔ سب نے ان سے اصرار کیا کہ شریکِ محفل ہو جائیں۔ بولے "تین چار پیگ شراب کتنے کی ہوتی ہے؟" جواب ملا "ایسی ہی کوئی پندرہ روپے کی۔" بولے "یہ پندرہ روپے مجھے دے دو اور ہمایوں کے پندرہ پرچے لے لو۔" ایک دوست نے کہا "ہم پندرہ پرچے بھی خرید لیں گے شرط یہ ہے کہ ہمارے ساتھ شریک ہوں۔" لیکن تاجور سامری کہاں ماننے والے۔ بولے ہم پندرہ کیا پندرہ ہزار روپے کے لیے بھی اپنی عادت

Marfat.com

نہیں بگاڑیں گے۔"

ہوسکتا ہے کچھ لوگ اسے ضد اور ہٹ دھرمی کا نام دیں۔ میرے نزدیک یہ کردار کی ایسی استواری اور اپنے ضمیر اور ذات سے ایسی وفاداری ہے جو لاکھوں میں کسی ایک انسان کو میسّر ہوتی ہے اور جس پر صرف رشک کیا جا سکتا ہے۔

اس زر پرست صارفی سماج میں جہاں اشیاء اور عقائد ہی نہیں ہر مرتبہ کے انسان بھی خرید و فروخت کی شے بن گئے ہیں اور جہاں انقلاب کے نام لیوا اشتراکی دانشور بھی اہل اقتدار اور سرمایہ داروں کی دہلیز پر جبہ سائی کرتے نظر آتے ہیں تاجور سامری جیسے انہی ارادوں کے ادیب دیوانے ہی کہلاتے ہیں اس لیے کہ ان کے قلم اور عقائد کو خریدنے کے لیے قارون کا خزانہ بھی کم ہوتا ہے۔

تاجور سامری اپنی کتابیں اور اپنے پرچے بیچ کر ہی گزر بسر کرتے تھے اور ہمیشہ تنگ دست اور مفلوک الحال رہتے تھے۔ لیکن اپنے اس حال میں مست تھے۔ کچھ لوگ ترس کھا کر ان کی مدد کرنا چاہتے تو صاف انکار کر دیتے۔ گوپال متل صاحب جو اشتراکیت کے سخت مخالف رہے ہیں لیکن تاجور سامری کو عزیز رکھتے تھے جنتا پارٹی کے دور اقتدار میں وہ کئی اہم کمیٹیوں کے ممبر ہو گئے۔ انھوں نے تاجور سامری کو بلا کر کہا کہ ایک درخواست تم لکھ کر دے دو۔ ہم تمہیں کسی سرکاری ادارہ سے کچھ رقم بطور امداد دلوا دیں گے۔ تاجور سامری بپھر گئے۔

"جن سرمایہ داروں کے ظلم و استحصال کے خلاف ہم ساری زندگی لکھتے آئے ہیں اب ہم ان سے امداد کے طالب ہونگے؟ یہ ممکن نہیں۔"

تاجور سامری 'جب بندھن ٹوٹے'، 'روشنیوں کا شہر' اور 'آگ کی گاڑی' جیسی اہم ادبی تخلیقات کے مصنف تھے۔ شعر و ادب کے علاوہ وہ دوسرے

Marfat.com

فنون لطیفہ خاص طور پر موسیقی کا بھی بڑا ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ وہ زندگی اور کائنات کی ہر حسین شے کی پرستش کرتے تھے لیکن خود ان کا رہن سہن بڑا گھناؤنا تھا۔ لباس نہایت گندہ بلکہ غلیظ پہنتے تھے۔ ہفتوں نہ دانت صاف کرتے تھے نہ نہاتے تھے۔ بال بنوانے اور شیو کرنے سے بھی انھیں کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی۔ میں نے انھیں پھٹی چپلوں میں ہی نہیں ننگے پیر بھی سڑکوں پر گھومتے دیکھا ہے۔ کئی بار میں نے ان سے ان گندی عادتوں کا سبب پوچھا تو ہنس کر ٹال گئے۔ گویا قلندری میں سب جائز ہے۔ اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ صفائی، خوبصورتی اور نفاست سے ان کا یہ بیر بورژوا سماج کی نمائشی زیب وزینت کے خلاف ایک بغاوت تھی ایک احتجاج تھا۔ یہ رویہ ان ادیبوں کے منہ پر بھی ایک طمانچہ تھا جو اپنے آپ کو عوام دوست کہتے تھے لیکن اعلا طبقہ کی طرح عیش ونشاط کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف تاجور سامری کا یہ رویہ ہندوستان کے ان کمزوروں محنت کش انسانوں کے ساتھ احساس یگانگت کی علامت تھا جو حیوانوں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ بقول تاجور

اپنا گھر جلایا ہے تو فضا اجالی ہے
غم میں ہم نے جینے کی راہ یہ نکالی ہے
تم نے لاکھ چھیڑی ہے بات چاند تاروں کی
ذہنیت ہماری ہی اہل خاک والی ہے

زندگی اور تہذیب کے دوسرے مسائل کی طرح شعروادب کے بارے میں بھی تاجور سامری کے خیالات انوکھے تھے مثلاً یہ کہ وہ آزاد اور معرّا شاعری کے قابل نہیں تھے اور اسے سخت گمراہی سمجھتے تھے۔ ہمایوں میں وہ صرف وہی تخلیقات شائع کرتے تھے جو ان کے مخصوص معیار پر پوری اترتی تھیں خواہ وہ کسی بڑے ادیب کی ہی کیوں نہ ہوں۔

Marfat.com

اپنے اس رویے میں وہ کسی لچک یا سمجھوتے کے لیے تیار نہ تھے اس سلسلہ میں ان کے دوستوں خاص کر اندر سروپ دت نادان نے انھیں بہت سمجھایا اور کہا کہ اگر تم فلاں استاد شاعر کا کلام شائع کرو تو وہ تمہارے پرچہ کی ۴۰ ـ ۵۰ کاپیاں خرید لے گا۔ تاجور سامری بڑی مشکل سے اس شاعر کی ایک غزل شائع کرنے پر آمادہ ہوئے۔ لیکن جب وہ غزل شائع ہو کر سامنے آئی تو اس کا حلیہ ہی بگڑا ہوا تھا۔ تاجور سامری نے اسے 'ہمایوں' کے معیار کے مطابق بنانے کے لیے ہر شعر میں اصلاح دی تھی۔ شاعر نے اسے اپنی غزل ماننے سے انکار کر دیا۔

فکر تونسوی نے تاجور سامری کی زندگی میں' اپنے ایک مضمون میں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"کل بھی اس کی عادت تھی ہر گری پڑی چیز کو اٹھا لینا اور آج بھی۔ وہ اَن پڑھ عورتوں کو یکایک قاعدہ اٹھا کر پڑھانا شروع کر دے گا۔ گرے پڑے ہوئے بچوں کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر اچھالنے لگے گا۔ بازار اور سڑک پر سے گری پڑی ہوئی چیزوں ۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔ کو اٹھائے گا انھیں جھاڑ پونچھ کر صاف کرے گا ۔۔۔۔ زمین پر پڑی ہوئی مٹی اٹھا کر ہاتھوں پر ملنا شروع کر دے گا ۔۔۔ وہ غلیظ مظلوم اور ناتواں عوام میں پہنچ کر فرطِ مسرت سے جھوم اٹھتا ہے اور کہتا ہے " دیکھیے فکر صاحب ! اس کامگار سے ہاتھ ملا کر دیکھیے۔ کتنے سخت اور گٹھے ہوئے ہاتھ ہیں یہ۔ یہ ہاتھ ہمارے انقلاب کے ساتھی ہیں"

گرے پڑے انسانوں' ان کے مقدر اور ان کے انقلابی عزائم

Marfat.com

ایسی بے اماں وابستگی اور وفاداری رکھنے والے ادیب اردو میں کم ہی پیدا ہوئے ہیں۔ تاجور سامری کی حوصلہ مندی، امید پرستی اور قوت ارادی کا سرچشمہ دراصل یہی گرے پڑے عوام تھے ان کی قلندری کی شان یہی دبے کچلے انسان تھے جن سے انھوں نے پیمانِ وفا باندھا تھا۔ یہ سوچنا غلط ہے کہ وہ اپنی انا کے اسیر تھے۔ وہ عام انسانوں کی صف سے نکل کر آئے تھے انہیں سے تھے۔ ان کا جذبہ بغاوت، ان کی انسانی غیرت، خودداری اور حمیّت سب اس لیے تھی کہ وہ انھیں سربلند کرسکیں۔ یقیناً وہ وقت آئے گا جب تاجور سامری جیسے باغی اور قلندر ہی انسانیت کے ہیرو کہلائیں گے۔

Marfat.com

صدیق الرحمٰن قدوائی

شفیع الدین نیّر

نیر صاحب کب اور کہاں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد یونان و مصر و روما میں کہاں سے اور کس صدی میں ہندوستان آئے تھے، انھوں نے تعلیم کہاں اور کتنی پائی۔ ملازمت کب ملی۔ آمدنی ٹیکس کے لائق تھی یا نہیں۔ جسم گول مٹول بلکہ بے ہنگم سا تھا۔ سارے وضع دار لوگوں کی طرح شیروانی، ٹوپی پہنتے تھے اور ایسی نہ جانے کتنی باتیں ہیں جن کا ذکر کیا جا سکتا ہے اور یہ معروضی قسم کی باتیں ایسے لوگوں کے بارے میں کرنی بھی چاہیں جنھیں ہم نہیں جانتے یا جن سے ہم بس کم کم واقف ہیں۔ مگر کسی ایسے شخص بارے میں جس کی ہم دل سے عزت کرتے ہوں یا جس سے ہمیں محبت ہو، یہ باتیں کبھی ذہن میں آئی ہی نہیں نہ ان باتوں کو کرنے کا عام طور پر جی چاہتا ہے۔ ایسے لوگوں کا محض وجود اور ان سے تعلق خاطر ہی بس ایسی بسیط حقیقت ہے کہ وہ جو اپنے اندر باقی سب کچھ سمیٹ لیتی ہے۔ چنانچہ ہم ایسے شخص کو اُس کسوٹی پر کیوں کسیں جسے آج کل کے روزمرہ میں بائیو ڈیٹا Bio-data کہتے ہیں۔ دنیا میں بعض لوگ واقعی ایسے ہوتے ہیں جنھیں ہم اپنے جذباتی رشتے کی بنا پر ان حقائق کے آئینے میں کبھی دیکھتے ہی نہیں جنھیں دوسروں کے

Marfat.com

لیے ہم بہت اہم قرار دیتے ہیں۔

نیر صاحب کو بھی ہم نے ہمیشہ اسی طرح دیکھا۔ وہ ہر خاندان کے فرد تھے۔ جہاں کہیں بچوں کے قہقہے چہچہے اور ہنگامے تھے، کھیل تماشے، شرارتیں اور گاتی بجاتی ٹولیوں کے مجمع تھے وہاں نیر صاحب موجود تھے۔ جب ہم نے حرفوں کو جوڑ جوڑ کر پڑھنا سیکھا تو شفیع الدین نیر کے شعر تھے جو تتلاتی ہوئی زبانوں پر آئے۔ ہماری اس وقت کی دنیا کتنی ہی چھوٹی اور بے حقیقت ہو اس دنیا کے سب سے بڑے آدمی کا اگر کوئی تصور ہو سکتا تھا تو وہ تھا شفیع الدین نیر کا۔ رسمی اسباق پڑھ چکنے کے بعد اگر کسی کی کتابوں تک ہماری رسائی تھی تو بس ان ہی تک۔ پڑھا لکھا آدمی تو یوں بھی بہت بڑا لگتا تھا اور جس نے اتنی ساری کتابیں لکھی ہوں کہانیاں اور نظمیں کہی ہوں اور وہ بھی ایسی کہ صرف ہمارے لیے جنھیں ہم آج کے فلمی گانوں کی طرح نہیں بلکہ خود اپنے گانے سمجھ کر گائے جائیں اور جب چاہیں ان کے مصرعوں کے ساتھ ہنسی ہنسی میں اپنے ہی من مانے، الٹے سیدھے بے ڈھنگ مصرعے بھی سناتے چلے جائیں جنھیں ہماری زبان سے سن کر بڑے بوڑھے ناراض نہ ہوں بلکہ بار بار سنانے کو کہیں اور شاباشی دیں! کون ہو سکتا تھا جو ایسی چیزیں لکھتا۔ وہ اتنا بڑا آدمی ہی ہو سکتا تھا جس کا سکہ ہمارے ان بزرگوں پر بھی چلتا ہو جن کے آنے سے سب کی سیٹی گم رہتی تھی۔ نیر صاحب کو دیکھنے سے پہلے ان کی کتابیں پڑھ کر مزا تو آتا ہی تھا۔ ان کی تصویر بھی ذہن میں عجیب و غریب تھی۔ اور جب یہ سننے میں آتا کہ ہمارا فلاں دوست ان کو دیکھ چکا ہے یا ہمارے بزرگوں میں فلاں صاحب ان کے ہاں آتے جاتے ہیں تو ان کو بھی ہم بہت بڑا آدمی سمجھنے لگتے۔ جس عمر میں پہلی پہلی بار پڑھائی لکھائی کی اہمیت یاد کرائی جاتی ہو اور چھپی ہوئی کتاب دنیا کی سب سے غیر معمولی شے لگی ہو اس وقت کتاب لکھنے والا شخص تو یقیناً غیر معمولی ہوگا۔ ورنہ جو ہماری سمجھ میں آجاتے

Marfat.com

وہ سب سے بڑا آدمی !

بہرحال مدتوں نیر صاحب کو دیکھے بغیر ہم ان کا دم بھرتے رہے۔ پھر جامعہ میں جب ان کو دیکھنے کا موقع ملا تو ہم بھی اپنے آپ کو بہت اہم سمجھنے لگے۔ اسی زمانے میں اور استادوں کو بھی دیکھا عبدالغفار مدھولی صاحب، عبدالواحد سندھی صاحب وغیرہ تو لگا کہ اس دنیا میں تو سب ہی دنیا کے سب سے بڑے آدمی ہیں۔ ان بڑے آدمیوں کو دیکھتے دیکھتے اور سنتے سنتے ہم بھی اپنے آپ کو ان دوستوں کے درمیان بہت کچھ سمجھنے لگے جنھوں نے ان ہستیوں کو نہیں دیکھا تھا۔

نیر صاحب سے باقاعدہ درس حاصل کرنے کا شرف ہمیں اس وقت حاصل ہوا جب ہم آٹھویں جماعت میں پہنچے۔ اردو زبان اور تہذیب تو جامعہ کی فضا میں ہی تھی۔ چنانچہ جس سطح سے اردو کی جماعت میں ہمیں اردو پڑھائی جاتی وہ دوسرے اسکولوں سے ذرا مختلف تھی۔ نیر صاحب نے جب ہمیں پڑھانا شروع کیا تو گویا ہمارا عمر بھر کا ارمان پورا ہو گیا۔ مگر اب ہم اس منزل سے بھی گزر چکے تھے جہاں نیر صاحب کی کتابیں ہی ہماری دنیا تھیں۔ اب ہم نے نیر صاحب سے دوسرے شاعروں اور ادیبوں کی تحریروں کو پڑھنا شروع کیا۔ نیر صاحب جب کتاب کھول کر کوئی سبق پڑھانا شروع کرتے تو لگتا تھا جیسے وہ اچانک ہماری ہی عمر کے ہو گئے ہوں۔ پڑھانے میں کچھ ایسے غرق ہوتے اور ہم ان کی باتوں میں کچھ ایسے کھو جاتے کہ گویا پڑھایا جانے والا سبق ہی ہمارا وجود بن جاتا۔

اُس زمانے میں ساتویں آٹھویں جماعت سے ہی اردو کے اہم مصنفوں سے دھیرے دھیرے متعارف کرایا جانے لگتا تھا۔ بس نصاب کے انتخاب میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا کہ مضامین و مطالب زبان سکھانے کے ساتھ ساتھ اخلاق و کردار پر بھی اثر ڈالیں۔ نیر صاحب بہت جلد ہر طالب علم کے

Marfat.com

انفرادی مزاج و مذاق سے واقف ہو جاتے ان کی جماعت کے کمرے میں ایک اچھا خاصا کتب خانہ بھی تھا۔ دیوار سے لگی ہوئی الماریوں میں شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کے تمام اہم مجموعے موجود ہوتے اور کچھ ایسا ہوتا کہ نصاب کی کتاب پڑھتے پڑھتے تھوڑے ہی دنوں میں بہت سے بچے ان الماریوں کی طرف مائل ہونے لگتے۔ ہوتے ہوتے ایک دن وہ آیا جب نیر صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ نصاب کی کتاب میں تمہارا دل اگر اب نہیں لگ رہا ہے تو جانے دو، اِدھر اُدھر کی چیزیں پڑھو بس مجھے بتاتے رہو۔ پھر کچھ عرصے بعد وہ خود ہمیں اِدھر اُدھر کی چیزیں پڑھنے پر خاص طور سے اکسانے لگے۔ اگلی جماعت میں جب پہنچے تو وہ لکھنے کے لیے طرح طرح کے موضوع دینے لگے۔ اور پھر ہمیں اپنی مرضی سے جو چاہیں لکھنے کی اجازت دے دی اور یہی ہمارا Home Work قرار پایا۔ چنانچہ ان کا روز کا درس یوں سمجھ لیجیے کہ ہماری آپ کی زبان میں اچھا خاصا سیمنار ہوتا تھا جس میں بیس پچیس طالب علم برابر کے شریک ہوتے۔ نیر صاحب طبعاً بے حد معصوم آدمی تھے۔ وہ ہم سے ہمیشہ کھل کر ملتے تھے۔ اپنی زندگی کے ابتدائی حالات جو بڑے سخت تھے مزے لے لے کر سناتے۔ اخبار بیچ کر گزارا کرتے۔ جہاں رات ہو جائے سو رہنا۔ خواجہ حسن نظامی صاحب کی سرپرستی اور ان کے لیے جذبۂ احسان مندی، پھر ماڈرن اسکول کی ملازمت اور اسے چھوڑ کر جامعہ کی زندگی میں تنگدستی کے باوجود عافیت و طمانیت اور اپنے بارے میں بے شمار باتیں اس طرح سناتے جیسے ہم چھوٹی جماعتوں کے بچے نہ ہوں ان کے دوست ہوں۔ ان سب باتوں کے پیچھے ان کی معصوم شخصیت کی پرچھائیوں کے ساتھ ساتھ اپنے طلبا کی ذہنی تربیت کی خواہش بھی ہوتی۔ ان کے نامی گرامی شاگرد خوشونت سنگھ کا یہ کہنا بڑا اچھا لگتا ہے کہ انھوں نے جن اساتذہ سے سب سے زیادہ سیکھا ان میں نیرؔ صاحب بھی تھے۔ خیر! اس میں حقیقت کے ساتھ انکساری بھی ہے کیونکہ

Marfat.com

خوشونت سنگھ کی تحریروں کو پڑھ کر یہ یقین کرنا ناممکن ہے کہ جو کچھ انھوں نے سیکھا وہ نیر صاحب کے فرشتوں کو بھی آتا ہوگا۔ پھر بھی اس میں شک نہیں۔ اردو زبان وادب کا مذاق انھیں یقیناً نیر صاحب کی بدولت ہی ملا ہوگا۔

نیر صاحب اپنے ذاتی شوق اور مشقت سے ہی اعلیٰ مدارج تک پہنچے تھے۔ اپنے مراسم کی بدولت نہیں بلکہ اپنے مرتبے کی بنا پر بھی ان کے لیے ایک خوشحال زندگی بنانے کے نئے نئے راستے ڈھونڈھ نکالنا مشکل نہ تھا۔ ان کا خاندان بڑا تھا۔ ذمہ داریاں بھی بہت تھیں۔ مگر وہ اپنی دھن میں مست رہے۔ تمام عمر جامعہ کے مدرسہ ثانوی میں پڑھاتے رہے۔ اس زمانے میں اور ان جیسے لوگوں کے لیے منصب اور حیثیت کا تصور ہی کچھ اور تھا۔ وہ بھی جانتے تھے اور سب مانتے ہیں کہ نیر صاحب جہاں بھی ہوتے نیر صاحب ہی ہوتے۔ اور یہ کون سا کم مرتبہ تھا۔ کیونکہ معلمی ان کے لیے پیشہ نہ تھا منصب تھا۔ اور سچ پوچھیے تو معلمی کا بچا کھچا وقار اگر آج کہیں کسی کو دکھائی دیتا ہو تو وہ ان ہی لوگوں کی عطا کی ہوئی قدر ومنزلت کا طفیل ہوا۔

جب ہم بچے تھے تو نیر صاحب ہم سے اس طرح ملتے کہ جیسے ہم ان کی عمر کے ہیں اور جب ہم بڑے ہوئے پڑھ لکھ کر نوکر ہوگئے تو وہ جب ملتے تو ایسا لگتا جیسے ہم ابھی بچے ہیں۔ ہماری چھوٹی چھوٹی کامیابیوں پر وہ جس طرح ہمیں شاباشی دینے کے لیے خود آتے تو لگتا کہ ہم ایک اور ہی کرّے کے باشندے ہوں۔ جہاں بس بزرگ ہوتے ہوں یا بچے جہاں اس دنیا کا کوئی جھگڑا ٹنٹا نہ ہو۔ شرافتیں مروتیں اور وضع داریاں ہی اس کی آب وہوا ہوں۔ یونیورسٹی کے امتحان میں پاس

ہوئے ہوں، کہیں انھوں نے ہمارا کوئی مضمون چھپا ہوا دیکھا ہو، یا ہماری نوکری کی خبر انھیں ملی ہو۔ وہ کچھ اس طرح مبارک باد دینے آتے جیسے ہم نے ایک دنیا ہی جیت لی ہو۔ اب ارد گرد نظر ڈالتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ ہم کتنے خوش قسمت تھے۔ آج یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں کہاں نصیب ہیں۔

میرے مشفق استاد ....

فرقت کاکوروی

"نام غلام احمد، تخلص فرقت وطن قصبہ کاکوروی، ضلع لکھنؤ، وہیں ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں فارسی اردو کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی پھر گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد لکھنؤ میں داخلہ لیا شفقت پدری سے بچپن ہی میں محروم ہو گئے تھے۔ اس لیے قدم قدم پر مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا گلی کوچوں میں پھر کر اخبارات فروخت کرتے اور جو کچھ مل جاتا اس سے تعلیمی اور خانگی مصارف برداشت کرتے۔ ان کی زندگی کے حالات آج کل کے نوجوانوں کے لیے سرمایہ عبرت ہیں۔ عرصے تک علیم کالج کانپور میں لیکچرار رہے متعدد اخبارات و رسائل کی ادارت کی۔ اینگلو عربک کالج دہلی میں تاریخ کے استاد تھے۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ لکھنؤ میں حضرت آرزو کی صحبت ملی جس نے ذوقِ شاعری کو نکھار دیا۔ طنز و مزاح نگاری میں فرقت نے خاص شہرت حاصل کی۔ انھوں نے ترقی پسند شاعروں کے اُس گروہ کو ہدفِ طنز بنایا جس نے انتہا پسندی اختیار کر رکھی تھی۔ فرقت کے بھرپور اور حقیقت پسندانہ طنزیہ نشتروں نے ترقی پسند شعراء کی بے راہ روی اور قلعہ میں تزلزل پیدا کر دیا۔

Marfat.com

اس سلسلے میں اُن کی کتابیں "مداوا" اور "ناروا" قابلِ دید ہیں۔ فرقت کے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کے متعدد مجموعے شامل ہو چکے ہیں۔ اُن میں "صید و ہدف"، "کفِ گُل فروش" کے علاوہ طنز و مزاح کی ضخیم تاریخ قابلِ ذکر ہے۔ ان کی طنز تحریریں بڑی شگفتگی اور ندرت ہے۔"

جدید تاریخ ادب اردو

ص ۳۳۱ ۔ ۳۳۲

از :۔ عظیم الحق جنیدی و سید امیر حسن نورانی

Marfat.com

صلاح الدین

میانہ قد، گندمی رنگ، ستواں ناک، بڑے کان، چھوٹی آنکھیں، آنکھوں پر کالے فریم اور موٹے لینس کا چشمہ، بال کالے کم اور سفید زیادہ۔ تیل اور کنگھے سے بے نیاز، باریک ناک نقشہ چھب تختی سے درست۔ چہرے کے یہ خط و خال آثارِ قدیمہ ہو جانے کے باوجود بھی، عمرِ رفتہ کو آواز دینا کی سراپا تمثیل پیش کرتے ہوئے اپنے حسین ماضی کا پتہ دیتے تھے۔ ضرورت سے زیادہ ڈھیلی ڈھالی پتلون، ایسا ہی کوٹ اور ایسی ہی قمیص کبھی ٹائی کے ساتھ اور کبھی بغیر ٹائی کے۔ گرمی کے موسم میں سوتی پتلون کبھی قمیص کے ساتھ اور کبھی آدھی آستین کی بوشرٹ کے ساتھ۔ کپڑوں پر پان کی کثرتِ استعمال کے باعث چھوٹی بڑی سرخ چھینٹیں گنگا جمنی تہذیب کا ماڈرن آرٹ پیش کرتے ہوئے بغل میں کبھی کتابیں دبی ہوئیں کبھی چمڑے کا بیگ دبا ہوا۔ بند دار جوتا پالش سے بے نیاز، چھریرا بدن مالش سے بے نیاز کندھے آگے کو جھکے ہوئے انکساری اور شرافتِ نفسی کا پتہ دیتے ہوئے چہرے پر گمبھیرتا۔ چال کیفیتِ جذب کی لذت سے دوچار

Marfat.com

آنکھ پڑتی ہے کہیں، پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے اُن کو خبر، اپنی خبر کچھ بھی نہیں

جی ہاں حضرات! اِس شعر کی زندہ تفسیر کا نام تھا غلام احمد فرقتؔ کاکوروی عرف اَماں شاب (پان ہر وقت منہ میں دبے رہنے کی وجہ سے صاحب کے بجائے شاب ادا ہوتا تھا اور یہ فرقت صاحب کا تکیہ کلام اور مخصوص اندازِ تخاطب تھا)۔

فرقتؔ صاحب سے ہماری پہلی شناسائی کلاس روم میں یوں ہوئی تھی کہ ہمارے ایک استاد چھٹی پر تھے اور اُن کے خالی پریڈ کو پُر کرنے کے لیے فرقت صاحب تشریف لائے تھے۔ ایک کلاس فیلو کی آواز آئی اسٹینڈاپ، سب کھڑے ہوگئے۔ اتنے میں پان کی پیک کے ساتھ گھل مل کر آواز اُبھری "اماں شاب تشریف رکھیے"۔ سب بیٹھ گئے، فرقت صاحب بھی کرسی پر بیٹھ چکے تھے۔ سب سے آگے والے ڈیسک پر ایک لڑکا ٹین کی بنی ہوئی چھوٹی سی پیٹی کا بستہ سنبھالے بیٹھا تھا (جی ہاں صاحب اب سے تقریباً چوتھائی صدی پہلے جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں ٹین کی رنگ برنگی چھوٹی چھوٹی پیٹیاں بطور بستے کے استعمال ہوا کرتی تھیں ان میں ایک ہُک اور کنڈا لگا ہوتا تھا جس میں لڑکے چھوٹے چھوٹے تالے ڈالا کرتے تھے) آگے کے ڈیسک پر بیٹھا ہوا وہ لڑکا اپنے اس ٹین کے چھوٹے سے بستے میں چھوٹے سے تالے کی جگہ شاید اپنے گھر کے صدر دروازے کا بہت بدہیبت اور پرانی وضع کا تالا ڈال لایا تھا۔ فرقت صاحب کی جیسے ہی اُس بدہیبت تالے پر نظر پڑی تو اُس تالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لڑکے سے پوچھا اماں یہ کیا بلا ہے، لڑکا بولا، سر تالا ہے۔ کہنے لگے اماں یہ تالا کہاں ہے، یہ تو "اللہ تالا" ہے۔ کلاس میں ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ ابھی کچھ ہی دیر گذری ہوگی کہ دوسری جانب ایک اور لڑکا

انگریزی کی پاکٹ ڈکشنری سجائے بیٹھا تھا۔ فرقت صاحب نے اس سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ کیا نام ہے تمہارا۔ اُس کے جواب دینے سے پہلے پیچھے سے آواز آئی چھٹن۔ فرقت صاحب نے اس آواز پر یقین کرلیا اور چھٹن سے اس ڈکشنری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا یہ کیا ہے۔ چھٹن بولا سر ڈکشنری ہے پھر سوال کیا؟ اس کا کیا کرتے ہو۔ چھٹن نے ذرا اتراتے ہوئے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔ سر A سے شروع ہونے والے ۱۰۰ Words اور ان کے Meaning رٹ لیے ہیں۔

فرقت صاحب رٹنے کا لفظ سنتے ہی چونک پڑے اور اُن کی زبان سے بے ساختہ اپنے Students کے لیے استعمال ہونے والا پیٹنٹ جملہ نکلا "آپ گدھے ہیں شمجھے" (منھ میں کثرت سے ہر وقت پان رہنے کی وجہ سے فرقت صاحب کے منھ سے "س" کی آواز "ش" بن کر نکلی تھی) چھٹن یہ خطاب ملتے ہی سٹپٹا گیا اور دہشت میں اس کے منھ سے نکلا جی سر۔ فرقت صاحب نے چھٹن سے پھر کہا۔ "اماں آپ بڑے انٹرنیشنل گدھے ہیں" چھٹن کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اس لیے دم سادھے چُپ بیٹھا رہا۔ اب فرقت صاحب یوں گویا ہوئے "اماں جب ہم پڑھتے تھے تو ہمارے شاتھ بھی لڈن نام کے ایک شاب یہ ہی گدھا پن کرتے تھے انھوں نے تین شال کی محنت میں ایف تک ڈکشنری رٹ لی تھی۔ آج کل وہ شاب لکھنؤ کی ایک ڈرائی کلینگ میں کپڑوں پر پریش کرتے ہیں" اور واقعی رٹنے کے متعلق فُرقت صاحب کی یہ پیش گوئی سچ ثابت ہوئی آج کل چھٹن بھی دہلی کے ایک پرنٹنگ پریس میں پلیٹیں صاف کرنے کا کام کر رہا ہے۔

فرقت صاحب کو غصّہ سال میں ایک آدھ بار ہی آتا تھا لیکن جب آتا تو غالب کے قصیدے کے اس مطلع کی طرح۔

پھر اِس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و ماہ تماشائی

جی جناب ! اس نرالے انداز سے آئی ہوئی نرالی بہار کے تماشائی غالب کے الفاظ میں مہر و ماہ ہی ہوا کرتے تھے کلاس کے طالب علم نہیں۔ اس لیے کہ جس دِن مار کھانے کا جشنِ نوروز ہوا کرتا تھا اُس دن کلاس کے ہر طالب علم کو کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ قصوروار اور بے قصور کا کوئی امتیاز اس جشنِ نوروز میں نہیں برتا جاتا تھا۔ عدلِ جہانگیری کا یہ حسین و جمیل منظر بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا سننے سے نہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہماری سعادت مندی کا امتحان لیا جا رہا ہو۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اب فرقت صاحب کسی سہمے ہوئے لڑکے سے کہتے کہ نیچے جاؤ اور لان میں لگی مہندی کی باڑ سے ایک مضبوط سی قمچی توڑ لاؤ۔ شامتِ اعمال کا مارا مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ لڑکا قمچی توڑ لاتا۔ فرقت صاحب اس کی پتیاں توڑ کر اُسے قابلِ استعمال بناتے اور پھر قمچی لانے والے لڑکے ہی سے اس قمچی کے استعمال کرنے کے افتتاحی اجلاس کا شبھ آرمبھ کرتے اس کے بعد ایک سرے سے دوسرے سرے تک کلاس کے سارے محمودوں اور ایازوں کو دو دو قمچیوں کا ہدیۂ تبریک پیش کیا جاتا اس کاری کرم کے بعد فرقت صاحب خود بھی بیٹھ جاتے اور ہم کو بھی بیٹھنے کا حکم دیا جاتا ——— معرفتِ قمچی حاصل ہو جانے کے بعد کلاس کے منصوروں کے ہکا بکا چہروں سے تنک ظرفی کے تاثرات نظر آنے کا سلسلہ شروع ہوتا اور فرقت صاحب غالب کے اس مصرعے کی: خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا نہیں بلکہ جو ہوا افسانہ تھا کچھ وقفے کے لیے خاموش بیٹھ جاتے اِس کے بعد پورے سال تک شرافت

سے مار کھانے کی سعادت مندی کا یوں صلہ دیتے کہ کبھی تو سمجھاتے ۔ کبھی نصیحتیں کرتے کبھی مزے دار لطیفے اور قصے سناتے اور اس طرح یہ مقولہ کہ "ہر دُکھ کے بعد راحت ہوتی ہے" صادق ہو کر پورے تعلیمی سال اپنی صداقت کے جوہر دکھلاتا رہتا۔ حتیٰ کہ امتحانات شروع ہو جاتے اور اگر خوبیٔ تقدیر سے یہ ہوتا کہ فرقت صاحب امتحان کی کاپیاں اور پرچے لیے دور سے کلاس روم کی جانب آتے نظر آتے تو یار لوگوں کے چہرے خوشی سے دمک اٹھتے کہ لو بھئی آج چاندی ہو گئی یارانِ طریقت ایک نعرۂ مستانہ بلند کرتے کہ آج اماں شاب کی ڈیوٹی لگی ہے۔ مزے آ گئے۔ (اسکول کے لڑکوں نے کب سے فرقت صاحب کا نام اماں شاب رکھا ہوا تھا)۔ فرقت صاحب امتحان کی کاپیاں اور پرچے تقسیم کرتے، لڑکوں کے نقل کے لیے بے قرار چہروں پر طائرانہ نظریں ڈالتے دو چار بار ادھر اُدھر چکر لگاتے اور کرسی لے کتاب کھول کر بیٹھ جاتے تھوڑی دیر بعد جب چہرے سے استغراقی کیفیت کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوتے تو یار لوگ بے فکری کے ساتھ آزادانہ تبادلۂ خیال اور تبادلۂ سوال و جواب کا سیشن شروع کر دیتے۔ پرچہ مشکل آتا تو باہر بھیج کر عقدہ کشائی کرائی جاتی۔

جیسے جیسے ہم اگلی جماعتوں میں پہنچتے گئے فرقت صاحب سے پڑھنے اور فرقت صاحب کو سمجھنے کے مواقع بھی زیادہ سے زیادہ فراہم ہوتے گئے کسی کلاس میں انھوں نے تاریخ پڑھائی تو کسی کلاس میں اردو ادب کے رموز و علائم ذہن نشیں کرائے۔ ایک بار اصنافِ شاعری میں غزل اور نظم کی اہمیت کا بیان جاری تھا کہ ہم نے پوچھ لیا: سر یہ آزاد نظم کیا ہوتی ہے بڑی سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے کہا "اماں جس طرح چھوٹا بچہ قدمچے پہ بیٹھا اپنے آپ سے بے تکی باتیں کرتا ہے ویسی ہی آزاد نظم ہوتی ہے جس کا مطلب شاعر خود بھی نہیں جانتا۔"

Marfat.com

کل کی پہلی نشست میں طنز و مزاح کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے نشست کے مہمانِ خصوصی پرشوتم لال گوئل جی نے نشست کے صدر پروفیسر سروپ سنگھ کے حوالے سے کہا تھا کہ طنز و مزاح کی حس اُن لوگوں میں سب سے زیادہ ہوا کرتی ہے جن کی زندگیاں مصائب و آلام میں گذری ہوں فرقت صاحب کی زندگی کا آغاز بھی غربت و افلاس کے ساتھ ہوا، وہ ہمیں بتاتے تھے کہ انھوں نے بچپن میں بہت عرصے تک اخبار بیچ کر اپنی تعلیم پوری کی۔ چھوٹی سی عمر میں شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے اس لیے قدم قدم پر مالی مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا، فرقت صاحب کو اپنی والدہ سے بہت محبت تھی۔ اپنے طلبا کو ماں کی خدمت کرنے عزت کرنے اور فرماں برداری کی ہمیشہ تلقین کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ فرقت صاحب کے مزاج میں طنز و مزاح کا عنصر انھی مصائب و آلام کی دین ہو۔

فرقت صاحب کو پان کے علاوہ جو دو چیزیں سب سے زیادہ مرغوب تھیں ان میں ایک مزاح اور دوسری مٹھاس ہو سکتا ہے اِن دونوں چیزوں کی پسندیدگی کے پیچھے بھی زندگی کی تلخیوں سے پیدا ہونے والی نفسیاتی کارفرمائی شامل ہو بات کچھ بھی ہو سچ تو یہ ہے کہ ان کے مزاج میں مٹھاس اور مٹھاس میں مزاح اس طرح ایک دوسرے میں رچ بس گئے تھے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یعنی مزاح، مٹھاس، پان، فرقت صاحب۔ اِس ضمن میں چند واقعات بھی سن لیجیے۔

ہوا یوں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کوئی تقریب تھی اور وہاں چند مخصوص شعرا کو مدعو کیا گیا تھا ان میں فرقت صاحب اور علی سردار جعفری بھی شامل تھے۔ مشاعرے سے پہلے گرم چائے اور بے تکلف گفتگو کا دور چل رہا تھا علی سردار جعفری چائے بنا کر خود بھی پی رہے تھے اور دوسرے دوستوں کو بھی پیش کر رہے تھے۔ فرقت صاحب دنیا و ما فیہا سے بالکل بے خبر گفتگو میں

Marfat.com

مُنہمک تھے۔ جعفری صاحب کو مذاق سوجھا انھوں نے فرقت صاحب کی پیالی میں چند قطروں کی گنجائش چھوڑ کر باقی پیالی میں شکر ہی شکر بھر دی اور پھر دس پانچ قطرے چائے اور دودھ کے ڈال کر پیالی فرقت صاحب کی طرف بڑھا دی انھوں نے بڑھ کر پیالی لی مگر گفتگو میں ہی منہمک رہے۔ اب جب انھوں نے پیالی پر ہونٹ لگائے تو وہاں چائے ندارد اور شکر ہی شکر فرقت صاحب فوراً سمجھ گئے اور انھوں نے معاً کہا "اچھا جعفری صاحب کوئی بات نہیں آج میں پھیکی ہی چائے پی لوں گا۔"

فرقت صاحب کا مزاح، اُن کے مزاج کی شگفتگی، بذلہ سنجی اور حاضر دماغی بے تکلف دوستوں کی محفل میں قابلِ دید ہوتی تھی، ایک شام چند بے تکلف دوستوں کی محفل جمی تھی، استادِ محترم شمیم کرہانی صاحب، کوثر چاندپوری صاحب، مولانا علیم اختر صاحب مظفر نگری اور چند دوسرے دوستوں کی خوش گپیاں ہورہی تھیں کہ علامہ انوؔر صابری بھی شریک محفل ہوگئے۔ انور صابری چند ہی روز پہلے پاکستان کا دورہ کرکے واپس لوٹے تھے باتوں باتوں میں پاکستان کا ذکر جو چھڑا تو انوؔر صابری مرحوم نے پاکستان اور خاص طور پر صدر پاکستان ایوب خاں کی مہمان نوازی اور خاطر مدارات کا تذکرہ مبالغے کی حد تک بڑھا چڑھا کر بیان کرنا شروع کردیا، ان کی گفتگو سے یہ تاثر قائم ہورہا تھا کہ جیسے صدرِ پاکستان نے انوؔر صابری کی سرکاری مہمان کی حیثیت سے بھی زیادہ مہمان نوازی کی ہو اور اُن کے ساتھ وقت گذارنے کے لیے اپنے تمام سرکاری کام بھی پسِ پشت ڈال دیئے ہوں۔ کافی دیر ہوگئی اور علامہ انوؔر صابری کا صدارتی قصیدہ کسی طرح ختم ہونے کو نہیں آیا تو اچانک فرقت صاحب مرحوم درمیانِ گفتگو یوں گویا ہوئے "اماں مولانا شاب آپ ٹھیک کہتے ہیں" میرٹھ کے لوگ ہوتے ہی مہمان نواز ہیں۔ میں ایک بار میرٹھ کالج میں ایوب خاں سے ملا تھا" ابھی فرقت صاحب مرحوم

Marfat.com

جملہ پورا بھی نہیں کر پائے تھے کہ علّامہ انور صابری نے نہایت معصومیت سے کہا "فرقت ایوب میرٹھ کے رہنے والے نہیں ہیں وہ تو پشاور کے رہنے والے ہیں فرقت صاحب کی رگِ ظرافت پھڑکی اور فوراً بولے" اماں مولانا! تم اتنی دیر سے جھوٹ پر جھوٹ بول رہے ہو، مجھے دیکھو میں سب کچھ خاموشی سے سنتا اور برداشت کرتا رہا اگر میں نے ایک جھوٹ بول دیا تو تم ذرا دیر بھی خاموش نہ رہ سکے"۔ تمام محفل زعفران زار بن گئی اور انور صابری پر ایسی پھبکی کہ سامعین مشاعرہ کو ترکی بہ ترکی جواب دینے والا حاضر جواب شاعر بھی لاجواب ہو کر رہ گیا۔

اینگلو عربک اسکول میں فرقت صاحب کے ایک دوست اور ہم پیشہ نہایت اعلا درجے کی سیاہ فام رنگت کے مالک تھے ایک دن ان صاحب کو کسی صاحب کی بات پر بہت طیش آگیا اور لگے اول فول کہنے لوگوں نے معاملہ رفع دفع کرنے کی بہت کوشش کی لیکن یہ کسی طرح قابو میں نہ آئے سخت گرمی کا موسم تھا اور ان کے سیاہ فام جسم اور چہرے پر پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ کہیں سے فرقت صاحب بھی اس طرف آنکلے انھوں نے جو یہ صورت دیکھی تو ان کے پاس گئے ان صاحب نے جب اپنے غصہ کا سبب بتانا چاہا تو فرقت صاحب بولے اماں وہ تو میں بعد میں سُن لوں گا پہلے آرام سے بیٹھو اور آپ کے مشکی جسم پر جو یہ تارکول بہہ رہا ہے پہلے اسے پونچھکر انسان ہو۔

فرقت صاحب یعنی اماں شاب اپنے طلبار کے صرف استاد ہی نہیں تھے مشفق و مہربان بھی تھے۔ ہمدرد، خیر خواہ اور غمگسار بھی تھے۔ انھوں نے نہ جانے کتنے ضرورت مند، مُفلس اور نادار طالب علموں کی انتہائی خاموشی کے ساتھ دامے، درمے، قدمے، سخنے مدد کی۔ وہ اِس قدر حساس طبیعت رکھتے تھے کہ اپنے کسی طالب علم کو مفلوک الحال نہیں دیکھ سکتے تھے اور

Marfat.com

اُن کی ہر ہر طرح سے مدد کرتے اور خیال رکھا کرتے تھے اسکول کی فیس سے لے کر کتابوں کی فراہمی تک اور کتابوں کی فراہمی کے ساتھ ساتھ پڑھانے اور "اِمپارٹینٹ نوٹس" Important Notes لکھوانے تک اور اسکول یونیفارم سے لے کر جیب خرچ دینے تک سب ہی باتوں کا دھیان رکھا کرتے۔ یہاں تک کہ اپنے طالب علموں کے گھر جا جا کر ان کی خبر گیری کرنا اور مقدور بھر ان کی مدد کرنا اُن کے روزمرّہ کے معمولات میں شامل تھا۔ فرقت صاحب وہ استاد تھے جن کو دیکھ کر ہی میں نے اس حقیقت کا مفہوم پایا کہ خدائے عزّوجل نے استاد کے مرتبے کو والدین سے بھی زیادہ بلند و برتر کیوں رکھا ہے اِس مردِ قلندر انسان کے روپ میں فرشتے کو جب ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے پٹنہ جاتے ہوئے مغل سرائے ریلوے اسٹیشن پر اچانک موت کے ظالم پنجے نے آدبوچا تو اُن کی لاش کو لاوارث قرار دے کر مغل سرائے میں ہی اُن کی تدفین کردی گئی اور جب یہ اندوہ ناک خبر دہلی پہنچی تو۔ اِس خبر کے ملتے ہی فرقت صاحب کے چاہنے والوں کا ہجوم اُن کے مکان واقع بھوجلہ پہاڑی پر جمع ہوگیا، سب کو ہنسانے والا سب کے کام آنے والا۔ کسی سے خدمت لیے بنا سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اِس سوگوار ہجوم میں ایسے دو نوجوان لڑکے بھی زار و قطار رو رہے تھے جو تھوڑی تھوڑی دیر بعد کہتے تھے کہ ہمارا استاد ہمارا باپ مر گیا جب حقیقتِ حال کا علم ہوا تو پتہ چلا کہ یہ لڑکے معاشی حالات ناسازگار ہونے کی وجہ سے آٹھویں درجے سے پڑھائی چھوڑ کر اسکول سے اٹھ گئے تھے مگر جب فرقت صاحب کو علم ہوا تو وہ ان لڑکوں کے گھر پہنچے اور ان کے والدین سے کہا کہ کھانا تو آپ اب بھی کھلائیں گے۔ والدین نے کہا جی ہاں فرقت صاحب بولے بس آپ پیٹ بھرا دیجیے باقی ذمّے داری اللہ پر چھوڑ دیجیے۔ آج جب ان لڑکوں

کو فرقت صاحب کے انتقال کی خبر ملی تو ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا کیونکہ اب یہ بی۔ اے فائنل کے آخری سال میں تھے لیکن اُن کا مشفق، اُن کا خواجہ ان کا دردمند انھیں ایک روشن مستقبل کی راہ پہ گامزن کر کے خود نہ جانے موت کی کس راہ پر گامزن ہو چکا تھا۔

اللہ ہُو بس، باقی ہوس

بارے دنیا میں رہو، غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں، کہ بہت یاد رہو

Marfat.com

حضرت شاہ ابوالخیر عبداللہ خیر دہلوی

شاہ ابوالخیر بن شاہ محمد عمر بن شاہ احمد سعید بن شاہ ابوسعید کا سلسلہ نسب حضرت شیخ احمد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ سے ملتا ہے آپ کے پردادا شاہ ابوسعید ۱۱۹۶ھ کو رامپور میں پیدا ہوئے۔ گیارھویں برس میں آپ نے قرآن مجید حفظ کیا۔ فن تجوید قاری نسیم اللہ صاحب سے سیکھا علوم دینی مفتی شرف الدین رامپوری اور شاہ رفیع الدین دہلوی سے پڑھے اور شاہ عبدالعزیز دہلوی سے حدیث کی سند حاصل کی طالب علمی کے زمانے میں علم باطنی حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا اپنے والد ماجد سے طریقہ نقشبندیہ میں بیعت کی اور والد صاحب کے حکم سے اپنے خاندان کے درویشوں سے تکمیل باطن کی۔ حضرت شاہ درگاہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خاندان قادریہ میں بیعت ہوئے اور خلافت پائی ہزاروں آدمی مرید ہوئے آپ جس پر توجہ ڈالتے وہ آپ کے ساتھ ہو جاتا تھا ۱۲۲۵ھ کو رامپور سے دہلی میں حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خدمت پہنچے شاہ صاحب نے ان کو اپنی مسند پر بٹھایا اور خلافت عطا کی ۱۲۴۹ھ کو حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے حج سے فارغ ہونے کے بعد ریاست ٹونک پہنچے وہاں بیمار ہوئے اور عیدالفطر کے روز اپنے عزیزوں کو نصیحت فرمائی کہ

Marfat.com

اہل دنیا سے پرہیز کرنا اگر دنیا داروں کے پاس جاؤ گے تو ذلیل ہو گے" آپ کا ٹونک میں ہی ۱۲۴۵ھ کو انتقال ہوا۔ نعش تابوت میں رکھ کر دہلی میں لائی گئی چالیس روز کے بعد تابوت سے نکالی گئی اور حضرت غلام علی کی خانقاہ میں دفن ہوئے۔

شاہ ابو سعید صاحب کے دوسرے صاحبزادے شاہ احمد سعید صاحب تھے جو ربیع الاول ۱۲۱۷ھ کو رامپور میں پیدا ہوئے قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد اپنے والد صاحب کے ہمراہ دہلی آ گئے نو دس برس کی عمر میں حضرت شاہ غلام علی صاحب سے بیعت کرائی گئی۔ شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے۔

"بہت سے لوگوں سے لڑکے مانگے۔ لیکن کسی نے نہیں دیا۔ البتہ ابو سعید نے اپنا لڑکا مجھ کو دے دیا۔ میں نے اس کو اپنا بیٹا بنایا ہے"

ابتدائی تعلیم آپ نے شاہ غلام علیؒ صاحب سے حاصل کی۔ باقی کتب معقول و منقول مولوی فضل امام، مولانا رشید الدین خاں، شاہ عبدالعزیز، شاہ مولانا رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر صاحب سے پڑھیں، بیس برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے۔ تو درس دینا شروع کیا پچیس سال خانقاہ حضرت شاہ غلام علی میں زندگی بتائی ستاون برس کی عمر میں ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کا دہلی میں بگل بجا یا جنگ کی ناکامی کے بعد دہلی سے ہجرت کی پنجاب سے گزرتے ہوئے کراچی پہنچے وہاں سے بمبئی روانہ ہوئے بمبئی سے حجاز مقدس پہنچے حج سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے وہاں بھی مریدوں کی تعداد کافی ہو گئی اہل شہر کی کوششوں سے ترکی حکومت سے وظیفہ مقرر ہو گیا ۲ ربیع الاول ۱۲۷۷ھ میں آپ کا مدینہ منورہ میں انتقال ہوا۔ حضرت عثمان خلیفۂ ثانی کے مزار کے قریب دفن ہوئے آپ کے تین صاحبزادے مولوی شاہ عبدالرشید، شاہ محمد عمرؒ اور شاہ محمد مظہر تھے [۱]

---

[۱] تذکرہ کاملان رامپور ص ۱۹

Marfat.com

شاہ محمد عمر صاحب شوال ۱۲۴۴ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد ابتدائی تعلیم مولوی حبیب اللہ صاحب سے پائی۔ حدیث اپنے چچا شاہ عبدالغنی سے پڑھی اور علوم دینی اور کتب اپنے والد ماجد سے تحصیل کی۔ بیعت بھی اپنے والد ماجد سے کی جنھوں نے ان کو اپنا خلیفہ بنایا آپ اپنے والد کے ساتھ حجاز مقدس گئے مدینہ منورہ میں مقیم تھے کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا نواب کلب علی خاں وہاں پہنچے ہوئے تھے ان کا اصرار تھا کہ اس خاندان میں سے کوئی صاحب رامپور تشریف لائیں اتفاق سے شاہ محمد عمر صاحب اپنے صاحبزادے کی شادی کرنے کے لیے رامپور تشریف لے گئے نواب صاحب نے قلعے کے اندر سرکاری مکان قیام کے لیے دیا اور رامپور میں رہنے کے لیے اصرار کیا۔ لیکن آپ حجاز مقدس جانا چاہتے تھے۔ کہ رامپور میں ۱۲۹۸ھ میں فوت ہوئے اور حضرت جمال اللہ صاحب کے متصل جانب غروب دفن ہوئے[1]

حضرت شاہ محمد عمر صاحب کے فرزند ارجمند حضرت شاہ ابوالخیر صاحب کی ولادت یکشنبہ ۲۷ ربیع الآخر ۱۲۷۲ھ مطابق ۶ جنوری ۱۸۵۶ء کو خانقاہ شریف میں ہوئی آپ کے والد ماجد نے آپ کی ولادت پر د[illegible] تاریخیں کہیں ایک اردو میں اور ایک فارسی میں، فارسی کی تاریخ ولادت یہ ہے

چوں ابوالخیر شدہ نور فگن   مہر بنیاد چراغ نبوی ؐ
سال میلاد عمر خواست زول   کرد ارشاد چراغ نبوی ؐ

جب آپ کی ولادت ہوئی تو آپ کے نانا شاہ غلام صدیق [illegible]پ کا مشرب معلوم کر کے آپ کا نام غلام غوث رکھا۔ آپ کے والد ماجد کا نام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نام پر رکھا گیا تھا انھوں نے حضرت امیر المومنین کے فرزند جلیل القدر کے نام پر اپنے محبوب پسر کا عبداللہ اور کنیت ابوالخیر رکھی۔ آپ

---

[1] آثار رحمت ص ۴۰۹

Marfat.com

کی عمر پونے دو سال کی تھی کہ اس وقت دہلی کو انگریزوں نے فتح کر لیا تھا آخر محرم ۱۲۷۴ھ میں اپنے جد امجد اور اہل خاندان کے ساتھ خانقاہ سے حجاز مقدس روانہ ہوئے آپ کی عمر چار سال کی جب پوری ہو گئی تو آپ کے والد بزرگوار آپ کو لے کر جد امجد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اس کو بیعت فرمالیں آپ کے جد امجد اس وقت حرم نبوی میں حلقہ و توجہ فرما رہے تھے انھوں نے آپ کو اپنے پاس بٹھایا اور آپ کے پیارے ہاتھوں کو لے کر آپ سے بیعت کے الفاظ کہلوائے اور پھر آپ کے واسطے دیر تک دعا فرماتے رہے اور اہلِ حلقہ آمین کہتے رہے[1]

آپ اکثر اپنے جد بزرگوار کے ساتھ حرم شریف لے جاتے اور ان کے پاس بیٹھ جاتے ایک دن حاضرین میں سے کسی نے پوچھا کہ آپ کا جانشین کون ہوگا تو حضرت شاہ محمد عمر صاحب نے فرمایا کہ خدا کا فضل ہے کہ میرے تینوں بیٹے حافظ، عالم، متقی صاحبِ نسبت ہیں سلوک مجددیہ اول تا آخر تینوں نے بدرجہ اتم حاصل کیا ہے ان میں سے ہر ایک میری جانشینی کے قابل ہے رہی میری خلافت تو اس بچے کے نصیب میں ہے پھر آپ نے اپنا مبارک ہاتھ ان کے سر پر پھیرا حضرت شاہ ابوالخیر صاحب نے علوم فضلیہ اور عقلیہ کی کتابیں مندرجہ ذیل حضرات سے پڑھیں۔

حافظ عبداللہ الضریر، قطب مکہ سید احمد دحلان، شیخ الاسلام سید احمد دحلان مفتی شافعیہ، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی بانی مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ، مولانا سید حبیب الرحمن ردولوی، عم اصغر حضرت شاہ محمد مظہر، عم پدر حضرت شاہ عبدالغنی محدث، اور مولانا محمد نواب، یہ خاص طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ آپ نے کون کون سا فن کس سے پڑھا۔ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ احیاء العلوم اور الطریقۃ المحمدیہ سید احمد دحلان سے پڑھی ہے مختصر المعانی پیر دس شوال کو مولانا سید حبیب الرحمٰن سے شروع کی۔ اور جمعرات پچیس ذی قعدہ ۱۲۹۵ھ کو ختم کی

[1] مقامات خیر ص ۱۴۹۔

یعنی پینتالیس دن میں یہ کتاب ختم کی اور آپ نے شاہ عبدالغنی سے مدینہ منورہ میں جامع ترمذی کا درس لیا۔ حضرت نے آپ کو اس کی سند لکھ کر اور اپنی مہر لگا کر عنایت کی۔ آپ نے حدیث شریف کی باقی کتابیں اور تفسیر و فقہ اصول فقہ نحو و صرف و منطق و فلسفہ کی کتابیں کس سے پڑھیں اس کا علم حاصل نہ ہوسکا۔ سہ شنبہ ۷ محرم ۱۲۹۶ھ میں آپ کے والد کے چچا اور آپ کے نہایت مشفق و مہربان استاد حضرت شاہ عبدالغنی کی وفات مدینہ منورہ میں ہوئی آپ ربیع الاول میں مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے اور آپ نے حضرت معصوم کے گھر میں قیام کیا اگرچہ وہ تو اس وقت رامپور میں تھے لیکن ان کے بہن بہنوئی وہاں تھے اس مبارک سفر میں باطنی فتوحات حاصل ہوئیں آپ مسجد نبوی میں حلقہ فرما رہے تھے کہ آپ کے چچا حضرت شاہ محمد مظہر اس وقت روضۂ اطہر پر حاضر ہوئے اور وہاں مراقبہ فرمایا ان سے سردارِ جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ جاؤ ہماری طرف سے اپنے بھتیجے کو چادر اڑھاؤ اور ان سے کہو کہ ہندوستان جائیں چنانچہ حضرت شاہ محمد مظہر آپ کے پاس آئے اور فرطِ مسرت سے آبدیدہ ہو کر اپنی چادر آپ کے کندھوں پر ڈال دی اور کہا کہ یہ چادر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے ڈال رہا ہوں آپ تم سے فرماتے ہیں ہندوستان جاؤ[1] چنانچہ آپ یہ حکم ملنے کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ ۱۲۹۷ھ کو حجاز مقدس سے کلکتہ پہنچے اور وہاں چالیس دن قیام کر کے آخر ماہ جمادی الآخر ۱۲۹۷ھ تک رامپور چلے گئے۔

آپ باقاعدہ طور پر پہلی صفر ۱۲۹۴ھ میں راہ تقرب الی اللہ پر گامزن ہوئے آپ کے پیر و مرشد والد ماجد نے پہلے دن آپ کو لطائف عالمِ امر، قلب، روح، سر، خفی، اخفی اور لطیفۂ نفس کی تعلیم دی اور ساتھ مراقبۂ احدیت کرنے کو فرمایا

---

[1] مقامات خیر ص ۱۵۷۔

Marfat.com

یعنی دائرہ امکاں قطع کرنے کا راستہ کھولدیا۔ وہ حضرات جو اس راہ و رسم سے واقف ہیں جانتے ہیں کہ ہزاروں میں کوئی آدمی ایسا ہوا کرتا ہے کہ جہاں اس کو لطیفۂ قلب کی تعلیم دی گئی ہو۔ اس کا نہ صرف لطیفۂ قلب ہی ذاکر ہو جاتا ہے بلکہ عالم امر کے بقیہ چاروں لطائف بھی ساتھ ہی ذاکر ہو جاتے ہیں کہ وہ لطائف خمسہ سے ذکر کرنے لگتا ہے ورنہ عام طور پر پہلے صرف لطیفہ قلب ہی کو ذاکر کیا جاتا ہے اور پھر روح کو، پھر سر کو، پھر خفی کو پھر اخفیٰ کو۔ اور ایسا شخص تو کم ہی ملتا ہے جو پہلے ہی دن سے لطائف خمسہ عالمِ امر و لطیفۂ نفس سے ذاکر الٰہی میں مصروف ہو جائے اور جس کو یہ بات نصیب ہوتی ہے وہ جماعت مُرادان وہ مجذوبان میں ہوتا ہے اللہ کی عنایت اور رحمت اس کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور وہ مجذوب سالک کہلاتا ہے اور وہ از رہ اجتبا منازل سلوک قطع کرتا ہے یہ اللہ کا بڑا فضل تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں حضرت شاہ ابوالخیر کا شمار صوفیائے ہند میں ہونے لگا تھا۔ اور لوگوں کو روحانی فیوض حاصل ہونا شروع ہو گئے تھے۔

خدا بخش بلند شہر کے ایک گاؤں میں رہتا تھا اور اس گاؤں میں ایک سادھو بھی رہتا تھا یہ خدا بخش اس سادھو کے پاس جاتا تھا اس کو سادھو سے محبت ہو گئی جس کی وجہ سے خدا بخش ہندو ہو گیا اس نے اپنا کوئی نام ہندووانی نہیں رکھا۔ خدا بخش ہی نام رہنے دیا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برا کہتا تھا اور گالیاں دیا کرتا تھا یہ بلند شہر کی نمائش دیکھنے کے لیے گیا۔ وہاں اس نے بگھی میں ایک شخص کو دیکھا اس کے ساتھ بچے بھی تھے کوچبان کے پاس ایک پٹھان بیٹھا تھا اس کو معلوم ہوا کہ بگھی میں کوئی آسمانی فرشتہ بیٹھا ہوا ہے اس نے بہت کوشش کہ ان سے مصافحہ کر لوں لیکن لوگوں کی کثرت کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔ آپ کی سواری روانہ ہو گئی میں نے لوگوں سے پوچھا کہ اس بگھی میں کون صاحب تھے انھوں نے بتایا کہ دہلی کے حضرت شاہ ابوالخیر ہیں خدا بخش نے فیصلہ کیا کہ میں جب دہلی جاؤں گا تو ان سے ضرور ملوں گا۔ خدا بخش کو آپ کے

Marfat.com

دیکھنے کا اثر یہ ہوا کہ وہ مسلمان ہوگیا اور اسلام کی طرف اس کا جھکاؤ ہوا[1]

منشی ننے خاں کا نام کرم اللہ خاں تھا وہ محمد شفیع خاں عرف منشی آغاجان کے فرزند تھے ایک ہی جگہ رہتے سہتے تھے عام طور پر ان کو حقیقی بھائی سمجھا جاتا تھا منشی ننے خاں اور ان کی ہمشیرہ حضرت شاہ ابوالخیر سے بیعت تھیں۔ عبدالرحیم خاں اگرچہ بیعت نہ تھے لیکن آپ کے نیاز مند تھے املاک کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے۔ وہ بیمار ہوئے بیہوشی کے دورے پڑنے لگے وہ رات دن دنیوی امور میں مصروف رہا کرتے تھے جب بھی ہوش آتا تھا اس کی زبان پر ہوتا تھا لاؤ حساب کتاب، لاؤ قلم دوات۔ اس حالت کو دیکھ کر منشی ننے خاں آپ کی خدمت میں آئے آپ ان کے ساتھ ان کے گھر گئے عبدالرحیم خاں پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے آپ ان کے پاس بیٹھے اور تھوڑی دیر توجہ دی پھر آپ نے اُن کو آہستہ جھنجوڑ کر تین مرتبہ خاں صاحب فرما کر آواز دی تیسری آواز پر انھوں نے آنکھیں کھولیں آپ کو پہچان کر عقیدت مندی کے ساتھ گفتگو کی آپ نے اس وقت اُن کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر ان سے توبہ کرائی پھر استغفار اور کلمہ توحید اور کلمۂ شہادت کی تلقین فرمائی اور کچھ پڑھ کر ان پر دم کیا۔ جب آپ وہاں سے روانہ ہونے لگے تو عبدالرحیم خاں پر اتنا اثر ہوگیا تھا کہ انھوں نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگایا۔ اور بوسہ دے کر کہا حضرت آپ نے میری عاقبت سنوار دی آپ کی عیادت کے بعد عبدالرحیم خاں چند روز حیات رہے جب بھی ان کو ہوش آتا تو کہتے تھے کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے لاؤ جائے نماز لاؤ وضو کراؤ۔

ایک روز عصر کے قریب نواب احمد سعید خاں والئے چھتاری آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت ہوئے عصر کی نماز حضرت شاہ ابوالخیر صاحب نے نمائش گاہ

---

[1] مقامات خیر ص ۳۰۵

Marfat.com

بلند شہر کی عارضی مسجد میں پڑھی وہاں کی صفائی و سبزہ کو دیکھ کر آپ بہت خوش ہوئے دریافت کیا کہ اس کا انتظام کس نے کیا ہے بتایا گیا کہ حافظ عبدالعلی مختار نے یہ سب کام کیا ہے اور وہی ہمیشہ یہ خدمت بجا لاتے ہیں اور ان پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے ماتحت عدالت پھانسی کی سزا کا حکم دے چکی ہے عدالتِ عالیہ میں اپیل دائر کر رکھی ہے اور وہ بیمار ہیں عدالت نے گھر میں رہنے کی اجازت دیدی ہے وہاں سپاہی نگرانی کرتا ہے مسجد کی خوشنمائی نے آپ کو اتنا متاثر کیا کہ آپ نے فرمایا سواری منگواؤ ہم ان سے ملیں گے سواری آئی وہاں سے آپ عبدالعلی کے گھر پہنچے آپ کی آمد کو سن کر حافظ عبدالعلی انتہائی مسرت سے رو پڑے اور انھوں نے کہا کہ میں کہاں اس لائق تھا جو حضور میرے گھر تشریف لائیں۔ اس عرصہ میں لوگوں نے کہا کہ ان کے بچنے کی امید بہت کم ہے حافظ عبدالعلی گھر سے باہر آئے اور آپ کو چائے پیش کی آپ نے فرمایا ہم نے مسجد میں نماز پڑھی وہاں کے انتظام اور صفائی کو دیکھ کر ہمارا دل خوش ہوا اور ہم تم سے ملنے آئے تم ہمارے یہ دو شعر ہر نماز کے بعد عاجزی سے تین مرتبہ پڑھو اللہ سے امید ہے کہ تم بری ہو جاؤ گے اور آپ نے ایک کاغذ پر اپنے ہاتھ سے یہ دو شعر لکھ کر دئے؛

حَسْبِیَ اللّٰہُ فِی الْحَیَاتِ وَفِیْ ۔۔۔ سَکَرَاتِ الْمَمَاتِ وَاللَّحَدْ
وَھُوَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ یَکْلُوْ فِیْ ۔۔۔ فِیْ نَہَارِیْ وَلَیْلَتِیْ وَنَمَدْ

حافظ عبدالعلی نے آپ سے پرچہ لے کر آنکھوں سے لگایا اور پھر تین اشرفیاں ان کے تینوں بیٹوں کو پیش کیں اور کہا حضرت آپ کے لائق میرے پاس کچھ نہیں ہے جو میں پیش کر سکوں آپ نے ان کے حق میں دعا فرمائی۔ اور نمائش گاہ واپس آگئے آپ اپریل ۱۹۱۹ء کو کوئٹہ تشریف لے گئے وہاں سے حافظ عبدالعلی صاحب کا تار پہنچا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بری کر دیا۔ تار کے ذریعے ایک سو روپے آپ کی خدمت میں بھیجے

Marfat.com

حضرت مولانا شاہ ابوالخیر صاحب ہر سال بارہ ربیع الاول کی شب کو (گیارہ بارہ کی درمیانی شب) محفل میلاد شریف منعقد کرتے تھے خود مولود شریف پڑھتے انوار و برکات کی یہ کثرت ہوتی تھی کہ برابر آنکھوں سے اشک رواں ہوتے یہاں کی تاثیر دلوں پر چھریاں چلاتی آہ و فغاں کی صدائیں بلند ہونے لگتیں اس محفل میں لوگ کثرت کے ساتھ شامل ہوتے تھے خانقاہ شریف میں تل دھرنے کی جگہ نہ ملتی اور سڑک کی آمد بند ہو جاتی تھی۔ حضرت شاہ ابوالخیر صاحب نماز بڑی خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھتے تھے نماز میں جب کسی آیت کے فہم معنی کی وجہ حلاوت پیدا ہوتی تو رقت طاری ہوتی اور تمام نمازی بھی بے چین ہو جاتے اور زار و قطار رونے لگتے تھے ۔ؔ

حضرت شاہ ابوالخیر دنیا کو منہ نہیں لگاتے تھے اور دنیا والوں سے زیادہ تر بے تعلق رہتے تھے اور حکمران طبقے سے بھی دوری اختیار کرتے تھے یہ ان کے بزرگوں کا شعار تھا یہ اس پر زبانی عمل نہیں کرتے تھے بلکہ عملاً اس پر عامل ہوتے تھے پیسہ والوں اور حکمران طبقے نے آپ کو اپنی طرف کھینچنے اور مائل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن انھوں نے ان پر توجہ نہیں فرمائی۔

میر محبوب علی خاں نظام حیدر آباد دکن کی آمد دہلی میں تاج پوشی کے دربار کے سلسلہ میں ہوئی جو کہ یکم شوال ۱۳۲۰ھ مطابق یکم جنوری ۱۹۰۳ء کو ہوئی اس موقع پر فرزند عثمان علی خاں آپ سے ملاقات کے لیے خانقاہ آئے خانقاہ کے دروازہ پر پٹھان بیٹھے ہوئے تھے نواب صاحب کی سواری آئی ایک انگریز افسر بھی ساتھ تھا اس کے اردلی نے پٹھان سے کہا کہ نواب صاحب آئے ہیں پٹھان نے اطلاع کی انگریز افسر دروازہ پر رہا نواب صاحب اور ان کے بیٹے اندر داخل ہوئے نواب صاحب آپ سے مل کر باہر آئے انھوں نے ایک لاکھ

ؔ

Marfat.com

روپے کی اشرفیاں چاندی کی تھالیوں میں بطور نذر پیش کیں آپ نے فرمایا نواب صاحب سے ہمارا اسلام کہہ دو۔ ہم نے ان سے ملاقات کرلی۔ اس نذر کی ہم کو ضرورت نہیں ہے ہم ان کے واسطے دعا کرتے ہیں۔ چنانچہ اشرفی کی تھالیاں اسی وقت لوٹا دی گئیں۔

امیر حبیب اللہ خاں وائسرائے کی دعوت پر ۱۹۰۷ء میں دہلی آئے تھے دہلی میں ان کے سفیر سردار محمد خاں تھے انھوں نے ۵ ذی الحجہ ۱۳۲۴ھ مطابق ۲۰ جنوری ۱۹۰۷ء کو اپنے سفیر محمد اسماعیل خاں کو آپ کی خدمت میں بھیجا کہ میں آپ سے ملاقات کا مشتاق ہوں مجھ کو حاضر ہونے کی اجازت دی جائے آپ نے سفیر صاحب سے فرمایا امیر صاحب کو ہمارا اسلام کہہ دو اور ہماری طرف سے یہ بات کہہ دو۔" آپ کی دہلی آنے کی غرض وغایت میری ملاقات نہ تھی لہذا جس کام کے واسطے آپ آئے ہیں اس کو پورا کرنے میں آپ کے واسطے دعائے خیر کرتا ہوں اگر آپ کابل سے اس فقیر کی ملاقات کی نیت سے آتے تو یہ فقیر آپ سے ملاقات کرتا۔" سفیر محمد اسماعیل صاحب ۷ ذالحجہ مطابق ۲۲ جنوری ۱۹۰۷ء پھر امیر صاحب کا پیام لائے کہ آپ میرا ہدیہ قبول فرمالیں آپ نے عذر کرتے ہوئے فرمایا اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے مجھ کو حاجت نہیں ہے وہ مسلمانوں کے امیر ہیں مسلمانوں کی خدمت کریں یہی میرا تحفہ ہے۔ حضرت شاہ ابوالخیر صاحب نرے خانقاہوں میں بیٹھنے والے مشائخ میں نہ تھے۔ بلکہ ملک کے حریت پسند لوگوں کے حامی اور بہی خواہ تھے اور ملک کی آزادی کی ہر تحریک کے حامی تھے۔ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا ہندوستان کے حریت پسند اپنے ملک کو آزاد کرانے کی فکر میں لگے ہوئے تھے اس سلسلہ میں حضرت مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی وغیرہ نے ایک فتویٰ شائع کیا تھا کہ انگریزوں کی نوکری اور خاص کر فوج کی نوکری ناجائز ہے اس فتوے سے حکومتِ برطانیہ کو پریشانی لاحق ہوگئی اور حکومت نے ارادہ کیا کہ کسی بااثر عالم سے اس فتوے کے خلاف فتویٰ

Marfat.com

حاصل کیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے حکومت کی نظر آپ پر پڑی چونکہ بلا اجازت آپ نے پاس کوئی جا نہیں سکتا تھا اور ہر شخص سے آپ ملتے نہیں تھے اس لیے حکومت کو ایسی شخص کی ضرورت ہوئی جو حکومت کے آدمی کو آپ تک پہنچائے اس کام کے واسطے مصباح الدین حقی کا انتخاب ہوا مصباح الدین پھاٹک مفتیان ترا ہا بہرام خاں میں رہتے تھے ان کی نانی صاحبہ آپ کے نانا کی چھوٹی بہن تھیں اور وہ جب تک حیات رہیں آپ ان کے پاس جایا کرتے تھے اور ان کو نانی صاحبہ کہتے تھے مصباح الدین صاحب کو بھائی مصباح الدین کہتے تھے مصباح الدین صاحب آپ کے پاس آیا بھی کرتے تھے جب بھی وہ آئے تو آپ ان سے ملے۔

مصباح الدین صاحب کے ذمہ یہ کام کیا گیا تو وہ رات کے نو بجے سی آئی ڈی کے بڑے افسر کو لے کر آپ سے ملنے آئے دربان نے اطلاع دی کہ مصباح الدین اور ان کے ساتھ ایک شخص ملاقات کے واسطے آئے ہیں آپ نے اجازت دی یہ دونوں صاحب آپ کے پاس آئے تھوڑی دیر بعد سی آئی ڈی افسر نے آپ سے کہا کہ میں سی آئی ڈی کا افسر ہوں مجھ کو آپ سے ایک بات کہنی ہے آپ نے فرمایا کہو اس نے کہا میری گفتگو تخلیہ میں ہوگی آپ نے فرمایا ہم ضعیف ہو گئے ہیں یہ جو بیٹھے ہیں بمنزلہ اولاد کے ہیں جس کو بھی جو کچھ کہنا ہے ان کے سامنے کہنا ہے تخلیہ میں ہم کسی سے نہیں ملتے اس نے پھر اپنی بات دہرائی آپ نے مجلس سے فرمایا کہو مولوی بخش اللہ مولوی بدرالاسلام حافظ عبدالحکیم نے کہا کہ حضور تنہائی میں نہیں ملتے وہ افسر اٹھ گیا اس نے باہر نکل کر کہا کہ میں بتاؤنگا کہ کس طرح نہیں ملتے۔ اس واقعہ کے بعد دوسرے دن سے خانقاہ کے دونوں دروازوں کے باہر چوبیس گھنٹے سی آئی ڈی کے دو دو سپاہی بیٹھے رہتے تھے جو بھی خانقاہ میں جاتا تھا اس کا نام ولدیت اور پتہ پوچھا جاتا تھا۔ اور رجسٹر پر لکھا جاتا تھا دس بارہ دن اس حال میں گزر گئے آپ کے پاس دہلی کے

Marfat.com

بڑے پولیس افسر کی چٹھی آئی کہ ہم سے آکر دفتر میں ملو۔ چنانچہ ان کے پاس دس بجے آپ اور حافظ عبدالحکیم اور ایک پٹھان بگھی میں بیٹھ کر کشیری دروازہ پولیس افسر سے ملنے گئے۔ بعد میں آپ کے چھوٹے صاحبزادے حضرت زید بھی چلے گئے تھے۔

اس دن صبح کو یہ خبر گشت کر رہی تھی کہ حکومت حضرت شاہ ابوالخیر کو گرفتار کرنے والی ہے حافظ عبدالحکیم نے یہ افواہ سن رکھی تھی اس لیے نہایت پریشان تھے۔ جب مولانا شاہ ابوالخیر کی سواری پولیس افسر کے دفتر میں پہنچی دربان نے آگے بڑھ کر آپ سے کہا چلیے صاحب نے آپ کو بلایا ہے دربان نے چلمن اٹھائی آپ داخل ہوئے جب حضرت زید داخل ہونے لگے تو دربان نے کہا آپ ٹھہریں حافظ عبدالحکیم نے یہ سنا تو ان پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی حضرت زید نے چلا کر کہا کہ یہ ہمارے حضرت صاحب ہیں ہم ان کے ساتھ جائیں گے نہ معلوم دربان پر کیا اثر ہوا جو حضرت زید آپؒ کے پیچھے اندر داخل ہو گئے انھوں نے دیکھا کہ آپ کے پہنچنے پر وہ انگریز افسر آپ کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے آپ سے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا چنانچہ آپ کرسی پر بیٹھ گئے انگریز نے اپنا سر جھکا لیا تقریبًا ایک دو منٹ خاموشی کے گذرے پھر آپ نے کہا صاحب کیا بات ہے ہم کو آپ نے کیسے بلایا ہے اس نے سر جھکائے ہوئے کہا کہ ہمارے پاس رپورٹ آئی ہے کہ آپ خانقاہ میں کسی کو داخل نہیں ہونے دیتے آپ نے کہا اگر کوئی فاتحہ پڑھنے کے لیے جاتا ہے اس سے ہم کو کوئی غرض نہیں وہ پڑھے جو کوئی ہم سے ملنے آتا ہے اگر ہمارا دل چاہتا ہے تو اس سے ملتے ہیں ورنہ رخصت کر دیتے ہیں آپ کی بات سن کر ایک دو منٹ وہ افسر خاموش رہا اور پھر اس نے کہا آپ جا سکتے ہیں۔ چنانچہ آپ وہاں سے تشریف لے آئے [1]

---

[1] مقامات خیر ص ۲۷۹

Marfat.com

دوسرے دن آپ نے اپنی والدہ صاحبہ سے فرمایا رامپور میں آپا صاحبہ سے ملنے کو طبیعت چاہتی ہے اس لیے ان سے ملنے کے لیے رامپور چلے آخر محرم ۱۳۳۴ھ مطابق نومبر ۱۹۱۵ء میں آپ دہلی سے رات کے گیارہ بجے والی ریل سے رامپور کے لیے روانہ ہوئے آپ کے ساتھ آپ کی والدہ صاحبہ تینوں بہنیں، تینوں صاحبزادے بھائی اور دو پٹھان تھے جب رامپور کے اسٹیشن پر پہنچے تو اسٹیشن ماسٹر نے آپ کے واسطے ویٹنگ روم کھول دیا اور کہا آپ دو گھنٹے یہاں آرام کریں اس وقت کوئی سواری نہیں ہے اور جانے میں خطرہ بھی ہے آفتاب نکل آنے پر آپ جائیں صبح ہوئی تو شکرم پر بیٹھ کر حضرت عمہ محترمہ کے گھر پر مکان حکیم مظہر حسین محلہ مدرسہ کہنہ پہنچے ادھر آپ کی رامپور سے روانگی ہوئی اور دوسری طرف دہلی کے چیف کمشنر نے آپ کے دہلی سے روانہ ہونے پر رات کے ڈھائی بجے نواب ماجد علی خاں والئی رامپور کو ویسرائے کا پیغام پہنچایا کہ حضرت شاہ ابوالخیر رامپور پہنچے ہیں ان کو تم رامپور میں رکھو اور جب تک ہماری طرف سے اجازت نہ ملے وہ رامپور سے باہر نہ جائیں۔ اس تار کے ساتھ چیف کمشنر دہلی بھی رامپور پہنچ گیا۔ بذریعہ موٹر۔

دہلی میں حکیم اجمل خاں صاحب کو کسی طرح چیف کمشنر کا رامپور میں جانے کی اطلاع ہوگئی اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وہ کس مقصد سے گئے ہیں انھوں نے حافظ عبدالحکیم صاحب کو ان کی دکان پر جو کہ بلی ماران کے سرے پر چاندنی چوک میں تھی بلوایا اور ان سے کہا کہ حضرت شاہ ابوالخیر صاحب کو نظر بند کر دیا گیا ہے تم فوراً رامپور جاؤ اور میری طرف سے ان سے کہو کہ وہ رامپور سے باہر جانے کی ہرگز کوشش نہ کریں۔ چنانچہ دوسرے روز صبح کو حافظ عبدالحکیم صاحب نے حکیم صاحب کی بات آپ سے کہہ دی۔

شاہ ابوالخیر صاحب عمہ محترمہ کے گھر تقریباً ساڑھے سات یا آٹھ بجے صبح کو پہنچے وہاں ناشتہ کی تیاری شروع ہوگئی ابھی ناشتہ سے فارغ نہیں ہوئے تھے۔

Marfat.com

کہ پٹھان نے عبدالصمد خاں چیف سکریٹری، ہادی حسین خاں پرائیوٹ سکریٹری چھٹن صاحب (نواب صاحب کے پھوپا) اور ابوالحسن خالسان کے آمد کی اطلاع دی۔ نواب صاحب کے پھوپا اور سکریٹریوں نے نواب صاحب کی خواہش کا اظہار کیا۔ کہ آپ ان کی مہمانی قبول فرمالیں۔ نواب صاحب کے سکریٹری صاحبان سے آپ نے فرمایا ہمارے بھائی صاحب حضرت معصوم صاحب کے ساتھ نواب صاحب نے جو معاملہ کیا ہے ہم کو معلوم ہے اور اس قسم کی بات ہم نہیں سن سکتے لہٰذا ہم ان تین شرطوں پر نواب صاحب کی مہمانی قبول کر سکتے ہیں۔

(۱) نواب صاحب ہم سے ملاقات نہیں کریں گے (۲) جس مکان میں ہمارا قیام ہوگا اس پر ہمارا کامل تصرف ہوگا اور بلا اجازت کوئی داخل نہیں ہوگا۔ (۳) نہ ان پر کوئی پابندی عائد کی جائے گی۔

سکریٹریوں نے آپ کے شرائط نواب صاحب سے بیان کیں۔ انھوں نے آپ کی شرائط منظور کیں۔ اس عرصہ میں گرمی کا موسم بھی شروع ہوگیا۔ جو آپ کے لیے تکلیف دہ ہوتا تھا گرمی دانوں سے اُن کا جسم پھل جاتا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس زمانے میں آپ کوئٹہ تشریف لے جایا کرتے تھے۔ آپ اس تکلیف کو صبر اور شکر کے ساتھ برداشت کر رہے تھے۔ آپ نے نظر بندی کو ختم کرنے کے لیے کسی سے نہیں کہا اور نہ کسی کو تحریر کیا۔ آپ کی والدہ سے یہ حالت دیکھی نہیں گئی انھوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ عبدالرحمٰن خضر خیل افغانی کو کوئٹہ بھیجا اور وہاں کے مخلصین و ہمدردوں کو آپ کی تکلیف سے آگاہ کیا اور نظر بندی کو ختم کرانے کے لیے کہا۔ ان لوگوں نے ایک وفد بلوچستان کے حاکم اعلا کے پاس بھیجا اس وقت سارا بلوچستان براہ راست ویسرائے کے ماتحت تھا وہاں کے حاکم اعلا کو ایجنٹ گورنر جنرل کہتے تھے ارکان وفد نے اے جی، جی، سے کہا حضرت صاحب کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے وہ صرف مذہبی رہنما ہیں ان کی تکلیف سے تمام بلوچستان و افغانستان کے لوگوں کو رنج

Marfat.com

ہو گا۔ ای، جی، جی نے اس سلسلہ میں فوری طور پر وبسرائے سے بات کی اور پھر آپ کے مخلصین کو پروانہ لکھ کر معہ ایک باوردی سپاہی کے دیا اور کہا اس سپاہی کے ساتھ جاکر تم حضرت صاحب کو یہاں لے آؤ چنانچہ رحمت اللہ کاکڑ پروانہ لے کر پولیس کانسٹبل کے ساتھ رامپور پہنچے اسی وقت دہلی آدمی بھیجا تاکہ کوئٹہ تک بوگی کر لی جائے۔ آپ سات ماہ کی نظر بندی کے بعد شعبان ۱۳۴۴ھ مطابق جون ۱۹۲۶ء میں نہایت خاموشی کے ساتھ رامپور سے دہلی روانہ ہوئے آپ صبح نو دس بجے رامپور سے چلے اور پانچ بجے تک دہلی پہنچے۔ خانقاہ میں دو تین گھنٹے قیام کیا اور خیر سے رات کے نو بجے کوئٹہ کو روانہ ہو گئے باوردی سپاہی معہ پروانہ کے ساتھ تھا اس کے بعد چار سال تک ایک باوردی سپاہی دہلی سے کوئٹہ اور کوئٹہ سے دہلی آپ کے ساتھ آتا جاتا رہا[1]

حضرت مولانا شاہ ابوالخیر صاحب انگریزوں کی غلامی سے انتہائی ناخوش تھے۔ انگریزوں کے خوشامدیوں سے انتہائی جلتے تھے اور سلطان عبدالحمید خاں کے بڑے مداح تھے اگر کوئی شخص سلطان عبدالحمید خاں کی مخالفت اور انگریزوں کی حمایت کرتا تھا یا انگریزوں کے حامیوں کی تعریف بیان کرتا تو اس کو آپ پسند نہیں فرماتے تھے اور جل کر تعریف کرنے والے کی مذمت کرنے میں گریز نہیں کرتے تھے چنانچہ آپ کے صاحبزادے حضرت زید فاروقی مجددی نے اپنی مشہور کتاب "مقامات خیر" میں اسی قسم کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔

امیر امان اللہ خاں کے پہلے سفیر سردار گل محمد خاں تھے روشن آرا باغ کے قریب ان کی کوٹھی تھی ان دنوں حضرت شاہ ابوالخیر روشن آرا باغ میں تفریح کے لیے جایا کرتے تھے ایک دن سردار گل محمد خاں اپنے سمدھی سردار امیر خاں کے ساتھ آپ سے ملنے آئے ان سے ان کی پہلی ملاقات تھی امیر احمد بغداد کے نقیب سرسید

---

[1] مقامات خیر صہ ۲۹۱

Marfat.com

عبدالرحمٰن کے مرید تھے انھوں نے اپنے پیر کا ذکر کیا۔ آپ خاموش رہے پھر انھوں نے اپنے پیر کی تعریف شروع کی آپ نے سر اٹھا کر غصہ میں امیراحمد سے فرمایا:

"اے خبیث تم میرے سامنے کس کا ذکر کر رہے ہو اس شخص کا جس نے سلطان المسلمین سے بغاوت کی اور انگریزوں کا ساتھ دے کر اسلامی ملکوں کو انگریز کے قبضہ میں دے دیا۔ خبردار ایسے غداروں کا ذکر ہمارے سامنے پھر نہ کرنا۔"

اس وقت امیراحمد اور گل محمد کی حالت دیکھنے کے قابل تھی دونوں نے معافی طلب کی تو آپ کا غصہ فرو ہوا۔

اسی طرح آپ کو خلیفۃ المسلمین سے بے پناہ محبت و قلبی تعلق تھا۔ جنگ طرابلس و بلقان کے زمانہ میں آپ کی نگاہیں اس جنگ کی طرف لگی رہتی تھیں مجاہدین اور خلیفۃ المسلمین کے لیے ہر وقت دعائیں مانگتے رہتے تھے اور اس جنگ میں فنڈ بھیجنے کی بے حد کوشش کرتے تھے اس سلسلہ کا کوئی قدم اٹھتا تو اس کو کامیاب کرانے کے لیے ایڑی سے چوٹی کا زور لگا دیتے تھے ۱۹۱۲ء میں دہلی کے مسلمانوں نے ترکیہ کو طبی وفد بھیجنے کے لیے چندہ جمع کیا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو وفد کا رئیس تجویز کیا گیا اور اس وفد کو رخصت کرنے کے لیے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جلسہ منعقد کیا گیا جامع مسجد کے جنوبی دالان سیڑھیاں اور اس کے سامنے کا میدان لوگوں سے بھرا ہوا تھا حضرت مولانا محمد علی جوہر اور حکیم محمد اجمل خاں نے تقریریں کیں اس جلسہ میں آپ کو بھی خاص طور پر بلایا گیا تھا کہ آپ دعا فرمائیں۔ اس وقت تمام میدان اور سیڑھیاں لوگوں سے اٹی پڑی تھیں اس اژدھام میں سے کسی کا گذرنا بہت مشکل تھا جب حضرت شاہ ابوالخیر صاحب کی تشریف آوری ہوئی تو پبلک وا جتماع میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور جس طرح کائی پھٹتی ہے اس طرح مجمع پھٹنا شروع ہوا اور آپ کے واسطے ایک راستہ

Marfat.com

بن گیا آپ سیڑھیوں کے اوپر اس مقام پر پہنچ گئے جہاں ارکان وفد حضرت مولانا محمد علی جوہر اور حکیم اجمل خاں صاحب اور دیگر عمائدین کھڑے تھے حیات اجمل میں بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے دلی کے عام مسلمانوں میں ایک ایسی روح پیدا ہو گئی تھی کہ تنہا انھوں نے پچاس ہزار روپیہ جمع کیا۔ وفد کو رخصت کرتے وقت مسجد جامع اور اس کے سامنے کے میدان میں آدمیوں کے سروں کے علاوہ کوئی دوسری چیز نظر نہیں آتی تھی یہ مجمع نہ صرف آدمیوں کی تعداد اور ان کے جوش کے لحاظ سے ایک تاریخی حیثیت رکھتا تھا بلکہ دہلی میں شاید شاہان مغلیہ کے بعد اپنے تزک و احتشام میں یکتا تھا۔ حکیم صاحب اور حضرت مولانا محمد علی جوہر کی الوداعی تقریروں اور مولانا شاہ ابوالخیر کی رخصتی دعا نے ایسے گہرے اثرات چھوڑے ہیں کہ تمام عمر کوئی نہیں بھول سکتا۔

اس زمانہ کے نمازیوں سے آپ کو عشق تھا بری طرح پر فدا تھے اسلام کو فروغ حاصل ہو اس کی بڑی تمنا تھی کوئی نمازی کم ہو جاتا اور وفات پا جاتا تو آپ کو بہت رنج ہوتا تھا جنگ بلقان وطرابلس کے ہیرو انور شاہ کی انتقال کی خبر جب آپ نے پڑھی تو انتہائی رنج ہوا۔ انور شاہ کا فوٹو بھی شائع ہوا تھا اس کو دیکھ کر آپ زار و قطار رونے لگے اور بڑی دیر تک انور پاشا اور حکومت ترکیہ کے واسطے دعائے خیر فرماتے رہے۔

حضرت شاہ ابوالخیر صاحب ہندوستان کے صوفیاء و مشائخ و علماء میں بڑی قدر و منزلت سے دیکھے جاتے تھے اور اسی طرح ہندوستان کے سیاسی قائدین بھی آپ کو عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے آپ روشن آرا باغ میں حسب معمول برائے تفریح بگھی میں تشریف لے جا رہے تھے اس سال آپ کی سواری لال کنواں و کھاری باولی اور قطب روڈ ہو کر جاتی اور آتی تھی ایک دن جب آپ کی سواری لال کنواں پر پہنچی تو وہاں راستہ کے مشرقی کنارے ایک بڑے اجتماع میں چار پانچ گز اونچے اسٹیج پر

Marfat.com

حضرت مولانا محمد علی تقریر کر رہے تھے اور مولانا شوکت علی اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے یہ دونوں قید فرنگ سے رہا ہوئے تھے یہ جلسہ ان کے اعزاز میں کیا گیا تھا ان دونوں بھائیوں کی نظر جب آپ کی طلعت نورانی پر پڑی تو فوراً اسٹیج پر سے اُترے اور دوڑتے ہوئے آپ کی سواری کے پاس آئے۔ آپ کے ہاتھوں کا بڑی محبت و عقیدت سے بوسہ لیا۔ آپ نے ان کی خیریت دریافت کی اور آپ کی سواری روانہ ہوئی۔

جب سے آپ نے آنکھ کھولی اپنے والد ماجد کو شعر و شاعری کی طرف متوجہ پایا پھر آپ کو استاد ملے تو مولانا حبیب الرحمٰن جیسے یگانہ روزگار مشفق و مہربان استاد ملے جن کی جامعیت مسلّم تھی قرأت، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول علوم بلاغت، ادب، نحو، صرف اور تصوف میں کامل دستگاہ تھی اور ان کو شاعری میں خوب کمال حاصل تھا ان سب کمالاتِ ظاہری کے ساتھ صفائے باطن اور عشق نبوی میں مشہور تھے آپ ان کا کلام سنتے تھے آپ نے اپنے گھر میں اور پھر مدرسہ میں شعر و شاعری کا چرچہ دیکھا تو اس کی طرف بھی متوجہ ہوگئے بچپن میں اپنے جوہر دکھائے گیارہ سال کی عمر میں جو تاریخ مدینہ منورہ کے سفر کی آپ نے نکالی ہے یہ سلسلہ زیادہ سے زیادہ یکم صفر ۱۲۹۴ھ تک جاری رہا یعنی بائیس سال کی عمر تک کیونکہ آپ پھر امور تبلیغیہ کی طرف متوجہ ہوگئے۔ خبیر تخلص کرتے تھے آپ کا کلام ملاحظہ ہو:

پہنچے نہ باغ طیبہ تک افسوس خبیر ہم — آئی خزاں ربیع کا موسم بسر ہوا
دم بند ہوگا مطربہ چرخ کا اگر — مدح نبی میں خبیر اگر نغمہ گر ہوا
نشانِ منزلِ مقصود سے واقف وہی ہیں خبیر — طواف کعبۂ دل روز و شب جو لوگ کرتے ہیں
مدد اے جاذب عشق احمد پاک — خبیر کو شوق جبہ سائی ہے

لہ دہلی کی یادگار ہستیاں۔

Marfat.com

مدفن کو گر بقیع میں تھوڑی سی جا ملے   مل جائے خیر دولتِ دنیا و دین مجھے

جبہ سائی کرے خیر گنہگار
شفیع المذنبین کی آستاں کی

آپ کا ۶۹ سال کی عمر میں جمعہ کی شب کو ۲۹ رجمادی الآخر ۱۴۱۳ھ کو انتقال ہوا اور خانقاہ غلام علی شاہ میں دفن ہوئے۔

Marfat.com

بیگم حمیدہ سلطان احمد

آکا بھائی

آکا بھائی پر کچھ لکھنے کے لیے قلم اٹھاتی ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس داستان کو کیسے شروع کروں وہ تو میری زندگی کا محور تھے۔ آکا بھائی مجھ سے کافی بڑے تھے لیکن میں نے ان کو ہمیشہ اپنے ہمجولی کے روپ میں دیکھا ہے اس کہانی کا تانا بانا جوڑنے کی میں کوشش کرتی ہوں تو سرا ہر بار ہاتھ سے نکل جاتا ہے اس لیے پہلے یہ کہانی والدہ صاحبہ کی زبانی سنیے فرماتی تھیں " فخرالدین میاں بالکل گول مٹول پیدا ہوئے تھے سوا مہینے کے تھے لیکن ۔۔ مہینے سے زیادہ کے لگتے تھے رونا بالکل جانتے ہی نہیں تھے۔ ڈھائی سال تک وہ بولے نہیں تو میں گھبرا گئی۔۔ صاحب نے کہا پریشان نہ ہو بیگم۔ تمہارا بچہ بالکل ٹھیک ہے اس کا سر بڑا ہے اس لیے دیر میں بولے گا۔ چلے گا بھی وہ کچھ مہینے بعد" آکا بھائی دو بہنوں کے بعد ہوئے تھے اس لیے ان کا جتنا لاڈ ہوتا بجا تھا مگر[1] ابا جان کا مقولہ تھا " کھلاؤ سونے کا نوالہ دیکھو شیر کی نگاہ"

---

[1] کرنل زنبور علی احمد

Marfat.com

والدہ صاحبہ خداترس دین دار فراخ دل بیوی تھیں۔ ابّا جان بات کے پکے، اصولوں کے پابند محنتی اور حق گو انسان تھے۔ والدین کی اچھی عادتوں کا اثر آکا بھائی کے حسّاس ذہن نے قبول کرلیا تھا۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو اُن کی شفیق نگاہیں ہردم میری نگراں رہیں۔

میں لڑکپن میں بے حد شریر اور بلا کی چنچل تھی مرحوم منجھلے بھائی کے ساتھ مل کر میری شرارت اور بھی بڑھ جاتی ہم دونو مل کر اتنا اُدھم مچاتے کہ گھر بھر میں طوفان مچا رہتا والدہ صاحبہ کے کان میں شوروغل کی آواز پہنچی تو وہ پائینچے سنبھالتی ہوئی ہماری خبر لینے کو اٹھتیں منجھلے بھائی تو باہر بھاگ جاتے میری شامت آجاتی۔ آکا بھائی نویں کلاس کا امتحان دے رہے تھے دوپہر کو کھانے کے بعد اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لیے لیٹتے تو میں اُن کے سر پر نازل ہوجاتی کبھی گانا گاتی کبھی اپنا سبق سناتی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی وہ آنکھیں بند کیے ہوں ہاں کرتے رہتے کبھی سو بھی جاتے مگر مجھے انھوں نے یہ نہیں کہا جاؤ مجھے آرام کرنے دو اس وجہ سے اُن کی بے پناہ محبّت میرے دل میں جاگزیں ہوگئی۔ جب وہ کیمبرج گئے تو ہر مہینے برابر خط لکھتے رہے اور مجھے ہر خط میں دِل لگاکر پڑھنے کی تاکید کرتے رہے۔ اور جب ۶ سال بعد وہ کامیاب و کامران واپس آئے تو میں نے خوشی سے بیخود ہوکر کہا۔

جلد لا بادہ گلرنگ کدھر ہے ساقی
دلّی کے پھر گئے دن تجھ کو خبر ہے ساقی

اِس وقت مجھے یہ کب اندازہ تھا کہ آکا بھائی آزاد ہندوستان کے صدر ہوں گے۔

آکا بھائی ہمیشہ اسکول میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتے رہے۔ سینٹ اسٹیفن کالج میں چند مہینے پڑھا اور ان کو ابّا جان نے ۱۸ سال

Marfat.com

پنشن آ کا بھائی کی پریکٹ
بھی وہ مسکراتے رہے
ہمیشہ کی کمزور تھیں اور
ہو چکی تھی خون کا دبا
اور اُن کا زیادہ وقت
دینے ہوتے تھے آکا بھا
تھے دونوں چھوٹے بہن
آکا بھائی کی شفقت کے

محمد کبیر الدین رازی

Marfat.com

بھولے ہوئے تھے یہ ۱۹۳۳ء کا زمانہ تھا آکا بھائی پانچ برائیٹ اسٹریٹ کلکتہ میں ہم سب کے ساتھ رہ رہے تھے اسی زمانے میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ آکا بھائی جو انگریزوں کی نوکری کو غلامی سمجھتے تھے۔

۱۹۳۴ء سے جنگِ آزادی کے لیے سپاہی بن گئے اور سیاسی جدوجہد میں حصّہ لینے لگے۔ جس طرح وہ گھریلو معاملات سلجھانے کی کوشش کرتے تھے اسی طرح انھوں نے سیاسی معاملات کو سمجھنے میں پوری دلچسپی لی۔ اور چند سال بعد ہی آسام کے ہر دل عزیز اور مشہور لیڈر بن گئے ان کو آسام کا مردِ آہنی کہا جانے لگا۔ انتھک محنت کی بدولت کامیابی آکا بھائی کے قدموں میں آبیٹھی اور پریکٹس بھی ان کی کافی بڑھ گئی ان کی رہنمائی میں آسام نے بہت ترقی کی آسمانِ سیاست پر وہ روشن ستارہ بن کر چمکے[1] پنڈت نہرو آکا بھائی کی سوجھ بوجھ کے قائل تھے اس لیے اُن کو کانگریس کی انتظامیہ کمیٹی کا ممبر بنادیا ۱۹۳۹ء میں آکا بھائی کو بردولی وزارت میں وزیر مال کا عہدہ ملا وہ تمام ریاستی وزارتوں میں سب سے کم عمر وزیر تھے اس وقت ان کی عمر پورے ۴۳ سال کی بھی نہیں تھی۔ انھوں نے اپنی لیاقت اور اہلیت کا پورا ثبوت دیا اور اس محکمے کے الجھے ہوئے مسائل کو بہت خوش اسلوبی سے سلجھایا۔ ۱۹۴۰ء میں جب کانگریس نے انگریز گورمنٹ کے خلاف تحریک شروع کی تو اور لیڈروں کے ساتھ

---

[1] سردار پٹیل نے آکا بھائی پر یہ فقرہ چست کیا تھا "نہرو لونڈھار کو کمیٹی میں لے آئے ہیں" کیونکہ اس وقت آکا بھائی کی عمر تقریباً ۳۵ سال تھی اور وہ سب سے کم عمر ممبر تھے۔

اعلا پیمانے پر منائی گئی۔ آکا بھائی نے اس صدی کا کام بہت لگن سے کیا۔ لہ عارف کی اولاد میں ہونے کا حق ادا کیا ایوانِ غالب کی شاندار عمارت اس کی گواہ ہے وہ سیاسی کاموں میں الجھے رہنے کے باوجود بھی ادبی مشاغل کے لیے کچھ نہ کچھ وقت نکال لیا کرتے تھے۔ اپنا یہ خاندانی ورثہ ان کو دل سے عزیز تھا۔ صدرِ جمہوریہ بن جانے کے بعد وہ بظاہر تو غالب انسٹی ٹیوٹ کا کام نہیں کر سکتے تھے لیکن ڈاکٹر یوسف حسن خاں سے اکثر اس کے انتظامی معاملات کے سلسلے میں مشورہ کرتے رہتے آکا بھائی کے استعفار دینے کے بعد ڈاکٹر یوسف خان غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری تھے۔ آکا بھائی بہت ہی با اصول انسان تھے ان کے ہر کام کا وقت مقرر تھا روزانہ صبح چھ۶ بجے جاگ جاتے اور تازہ پانی میں ایک لیمو کا عرق ملا کے پینے کے بعد آدھے گھنٹے باغ میں چہل قدمی کرتے پھر اخبار پڑھتے اور چائے پیتے غسل کر کے ٹھیک ۹ بجے ناشتے کی میز پر آجاتے ساڑھے نو بجے سے دس بجے تک وہ ضرورت مند لوگوں سے ملاقاتیں کرتے پھر دس بجے دفتر چلے جاتے شام کو دفتر سے آنے کے بعد بھی ملنے والے اُن کا پیچھا نہ چھوڑتے دن بھر کی دفتر کی مصروفیات کے باوجود بھی وہ ہر آنے والے سے خندہ پیشانی سے ملتے اور جو کوئی بھی ان سے مل کر جاتا وہ مطمئن ہوتا کیونکہ وہ ہر ایک کی مدد دلی لگن سے کرتے تھے۔

ان کی مہربان نگاہیں اور مسکراتی صورت ہر مایوس انسان کو دلاسا دیتی تھی۔ ۱۹۶۷ء میں دل کا دورہ پڑنے کے بعد ڈاکٹر کی

لہ ان کی والدہ رقیہ سلطان نواب زین العابدین خان عارف کے بڑے بیٹے مرزا باقر علی خاں کامل کی چھوٹی صاحبزادی تھیں۔

Marfat.com

ہدایات پر وہ کچھ آرام لیتے پھر بھی جتنا ممکن ہوتا وہ لوگوں کی مدد کرتے خدا کا شکر ہے کہ میرے آکا بھائی کا دل محبت کی دولت سے لبریز تھا اور مخلوق خدا پر اپنی دولت زندگی بھر لٹاتے رہے کبھی بھی کسی پر انھوں نے اپنی بڑائی کا رعب نہیں ڈالا۔ ان کی نظر میں امیر غریب ہندو مسلم سکھ عیسائی یکساں تھے ہر دردمند انسان کے دکھ کو وہ جلد از جلد دوا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بزرگوں کا احترام کرتے برابر والوں سے محبت چھوٹوں پر شفقت رشتے داروں سے خواہ وہ دور کے ہوں یا نزدیک کے اور کسی بھی حیثیت کے بلا تکلف ملتے تھے۔ ان کی اچانک وفات کے بعد ہر رشتے دار نے یہ محسوس کیا کہ اس کے سر پر سائبان نہیں رہا۔ یوں تو یہ دنیا فانی ہے جو یہاں آئے گا وہ ضرور جائے گا۔ مگر اِن جیسے انسان کا جانا پوری قوم کے لیے بہت بڑا المیہ ہے وہ پرانی اقدار کے پاسبان اور جدید تہذیب کے قدردان تھے ان کی ذات گرامی میں نئی اور پرانی قدروں کا بہت دلکش امتزاج تھا۔

وہ دلّی کی شائستہ روایات کا مکمل نمونہ بھی تھے اور اس زمانے کی تہذیب کے علمبردار تھے۔ مذہب سے ان کو گہرا شغف تھا کہیں بھی ہونے جمعہ کی نماز ہمیشہ مسجد میں پڑھتے دِل کی بیماری سے قبل رمضان کے پورے روزے رکھتے تھے بچّوں کو نماز پڑھنے کی تاکید کرتے لیکن مذہب کو انھوں نے اپنے اوپر ایسا طاری نہیں کیا کہ تفریحات میں حصّہ نہ لیتے۔ برج گولف ٹینس ان کے پسندیدہ کھیل تھے۔ گولف تو وہ مرتے دم تک کھیلتے رہے۔ وہ فرمابردار بیٹے تھے شفیق بھائی چاہنے والے شوہر اور عاشقِ زار باپ ان کی اچانک وفات کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ کچھ گھنٹوں کے لیے میں ہوس و حواش کھو بیٹھی اور

Marfat.com

ایسا ہونا قدرتی اثر تھا ان کی بے پناہ شفقت نے ابّا جان کے دنیا سے رخصت ہونے کا غم دل سے بھلا دیا تھا اور میں نے یہ کہکر دل کو سمجھایا تھا۔

مبارک تمھیں فخرِ والد گوہر
کہ کرسی نشیں ہو بجائے پدر

ان کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد غالب کا یہ شعر بے ساختہ میرے لب پر آگیا۔

تم ایسے کھرے کون سے تھے داد و دنستہ کے
کرتا فلک الموت تقاضا کوئی دن اور

Marfat.com

محمد ذاکر

مولانا محمد یوسف مرحوم دہلوی

حضرات! مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں دلّی کی ایک سرگرم سیاسی شخصیت پر بطور خاکے کے کچھ لکھوں۔ میں نے ہامی بھی بھر لی تھی مگر شاید آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ خاکہ نگاری دراصل ایک تاثراتی آرٹ ہے۔ اور تاثرات کا معاملہ یہ ہے کہ یہ غیر ارادی طور پر ذہن پر مرتسم ہوتے رہتے ہیں اور وقتاً فوقتاً پردۂ شعور پر جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو مشق ہوتی ہے کہ جب چاہیں اپنے تاثرات کسی بھی شخصیت کے بارے میں بالارادہ یکجا کر لیں۔ اسے آپ میری کوتاہی یا کوتاہ قلمی کہیے کہ میں اپنے آپ کو ایسے حاضر قلم لوگوں کے زُمرے میں شامل نہیں پاتا اور شاید شامل ہونے کو جی بھی نہیں چاہتا چنانچہ میں نے ارباب اختیار سے اپنی معذوری کا اعتراف کر لیا مگر گلو خلاصی نہیں ہوئی بلکہ حکم یہ ہے کہ اب کے مولانا محمد یوسف دہلوی مرحوم پر لکھکر پڑھو اور بعد میں اُس شخصیت پر جو اصلاً تجویز کی گئی تھی۔ گویا وہی نماز بخشوانے اور روزے مزید گلے پڑنے والی بات۔ بہرحال، دیکھیے کیا لکھتا ہوں۔

مگر اس سے پہلے ایک بات اور۔ "یہ دلّی والے" سیمنار بھی خوب ہے۔ ہفتوں پہلے وعدے وعید لکھنے لکھانے کے مگر عین وقت پر پروگرام پر مشتمل

Marfat.com

باقاعدہ دعوتی کارڈ جن کا اردو اکادمی والوں نے بھی عادی بنا دیا ہے ندارد ممکن ہے ڈاک والوں کی کارستانی ہو وہ تو کہیے کہ کل رات ایک ہم محلہ سے تصدیق ہوئی کہ یہ منعقد ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس خیال سے کہ مہتمم حضرات سے شرمساری نہ ہو بندہ بھی کان پر دھر کر قلم کے مصداق مضمون یا خاکہ در بغل عدالتی زبان میں حاضر آیا۔

حضرات، ویسے تو اپنے آپ کو جاننا بہت مشکل ہے اور کما حقہ، اپنے آپ کو کتنے لوگ جان سکے ہیں مگر میرے لیے مولانا محمد یوسف دہلوی مرحوم ان بزرگوں میں تھے جن کو میں نے اپنے آپ کو جاننے سے پہلے پہچانا۔ اصل میں اپنے وجود کی حیثیت بھی اضافی ہی تو ہے۔ اوائل عمر ہی میں اسکول جاتے ہوئے چوڑی والوں کی مسجد حوض والی کے آگے سے گزرتے ہوئے روزانہ ان کی آواز کانوں میں پڑتی قرآن مجید کا ترجمہ بیان کرتے ہوئے۔ گھر گھر وعظ اور میلاد کی محفلیں ہوتیں، مولوی صاحب کی آمد آمد، خواتین کا اژدحام، پردے کا اہتمام، عطر و اگر کی خوشبوئیں۔ لیجیے وہ مولوی صاحب تشریف لے آئے۔ ٹھیک وقت مقررہ پر۔ نہ ایک منٹ اِدھر نہ اُدھر۔ وقت کی پابندی کا ہر ممکن خیال رکھتے۔ وجہ بھی سن لیجیے۔ اب سے دور کچھ عرصے پہلے میں بیمار رہوا۔ مولوی صاحب کو خبر پہنچی۔ تشریف لائے۔ بیماری کا حال سن کر فرمایا میاں یہ سب کھانے کے وقت کی پابندی نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ بات کچھ بے جا نہ تھی۔ فرمایا میاں دیوبند کے مدرسہ دارالعلوم میں ایک استاد نے میرے سرٹیفکیٹ یا سند پر صرف اس لیے دستخط نہیں کیے کہ ان کی جماعت یا درسیہ میں میں صرف ایک دن وقت پر نہ پہنچ سکا تھا۔ بس وہ دن ہے اور آج کا دن۔

تو لیجیے وہ مولوی صاحب تشریف لے آئے۔ وہ ان کی نشست پردے کے اس طرف عربی میں خطبہ کا آغاز، آیات مقدسہ کی تلاوت، صحیح مخرج کے

Marfat.com

ساتھ ٹھہر ٹھہر کر جیسے کلام الٰہی کے ہر لفظ کو دل نشین کرتے جاتے ہوں۔ میری پیاری ماؤں اور بہنو۔ پہلے آیات متبرکہ کا ترجمہ، پھر تفسیر۔ روزمرّہ زندگی کے معمولی معمولی واقعات سے مثالیں اس طرح کہ سنجیدہ دقیق سے دقیق مسئلے کو بھی جیسے پانی کر کے ہر دل میں اتار رہے ہوں اور دلوں میں عمل کی حرارت پھونکتے جاتے ہوں۔ میں نے ڈپٹی نذیر احمد کی تقریریں نہیں سنیں، ان کی تحریریں دیکھی ہیں۔ کیسے کیسے مسائل انھوں نے سمیٹے ہیں اور کس انداز سے عام فہم مکالموں کے ذریعے اسی روزمرّہ و محاورے میں جسے آپ ہم سب بولتے ہیں۔ مولانا احمد سعید مرحوم میں بھی یہی وصف تھا۔ عام بولی ٹھولی سے کیسے کیسے کام لیا ان بزرگوں نے۔ کبھی یہ پکّی سیاہی میں چھپیں تو اردو میں یقیناً بے مثل اضافہ ہوگا۔ آج کل ذکور و اُناث یا مردانہ اور زنانہ کی خانہ تقسیمی جس تیزی سے کم ہوتی جاتی ہے، مردانے اور زنانے کی زبان کا تخصیصی امتیاز و تمیز بھی اٹھ رہی ہے لیکن اس سے کس کو انکار نہ ہوگا کہ اردو میں بوجوہ عورتوں کی زبان و محاورہ اب تک ایک الگ باب رکھتا ہے۔ مولانا یوسف مرحوم کو جو قدرت اس پر تھی اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ عورتوں کی مخصوص اصطلاحات، محاورات، بات کہنے کا انداز، مولوی صاحب ان سب سے کام لیتے۔ کبھی طعن، کبھی دلار، کبھی تنبیہ اور پھر اکثر لب و لہجے میں ڈرامائی اتار چڑھاؤ۔ غرض ہر ہر طرح کام کی بات، دین کی بات دنیا داروں کے ذہن میں اس طرح پیوست کر دیتے کہ اس کا اثر جلد یا بدیر ہر گھر میں ظاہر ہوئے بغیر نہ رہتا۔

مولوی صاحب نے دراصل یہ نکتہ پا لیا تھا کہ عورت کی گھر میں اور گھر داری میں کیا بنیادی اہمیت ہے اور سچی اور دیرپا معاشرتی اصلاح کی بنیاد وہی ہو سکتی ہے۔ ان کے لیے وعظ و تلقین ہی کا اثر تھا کہ نماز روزہ زکوٰۃ ہی کے ضوابط میں نہیں بلکہ حسنِ سلوک کے ہزاروں معاملات سامنے

آتے۔ چپکے چپکے سیکڑوں ہزاروں ان تک پہنچتے اور وہ حساب کتاب کے معاملے میں ایسے پکے اور کھرے کہ خواہی نخواہی ہر وصول شدہ رقم کا اعلان محفل وعظ میں کرتے، حسابات رکھتے۔

عورتوں کی تعلیم و تہذیب کا جو شغف ان کو تھا اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک مدرسہ تعلیم نسواں کا قائم ہو سکا اور اب تک قرآن مجید کی تعلیم وہاں جاری ہے۔ ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی کہ قرآن مجید صحت سے پڑھا جاتے۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے رسالے ''صراط مستقیم'' کے چند نمبر بھی وقف کیے تھے اور یہ رسالہ مفت تقسیم کیا جاتا تھا۔

حضرات! یہاں تک لکھ چکا تھا کہ خیال آیا کہ مولوی صاحب کا حلیہ تو لکھا ہی نہیں۔ تو لیجیے حُلیہ بھی سُن لیجیے اور چہرہ مُہرہ بھی دیکھ لیجیے۔ میانہ قد، رنگ وہ جسے ہم دلی والے پکّا کہتے ہیں، بغیر کالر کی قمیص اکہرے کفوں والی سیدھی آستین کی، یا کرُتہ، اوپر واسکٹ، خیال آتا ہے شاید اُسی میں جیبی گھڑی ویسے پرانی چال کی گھڑی کلائی پر بھی دیکھی ہے۔ سفید شرعی پاجامہ، سر پر کپڑے کی چند دے والی گول ٹوپی، ہاتھ میں شانوں پر ڈالنے والا بڑا رومال اور کتاب، پاؤں میں پمپ بالعموم براؤن۔ آخر میں اکثر مسجد کے حجرے ہی میں قیام کرتے۔ تہمد اکثر نیلا، اور خانہ ساز سفید نیم آستین، ناک لمبی سُتواں نہ تھی، چھوٹی بھی نہ تھی، نہ پھیلی ہوئی، چہرہ کسی قدر گول، چھوٹا دہانہ۔ شرعی داڑھی نہ بہت گھنی نہ چھدری، بالعموم منڈا ہوا سر، چھوٹے تال کی تار کے کالے فریم کی عینک۔ چال میں میانہ روی اور ہمواری مصافحہ میں کبھی ہاتھوں کو نہ چومنے دیتے۔

کہتے ہیں کہ کسی آدمی کے بڑے ہونے کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اُسے بچوں سے کتنی محبت ہے۔ مولانا یوسف مرحوم انھیں عزیز رکھتے تھے۔ اب جب کہ میں عمر کی اس منزل سے گزر رہا ہوں کہ آنے والی کسی بھی بات کو پہلے

Marfat.com

سے جان لینے کا اشتیاق باقی نہیں رہتا اور کیرو کی جیسی قیافہ شناسی اور علم الید سے متعلق کتابوں سے دل چسپی بھی مفقود ہو جاتی ہے لڑکپن کی ایک بات کا خیال آتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کتاب مستعار دینے کا آپ کا کیا تجربہ ہے۔ میرا تجربہ تو خیر، اس کے بیان کرنے کا موقع نہیں۔ میں نے سنا کہ مولوی صاحب کے پاس فالنامۂ دانیال کا ایک نسخہ ہے۔ حاضر ہُوا۔ مولوی صاحب میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس فالنامۂ حضرت دانیال ہے۔ میاں ہاں کیا کروگے عربی میں ہے۔ عربی عبارت آپ سے سمجھ لوں گا۔

مسکرائے۔ ایسی نادر کتاب فوراً مجھ معمولی لڑکے کو دینے میں دریغ نہ کیا۔ چند گھنٹوں کے لیے میں نے اُسے رکھا اور واپس کر آیا۔ ان کی خدمت میں اکثر قرآن شریف کے مطالب اور آیات کی نشاندہی کے لیے حاضر ہوتا۔ کرم فرماتے۔ نہ صرف نشاندہی کرتے بلکہ سیاق وسباق پر بھی روشنی ڈالتے۔ موضوع سے موضوع پیدا ہوتا۔ پھر مزید آیات کی نشاندہی۔ مطالب پر اتنا عبور اور یہ مشق و مزاولت کسے کسے نصیب ہوتی ہے اور پھر احادیث سے استشہاد۔

بچوں کی تعلیم و تربیت، اور جدید زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر انھوں نے مدرسہ کریمیہ کی ذمہ داری سنبھالی اور اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔ انتظام کی وہ صلاحیت کہ باید و شاید۔ ان کے زمانے کے مدرسۂ کریمیہ کے بچے اب بڑے بن چکے ہیں ان میں جو تعلیمی میدان یا متعلقہ پیشوں میں ہے مجھے امید ہے کہ وہ اعتراف کریں گے کہ وہ خشتِ اول یعنی مدرسہ کریمیہ کی ابتدائی ٹھوس تعلیم ان کے لیے کتنی نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ مولوی صاحب اردو میڈیم کے قائل تھے مگر انگریزی یا ہندی سے انھیں بیر نہیں تھا۔ انھوں نے خود بھی انگریزی سیکھی تھی۔ میرے ایک مرحوم رفیق ناقل تھے کہ ان کی انگریزی سیکھنے کی رفتار نہ صرف حیرت انگیز طور پر تیز تھی بلکہ انھیں انگریزی ادب کے

Marfat.com

شاہکاروں کے متعلق واقفیت پیدا کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔

مولوی صاحب تقریر بے تکان کرتے۔ سیرت کے بیان میں ایک ایک موضوع کئی کئی رات چلتا۔ دلّی سے باہر کم ہی جاتے تھے۔ ایک مرتبہ کہیں سیرت پاک ہی پر خطاب کرنے گئے تھے۔ قاضی زین العابدین بھی وہاں تشریف رکھتے تھے۔ عشار کے بعد سے صبح کی اذان کے وقت تک مولوی صاحب کی تقریر جاری رہی۔ کیا مجال کہ کسی کا اٹھنے کو جی چاہے۔ قاضی صاحب نے طلاقت اور تقریر کی پُر مغزی کی داد دی۔ مولوی صاحب نے فرمایا قاضی صاحب ابھی تو تمہید ہے دو راتوں کا بیان اور ہے۔۔۔ سبحان اللہ۔ واقعی کتنا عمدہ اور واضح بیان ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر کئی واعظین و مقررین کو سنا ہے مگر جس انداز سے مولوی صاحب سیرت پاک کا بیان فرماتے تھے وہ انھیں کا حصہ تھا۔ جذبات آفرینی کے باوجود کس قدر واضح اور مفصل بیان ہوتا تھا ان کا۔ کہیں کہیں نعتیہ اشعار بھی شامل کرتے جاتے۔ حضور سے جو عقیدت انھیں تھی اس کا اظہار ان کی اس دعا میں بھی ہے جس پر نیک خاتون یہی چاہتی تھی کہ وعظ میں وہ دعا اُسی کے ہاں پڑھی جاتی۔ اکثر دیکھا ہے کہ دعا پڑھتے وقت خود مولوی صاحب پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔

بہت لوگوں سے ان کے غصے اور برہمی کی بات سنی ہے۔ خود بھی کسی بے ڈھنگی بات پر بچوں اور بڑوں کو بھی جن میں عورت مرد سب شامل ہوتے تھے انھیں سخت سُست کہتے دیکھا ہے محفل وعظ میں بھی اور مسجد میں بھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ عالم تو تھے ہی مدرس بھی تھے اور بعض مواقع پر برہمی ناگزیر ہو ہی جاتی ہے۔

ناؤ والی ہر پتنگ بازی کے ان کے مقابلے تو میں نے نہیں دیکھے مگر میں نے انھیں شطرنج کھیلتے میں بھی برہم ہوتے دیکھا ہے۔ حاجی بدرالاسلام

Marfat.com

صاحب مرحوم سے شطرنج کھیلتے ہوتے۔ اول دوپہر سے شام تک، عشار تک۔ اور برہمی اس وقت ہوتی جب بازی ذرا کمزور ہوتی۔ وہ ایک ایک مہرے کو پٹخ کر چلنے لگتے۔ حاجی صاحب زیرِ لب مسکراتے رہتے۔ اب شطرنج کا معاملہ یہ ہے اور میرے خیال میں ہر کھیل یا شغل کا کہ غصّے میں چال اکثر الٹی ہی پڑتی ہے ہاں جب جیتنے لگتے تو اس طرح خوش ہوتے، ہنستے بچوں کی طرح کھکھلا کر۔ تفریح کے طور پر یہی دو شوق غالبًا اس زمانے کے باقی رہے جب تک وہ دیوبند نہیں گئے تھے۔

چلے گئے وہ ۔ دلّی والے۔ مرتے مرگئے دلّی نہ چھوڑی

کون کون گیا۔ مفتی کفایت اللہ گئے، بڑے امام صاحب سید احمد صاحب گئے، مولوی احمد سعید گئے۔ صرف مذہب سے متعلق کچھ بزرگوں کا نام لیا۔ کیا کروں، دل کچھ ایسا ہے کہ ہر نئے گھاؤ پر پرانے داغ تازہ ہو جاتے ہیں۔

Marfat.com

تنویر احمد علوی

مولانا شرف الحق دہلوی

میں نے مولانا شرف الحق کو کبھی نہیں دیکھا دیکھتا بھی کیسے میرے دہلی آنے سے ربع صدی بیشتر مولانا دنیا سے رخصت ہو چکے تھے دہلی میں اب بھی ایسے بہت سے لوگ ضرور ہونگے جنھوں نے مولانا کو چلتے پھرتے اور بات چیت کرتے دیکھا ہوگا ایسے بھی کچھ لوگ ہو سکتے ہیں جنھوں نے ان مذہبی جلسوں اور مناظروں کو بھی دیکھا ہو، مولانا جن کے مرد میدان بلکہ شیر نیستاں تھے اور اسی نسبت سے خادم الدین اور محمدی کہلاتے تھے۔

میری نظر میں تو مولانا کا وہ چہرہ مہرہ ہے جو ان کے صاجزادے مولانا امداد صابری کی گفتگو کے پس منظر سے ابھرتا ہے یا پھر داستانِ شرف میں (جو میری معلومات کا ماخذ ہے) ان کی وہ تصویر ہے جو گویا پڑی منھ سے بول رہی ہے۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں جو ہمہ وقت جیسے کچھ دیکھتی اور سوچتی رہتی تھیں، نیم خمیدہ اور کچھ کچھ گھنیری بھنویں بلند پیشانی اس پر سفید براق عمامہ جس کا پھینٹا کانوں کے بالائی کناروں کو چھوتا ہوا گذرتا تھا بائیں کان کی طرف سے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر آتا ہوا شملہ۔

Marfat.com

سرخ وسفید رنگ شرعی وضع کی نورانی داڑھی پیوستہ لب جو غیر معمولی عزم وارادہ کی ترجمانی کرتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ چوڑا چکلا سینہ اچھا خاصہ بھاری بھرکم جسم نیچا کرتا شرعی پائے جامہ جو ہمیشہ ٹخنوں سے اونچا رہتا تھا نری کی مضبوط گھٹیلی جوتی نکلتا ہوا قد' کرتے پر کبھی بنڈی (جسے صدری بھی کہتے تھے) اور خاص خاص موقعوں پر اس پر آراستہ سنہری کناری کا جبہ غرض کہ اپنی قدیمانہ وضع اور مولویانہ شان کے لحاظ سے بڑی رعب داب والی شخصیت تھے۔

جوانی میں تیز تیز چلتے اور زور زور بولتے تھے عمر کے آخری زمانے تک آواز بقول مولانا امداد صابری بڑی گرجدار تھی عصا نما ایک بڑی لمبی چوڑی بینت جو ساری صفت دشمنان حق کے لیے عصائے موسوی کا کام دیتا تھا' اور بڑھاپے میں وہی عصائے پیری کے طور پر بھی کام آیا۔

لہجہ میں ایک گونہ قطعیت اور عالمانہ درشتی موجود تھی جلسوں میں تقریر کرتے کرتے یہ عادت پڑ گئی ہوگی ــــ اور پھر اس زمانے میں ہمارے معاشرہ اور تہذیبی ماحول کا جو رنگ ڈھنگ تھا اس میں گفتگو کا یہ سلیقہ طریقہ بُرا نہیں سمجھا جاتا تھا ویسے مولانا بڑے خوش اخلاق تھے لیکن جلالی مشہور تھے۔ یوں بھی شیخ جلال الدین صدیقی کے فرزند ارجمند تھے۔

محلہ کے لڑکے بالے ان سے بہت ڈرتے تھے اور اُن کو آتے دیکھ کر اِدھر اُدھر بھاگ جاتے اور پاس پڑوس کے گھروں میں چھپ جاتے کسی کو اگر دنگا مشتی کرتے دیکھتے تو بری طرح دھمکا دیتے اور کبھی کبھار ایک آدھ کے مار بھی دیتے تھے مگر کسی کو یہ جرأت نہ ہوتی کہ گھر جا کر شکایت کرے اور اگر چھٹے چھ ماہے کوئی بچہ ماں باپ کے لاڈ پیار کے بھروسے اور عزیزوں کی حمایت کے خیال سے روتا ہوا گھر جاتا اور شکایت کرتا تو یہی جواب پاتا

Marfat.com

مولانا نے ٹھیک کیا، وہ محلہ کے بڑے تھے اور بڑوں کو یہ حق ہوتا ہے۔

مولانا شرف الحق کے والد قاری جلال الدین بڑے دین دار خدا ترس اور قناعت پسند بزرگ تھے اپنے خاندانی پیشے کے مطابق جفت فروشی کی دکان کرتے تھے جامع مسجد کی طرف چاوڑی بازار کے نکڑ پر جہاں اب جامع ہوٹل ہے، وہیں ان کی دکان تھی۔ صبح سویرے اٹھتے نماز وظیفہ اور ناشتے سے فارغ ہو کر دکان پر جاتے کوئی گاہک آتا تو اس کے پیر کے نمبر کے مطابق بتلا دیتے کہ دیکھو فلاں جگہ سے نکال لو یا اٹھا لو جوتی ٹھیک آتی تو پیسے طے ہو جاتے اور بسم اللہ کر کے رکھ لیتے چار پانچ گاہکوں کے بعد دکان بند کر کے گھر کی طرف رخ کرتے۔ سودا سلف خرید تے اور گھر پہنچ کر خدا کا شکر ادا کرتے۔ قاری جلال الدین کے تعلقات اپنوں بیگانوں سے بڑے شگفتہ تھے، صبر و شکر کی زندگی گذارتے تھے۔ صبح سے شام تک گاہکوں کا انتظار کبھی نہ کرتے تھے پیسے سے محبت نہ تھی جو کچھ کماتے اپنوں اور دوسروں پر خرچ کر ڈالتے۔ وضع کے پابند تھے سستے زمانے اور اچھے لوگ تھے پیسے سے زیادہ انسان کی قدر تھی۔ برادری کے باہر بھی سب سے برابری کا تعلق رکھتے۔ امام جامع مسجد محمد میاں صاحب سے دوستانہ مراسم تھے۔

قاری جلال الدین کے پیکر میں ایک مجاہدانہ روح تھی جس نے بے قرار کیا تو ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف بادشاہ کے ہمدرد اور بعض امور میں معاون رہے قسمت اچھی تھی فتح دہلی کے بعد انگریزوں کے مظالم کا شکار ہونے سے بچ گئے پرانے قلعے میں جا کر چھپ گئے تھے اور کافی دنوں تک وہیں گوشہ گیر وزاویہ نشیں رہے۔

اس واقعہ کے پورے دس برس کے بعد قاری جلال الدین کے یہاں مولانا شرف الحق کی سنہ ۱۸۶۷ء میں پیدائش ہوئی (رجب ۱۲۸۳ھ کے

مطابق سمجھنا چاہیئے۔)

بچپن ہی سے بہت شوخ و شنگ اور بڑے طباع تھے۔ بات بات کی نقل کرتے تھے۔ مولانا نے بتلایا ان کے والد قاری جلال الدین کا ایک دوست جو شہر کا کوئی پولیس افسر تھا ان سے ملنے آیا کسی وجہ سے لنگڑا لنگڑا کر چل رہا تھا یہ کوئی تین چار برس کے رہے ہونگے اسے دیکھ کر خود بھی اس کی نقل کرنے لگے والد صاحب نے دیکھا تو ڈانٹا اور مارنے کو دوڑے یہ بھاگے تو خود اس آفیسر نے ان کو گود میں اٹھالیا اور پیار کیا۔

آپ کی والدہ مولوی رحیم بخش صاحب سے بیعت تھیں اور وقتاً فوقتاً اپنے پیر روشن ضمیر کے ہاں اظہار عقیدت کے طور پر حاضر ہوا کرتی تھیں ایک مرتبہ انھوں نے اپنے بیٹے کے لیے دعا کرائی تو مولوی صاحب نے فرمایا کہ بچے کی پرورش کی طرف خاص دھیان دیتی رہو اور ہاں دیکھو صبح شام کسی کے ہاتھ بچے کو میرے پاس بھیجدیا کرو۔

چار پانچ برس تک برابر اس حاضری کا سلسلہ جاری رکھا اس کے بعد ابتدائی تعلیم کا مرحلہ پیش آیا تو مولوی رحیم بخش ہی کی شاگردی اختیار کی زیادہ وقت ان کی خدمت میں بسر ہونے لگا۔

مولوی رحیم بخش صاحب پنجاب کے رہنے والے تھے نہایت ہی نیک طینت اور پاک باطن انسان تھے درگاہ ابوالخیر میں قیام تھا۔ ۱۲۸۳ھ میں انتقال کیا "الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا ھم یحزنون" آپ کی تاریخ وفات ہے۔

مولانا شرف الحق نے حالت صبا ہی میں مولوی رحیم بخش کے معتقد خاص پنڈت درگا پرشاد سے کچھ ہندی و سنسکرت سیکھی ان زبان سے واقفیت آگے چل کر بہت کام آئی۔

سنہ ۱۸۷۷ء میں اینگلو عربک اسکول میں حصول تعلیم کے لیے داخلہ لیا

جن مضامین کو انتخاب کیا ان میں انگریزی بھی شامل تھی اس میں بہت اچھے نشانات بھی پائے سنہ ۱۸۸۱ء میں مولانا حالی سے انھیں بڑی عقیدت تھی جو اینگلو عربک اسکول کے مدرسین میں تھے۔ فارسی پڑھی مولانا حالی کے بیے کہا کرتے تھے کہ جب انھیں کسی طالب علم پر غصہ آتا تھا تو اسے کودن کہا کرتے تھے جو انتہائی غصہ کی حالت میں مولانا حالی کا تکیہ کلام ہوتا تھا۔

سنہ ۱۸۸۴ء میں مدرسہ فتحپوری کے طالب علم کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی کے امتحان منشی فاضل میں بیٹھے اور جیسا کہ ان کی سوانح سے معلوم ہوتا ہے تمام پنجاب میں اول آئے۔ منشی فاضل کا امتحان اس طرح نشانات (ڈسٹنکشن مارکس) امتیاز کے ساتھ پاس کر کے عربی درسیات کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں بھی اس انہماک اور شوق و شغف کا اظہار کیا۔

یہ وہ دور تھا کہ اشاعت اور تبلیغ اسلام کے بیے مناظروں سے دلچسپی اور اس نوع کے مذہبی معرکوں میں شرکت کا شوق عام تھا مولانا کے دل میں بھی اس کے بیے ایک لگاؤ اور لگن پیدا ہوا وہ ایسی مجالس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے دھیرے دھیرے پادریوں سے مناظرے کا شغل بڑھ گیا لہذا اس کام میں کافی وقت صرف ہونے کی وجہ سے باقاعدہ حصول تعلیم میں فرق آجانے کا اندیشہ سا ہوا تو مولانا حالی نے آپ کو مشورہ دیا کہ پہلے تعلیم درسیات کی تکمیل کرو اس کے بعد مناظروں میں الجھنا زیادہ مناسب ہوگا۔

چنانچہ مولانا شرف الحق نے اپنے استاد حالی الطاف حسین کے مشورہ پر دہلی کو خیرباد کہا اور اس وقت کے مدرسہ دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا وہاں عربی کی ثانوی اور اونچے درجات کی کتابیں پڑھیں جب دورۂ حدیث کا وقت آیا تو مولانا یعقوب علی نانوتوی اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی سے پڑھیں۔

Marfat.com

مولانا رشید احمد گنگوہی سے دورۂ حدیث کی سند حاصل کرنے اور ان کی نگاہ رشد و ہدایت سے فیض پانے کے لیے گنگوہ شریف ضلع سہارنپور کا رخ کیا۔

اُس زمانے میں مولانا رشید احمد گنگوہی کے علم و فضل کا بہت چرچا تھا آپ سے بیعت کرنے اور فیضان علم حاصل کرنے کے لیے دور دور سے لوگ کھنچے چلے آتے تھے خصوصیت کے ساتھ کتب احادیث کے اسباق آپ کے ہاں بقول مولانا امداد صابری " بڑے معرکے کے ہوتے تھے"۔

گنگوہ کے زمانہ قیام میں حضرت مولانا رشید احمد سے نہ صرف یہ کہ دورۂ حدیث کی سند پائی روحانی طور پر رشتۂ ارادت بھی استوار کیا۔ مولانا رشید احمد کو بھی اپنے اس مجاہدانہ روح کے ساتھ زندگی گذارنے والے شاگرد سے بہت محبت تھی اور جب انھیں دہلی خط لکھتے تھے تو بڑی شفقت سے یاد فرماتے تھے۔ اپنے وقت کے جلیل القدر اساتذہ اور علمائے عربی درسیات اور دورہ حدیث کی تکمیل کر کے۔

فن مناظرہ کی ضروریات اور تقاضوں کے پیشِ نظر (جو زندگی بھر مولانا کا خاص فن اور میدان فکر عمل رہا) مولانا نے بروایت داستان شرف عبرانی زبانیں بھی سیکھنا چاہی قدرت نے اس کے لیے بھی ایک عجیب موقع فراہم کیا۔ ایک یہودی عالم حکیم عبدالحمید خاں برادر والا حکیم اجمل خاں کے زیر علاج تھا آپ نے اس سے یہ زبان سیکھی جس کے لیے اس نے آپ کو تحریری سند دی جو عبرانی زبان میں ہے جس کے نیچے اس کا اردو ترجمہ حکیم اجمل خاں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے تاکہ سند رہے یہ ترجمہ حکیم اجمل خاں کے دستخطوں سے مزین ہے اور اس کے نیچے تصدیقی دستخط خود اس یہودی عالم کے ہیں۔

Marfat.com

مولانا کے امتیازات میں ایک بات یہ بھی ہے کہ دیوبند میں ان کے احباب اور اس کے ساتھیوں میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی تھے۔ یوں بھی دیکھا جائے تو شرف واشرف میں کتنی قربت (اور کتنا سا فرق ہے) دونوں نے اس زمانہ میں چھپنے والی روداد دارالعلوم کے مطابق اپنے اعلیٰ نشانات کے باعث انعام پائے اور اپنے ہم چشموں میں امتیاز حاصل کیا۔

اس طرح عربی فارسی وغیرہ زبانوں میں اعلا تعلیم کی تحصیل وتکمیل کے بعد آپ پورے ذوق وشوق اور جذب وانہماک کے ساتھ مناظروں کی طرف آنا چاہتے تھے مگر طبیعت کی احتیاط اور ذمہ داری کے تقاضوں نے روکا اور آپ نے اس فن کے امام الاول مولانا رحمتہ اللہ کیرانوی سے استفادہ واجازت کے لیے سفر حج بیت اللہ کا ارادہ کیا زیارت حرمین الشریفین اور حضرت مولانا رحمتہ اللہ علیہ خدمت بابرکت وسعادت حج سے بہرہ یاب ہوئے. آپ کا یہ سفر اب سے ایک صدی اور ایک سال پیشتر سنہ $\frac{۱۳۰۵}{۱۸۸۸}$ ہجری کا واقعہ ہے۔

تین ماہ تک شب وروز حضرت رحمتہ اللہ کی خدمت بابرکت میں حاضر اور آپ کے خاص مہمان رہے مولانا رحمتہ اللہ نے تین بار سفر حج کیا اور تینوں بار اپنا سفرنامہ لکھا یہ سفر آپ نے جس عشق وعقیدت کے ساتھ کیا اس کا اظہار بھی ایک ایک بات سے ہوتا ہے اور اس ضمن میں جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ مولانا نے ان وقوعات سے متعلق روزنامچے تیار کیے ہونگے۔

واقعات کے بیان جہاں بزرگان دین بالخصوص مولانا رحمتہ اللہ اور حضرت حاجی صاحب سے آپ کی ارادت وعقیدت کا ذکر ملتا ہے وہیں جگہ جگہ ان دشواریوں اور شدید وقتوں کا بھی ذکر ہے جو بدوٗں حمالوں اور

Marfat.com

قزلطینوں کی بدنیتی بدمعاملگی اورقدم قدم پر چوروں کے خوف کی وجہ سے پیش آئیں یہ بدّو اور حمال حاجیوں کو طرح طرح سے تنگ کرتے تھے اور موقع پاکر لوٹ لیتے تھے اس ضمن میں ایک عورت کے چوروں کے ہاتھوں قتل ہوجانے کا واقعہ بھی لکھا ہے۔

میاں داد خاں سیاح سے بھی اس سفر میں مولانا کی ملاقات ہوئی تھی مولانا کے ان سفرناموں سے اس عہد کے تہذیبی و تاریخی حالات کا بھی علم ہوتا ہے ان میں ایک دل چسپ منظرنامہ عربوں کے مشاعرے یاالکاس کے میلہ میں ان کے شاعرانہ مقابلوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔

وہاں شعرائے عرب کے مشاعرے مشہور تھے اُن کا ذکر سنا تو معلوم ہوا آج ہونگے۔ وہاں گیا اگرچہ کچھ سمجھ میں نہ آیا لیکن ان کی نشست برخاست دیکھی فی البدیہہ وہی بدو جو ہمارے اونٹوں کے حمال ہوتے تھے ایسے اشعار کہتے تھے کہ سمجھنے والے پریشان تھے وہ دو گروہ ہوجاتے تھے ہر ایک کا مجمع جُدا جُدا آمنے سامنے کھڑا ہوتا اور نالیا بجابجا کر اشعار پڑھتے تھے ہر ایک اپنے بڑوں اور اپنی قوم کی تعریف میں اشعار کہتے تھے طریقہ یہ تھا کہ تمام مجمع میں سے ایک شعر کہتا اور اس کے تمام ساتھی اسے دہراتے تھے اس وقت تک جب تک دوسرے جانب سے کوئی شعر نہ کہا جاتا تھا (۴۵۲)

مولانا رحمتہ اللہ نے اس فن سے آپ کی خصوصی دل چسپی اور اس سلسلے میں آپ کی ذاتی قابلیت اور علمی دسترس کو دیکھتے ہوئے مناظرۂ عام کی اجازت دی اور مکہ معظمہ سے آپ کے رخصت ہوتے وقت فن مناظرہ سے متعلق اپنی خاص تصانیف، اظہارالحق وازالۃ الشکوک بزبان عربی و ترجمہ فرانسیسی بطور تبرک وعطیہ رحمت آپ کو مرحمت فرمائیں۔ ایک خاص تحفہ وہ لباس پائجامہ تھا جو سلطان عبدالحمید پایۂ سربین حضرت مولانا رحمتہ اللہ کو بطور خلعت خاص عنایت فرمایا تھا۔

Marfat.com

ان سلطانی برکات علمی و برکات کے ماسوا آپ نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی مدنی رحمۃ اللہ سے بھی علوم باطنی کی مزید تحصیل و تکمیل کی راہ طے کی حاجی صاحب سے باقاعدہ بیعت ہوتے جو مولانا گنگوہی کے بھی مرشد تھے حاجی صاحب نے اہل تصوف کی روایت کے مطابق آپ کو خرقہ عنایت فرمایا اور سلاسل اربعہ میں بیعت کی اجازت دی اور اس ضمن میں سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں خصوصیت کے ساتھ مجاز قرار دیا کہ یہی آپ کے مزاج زندگی کا طریقہ امتیاز ہے

حضرت مولانا شرف الحق کو اپنے ان دونوں مرشدین اور صابری سلسلہ سے اس درجہ عقیدت تھی کہ اپنے اکلوتے صاحب زادے کا نام امدادالرشید صابری رکھا۔ مولانا امداد صابری کی ایک بڑی بہن تھی اس کا نام امت الرشید تھا۔

حضرت مولانا شرف الحق کی دو شادیاں ہوئیں پہلی شادی آپ نے اپنی برادری ہی کی ان محترمہ سے ایک صاحب زادی امت البصر پیدا ہوئیں پہلی زوجہ کی وفات کے بعد آپ نے مولانا رشید احمد گنگوہی کے خلیفہ سید شجاعت علی کی دختر نیک اختر اللہ بندی سے نکاح کیا ان سے دو صاحب زادیاں اور ایک بیٹے یعنی مولانا امداد صابری پیدا ہوئے

مولانا کی پوری زندگی اعلا کلمۃ الحق تبلیغ دین اور اشاعت اسلام میں گزری جس کے لیے آپ مسلسل سفر میں رہتے تھے گاؤں گاؤں قصبہ قصبہ اور شہر شہر مذہبی تبلیغ اور اشاعت دین کی لگن میں مارے مارے پھرتے رہے۔ نہ کھانے پینے کی خبر نہ راحت و آرام کا خیال بس ایک دھن تھی جو ادھر سے ادھر لیے پھرتی تھی۔

Marfat.com

پھرتے تھے دشت دوانے کدھر گئے
وہ عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

اکثر تو ایسا ہوتا تھا کہ زاد راہ کے لیے کچھ موجود نہ ہوتا تھا چنے لے کر ایک تھیلے میں بھر لیتے تھے جب بہت بھوک لگتی تو ایک مٹھی چنے چبا کر پانی پی لیتے اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے راہ حق میں آگے چل پڑتے۔

دو بار حج کیا اور بارگاہ رسالت مآب میں حاضری کی ابدی سعادت پائی آخری عمر میں کافی ضعیف ہو گئے تھے مسلسل سفر نے اعضا و عزم کو تھکا دیا تھا آخر ایک طویل عمر پا کر جنوری ۱۹۲۶ء میں سفر آخرت اختیار فرمایا ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اپنے پیچھے اپنی اولاد کے ماسوا ایک قیمتی کتب خانہ چھوڑا جو ان کے بیٹے کے لیے ان کا سب سے بیش بہا ترکہ تھا۔

رحمت حق بروح پاش باد

داستانِ شرف کے ماخذ کی فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا شرف الحق کی اولادِ معنوی میں مندرجہ کتب اور مسودات موجود ہیں دافع البیان، دو کتابچوں پر مشتمل ہے بروف لامعہ ستیارتھ پرکاش کے جواب میں لکھا ہوا رسالہ ہے رجسٹر یاد داشت حوالہ جات (قلمی) اس میں ایسے علمی حوالے موجود ہیں جو مناظروں میں گویا ریفرنس کے طور پر کام آئے۔ بیاض لغت اس بیاض میں تقریباً ڈھائی سو لغتیں جمع کی گئی ہیں۔ قلمی روزنامچہ۔ تقریرات مولانا رشید احمد گنگوہی۔ قلمی۔ مزید براں بہت سے علمی رسالوں کی نقل بھی آپ سے یادگار ہے۔ رسالہ علم طبعیان۔ منصب اکابر۔ اس کے علاوہ مباحثہ دہلی و کیفیت۔ مسیح اسلوب۔ انگریزی اردو مباحثہ پونہ۔ مباحثہ غازی پور وغیرہ (۹۸)

Marfat.com

خواجہ حسن ثانی نظامی

مرزا سہراب شاہ مجّی

مجّی مرحوم آخری مغل تاجدار حضرت بہادر شاہ ظفر کی یادگار تھے۔ مگر کسے یقین آئے گا کہ ان کی عمر ہنڈیا ڈوئی کرتے گذری۔ لال قلعے کا ہونے والا مالک دلّی شہر میں باورچی بن کر رہا۔ ان کے باپ مرزا ولایت شاہ حضرت ظفر کے ولی عہد کے پوتے تھے۔ ولی عہد باپ کے سامنے اللہ کو پیارے ہوئے۔ اس لیے ان کی اولاد اس نام چارے کے راج پاٹ کی امیدوار بھی نہ بن سکی جو عظیم مغلوں کا مقدر رہ گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں مغل سلطنت کا ٹمٹماتا چراغ بجھا تو اس خاندان کے لیے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ یہ لوگ غدر کے بعد بستی حضرت نظام الدین میں اٹھ آئے تھے اور افلاس کی زندگی گزارتے تھے۔ آمدنی کے ذرائع محدود اور مرزا ولایت شاہ کو افیون کی لت۔ بزرگوں کا اثاثہ کب کا ٹھکانے لگ چکا تھا۔ بس اللہ ہی تھا جو دن کٹ رہے تھے۔ اس حال میں ان کو "صاحب عالم" وہ لوگ بھی نہ کہتے تھے جو ان کے نسب سے واقف تھے۔ چنانچہ وہ جیتے جی "مرزا جی" ہی پکارے گئے۔ اور ان کے لڑکے مرزا سہراب شاہ تو مرزا جی بھی نہ رہے بگڑ کر مجّی بن گئے۔ کبھی کبھار کوئی وضعداری کا مارا انھیں مرزا جی کہہ کر مخاطب کرتا تو مجّی کھل اٹھتے۔

میانہ قد۔ دوہرا بدن، کالا بھٹ رنگ، موٹی ناک، لال لال آنکھیں، پھیلا ہوا دہانہ ۔ جھکی ہوئی مغلئی موچھوں کے سوا وہ اپنے چہرے مہرے سے مغل بالکل نہ لگتے تھے مگر ان کے حسب نسب پر شبہ کبھی نہیں کیا گیا۔ کیا بھی کیسے جاتا۔ دنیا جانتی تھی کہ محلسرا ابن خبر سے کرہ قاف کی پریاں بھی تھیں اور افریقہ کی حبشنیں بھی۔ پھر کیا عجب تھا کہ اوپر کی کسی پشت میں مجی کا ننھیالی رشتہ حبشہ سے رہا ہو اور اُس نے رنگ اب دکھایا ہو۔

مجی کو اپنے بزرگوں سے اور کوئی ورثہ ملا ہو یا نہ ملا ہو۔ زندگی کی اچھی چیزوں کی قدر کرنا اور ان سے لطف اٹھانا انھیں خوب آتا تھا۔ شعروسخن سے بھی بڑی دل چسپی تھی۔ افسوس ان کا کوئی شعر محفوظ نہیں رہ سکا۔ پڑھے لکھے نام کو نہ تھے۔ مگر شعر پڑھنے اور اس سے زیادہ شعر سننے اور داد دینے کا شوق تھا۔ لوگ ان کی غزلوں کو لے پالک بتایا کرتے تھے۔ لیکن مجی نے کبھی اس پر ملال کا اظہار نہیں کیا۔ ناچ گانے کے بھی بڑے رسیا تھے۔ ناممکن تھا کہ پاس پڑوس میں کہیں مجرا ہو یا سانگ ہو اور مجی صاف ستھرا کرتا پاجامہ واسکٹ پہنے اور دلی والوں کی گول ٹوپی اوڑھے وہاں موجود نہ ہوں ۔ سینما آیا تو اس کی خاطر وہ دس دس میل پیدل سفر کرتے لگے کہ اسی زمانے میں رات کے وقت بستی حضرت نظام الدین اور دہلی شہر کے درمیان کوئی عام سواری نہ ملتی تھی۔

مجّی نے مزاج لڑکپن سے عاشقانہ پایا تھا۔ ابھی ان کی پہاڑدا[1] کھیلنے کی

---

[1] پہاڑدا ایک دیہاتی کھیل تھا اور بجلی آنے سے پہلے صرف اندھیری راتوں میں کھیلا جاتا تھا۔ دو دو لڑکے اندھیرے میں الگ الگ آبادی سے دور نکل جاتے۔ اور ایک پارٹی دوسرے کو ڈھونڈتی۔ اور ہر پارٹی کے لیے یہ ضروری ہوتا کہ پہیلی کے اتنے پتنے کی طرح تھوڑے تھوڑے وقفے اور فاصلے سے باآواز بلند (بقیہ اگلے صفحے پر)

Marfat.com

عمر تھی۔ اور مسیں بھی پوری طرح نہ بھیگی تھیں کہ انھوں نے فقیر خاندان کی ایک نوجوان بیوہ سے پینگیں بڑھانی شروع کیں۔ دور وہ تھا کہ بستی اور محلے کے بڑے متفقہ اور مشترکہ طور پر سب کے بڑے سمجھے جاتے تھے۔ ان کے دل میں سب کا درد ہوتا تھا۔ اور سب کی وہ خبر خبر رکھتے تھے۔ چنانچہ مجی کا کورٹ شپ بھی زیادہ دن تک ان کی عقابی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکا۔ اور بستی کے چند بزرگوں نے کسی سہانے وقت انھیں محبوبہ سمیت پکڑ بلوایا۔ زنانے مکان میں محبوبہ پر کیا بیتی یہ تو کم لوگوں کو معلوم ہوا۔ البتہ مردانے میں مجّی کے مرغا بننے کا تماشا بہت سے لوگوں نے دیکھا۔ مجّی کی قسمت اچھی تھی کہ اُدھر سے حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کا گزر ہو گیا۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء پہ کتابیں ہی نہیں لکھی تھیں۔ مصیبت زدہ شاہی خاندان کی امداد میں بھی پیش پیش رہے تھے۔ خواجہ صاحب نے پہچان لیا کہ جس لڑکے کو مرغا بنایا گیا ہے وہ مرزا ولایت شاہ کا بیٹا اور حضرت بہادر شاہ ظفر کا پوتا ہے۔ انھوں نے مجّی کے مقدمے میں فوری مداخلت کی اور زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ مجّی اپنی محبوبہ سکینہ کو نکاحتاً بیوی بنائے حیران پریشان کھڑے تھے کہ اس نیک بخت کو کہاں لیجا کر رکھوں اور کس گھر سے کھلاؤں۔ یہ افتاد اور مشکل تھی۔ خواجہ صاحب ہی نے آسان کی اور اپنے گھر کی ایک کوٹھڑی کو دل پھینک شہزادے کا حجلۂ عروسی بنوا دیا۔ دونوں وقت کھانا بھی دولہا دلہن کے لیے جانے لگا۔ رفتہ رفتہ مجّی نے گھر کا سودا سلف لانے کا کام سنبھالیا جس کا معاوضہ ان کو اپنے حق سے زیادہ ملتا تھا۔ مگر یہ مجّی کی سعادت مندی تھی

(بقیہ: پچھلے صفحے کا) پہاڑدا کی آواز لگائے۔ اور دوسری پارٹی اس آواز پر اس کو پکڑنے کے لیے اندھیرے ہی میں دوڑے۔ سنسان زمانے کی سنسان راتوں کا یہ کھیل جو راجی داری چاہتا تھا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے لڑکے ہی کھیلا کرتے تھے۔

Marfat.com

کہ انھوں نے بیوی سے روٹی سالن پکانا سیکھ لیا اور معمولی گھریلو ملازم سے ایک درجہ ترقی کرکے باورچی اور خانساماں بن گئے۔ اس سے زیادہ کی ان کو ہوس بھی نہ تھی۔ چنانچہ باقی زندگی کھانا پکاتے، میز سجاتے گزاردی۔

حضرت خواجہ نے مجّی کو آگے بڑھانے کی بہت کوشش کی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ترقی کا حصّہ ان کے نامور اجداد اپنی اولاد کی تقدیر کا بھی پیشگی وصول کرچکے تھے۔ اور اب مجّی کی قسمت میں کچھ بھی نہ تھا جسے وہ حاصل کرتے۔ خواجہ صاحب انھیں حیدرآباد لے گئے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد نے خواجہ صاحب کی دعوت کی اور حیدرآباد کے سارے اکابر اور امراء کو جمع کیا تو خواجہ صاحب نے مجّی کو میز پر اپنے برابر بٹھایا۔ حیدرآباد کے نوابی ماحول میں یہ منظر قیامت سے کم نہ تھا۔ مہاراجہ ضبط نہ کرسکے اور پوچھ ہی بیٹھے کہ آپ کے برابر جو شخص بیٹھا ہے۔ کیا آپ کا ملازم ہے؟ خواجہ صاحب نے مختصر سا جواب دیا کہ جی ہاں میرا باورچی ہے۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے پھر کہا کہ اس کو پاس بٹھانے میں کوئی مصلحت ہوگی۔ خواجہ صاحب اس دفعہ بھی ایک فقرے کا جواب دے کر چپکے ہوگئے کہ "جی ہاں مصلحت ہے"! تیسری دفعہ جب مہاراجہ نے اس مصلحت کی تفصیل پوچھی تو خواجہ صاحب کھڑے ہوگئے اور میز پر بیٹھنے والے امراء و رؤسا کو مہاراج سے اپنی گفتگو کا حال سنایا اور کہا کہ اپنے باورچی کو پاس بٹھانے کی مصلحت سے میں صرف اپنے میزبان ہی کو نہیں آپ سب کو بھی آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ وہ شخص ہے کہ اگر اس کا اچھا وقت ہوتا تو یہ لال قلعہ دہلی کے تخت کو زینت بخشتا۔ اور مہاراجہ بہادر تو خیر ایک وزیر ہیں۔ ان کے ولی نعمت اعلا حضرت نظام دکن دہلی جاتے تو اس کے ایک صوبیدار کی حیثیت ہی سے جاتے۔ اور اس کی مرضی تھی کہ انھیں شرف باریابی بخشتا یا نہ بخشتا۔ لیکن آج زمانے کے

Marfat.com

انقلاب نے اسے ایک معمولی باورچی بنا دیا ہے۔ اور سب کی پیشانیوں پر بل ہیں کہ ایک معمولی نوکر فلاں جنگ اور فلاں درلہ کے پاس کیوں بٹھایا گیا۔

حیدر آباد کے نوابوں کو تو اس واقعے سے یقیناً عبرت ہوئی ہوگی۔ مگر مجی ہر عبرت اور آج اور کل کے ہر قصے سے بے نیاز تھے۔ انھیں بالکل یاد نہیں آتا تھا کہ وہ کیا تھے اور کیا ہوگئے۔ ایک دوسرا واقعہ ہے کہ مشہور انگریز مصنف ایسٹ براؤن دہلی آیا تو خواجہ حسن نظامی صاحب سے بھی ملا۔ اور ان سے ۱۸۵۷ء کی کوئی ایسی کہانی سننے کی فرمائش کی جو چھپی نہ ہو اور جس کو وہ انگریزی میں لکھ سکے۔ خواجہ صاحب نے اس انگریز مصنف سے کہا کہ آپ کہانی صرف سننا چاہیں گے یا اس کو لکھنا بھی پسند کریں گے؟ وہ سراپا اشتیاق بن کر بولا کہ کیا آپ کہانی دکھا بھی سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھوں گا۔ خواجہ صاحب نے فوراً مجیّ! کہہ کر آواز دی اور ایک آدمی آٹا گوندھتے گوندھتے سامنے آکھڑا ہوا۔ خواجہ صاحب نے مجیّ سے کہا کہ صاحب کو سلام کرو اور صاحب سے تعارف کرایا۔ یہ میرا باورچی ہے!

صاحب نے حیرت سے پوچھا کہ آپ نے تو کہانی دکھانے کو کہا تھا۔ آپ مجھے اپنے باورچی سے کیوں ملاتے ہیں؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔ خواجہ صاحب نے کہا ذرا صبر کیجیے۔ ابھی سمجھ میں آجائے گا۔ یہ باورچی ہی کہانی ہے ۔ یہ بہادر شاہ ظفر کا پوتا ہے۔ میں اس کو اس کے دادا کی قبر پر رنگون لے گیا۔ میں وہاں کھڑا روتا رہا۔ مگر اس نے نہ فاتحہ پڑھی نہ اس کی آنکھوں میں میں نے نمی دیکھی۔ جب مجھے وہاں رونے رونے بہت دیر ہوگئی تو یہ میرے قریب آیا اور رازداری سے کہنے لگا۔ میاں! میں نے سینما کا ٹکٹ لے لیا تھا۔ شو کا وقت جا رہا ہے۔ اگر اجازت ہو تو میں واپس چلا جاؤں! تو

Marfat.com

جناب مجھے یہی کہانی آپ کو دکھانی تھی کہ جو کام آپ کی توپیں اور بندوقیں اور سنگینیں نہ کر سکیں وہ آپ کے سینما نے کر دکھایا۔ اس شخص کو اپنی عظمت رفتہ کا احساس ہونا چاہیئے تھا۔ اس کی واپسی کے لیے اسے جدوجہد کرنی چاہیئے تھی۔ مگر اسے کچھ یاد نہیں رہا ہے۔ اس نے خود کو آپ کے سینما میں گم کر دیا ہے۔

انگریز مصنف کا تاثر جو کچھ بھی رہا ہو۔ لیکن حیرت اس پر ہوتی تھی بار بار جتاتے جانے کے باوجود مجی کو یاد نہ آتا تھا کہ وہ کیا ہیں؛ ان کا چھوٹا لڑکا مرزا حیدر شاہ میرا ہم عمر تھا۔ ہم ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ بچے اپنے اطراف ہونے والے واقعات کی نقل بھی کھیل کھیل میں کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ ہمارا ایک دل چسپ مشغلہ یہ تھا کہ اپنے گھر میں ہونے والی دعوتوں پارٹیوں کی نقل کیا کرتے۔ دفتر قائم کرتے جھوٹ موٹ اخبار نکالتے کتابیں چھاپتے۔ ممکن ہے خواجہ صاحب نے اپنے کسی اخبار نویس دوست کی مشکل آسان کرانے کے لیے اسی زمانے میں دہلی کے انگریز ڈپٹی کمشنر کی دعوت کی ہو۔ ہم لوگ اس کی نقل کر رہے تھے۔ کوئی بچہ خواجہ حسن نظامی بنا تھا۔ کوئی عزیز حسن بقائی۔ علیٰ ھذالقیاس مجّی کے لڑکے مرزا حیدر شاہ کے حصّے میں ڈپٹی کمشنر بننا آیا تھا۔ اور وہ میز کے صدر مقام پر بڑی تمکنات سے بیٹھے تھے۔ پارٹی زور شور سے جاری تھی کہ مجّی خدا معلوم کہاں سے آٹپکے۔ کچھ کہے سنے بغیر انھوں نے اپنے لڑکے حیدر کا کان پکڑا اور اتنے زور سے اُسے اوپر اٹھایا کہ وہ بے چارہ ایک آنکھ بند کیے دوسری میں اپنے سارے کرب کو سمیٹے اسپرنگ کی طرح کرسی سے اٹھتا چلا گیا۔ سب بچے کورس میں چیخے۔ مجی مجی کیا کرتے ہو۔ ان کا کان نہ پکڑو۔ یہ تو ڈپٹی کمشنر ہیں۔ مگر مجّی نے ایک نہ سنی اور اُس بے چارے کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ بچوں نے خواجہ صاحب سے فریاد کی۔ مجّی کی طلبی ہوئی مگر انھوں نے بہت

Marfat.com

کھسیا کر اور کسی قدر گلوگیر ہو کر اپنی صفائی میں بس یہ کہا کہ میاں! مجھے اچھا نہیں لگا کہ نوکر کا بچہ آقازادوں کا صدر بن کر بیٹھے۔

مجّی اپنی نوکری میں بڑے مگن رہتے تھے۔ ان کی ساری صلاحیتیں ایک اچھا نوکر بننے میں صرف ہو گئیں۔ کھانے پینے کے ذوق اور عادتوں کے سلسلے میں انھوں نے گھر کے ہر فرد اور روزمرّہ کے مہمانوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مثلاً انھیں معلوم تھا کہ کون کتنا پانی پیتا ہے۔ اس مناسبت سے وہ پانی کا کٹورہ یا گلاس سامنے رکھتے۔ مگر اس سلسلے میں کبھی کبھی ان کی ظرافت کا اظہار بھی ہوتا۔ ایک دفعہ علامہ اقبال یا اور کوئی معزز پنجابی مہمان دسترخوان پر تھے اور ان کے برابر ایک دھان پان لکھنوی تشریف فرما تھے۔ مجّی نے گھر کا سب سے بڑا تانبے کا کٹورہ پانی سے لبالب بھر کر لکھنوی مہمان کے سامنے رکھا اور ایک چھوٹا سا نازک بلوری گلاس بقدر بادہ پنجابی مہمان کو پیش کیا۔ دونوں مہمانوں نے اس مذاق سے لطف لیا اور مجّی کو داد دی۔ مگر مجّی اس طرح کا مذاق ہر ایک سے نہیں کرتے تھے۔ حفظ مراتب اور رکھ رکھاؤ ان کے مزاج کا حصّہ بن گئے تھے۔ مذاق مجّی اسی سے کرتے جس کو بے تکلف جانتے۔ خواجہ صاحب کے ایک ایسے ہی دوست ولی محمد مومن سابق چیف منسٹر ریاست جوناگڈھ تھے۔ مجّی کو معلوم تھا کہ وہ شیعہ ہیں۔ ان کو مجّی نے اس طرح چھیڑا کہ میزبان اور مہمان دونوں کی پلیٹوں میں روٹی کو چار چار ٹکڑے کر کے رکھا۔ مومن صاحب بڑے مزے کے آدمی تھے۔ فوراً سمجھ گئے اور خواجہ صاحب کی پلیٹ میں سے روٹی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھا اور مجّی کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھ کر بولے مرزا جی میرے تو پانچ پورے ہیں۔ اب آپ اپنے تین ادھوروں کو لیے بیٹھے رہیے۔

لال قلعے میں بیکاری کے مشغلے طرح طرح کے تھے انہی میں ایسے

Marfat.com

مقررہ فقروں کی ایجاد بھی ایک مشغلہ تھا جو خاص خاص موقعوں پر بولے جاتے تھے۔ بعض دفعہ، فقرے بامعنی اور بلیغ ہوا کرتے تھے اور بعض دفعہ بسمل۔ لال قلعے کی جھلکیاں دکھانے والوں نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ مجّی کی زبان پر بھی اس طرح کے فقرے اکثر آتے۔ خدا معلوم یہ انھوں نے اپنے بزرگوں سے سن رکھے تھے۔ یا خود ایجاد کیے تھے۔ مثلاً ان سے پانی مانگا جاتا تو جواب میں جی اچھا۔ بہت اچھا یا ابھی لاتا ہوں کہنے کی بجائے کہا کرتے " آنکھوں میں " اب اللہ جانے اس کا مطلب نین کٹورے ہوتا تھا۔ یا یہ بسروچشم کا ایجادِ بندہ قسم کا ترجمہ تھا۔ میری سمجھ اس وقت ایسی نہیں تھی کہ جرح کرکے اس کا اور بعض دوسرے فقروں کا مطلب ان سے پوچھتا۔

مجّی کو بے شمار کہانیاں یاد تھیں۔ شام ہوتے ہی گھر کے اور پڑوس کے بچے ان کے پاس باورچی خانے میں جمع ہو جاتے اور مجّی کی داستان گوئی کا آغاز ہوتا۔ بیڑی کے کش پر کش لیتے جاتے اور اگلے وقتوں کے بادشاہ زادوں اور بادشاہ زادیوں کی کہانیاں سناتے رہتے۔ ایک ایک کہانی کئی کئی نشستوں میں پوری ہوتی۔ جزیات بڑی تفصیل سے بیان کی جاتیں کھانے زیور اور لباس تو فہرست بنانے کے لائق ہوتے۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ انھوں نے مغل دربار غدر اور لال قلعے کا اپنی کہانیوں میں کبھی تذکرہ نہیں کیا۔ نہ کبھی ہم نے ان سے بہادر شاہ ظفر کا نام سنا حالانکہ یہ داستان بھی ان تک بزرگوں سے ضرور پہنچی ہوگی۔ شاید اس ذکر سے انھیں تکلیف ہوتی ہو اور وہ اُس آشیانے کا ذکر پسند نہ کرتے ہوں جس پر ابھی کل ہی بجلی گری تھی۔ ساری

Marfat.com

خود فراموشیوں کے باوجود یہ احساس عجیب احساس تھا اور اس سے عجیب تر احساس یہ تھا کہ آزادی کی جدوجہد اپنے عروج کو پہنچی اور اس کے فوراً بعد پاکستان کی تحریک شروع ہوئی تو مجّی گویا اپنے Hibernative اور ایک طویل نیند سے یکایک جاگ اٹھے۔ ہمارے ہاں اہم لوگوں کا میلا لگا رہتا تھا۔ مجّی ان سب سے اس موضوع پر گفتگو کرتے۔ انھیں اس وقت کے سیاسی رجحانات سے سخت تشویش تھی۔ اس کا اظہار وہ اکثر کرتے۔ شاید ان کی چھٹی حس ان کو بتا رہی ہو کہ پاکستان بن گیا تو انھیں بھی وہاں جانا پڑے گا۔ دلی پیاری کو چھوڑنا ہوگا۔ دلّی کے میلے ٹھیلے ان کو ایسے عزیز تھے کہ ان کی خاطر وہ کئی دفعہ نوکری تک چھوڑنے کو تیار ہو گئے۔ مہاراجہ کشن پرشاد والی دعوت نے انھیں حیدرآباد کے ایک وظیفہ سے نواز دیا تھا۔ جو انھیں ریاست کے زمانے تک ملتا رہا۔ ۱۹۴۸ء میں اپنی بیوی کے مجبور کرنے سے وہ پاکستان چلے گئے۔ وہاں ان کے دونوں لڑکوں مرزا سکندر شاہ اور مرزا حیدر شاہ کو غالباً چپراسی کی نوکریاں مل گئی تھیں۔ لیکن اپنے بچوں کی کمائی سے وہ اپنے آپ کو خوش اور مطمئن نہ رکھ سکے۔ ۱۹۵۹ء میں کراچی کے سفر کے وقت میں ان سے ملا تو خوب روئے کہتے تھے۔ مجھے دہلی لے چلو۔ میں دلّی جاکر مرنا چاہتا ہوں۔ بچوں کے پاس مجھے ہر طرح کا آرام ہے مگر چین اور راحت مجھے ایک لمحے کو بھی میسر نہیں آئے ہیں۔ دلّی کی جدائی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔

مجّی کو میں اپنے ساتھ دلّی لے آتا۔ لیکن پاسپورٹ کی پابندی رکاوٹ بن گئی۔ ان کی مٹی کراچی ہی کی تھی۔ اپنے پر دادا حضرت بہادر شاہ ظفر کی طرح مجی کو بھی کوئے یار میں دو گز زمین نہ مل سکی۔ ۱۹۶۱ء میں ان کی موت کی اطلاع پہنچی بھی تو تین مہینے بعد دلّی پہنچی۔ اور کوشش کے باوجود تاریخ انتقال معلوم نہ ہو سکی۔

سدا رہے نام اللہ کا۔

Marfat.com

اسلم پرویز

پچی

وہ جگت پچی تو نہیں تھیں لیکن محلّے کے جن دو چار گھروں میں وہ پچی کہلاتی تھیں ان میں ایک گھر ہمارا بھی تھا۔ پچی کا نام فصیح اردو میں تو محمدالنسا تھا لیکن خود اپنی زبان میں وہ اپنا نام ٹھہراؤ کے ساتھ ممّدنساں اور روانی میں ممّن نساں بتاتی تھیں۔ پڑھنے کے نام پر انھیں سوائے نماز کے اور کچھ نہ آتا تھا۔ ایسی صورت میں ہاتھ میں قلم پکڑنے کا بھی کیا سوال پیدا ہوتا ہے ہاں سینے پرونے میں انھیں وہ کمال حاصل تھا کہ اپنی سوئی کی نوک سے وہ کپڑے پر خطِ گلزار کے وہ نمونے پیش کر دیا کرتی تھیں جو بڑے بڑے خطّاط اور خوش نویس قلم کے قط سے نہیں کر سکتے۔ پچی نے لگ بھگ اسّی برس کی عمر پائی زندگی کی آدھی صدی انھوں نے ۱۹۴۷ء سے پہلے کی دِلّی میں گزاری اور آدھی سے کچھ کم سینتالیس کے بعد کی دلّی میں۔ پچی ان لوگوں میں تھیں جو اپنے زمانے کے علاوہ کسی اور زمانے میں نہ تو جینا پسند کرتے ہیں اور نہ جی ہی سکتے ہیں۔ اس لیے پچی نے بھی سینتالیس کے بعد کے اپنی زندگی کے پینتیس چالیس سال پرانی دلّی کے اُنھی محلّوں میں گزار دیے جہاں وقت بالکل اُسی طرح ٹھہرا ہوا ہے جس طرح

Marfat.com

سیلاب کے گزر جانے کے بعد سیلاب کا کچھ پانی آس پاس کے گڑھوں میں ٹھہرا رہ جاتا ہے۔ سینتالیس سے پہلے جب دلّی کی عورتیں تانگوں میں بیٹھ کر اور ان کے گرد موٹے موٹے پردے لپیٹ کر کوٹلے، نظام الدین، ہمایوں کے مقبرے، منصور کے مدرسے اور قطب صاحب کی سیر کو جاتی تھیں اور اولیا مسجد کے جھروکوں سے شمسی تالاب کا وہ نظّارہ دیکھتی تھیں جہاں تالاب کے بیچوں بیچ مٹکوں پر بیٹھا کوئی آدمی سنگھاڑوں کی بیل سے سنگھاڑے توڑ توڑ کر جمع کر رہا ہوتا تھا تو چچی بھی اُن عورتوں میں ایک ہوتی تھیں۔ لیکن سینتالیس کے بعد تو چچی بس ایک ہی بار فصیل کے باہر آئیں اور وہ بھی تب جب ہم اُنھیں دلّی دروازے کے باہر پہنچانے گئے تھے۔

معصوم قسم کی مذہبیت، پرانے رسم و رواج، تعویذ گنڈے، ٹونے ٹوٹکے، بدعتیں اور توہمات، چھل پیریوں اور جنّات کے قصّے یہی وہ فضا تھی جس میں چچی پیدا ہوئیں اور زندگی بھر وہ اسی فضا میں سانس لیتی رہیں۔

ہم نے جب سے ہوش سنبھالا چچی کو رانڈ ہی دیکھا۔ لیکن انھوں نے اپنا رنڈاپا جس کرّوفر سے گزارا اسے دیکھ کر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اگر کہیں ان کی جگہ ان کے میاں رنڈوے ہوگئے ہوتے تو شاید ایسی نہ گزار پاتے جیسی چچی گزار گئیں۔ چچی کے میاں اُن کی جان پہ چار لڑکیوں کو چھوڑ کر سینتالیس سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ جب تک اللہ بخشے وہ زندہ رہے چچی کو خوب عیش کرایا۔ کچہری میں منشی تھے اس لیے اس چھوٹی سی نوکری میں بھی پیسے کی خوب ریل پیل تھی۔ چچی کہا کرتی تھیں 'بوا کوئی کیا کسی کے نخرے اٹھائے گا جو ہمارے میاں نخرے اٹھا گئے'۔ لیکن چچی کا جو طمطراق، ہم نے دیکھا ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ

Marfat.com

نخرے چچی کے میاں نے شاید اتنے نہیں اٹھائے جتنے خود چچی نے ان سے اٹھوائے ہوں گے۔ پٹاری کے خرچے کے علاوہ اچھے سے اچھا کھانے اور بڑھیا سے بڑھیا پہننے کا شوق بھی چچی نے میاں کے جیتے جی، جی کھول کر پورا کیا۔ کچہری کی آمدنی برسات کے پانی کی طرح جیسے گھر میں چھم چھم برستی تھی ویسے ہی جھر جھر بہہ بھی جاتی تھی۔ اس لیے جب اچانک چچی کے میاں کا انتقال ہوا تو گھر میں چار معصوم بچّوں کے علاوہ باقی اللہ کا نام تھا۔ چچی کے پاس نہ تعلیم تھی اور نہ روپیا پیسا لیکن مفلس اور ان پڑھ لوگ جس عقیدے کے سہارے کڑی سے کڑی جھیل جاتے ہیں وہ ان کے پاس بھی تھا۔ یعنی یہ کہ جو لِکھّا ہے وہ پورا ہونا ہے۔ چچی شاید لوحِ محفوظ کی حقیقت سے تو واقف نہیں تھیں لیکن یہ فقرہ البتّہ ان کی گفتگو میں تکیہ کلام کا سا درجہ رکھتا تھا کہ ' بوا لِکھّے کو کوئی نہیں مٹا سکتا'۔ چچی نے بھی لکھّے کو مٹانے کی کوشش نہیں کی۔ اُنھوں نے لِکھّے کے آگے سر جھکا کر ہی اپنی ساری زندگی گزاری۔

چچی کو سینے پرونے میں فن کارانہ مہارت حاصل تھی۔ جب تک سہاگن رہیں طرح طرح کے جوڑے خود اپنے ہاتھ سے ٹانک کر پہنتی تھیں۔ اب یہی مہارت ان کی زندگی کا سہارا تھی۔ ہاتھ کی ترُپائی کے مقابلے میں اس 'موئی سنگر مشین' کی حیثیت چچی کے نزدیک وہی تھی جو اکبر بادشاہ کے نزدیک خطّاطی کے مقابلے میں چھاپے خانے کی تھی۔ چچی اگرچہ انسان کے چاند پر پہنچنے کے بھی دس برس بعد اللہ کو پیاری ہوئیں لیکن سلائی مشین کے ہینڈل کو ان کا ہاتھ مرتے دم تک چھو کر نہیں گزرا۔ وہ سلائی کا باریک سے باریک کام بڑی مہارت سے کرتی تھیں۔ ان کے کام میں لاگت برائے نام اور محنت اور کاری گری پوری ہوتی تھی۔ کپڑے کی رنگ برنگی کترنوں کو جمع کر کے، جو انھیں اِدھر اُدھر سے مفت مل جاتی تھیں،

وہ سلائی کے کرتوں، ساڑیوں اور دوپٹوں پر کبکری کٹاؤ کا بہترین کام بنا دیا کرتی تھیں۔ چوں کہ اس کام کے کرنے والے بہت کم رہ گئے تھے۔ اس لیے پچی کے پاس کام کی کمی نہیں تھی۔ تاہم اس کام سے ان کا مشکل گزارا ہی ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک طرف تو وہ اپنے کام میں فن کارانہ خلوص برتتی تھیں اور دوسرے وہ کام کی اجرت گاہک کی حیثیت کو دیکھ کر نہیں بلکہ اپنی حیثیت کو دیکھ کر طلب کرتی تھیں۔ پچی نے اسی قلیل آمدنی میں اپنی چاروں لڑکیوں کی شادیاں کر ڈالیں اور دنیاداری کے معاملات کو بھی سلیقے کے ساتھ پورا کیا۔

پچی میں خدمت خلق کا بے پناہ جذبہ تھا۔ ہر ایک کے دُکھ سُکھ میں ہمیشہ شریک رہتی تھیں۔ اسی لیے پرانی بڑی بوڑھیوں کی طرح انھیں ہر ایک کی سُن گن لینے کی عادت تھی۔ آپ کوئی بات پچی کو بتانا چاہیں یا نہ چاہیں لیکن اُن سے کوئی بات چھپی نہیں رہتی تھی۔ ہمارے محلّے میں جوُالا نام کی ایک بوڑھی دائی آیا کرتی ہیں۔ محلّے کی ساری بڑی بوڑھیوں کے جاپے انھی کے ہاتھ سے ہوئے ہیں۔ جوُالا سال میں تین بار یعنی شب برات، عید اور بقرعید کو اپنے لگے بندھے گھروں سے عیدی لینے آتی ہیں اور اسی بہانے کن انکھیوں سے نئی نویلیوں کی چال ڈھال بھی دیکھ جاتی ہیں۔ پہلے تو وقت پڑنے پر لوگ خود جوُالا کے گھر دوڑے جاتے تھے لیکن جب سے یہ ہسپتالوں اور ڈاکٹرنیوں کا چکر چلاّ ہے دائیوں کا کاروبار خاصا مندا ہو گیا ہے۔ جوُالا کے ساتھ بھی اکثر یہ چوٹ ہوئی ہے کہ جب وہ بقرعید کی گئی گئی شب برات کو کسی گھر میں لوٹی ہیں تو انھیں کوئی ننھّا منّا وہاں ہمکتا ہوا ملا ہے۔ اس معاملے میں پچی کا تجربہ جوُالا سے کہیں زیادہ تھا اس لیے کہ جن گھروں میں ان کا ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا تھا وہاں تو پچی سے یہ بات بھی چھپی نہیں رہتی تھی کہ دلہن کا جی پہلی دفعہ تیرہ تیزی

کے مہینے میں مبتلا یا یا بارہ وفات کے۔ چناں چہ جُواَلا بھی جب اپنے دورے پر نکلتیں تو پچی کے ساتھ خاصی کھُسر پھُسر کر کے جاتی تھیں۔ محلّے کی کوئی عورت جب پچی سے یہ پوچھتی کہ فلاں کی دلہن کو کونسا مہینہ ہے تو پچی انگلیوں کی پوروں پر، رجب، سب برات، رمضان، عید، خالی، وغیرہ کا حساب لگاکر فوراً بتا دیتی تھیں تیسرا ہے، چوتھا ہے یا پانچواں پیٹ والیوں کے پیٹ کا حال پچی، دائی سے بھی پہلے جان لیا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کس گھر میں ولادت ہونے والی ہے اور دائی کو آنے میں دیر لگ رہی ہے تو ایسے میں پچی کی موجودگی سے بڑی ڈھارس رہتی تھی۔ پچی نے کسی کا جاپا کرایا ہو یا نہ کرایا ہو لیکن جاپے کے دنوں میں پچی کا پاس رہنا بڑا ضروری تھا۔ بڑی بوڑھیوں والے علاج اور نسخے تو پچی کے پاس بے شمار تھے۔ ذرا کسی کے بچے کی طبیعت بگڑی اور پچی حاضر۔ فوراً بقائی کی گھٹی منگا بچے کو پلادی۔ ان کا خیال تھا کہ بقائی کی گھٹی بچوں کی ہر بیماری کا علاج ہے۔ آس پڑوس میں اگر ناوقت کسی کی طبیعت خراب ہو جائے تو فوراً پچی کو بلایا جاتا تھا وہ مرض کی تشخیص اور اس کا علاج دونوں کر دیا کرتی تھیں۔ بعض موقعوں پر خود برقع اٹھا کر حکیم ڈاکٹر کے ہاں سے دوا بھی لا دیا کرتی تھیں ہمارے گھر کے قریب ہی ڈاکٹر کی ایک نئی دُکان کھلی تھی۔ پچی نے اسے آزمایا تو ڈاکٹر ٹھیک نکلا۔ لیکن نیا نیا ڈاکٹر تھا اس لیے زیادہ مریض اس کے پاس نہیں جاتے تھے۔ پچی کا اس ڈاکٹر کے بارے میں یہ کہنا تھا کہ 'بُوا ہے تو ٹٹ پُونجیا مگر دوا اچھی دیتا ہے'۔

پچی جس مکان میں رہتی تھیں اس میں کنبے کے کئی گھر آباد تھے۔ دن بدن اس گھر کی آبادی بڑھتی جا رہی تھی جس سے پچی کے لیے جگہ تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ جتنا پچی کی بیٹیاں ان کو مانتی تھیں اتنا نواسیاں نواسے نہیں مانتے تھے اور جب نواسے نواسیوں کے بھی بچے ہونے لگے تو ان کے لیے تو پچی

Marfat.com

کی حیثیت ایک آثارِ قدیمہ کی سی تھی۔ ایک طرف عمر کے ساتھ مزاج بے ٹھکانے ہوتا جا رہا تھا اور دوسری طرف نئی پود نے پچی کے ساتھ ہر وقت چھیڑ خانی مچا رکھی تھی جس سے پچی اکثر ان سے ناراض ہو جایا کرتی تھیں۔ ایسے میں آکر ہمارے گھر میں کہا کرتی تھیں 'بوا آج کل میں گھر میں سب سے ناراض ہوں' پھر دوسرے ہی سانس میں یہ بھی بتاتی تھیں کہ 'کسُو کو پتا تھوڑی ہے کہ میں ناراض ہوں'۔

پچی کبھی کبھی بڑے مزے کی باتیں کرتی تھیں۔ ایک دفعہ کسی صاحبہ کا ذکر کر رہی تھیں جو اپنے گھر میں اپنے میاں کو غلوتوں کا زیادہ موقع نہیں دیتی تھیں۔ پچی کا کہنا تھا 'بوُا تم جانو مَرَد ذات' خالی بٹھا کے تو کھلانے سے رہا' ایسے ہی ایک بار مہنگائی کا رونا روتے ہوئے بولیں 'آج کل تو روٹی کھانا بھی چاندی چبانا ہے'۔ پچی کو اس بات کی بڑی شکایت تھی کہ آج کل کے لوگوں نے فیشن میں آکر 'چا' میں نمک ڈالنا چھوڑ دیا ہے اور پتّی کو بھی اونٹانے کے بجائے اب کچّے رنگ کی 'چا' پینے لگے ہیں۔ وہ کہتی تھیں 'اس لیے تو اب چا پینے کا کوئی فیدہ نہیں ہوتا' نہ سردی دور ہو نہ نزلہ'۔

ہسپتال سے' جسے وہ اسپتّال کہتی تھیں' پچی بڑا ڈرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ کسی کو ہسپتال بھیجنے کا مطلب اسے جیتے جی قبرستان بھیجنا ہے۔ پچی کے ایک داماد کسی موذی مرض کا شکار ہو کر ہسپتال میں داخل ہوئے اور دو مہینے بعد اچھے ہو کر گھر لوٹے۔ لیکن پچی کا تاثر یہ تھا کہ 'بوا جب اسپتّال میں بھرتی ہوا تھا تو خاصا ہٹّا کٹّا تھا' مرڈوں نے ادھ مرا کر کے نکالا ہے' نگوڑے کے بدن کا سارا خون کھینچ لیا'۔

سائنس کی نئی نئی ایجادات نے جیسے نظامِ فطرت کا توازن بگاڑ کر رکھ دیا ہے ویسے ہی پچی کے اعصاب کو بھی متاثر کر دیا تھا۔ بس اور موٹر کی گھُوں گھُوں سے پچی کو چکّر آتے تھے اس لیے وہ ان سواریوں میں

کبھی نہیں بیٹھتی تھیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ ریل میں بھی کبھی بیٹھی تھیں یا نہیں۔ ایک بار کسی بہانے گھر والے انھیں بائیسکوپ لے گئے۔ اُس بند اور تاریک منڈوے میں ان کا ایسا دم گھٹا کہ انھوں نے منڈوے کی بتیاں بجھتے ہی چلوچلو مچا دی اور ان کے ساتھ سب کو ویسے ہی واپس آنا پڑا۔ 'ریڈوے' کی دہائیں دہائیں سے تو ان کا ویسے ہی سر چکراتا رہتا تھا اب یہ 'نئی آفت موئی ٹیلی وِجن کی' شروع ہوئی تھی۔ اِدھر شام کو گھر میں ٹیلی وژن کھلا اور اُدھر پچی نے اپنا برقع اٹھا کسی ایسے گھر کا رخ کیا جہاں ٹیلی وژن نہیں تھا۔

پچی کی والدہ کا انتقال خود پچی کے انتقال سے کوئی سات آٹھ برس پہلے ہی ہوا تھا۔ ان کی امّاں نے کوئی سو سے اوپر عمر پائی تھی۔ جیسا کہ اتنی عمر کے لوگوں کا حال ہوتا ہے بے چاری بڑی بی بالکل حواس باختہ اور معذور بس کھٹولے پر ہی پڑے پڑے دنیا کے کاموں سے فراغت پائی تھیں۔ اس حالت میں 'غدر'[۴] کے زمانے کی اس بڑھیا بے چاری کا گُو مُوت کون کرتا' بس پچی ہی جیسے تیسے کرتی تھیں۔ پچی دل سے چاہتی تھیں کہ اللہ ان کی امّاں کا پردہ ڈھک لے مگر پچی کے نواسے نواسیوں کا خیال تھا کہ بڑی بی تو قیامت کے بوریے سمیٹ کر جائیں گی۔ انھوں نے تو قیامت کے بوریے نہیں سمیٹے لیکن جب تک وہ زندہ رہیں ان کی صفائی ستھرائی کے رستے پچی ضرور جنت کی جھاڑو دیتی رہیں۔ جب کبھی ہم پچی سے ان کی امّاں کی خیر سلا خیر عافیت' پوچھتے تو وہ ان کی حواس باختگی کا ذکر اپنی بھولی بھالی زبان میں یوں کرتیں: 'وِن کے خیالات خراب ہوگئے ہیں' بہکی بہکی باتیں کرتی ہیں'

پچی نے بیوہ اور بے سہارا ہونے کے بعد اپنے تمام تر دقیانوسی پن کے باوجود حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا سیکھ لیا تھا۔ وہ سیدانی تھیں اور اس زمانے کی سیدانی جب بیاہ شادی کے معاملوں

Marfat.com

ہیں لڑکی دیتے ہوئے اس بات کا بہت خیال رکھا جاتا تھا. لیکن جب بچی نے اپنی لڑکیوں کی شادیاں کیں تو ان کے سامنے تو ایک ہی بات تھی اور وہ یہ کہ رانڈ ماں کی جوان بچیاں جتنے جلدی اپنے گھر کی ہو جائیں اچھا ہے۔ انھوں نے سیّد زادوں کے انتظار میں اپنی لڑکیوں کو چھاتی پہ نہیں بٹھائے رکھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کے چاروں دامادوں میں سے کوئی سید زادہ ہے یا نہیں۔

محلہ قبرستان کے بیچوں بیچ ایک درگاہ ہے' درگاہ حضرت شمس العارفین. حضرت شمس العارفین کو محلّے والے دادا پیر کہتے ہیں اور انھی کے دم کی برکت سے خود کو ہر بلا سے محفوظ سمجھتے ہیں۔ محلّے کی بوڑھی اور ادھیڑ عمر کی عورتیں ہر جمعرات کو دادا پیر کے مزار پر چراغ اور اگربتیاں جلاتی ہیں اور کھیلوں اور الائچی دانوں کی نیاز دیتی ہیں۔ اسی محلّے قبرستان میں ایک اور بزرگ کی بڑی سنگین قسم کی قبر لب سڑک بنی ہوئی ہے اور اس قبر کی پشت پر سے میونسپلٹی کی نالی بہتی ہے۔ اس قبر کی پائنتیوں میں کبھی ایک چھوٹی سی قبر ایک بچے کی بھی تھی جو سڑک کے پختہ بن جانے سے اب معدوم ہو گئی ہے۔ بچی ان دونوں قبروں کے بارے میں بڑا دلچسپ قصّہ سنایا کرتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ یہ نالی کے پاس والی قبر پہلے دادا پیر کے 'احاطے' میں تھی یہ اپنے وقت کے بڑے جلالی بزرگ تھے. ایک دفعہ کوئی عورت درگاہ میں فاتحہ پڑھنے گئی۔ اس کے بچّے نے قبر کے پاس پیشاب کر دیا۔ بس پھر کیا تھا انھیں جلال آگیا اور انھوں نے بچّے کو ایسی پٹخنی دی کہ بچّہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ عورت رو رو کر دادا پیر کے مزار کی پائنتیں اپنا سر دھننے لگی۔ دادا پیر ان کے اس بے جا جلال پر بہت ناراض ہوئے اور ان کے مزار کو اپنے 'احاطے' سے اٹھا کر یہاں نالی کے پاس پھنکوا دیا، تو بوا آج تک نالی کے پاس پڑے ہیں؛ بچی سے

Marfat.com

ہماری یہ کہنے کی جرات نہیں ہوئی کہ چچی یہ قبر تو یہاں میونسپلٹی اور اس کی نالیوں کے وجود سے بہت پہلے کی ہے۔

چچی کو وہ مرد بڑے عجیب لگتے تھے جو گھر کے کام کاج میں حصہ لیتے ہیں۔ مجھے باورچی خانے میں گھسنے کا کچھ زیادہ ہی مرض ہے۔ اگر ایسے موقعے پر کبھی چچی آدھمکتیں تو فوراً میری بیوی سے کہتیں "اچھا بوا تو آج یہ پکا رہے ہیں" اس بات کا سلیس اردو میں یہ مطلب ہوتا تھا "ڈوب مرو خصم سے کھانا پکوا رہی ہو"؛ لہذا مجھے بیوی کی طرف سے یہ ہدایت تھی کہ اگر میں باورچی خانے میں ہوں اور چچی آتی دکھائی دے جائیں تو فوراً ہنڈیا چھوڑ چھاڑ جا کر اپنے لکھنے پڑھنے میں لگ جاؤں۔ مجھے گھر میں کام کرتا دیکھ کر چچی کہتی تھیں "بوا تمہارے میاں تو خاصا ہاتھ بٹا دیتے ہیں ہمارے دامادوں میں سے تو کوئی ہل کے پانی بھی نہیں پیتا۔"

چچی ہمارے گھر کتنے ہی مختصر دورے پر کیوں نہ آئیں لیکن ایک چاق وچوبند پریس رپورٹر کی طرح وہ جلدی جلدی اپنی تمام تفتیش مکمل کر لیا کرتی تھیں۔ ایک بار میں گھر پر اکیلا تھا۔ یونیورسٹی کی کچھ خواتین کسی سلسلے میں میرے گھر پر آئیں۔ کچھ ہی دیر میں پیچھے پیچھے چچی بھی آگئیں۔ انھیں ذرا جلدی تھی اس لیے بس کھڑے کھڑے کو آئی تھیں۔ چچی نے آتے ہی ان اپٹوڈیٹ خواتین کو دیکھا، پھر میری طرف دیکھا، پھر ان سے مخاطب ہوئیں اور بولیں "اچھا تو بوا دلہن سے ملنے آئی ہو گی"؛ میں نے کہا چچی نہیں یہ تو مجھ سے ملنے آئی ہیں۔ چچی یہ سنتے ہی برقع ایک طرف رکھ پھسکڑا مار کے بیٹھ گئیں اور لگیں ان خواتین سے طرح طرح کی باتیں کرنے۔ کچھ ہی دیر میں میری بیوی بھی آگئیں۔ اب ذرا چچی کی جان میں جان آئی اور انھیں یہ بھی یاد آیا کہ "اے ہے میں تو کھڑے کھڑے کو آئی تھی"؛ یہ بات چچی کی سمجھ میں بہت دن تک نہیں آئی کہ وہ عورتیں بجائے میری بیوی کے مجھ سے ملنے کیوں آئی

Marfat.com

تھیں اور اگر آئی بھی تھیں تو میری بیوی نے اس کا فضیحتا کیوں نہیں کیا۔
آخری دنوں میں جب آنکھوں اور ہاتھ پیروں سے مجبور ہو گئی تھیں اور ان سے کام بھی زیادہ نہیں ہوتا تھا تو ان کا وقت زیادہ تر اپنے قدردانوں کے گھروں میں گزرتا تھا۔ وہ سلوک کی توقع میں وہاں جاتی تھیں مگر اپنے منھ سے کچھ نہیں کہتی تھیں۔ ایسے موقعے پر وہ بڑی ہانپتی کانپتی دروازے میں داخل ہوتی تھیں لگتا تھا اب گریں۔ لوگ انھیں سہارا دے کر بٹھاتے تھوڑی دیر میں ان کے حواس بجا ہونے شروع ہوتے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھلی چنگی ہو جاتیں اور پھر آگے کے معاملات یوں چلتے:

'پچی چا پییں گی؟'
'بوا تم پی رہی ہو تو ذری سی مجھے بھی بنا دو'
'پچی کھانا کھائیں گی؟'
'لاؤ کہتی ہو تو کھا لیتی ہوں، کیا پکا پا ہے؟'
'اروی کا سالن'
'دے دو ذرا سا ..... نیبو اور گرم مسالہ بھی ہے؟'

اب پچی کے سامنے کشتی میں کھانا لگا ہوا ہے پچی کھاتی جا رہی ہیں اور کھانے پر بے لاگ تبصرہ کرتی جا رہی ہیں:

'اے بوا چپاتی کے کنارے ذرا سے کچے رہ گئے ...... کنارے چھوڑنا رزق کی بے ادبی ہے..... دیکھنا سالن میں نمک ذرا پھیکا رہ گیا' اب اگر آپ انھیں پسا ہوا نمک پیش کریں تو کہیں گی 'اے بوا پکتے وے نمک کا اور مزا ہوتا ہے کچا نمک ڈالنے میں وہ بات تھوڑی آتی ہے'؛ پچی کو پانی پلانا بھی اپنے آپ کو مشکل میں ڈالنا ہوتا تھا۔ پہلا گھونٹ لیتے ہی کہتی تھیں، اے کیا صراحی تازی بھری ہے؟ بالکل گرم پانی ہے؛
عمر کے ساتھ ساتھ پچی کا ہاضمہ بھی جواب دے چکا تھا لیکن

Marfat.com

زبان کا چٹخارا پھیکے سیکھے کھانوں کو قبول نہیں کرتا تھا اس لیے آئے دن انھیں بقائی کی دو نمبر خوراک پینی پڑتی تھی۔ بقائی کی دو نمبر خوراک کا بھی اپنا مزا ہے پیٹ کی تکلیف کی اتنی مزے دار دوا ہمیں سب سے پہلے چچی نے ہی بتائی تھی۔ ایک دفعہ کسی دعوت میں سے پیٹ پکڑے پکڑے ہمارے گھر آئیں۔ میری بیوی نے کہا "چچی پھر کچھ الٹا سیدھا کھا لیا کیا؟" کہنے لگیں "بوا تم جانو بندہ بشر ہے سب کو کھاتا دیکھ کر ذری سی لال روٹی کا ٹکڑا اور دو نوالے چاولوں کے میں نے بھی کھا لیے۔ ایسا کون سا غضب ہو گیا۔ تم جانو سدا اں اچھا کھا لیا" ان کی حالت یہ تھی کہ روکھا پھیکا کھایا نہیں جاتا تھا اور قورمہ بریانی پچتا نہیں تھا۔

آخری دنوں میں جب چچی کی آنکھیں حد سے زیادہ جواب دے گئیں اور ان کی نظروں سے سوائے دھند کے دنیا کی ہر چیز اوجھل ہو گئی تو انھوں نے برقعے کو بھی کھونٹی پہ ٹانگ دیا۔ شاید وہ یہ سمجھنے لگی تھیں کہ جس طرح ان کی آنکھوں سے دنیا اوجھل ہو گئی تھی اسی طرح دنیا کی آنکھوں سے وہ خود بھی اوجھل ہو گئی ہیں۔ ویسے بھی وہ کہا کرتی تھیں "بوا پردہ کیا بس ذری سی آنکھ کی شرم ہے اب جب آنکھیں ہی پٹم ہو گئیں تو پردہ کاہے کا!"

چچی اپنی ضعیف العمری کے ساتھ ساتھ موت سے بہت ڈرنے لگی تھیں اور اس کے ساتھ ہی قبر کی کال کوٹھری کے تصور سے بھی۔ سب ان کو دلاسا دیتے رہتے تھے کہ چچی ابھی آپ مرنے والی نہیں ہیں۔ آپ کی اماں کو مرے کے برس ہوئے ہیں جو آپ مرنے کی باتیں کرتی ہیں۔ ان باتوں سے بھولی بھالی چچی کے دل سے شاید کچھ دیر کے لیے موت کا ڈر دور ہو جاتا پھر وہ کہنے لگتی تھیں "بوا دعا کرو آنکھوں میں ذری سی

Marfat.com

روشنی آجائے تو پھر کچھ ہاتھ پیر ہلانے شروع کروں یہ موئی ٹُج مُج کی محتاجی سے تو میرا جی بولا گیا؛ اور یہی کہتے کہتے ایک دن پچی چپ چاپ اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ ان کی وصیّت کے مطابق ان کے عزیزوں نے ان کے ہاتھوں میں پڑی ہوئی سونے کی دو چوڑیوں اور کانوں کی بالیوں سے اُن کا کفن کیا، اور دلّی دروازے کے باہر نئے قبرستان میں انھیں سپرد خاک کر آئے جہاں بہت سی گمنام اور جلد ہی بے نشان ہو جانے والی قبروں میں ایک قبر ان کی بھی ہے۔

Marfat.com

مغیث الدین فریدی

ذاکر صاحب

(ایک مختصر خاکہ)

ذاکر صاحب کی دل آویز شخصیت کے جلوۂ صدرنگ کی ہلکی سی جھلک بھی کسی مختصر خاکے میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ علامہ اقبال کے ایک شعر کی مدد سے ذاکر صاحب کی سیرت کے اجزائے ترکیبی کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

چہ باید مرد را طبع بلندے مشربِ نابے
دل گرمے، نگاہِ پاک بینے، جان بیتابے

اُن کی طبع بلند، اُن کا دل گرم اور اُن کی نگاہِ پاک بیں اُن کی شخصیت کے بنیادی جوہر ہیں۔ عمر کی ہر منزل میں یہ جوہر چمکتے رہے۔ گھر کے ماحول سے نکل کر ان پر اور جلا ہو گئی۔ ذاکر صاحب ۱۴ فروری ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ گھر میں ماں کی تربیت نے ان میں یہ صلاحیت پیدا کر دی کہ وہ اسلامیہ ہائر اسکول اٹاوہ کے سخت ڈسپلن کی پابندی خوش دلی کے ساتھ کر سکے۔ اُن کی شرافتِ نفس اور فرماں برداری نے اُنھیں اسکول کے اساتذہ میں ہر دل عزیز بنا دیا اور اُن کی تحریر اور تقریر کی خوبی نے اُنھیں اپنے ساتھیوں میں ممتاز کر دیا۔ تعلیم کے ابتدائی دور میں اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے ماسٹر الطاف حسین صاحب کی شخصیت نے اُن کو بے حد متاثر کیا جس کے اعتراف میں ذاکر صاحب نے کہا تھا:

Marfat.com

"میری لڑکپن سے یہ خواہش کہ میں ٹیچر بنوں صرف اس وجہ سے تھی کہ میں اپنے ہیڈ ماسٹر کا انتہائی احترام اپنے دل میں رکھتا تھا اور وہ تمام خوبیاں اور نیکیاں اُن میں دیکھتا تھا جو ایک انسان میں ہو سکتی ہیں۔"

دوسری شخصیت حسن شاہ کی ہے جو اُس دور کے ایک صوفی اور درویش تھے۔ وہ ذاکر صاحب کو بہت چاہتے تھے۔ اُن کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ ذاکر صاحب کو تصوف اور فارسی شاعری سے لگاؤ پیدا ہوگیا۔ وہ فارسی کی اکثر کتابیں ذاکر صاحب سے نقل کرواتے تھے اس مشن کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذاکر صاحب کا اردو کا خط بہت پختہ ہوگیا۔ اسکول میں جب وہ آٹھویں درجے کے طالب علم تھے اُس وقت اُنھوں نے طالب علم کی زندگی پر ایک مختصر مضمون لکھا تھا۔ اُس مضمون کے ایک اقتباس سے ذاکر صاحب کے اُن نظریات اور تصوّرات کا اندازہ ہو سکے گا جو علی گڑھ اور جامعہ کے دور میں اُن کی زندگی کا سرمایۂ افتخار بنے۔

"طالب علم سے مراد وہ شخص ہے جو اپنی طبیعت کو موجودہ حالت سے بہتر کرنا چاہتا ہے۔ جو اپنی قوتوں کو جہاں تک اُن میں بڑھنے کی طاقت ہے وہاں تک اُن کو بڑھانا چاہتا ہے۔ جو علم اور خیالات کے اُن خزانوں سے جو ہزاروں برس میں سیکڑوں نسلیں اپنے وارثوں کے لیے چھوڑ گئی ہیں فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ شخص ہرگز طالب علم کہلانے کا مستحق نہیں جو اپنے فرائض کو استقلال اور سنجیدگی سے پورا نہ کر سکے۔ اس کو ہرگز اپنے دل میں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ اگر وہ ایسا خیال کرے گا تو وہ کچھ بھی نہ کر سکے گا بلکہ اس کو ہمت کے ساتھ کیے جانا چاہیے کیونکہ اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ ضرور اپنے کام میں کامیاب ہوگا۔"[۱]

---

[۱] ڈاکٹر ذاکر حسین از محمد مجیب صفحہ ۱۲ ـ ۱۳

ہمت بلند دار کہ پیش خدا و خلق
باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو"

طالب علم کی یہ تصویر اور علم کا یہ تصور جو ابتدائی تعلیم کے زمانے میں پیدا ہوا تھا علی گڑھ کے زمانے میں وہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نکھرا۔ یونین کے جلسوں میں ذاکر صاحب نے اپنی تقریر کے جادو سے اپنی ذہانت اور طباعی کا لوہا منوالیا۔ اُن کے مزاج میں جو فطری تحمل تھا اور حسن شاہ کی صحبت نے ان کی جو تربیتِ نفس کی تھی اُس نے اُن کے مزاج میں وہ رواداری پیدا کردی جس کی بدولت اُنھوں نے نازک اور پیچیدہ مراحل کو آسانی سے طے کرلیا۔ وہ جب بھی کسی آزمائش میں مبتلا ہوئے انھیں اُن کے کردار کی استقامت اور بلند نظری سے سہارا ملا۔

علی گڑھ میں ذاکر صاحب نے جب داخلہ لیا تو پہلی جنگِ عظیم شروع ہوچکی تھی۔ ہندوستان میں قومی بیداری کے آثار پیدا ہورہے تھے۔ سیاسی اور سماجی سطح پر ہندوستان کے رہنماؤں کے سامنے قومی آزادی کا ایک مبہم مگر خوش آیند خاکہ تو تھا لیکن مشترک اقدار کا کوئی ایسا واضح تصوّر سامنے نہ تھا جس کو مشعلِ راہ بنایا جاسکتا۔ یہ کڑی منزل ایسی تھی جس کے لیے اقبال نے کہا تھا:

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

ذاکر صاحب نے ایک دور اندیش اور حساس طالب علم کی حیثیت سے وقت کے تقاضے کو اپنے ساتھیوں سے بہت پہلے سمجھ لیا تھا۔ کالج کی اقامتی زندگی نے اُن کے حوصلے کو بلند اور اُن کی نظر کو وسیع کردیا تھا وہ عدم تعاون کی تحریک کی حمایت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے منسلک ہو گئے۔ مگر جامعہ کی تعمیر کے زمانے میں بھی۔

Marfat.com

آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

اس اجمال کی تفصیل خود اُن کی زبانی سنیئے۔

۲۸ جنوری ۵۷ کے کنووکیشن ایڈرس میں ذاکر صاحب نے جب اپنی عمر رفتہ کو آواز دی تو اُن کا شاندار ماضی اپنی تمام رعنائی و برنائی کے ساتھ ان الفاظ میں مجسم ہوگیا تھا۔

"یہاں فرماں برداری سیکھی، اطاعت شعاری سیکھی ادب سیکھا۔ بڑوں کا ادب، ہم نشینوں کا ادب، چھوٹوں کا ادب اور خود اپنا ادب۔ سعادت مندی اور وفا شعاری کے ساتھ اس علمی بستی کے نظام کی پابندی کو عین آزادی جانا پر جب اس نظام کو ضمیر کی آزادی سے ٹکراتا پایا تو اس سے بغاوت کی طاقت بھی اسی چشمۂ حیات میں ملی۔ باغی بنے، نکالے گئے۔ دوسری بستی بسانے میں ایک رُبع صدی کاٹ دی مگر اس مادرِ علمی کی طرف سے کبھی دل میں تلخی محسوس نہ کی۔" [۱]

جامعہ ملیہ سے وابستگی کے بعد ذاکر صاحب نے مزید تعلیم اور تجربے کے لیے ہندوستان سے باہر جانے کا فیصلہ کیا برلن سے معاشیات کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی لیکن تعلیم کے مضمون سے اُن کی دل چسپی اتنی بڑھی کہ وہ معاشیات سے زیادہ ماہر تعلیم کی حیثیت سے پہچانے گئے۔

ذاکر صاحب جرمنی سے جب واپس آئے تو مغربی تعلیم کے اعلا تصوّرات کے ساتھ اُن تعلیمی تجربات کا ذخیرہ بھی لے کر آئے جس کی مدد سے اُنھوں نے جامعہ ملیہ کے نظام تعلیم کا خاکہ تیار کیا جامعہ ملیہ میں ذاکر صاحب کا قیام اور ان کی خدمات ایک الگ داستان ہے جس کی اس مختصر خاکے میں

---

[۱] ڈاکٹر ذاکر حسین از محمد مجیب ص ۱۷

Marfat.com

گنجایش نہیں ہے۔

جامعہ ملیہ کی تعمیر میں اُن کی عمر کا بیشتر حصّہ صرف ہوا لیکن علی گڑھ سے اُن کی عقیدت اور شیفتگی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ نومبر ۱۹۴۸ء میں وہ جامعہ سے سبکدوش ہوکر علی گڑھ آگئے یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے علی گڑھ آگئے۔ علی گڑھ میں سرسید ہال کے ڈنر میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے جامعہ ملیہ اور علی گڑھ دونوں سے وابستگی کا حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

" جب میں طالب علم تھا تو میں علی گڑھ ہی کو اپنا سب کچھ سمجھتا تھا۔ یہ میرا گھر ہے۔ یہ میرا باغ ہے۔ میرا وطن ہے میں جب کبھی اس سے خواہ کسی غرض اور قلیل مدّت کے لیے بھی جدا ہوا میرے دل میں یہ گھر، یہ باغ یہ وطن سمایا رہا میں اس کے متعلق منصوبے باندھتا رہا اور جو زندگی میں نے اپنے لیے تجویز کی اس کا یہ ایک جزو رہا لیکن ابھی میں ایک طالب علم ہی تھا کہ مجھے اس سے علاحدہ کردیا گیا۔ میں نے اور کچھ میرے ساتھیوں نے اس ادارہ سے بغاوت کی۔ یہاں کے ارباب حل وعقد یہ گوارا نہیں کرتے تھے کہ یہ وہ ہوجائے جو ہم اسے بنانا چاہتے تھے نہ اس پر متفق تھے کہ ہم نے جو مقصد قرار دیا ہے اس کو وہ تسلیم کرلیں اس وقت میں صاحب باغ میں رہتا تھا۔ پولیس آئی مجھے اٹھا کر ٹرک میں ڈال دیا گیا۔ ریلوے اسٹیشن پہنچا دیا گیا میرا یہاں آنا ممنوع تھا اس کے بعد میں اور میرے ساتھی جامعہ میں کام کرنے لگے۔ ہم نے جامعہ ملیہ کی بنیاد یہاں سے بغاوت کرکے رکھی تھی لیکن ہم نے جامعہ ملیہ کو کبھی اس سے جدا نہیں سمجھا۔ میں نے ۲۷ سال جامعہ ملیہ میں دل وجان سے کام کیا کیونکہ میں محسوس کرتا تھا کہ میں وہاں بھی علی گڑھ ہی کا کام کر رہا ہوں مجھے یقین تھا کہ

Marfat.com

ایک نہ ایک دن ہم پھر علی گڑھ پلٹ آئیں گے اور اس کو اپنی امیدوں اور خیالی قلعوں کا مرکز بنا لیں گے۔" [1]

وائس چانسلر ہوکر جب ذاکر صاحب علی گڑھ پہنچے تو اُن کے دیرینہ رفیق پروفیسر رشید احمد صدیقی کے تاثرات یہ تھے۔

ذاکر صاحب نے اس وقت علی گڑھ کی قیادت کی ذمہ داری قبول کر کے اس بات کو واضح طور پر ثابت کر دیا کہ نئی ہندوستانی ریاست کا بنیادی مقصد ایک مہذب ترقی پسند اور ایک انصاف دوست معاشرے کو قایم کرنا ہے اور علی گڑھ کی بقا اور توسیع کا کام اس مقصد کے حصول میں ایک موثر اور مبارک وسیلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذاکر صاحب کا یہ کوئی نیا خیال نہ تھا۔ ان کی پوری زندگی اس مقصد کی نہایت مستند روشن اور دلکش تصویر و تعبیر رہی ہے۔

رشید صاحب کے ان خیالات کی تائید یونیورسٹی کی رپورٹ سے ہوتی ہے جسے پیش کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے کہا تھا۔

" میں یہاں آنے اور یہاں رہنے پر اس لیے رضا مند ہو گیا کہ میں نے دیکھا کہ قومی مفاد کا ایک اہم کام یہاں انجام دیا جا سکتا ہے۔ یہ کام ہندوستان کے تدبر کا بڑا خاص مسئلہ ہے اور ہندوستانی قومیت، سیکولر جمہوریت اور ۴ کروڑ مسلمان شہریوں کے کردار سے متعلق ہے جو اس ملک کی زندگی سے وابستہ ہیں۔ ہماری زندگی میں جو مختلف تہذیبی عناصر کار فرما ہیں ان کو ایک متوازن اور خوشنما شکل میں ڈھالنے کا ایک کام ہے جو وسیع بھی ہے دلکش بھی ماضی کے خزانے خواہ کسی سرچشمے سے پھوٹے ہوں اُنھیں ایک مشترک قومی میراث میں تبدیل کرنا ہے جسے ہر ہندوستانی شہری اپنی خود میراث سمجھے اور اس طرح اس کے اندر ایک مشترک ماضی اور اس کے کارناموں کا شعور پیدا ہو۔ اس

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین از محمد مجیب ص ۱۸۵

Marfat.com

عظیم الشان ملک کے مسلمان شہریوں کے دل میں یہ احساس بڑھنا چاہیے کہ اپنے دین اور اُس کے مخصوص کارناموں کے ذریعہ وہ ہندوستانی زندگی صحت مند فروغ دے سکتے ہیں۔ یہ اُن کی مزید ذمہ داری ہے اور خدمتِ خلق کا خاص موقع ہے۔"

اس نصب العین کو ذاکر صاحب نے علمی جامہ پہنانے کے لیے جو کچھ کیا وہ علی گڑھ کی تاریخ میں محفوظ ہے۔ لیکن جامعۂ اردو کا نام ذاکر صاحب کے کسی سوانح نگار نے نہیں لیا۔ سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے بھی اپنی تحریروں میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔

بزم اقبال آگرہ نے ۱۹۳۹ء میں جامعۂ اردو نام کا ایک ادارہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے قایم کیا تھا۔ اس ادارے کے تحت ہر سال ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل کے تین امتحانات ہوتے تھے بزم اقبال آگرہ کے جنرل سکریٹری پروفیسر محمد طاہر فاروقی جامعۂ اردو کے بانی اور پہلے رجسٹرار تھے۔ محمد طاہر فاروقی صاحب نے ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۸ء تک بلا معاوضہ اس ادارے کی ایسی خدمت کی کہ اس کے مختلف مقامات پر ۵۶ مراکز قایم ہو گئے تھے۔ دن بدن اس ادارے کی مقبولیت بڑھتی گئی۔ تقسیم سے پہلے اس کے سرپرستوں میں سر تیج بہادر سپرو، بابائے اردو ڈاکٹر عبد الحق، پنڈت راج ناتھ کنزرو اور اُس کے معاونین میں ڈاکٹر ذاکر حسین، سر محمد یعقوب غلام السیّدین پروفیسر رشید احمد صدیقی پروفیسر حامد حسن قادری اور علامہ میکش اکبر آبادی کے نام قابل ذکر ہیں۔

ملک کی تقسیم کے بعد محمد طاہر فاروقی صاحب نے پاکستان جانا طے کیا تو ذاکر صاحب اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مشورے سے جامعہ اردو کے ادارے کو علی گڑھ منتقل کر دیا گیا بزم اقبال آگرہ کی مجلس منتظمہ نے

Marfat.com

جامعہ کے نئے عہدیداروں کا تقرر کیا۔ ذاکر صاحب شیخ الجامعہ رشید احمد صدیقی نائب شیخ الجامعہ اور سید ظہیر الدین علوی رجسٹرار مقرر ہوئے۔

علی گڑھ میں سید ظہیر الدین علوی کی انتھک کوشش اور ذاکر صاحب کی سرپرستی اور رہنمائی میں جامعۂ اردو کے ادارے نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔ ملک کے طول و عرض میں اس کے امتحانات کے سینٹر قایم ہوئے اور ملک کے باہر ماریشس میں بھی جامعہ اردو کے امتحانات ہونے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی غیر معمولی مصروفیات کے باوجود جامعۂ اردو کی مجلس منتظمہ کے جلسوں میں بڑی پابندی سے شرکت کی اور شیخ الجامعہ کے فرائض کو بڑے شوق اور لگن سے انجام دیا۔ ذاکر صاحب کی توجہ کا یہ اثر ہوا کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے ممتاز اساتذہ جامعہ کے کاموں میں دل چسپی لینے لگے۔ ذاکر صاحب کی کوشش سے علی گڑھ یونیورسٹی نے ان امتحانات کو منظور کیا اس سے ان امتحانات کے وزن اور وقار میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ رفتہ رفتہ ہندوستان کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں نے ان امتحانات کو تسلیم کر لیا۔

جامعۂ اردو کی شکل میں ذاکر صاحب کو اردو یونیورسٹی کے خواب کی تعبیر نظر آ رہی تھی۔ جامعۂ اردو کے کاموں سے اُن کی دل چسپی بڑھنے لگی۔ ان امتحانات کو مقبول بنانے اور ان کی وقعت کو بڑھانے کا ایک طریقہ یہ بھی نکالا کہ علی گڑھ میں جامعۂ اردو کے سالانہ جلسۂ تقسیم انعامات کی طرح ڈالی۔ جب تک جامعۂ اردو کی موجودہ عمارت نہیں بنی تھی اس وقت تک یہ جلسے یونین ہال میں ہوتے تھے۔ ذاکر صاحب جب تک علی گڑھ میں رہے ان جلسوں کی صدارت کرتے تھے۔ اُن کی تقریر سننے کے لیے لوگ بڑے ذوق و شوق سے آتے تھے۔ ان جلسوں میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنے منفرد انداز میں مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے تھے۔

Marfat.com

شکریہ کی یہ تقریر محض رسمی نہیں ہوتی تھیں۔ رشید صاحب بڑی ذمہ داری سے اس فریضہ کو ادا کرتے تھے۔ ذاکر صاحب اور رشید صاحب کی تقریروں کی وجہ سے جامعۂ اردو کے تقسیم اسناد کے جلسے یونیورسٹی کے اکابر اور شہر کے عمائد کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ ۱۹۵۲ء کا جلسۂ تقسیم اسناد غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا ذاکر صاحب نے اس جلسے میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے جامعۂ اردو کے بانی اور اس کے پہلے رجسٹرار پروفیسر محمد طاہر فاروقی صاحب کو مدعو کیا تھا محمد طاہر فاروقی صاحب پاکستان سے اس جلسے میں شرکت کے لیے علی گڑھ تشریف لائے۔ اس جلسۂ تقسیم اسناد میں ذاکر صاحب نے محمد طاہر فاروقی صاحب پاکستان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں ڈکتورِ ادب کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

تعلیم کے میدان میں تیس سال تک اپنا خونِ جگر صرف کرنے کے بعد ذاکر صاحب اپنے عہدے سے مستعفیٰ ہوئے۔ بقول اُن کے معلّم کی زندگی کی قدرتی میعاد جب پوری ہو جائے اور ایک حد سے آگے اس کی قوتیں ساتھ نہ دیں تو غالب کا یہ شعر ہی اس کی تشفی کا سامان فراہم کر سکتا ہے۔

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانی صحرا نوشتہ ایم

۱۹۵۷ء میں اُن کو بہار کا گورنر مقرر کیا گیا۔ پھر وہ نائب صدر جمہوریہ ہند ہوئے اور آخر میں صدر جمہوریۂ ہند کی حیثیت سے اپنے وطن عزیز کی خدمت کرتے ہوئے ۳ مئی ۱۹۶۹ء کو وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ ذاکر صاحب کی شخصیت کی بلندی اور پاکیزگی زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں رہی شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ، وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی، گورنر بہار، نائب صدر جمہوریہ اور صدر جمہوریۂ ہند ہر منصب کی قبا ان کے قامت کی رعنائی سے دلکش ہو گئی۔ ان کی طباعی، اُن کی معاملہ فہمی اور اُن کا حسنِ

Marfat.com

اخلاق ہر جگہ ضرب المثل رہا۔ اُنھوں نے مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد کے جوہر دکھائے اور شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں بن کر رہے وہ اپنے مقصد کی لگن میں راہ کی دشواریوں کے کوہ و بیاباں سے سیل تُندرو کی طرح گزرتے تھے اور دوستوں، عزیزوں کے گلستانِ محبت میں جوئے نغمہ خواں بن جاتے تھے۔ اُن کی ذات گرامی اقبال کے اس مصرع کی تفسیر تھی۔

وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

Marfat.com

کامل قریشی

مخمور دہلوی

ڈاکٹر فضل الٰہی مخمور دہلوی ۱۹۰۰ء میں اپنے آبائی مکان واقع باغیچی اچھے جی، باڑہ ہندوراؤ دہلی میں پیدا ہوئے تھے اُن کے دادا اچھے جی کے لقب سے موسوم تھے یہ گلی انہی کے نام سے باغیچی اچھے جی کہلاتی ہے۔

مخمور صاحب نے ایک بار اپنی حیات میں اپنے مکان کی نشاندہی باغیچی اچھے جی میں کی تھی جہاں تک ان کی تاریخ پیدائش اور دن کا تعلق ہے اس پر کسی بھی ذریعہ سے روشنی نہیں پڑی غالباً خود مخمور صاحب کو اس کا پتہ نہیں تھا اسی وجہ سے اُن کے ہم عصروں، اہلِ خاندان، دوستوں اور اولاد وغیرہ نے صرف سنہ پیدائش کا ہی ذکر کیا ہے اور اب صرف اولاد یا چند شاگردوں کے علاوہ کوئی ایسا نہیں جو ان باتوں پر اظہار رائے کرسکے بہر حال اس کی تحقیق ضروری ہے۔

مخمور صاحب کی والدہ ایک ایرانی النسل خاتون تھیں مخمور صاحب کے والد نے کس زمانے میں، کن حالات میں اور کن اسباب سے ایک ایرانی خاتون سے رشتۂ ازدواج قائم کیا یہ حالات بھی پردۂ خفا میں ہیں البتہ واقعات سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ ایران کی اچھی نسل سے تھیں نہایت وجیہ، خوب رو،

Marfat.com

خوش رنگ اور اچھے نقش و نگار کی خاتون تھیں کچھ عرصے تک اچھی گذرنے کے بعد مخمور صاحب کے والد کے ساتھ ان کی نبھ نہ سکی، نوبت طلاق تک پہنچی اور وہ دماغی خلل میں مبتلا ہوگئیں مخمور صاحب کی زندگی میں یہ پہلا شدید نفیاتی جھٹکا تھا جس نے انھیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا کچھ عرصے تک جیسے تیسے گذارنے کے بعد رشتہ داروں کے زور دینے پر والدۂ مخمور نے رام پور کے کسی شخص سے دوسری شادی کرلی جن سے مخمور صاحب کے سوتیلے بھائی صغیر احمد پیدا ہوئے مخمور صاحب کے حقیقی والد نے اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کرنے سے قبل محلہ رودگران میں مخمور صاحب اور ان کی والدہ کے لیے ایک مکان لے دیا تھا جس میں یہ دونوں رہتے تھے اور والدہ کی دوسری شادی کے بعد بھی یہ مکان ان کے قبضے میں رہا والدہ کے انتقال کے بعد اس میں مخمور صاحب اور سوتیلے بھائی صغیر احمد رہنے لگے۔

مخمور صاحب کے حقیقی والد تو پہلے ہی فوت ہو گئے تھے والدہ کی دوسری شادی اور سوتیلے بھائی صغیر احمد کی پیدائش کے بعد اُن کے سوتیلے والد بھی اللہ کو پیارے ہوئے اور ان حالات میں جب دنیا ان کی نظر میں تیرہ و تار ہوگئی تو وہ بے یارو مددگار رہ گئے پھر نہ جانے کن حالات میں نواب افتخار علی خاں والئ پٹودی سے ان کی رسائی ہوئی اور وہ نواب صاحب کے ملازم ہوکر ان کے مصاحبین میں شامل ہو گئے اور برائے نام اُن کو نواب صاحب کے موٹر گراج کا انچارج بنا یا گیا یہ نوکری ان کی ۱۹۴۷ء تک قائم رہی اس دوران اُن کو نواب پٹودی مرحوم جیسی علم پرور، ادب نواز اور عالی مرتبت شخصیت کی صحبت نصیب ہوئی اور ان کے فیض سے مخمور صاحب کو جہاں خوشحالی میسر آئی وہاں شاہی ذوق و شوق علم و فن سیر و شکار سپہ گری، شعر و شاعری وغیرہ سے گہری دلچسپی پیدا ہوئی. نواب صاحب نے کہنے کو تو مخمور صاحب کو موٹر گیراج کا انچارج بنایا ہوا تھا لیکن وہ زیادہ وقت

Marfat.com

نواب صاحب کی خدمت میں ہی گذارتے اور خاص موقعوں پر جب کبھی نواب صاحب کے ساتھ سفر میں ہوتے تو موٹر ڈرائیور کی خدمت بھی انجام دیتے اور وہ بھی اس طرح کہ کبھی مخمور صاحب اور کبھی خود نواب صاحب کار چلاتے تھے اسی دوران وہ دہلی بھی آتے جاتے رہتے اور یہاں کے علمی و ادبی مشاغل میں بھی حصہ لیتے تھے اس بات پر بھی روشنی نہیں پڑتی کہ وہ استاد بیخود دہلوی کے شاگرد کب ہوئے تھے لیکن اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً وہ ۳۶-۱۹۳۵ء میں پٹودی گئے اور وہاں ۱۹۴۷ء تک رہے اس دوران ان کا ذوق شعر و شاعری پٹودی میں پروان چڑھتا رہا ہوگا کیونکہ بقول کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ۴۳-۱۹۴۲ء میں جب ایک بار وہ پٹودی کے مشاعرے میں شریک ہوئے تو استاد بیخود دہلوی ان کے ساتھ تھے جن کی صدارت میں یہ مشاعرہ ہوا تھا اس موقعہ پر پہلی بار نواب پٹودی کے توسط سے بیدی صاحب کی ملاقات مخمور صاحب سے ہوئی تھی اور انھیں سننے کا موقعہ ملا تھا مذکورہ مشاعرے میں اختتام پر جب چند مقامی شعراء اپنا کلام پڑھ چکے تو نواب پٹودی نے یہ کہہ کر اب ہم اپنا محبوب شاعر آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں، مخمور صاحب کا تعارف اہل محفل سے کرایا تھا اور اس موقعہ پر مخمور صاحب نے جو غزل پڑھی تھی وہ حاصل مشاعرہ تھی اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخمور صاحب نے استاد بیخود سے پٹودی منتقل ہونے سے قبل اور پھر اس واقعہ کے بعد دہلی پہنچ کر شرف تلمذ حاصل کیا ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ مخمور صاحب کی تین شادیاں ہوئیں لیکن صرف ایک بیوی سے اولاد ہوئی جن میں دو لڑکیاں اور دو لڑکے بفضل خدا حیات ہیں ان تین شادیوں کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ ان کی پہلی شادی ایک ایسی خاتون سے ہوئی جن سے انھیں غیر معمولی عشق تھا اور یہ عشق جب جنوں کی حدوں کو چھو گیا تو قدرت نے خود بخود کوئی ایسی سبیل نکالدی کہ یہ مخمور صاحب کی

شریک حیات بن کر اُن کی زندگی میں داخل ہوگئیں اور کچھ عرصے بعد جب اچانک ان کا انتقال ہوا تو مخمور صاحب پر اس قدر شدّت کی دیوانگی طاری ہوئی کہ وہ تقریباً چھ ماہ تک قبرستان میں بیوی کے مزار کے قریب پڑے رہے رفتہ رفتہ جب حالت سنبھلی اور وہ شب و روز کے کاموں میں مصروف ہو گئے تو احباب و رشتہ داروں نے اُن کے ذہن کو یکسو کرنے اور دل کو طمانیت پہنچانے کے لیے انھیں دوسری شادی کے مشورے دیے اور اس طرح ان کی دوسری شادی خوشنودی بیگم نام کی خاتون سے ہو گئی جن کے بطن سے نسیم، بدر، لیقہ اور فخر چار بچے تولد ہوئے ان کے انتقال کے بعد متوفیہ کی چھوٹی بہن شکیلہ سے مخمور صاحب کے رشتے کی بات اس لیے چلی کہ موصوفہ بچوں کی خالہ تھیں اور ماں بن کر آئیں تو کم سن بچوں کی صحیح نگہداشت و تربیت ہو سکے گی مگر ایسا نہ ہوا اور پھر بعد میں احباب و اعزا کے شدید اصرار پر بچوں کی پرورش و دیکھ بھال نظر میں رکھتے ہوئے ایک مطلوبہ طلاق شدہ خاتون سے مخمور صاحب کی تیسری شادی ہو گئی یہ بیوی دق کی مریضہ تھیں — اور مستقل بیمار رہتی تھیں یہ بچوں کی نگہداشت اور پرورش کیا کرتیں خود مخمور صاحب اور بچوں کو ان کی تیمارداری کرنی پڑی اور تقریباً چھ سال گذار کر یہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں' اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ مخمور صاحب کے دورِ شباب اور شاعری کے عروج کے زمانے میں کچھ اور خواتین کی طرف سے بھی کوشش رہی اور پیش کش جاری رہیں کہ مخمور صاحب ان کو اپنے نکاح میں لے لیں ان میں ایک خاتون دلّی کے مشہور خاندان کی چشم و چراغ، مانی ہوئی ثقافتی و علمی و ادبی شخصیت اور دلّی کی مجلس زندگی کی خاص علمبردار تھیں اور دوسری خاتون دِلّی کی شاعرۂ ادیبہ اور دلّی کی محفلوں کی جان کہی جاتی تھیں لیکن ان کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔

۱۹۴۷ء کے بعد مخمور صاحب کی بزرگ ایرانی والدہ کا دہلی میں انتقال

ہوگیا تھا، ان کی پہلی بیوی پہلے ہی چل بسی تھیں دوسری بیوی خوشنودی بیگم بھی فوت ہوگئی تھیں اُن کی بیمار بیوی زبیدہ بھی گذر چکی تھیں اُن کے سوتیلے بھائی صغیر احمد کا سلوک اپنی ایرانی والدہ کے ساتھ اس قدر ناگفتہ بہ تھا کہ ماں نے مرتے وقت مخمور صاحب کی درخواست کے باوجود دودھ تک نہیں بخشا تھا، علاوہ ازیں پٹودی کی خوشحال زندگی کے بعد تقسیم ہند کے ساتھ ہی جو افتاد، جو مصیبت اور جو پریشان کن حالات مخمور صاحب کو پیش آئے وہ ایک ایسی درد بھری داستان ہے کہ سن کر دل دہل جاتا ہے ویسے تو ۱۹۴۷ء کے سنگین واقعات سے سارا ماحول ہی متاثر تھا لیکن اس کی طوفان خیزیوں، ہلاکتوں اور بربادیوں کا اثر اقلیتوں اور بالخصوص دلّی کے مسلمانوں پر زیادہ تھا پٹودی سے مخمور صاحب جب دہلی آئے تو یہاں بھی نفسا نفسی کا عالم تھا انھیں اپنے بیگانے نظر آتے، چھوٹے بچوں کا ساتھ، بوڑھی ماں، بیمار بیوی اور سوتیلا بھائی برادر یوسف کے مانند، ایسے حالات میں مخمور صاحب کا سوائے خدا کے اور کوئی سہارا نہ تھا اپنے ہی شہر میں اُن کو زندگی کے ناخوشگوار تجربوں اور صبر آزما امتحانوں سے دو چار ہونا پڑا حالات کی ناہمواریوں اور پریشانیوں کی وجہ سے ان کے دل و دماغ پر جو اثرات مرتب ہوئے انھوں نے ایسے درد و غم اور رنج و الم کی شکل اختیار کی جس نے زندگی بھر ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔

مخمور صاحب نے اولاد کی پرورش، تعلیم و تربیت اور گھر کا کاروبار چلانے کے لیے کس طرح کی دوڑ دھوپ، جدوجہد سعی کوشش اور محنت مزدوری تک سے کبھی گریز نہ کیا ڈاکٹر سلطان احمد محلہ رودگران میں ہومیوپیتھی کے مشہور ڈاکٹر تھے اور ایک درد مند دل بھی رکھتے تھے انھوں نے مخمور صاحب اور ان کے ایک یار مبین احمد سرشار دہلوی کو ہومیوپیتھی سکھائی مخمور اور سرشار دونوں نے ہومیوپیتھی سیکھی، سرٹیفکٹ حاصل کیے اور مخمور صاحب نے

Marfat.com

اپنے گھر پر ہومیوپیتھی کی پریکٹس شروع کردی، قدرت نے اُن کے ہاتھ میں شفا دی تھی ایک قلیل عرصے میں ان کی ہومیوپیتھی چل گئی اور اُن سے نازک سے نازک مریض بھی اچھے ہونے لگے، حبیب صاحب جو مخمور صاحب کے ایک خاص کرم فرما حاجی کریم الدین کے بڑے داماد مرگی دوروں کے سخت مریض تھے مخمور صاحب کے علاج ہی سے انھیں ایسا فائدہ ہوا کہ الحمدللہ وہ آج تک بقیدِ حیات ہیں اس کے علاوہ جو مریض ان کے پاس آتا اُس کا مخمور صاحب بھرپور علاج کرتے اور غریبوں سے فیس بھی نہ لیتے بلکہ اُن کو کچھ اپنی ہی جیب سے دیتے انھیں ہومیوپیتھی سے کوئی مالی منفعت نہ تھی بعض اوقات وہ دن بھر بھوکے رہتے، صرف چند کپ چائے اور دو چار پیسٹریوں پر ہفتوں گزر بسر کرتے تھے لیکن کبھی کسی شخص کو بھوکا، دکھی یا پریشان دیکھنا پسند نہ کرتے تھے اور مریض کے لیے تو وہ اپنی جان بھی دے سکتے تھے۔

حاجی کریم الدین کی ملنگ مشین تھی جس پر غراری بنانے کا کام ہوتا تھا مخمور صاحب سے اُن کے خاص تعلقات تھے دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے مخمور صاحب کے حالات اُن سے پوشیدہ نہ تھے چنانچہ ان کی مروت کے پیشِ نظر مخمور صاحب کو ان کے کارخانے کے حساب کتاب، مزدوروں کی تنخواہ اور دیگر اہم کاموں کی پیروی کی خدمت انجام دینی پڑتی تھی کبھی کبھی وہ ملنگ مشین پر بھی کھڑے ہوجاتے تھے اور بیشتر وقت کارخانے میں کام کرنے والوں کی نگرانی میں گذارنا پڑتا تھا اس طرح انھیں جو آمدنی ہوتی اس سے گھر کے اخراجات چلتے تھے۔

مخمور صاحب پٹودی سے دلّی پہنچے تھے تو جو کچھ پونجی اُن کے پاس تھی تو وہ ان کے چھوٹے سوتیلے بھائی صغیر احمد نے ان سے یہ کہہ کر لے لی تھی کہ وہ اس رقم سے رام پور میں ایک موٹر ورکشاپ کھولیں گے جس سے

Marfat.com

بہت زیادہ آمدنی ہو سکے گی۔ اس دھوکے سے رقم اینٹھ کر اُس نے رام پور میں کچھ نہ کیا اور مخمور صاحب کے بُرے وقت کے لیے جو سرمایہ بچا ہوا تھا اسے اِس طرح خرد برد کر دیا اور ان کا یہ سہارا بھی جاتا رہا۔

مخمور صاحب کے ایک دوست ماسٹر خلیل جو کیمیاگری کے دھتی تھے اُنھوں نے مخمور صاحب کو بھی کیمیاگری کا چسکا لگا دیا تھا اس شوق نے مخمور صاحب کو اس قدر دیوانہ کیا کہ اُن کی بیوی کے تمام زیور کیمیاگری کی بھینٹ چڑھ گئے اور اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے مخمور صاحب کا رہا سہا اثاثہ بھی جاتا رہا، لیکن اُنھوں نے کسی طرح اس شوق کا پیچھا نہیں چھوڑا کہا جاتا ہے کہ ماسٹر خلیل کیمیاگری کے فن سے واقف تھا وہ خود تو کبھی گھاٹے میں نہ رہا لیکن جس کو اُس نے اس راہ پر ڈالا وہ کبھی پنپ نہ سکا اور یہی مخمور صاحب کے ساتھ بھی ہوا ان حالات میں اُن کے اور ان کی بیوی کے درمیان ناچاقی کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا جو زیورات بیوی بچوں کا سہارا اور بُرے وقت کے ساتھی ہو سکتے تھے وہ خود بُرا وقت لے آئے مخمور صاحب کو زندگی بھر یہ آرزو رہی کہ وہ کیمیا بنالیں اور ان کی ہر کوشش ان کو کامیاب کوشش پر آمادہ کرتی تھی وہ اس شوق میں ذہنی طور پر اس منزل کو پہنچ گئے تھے کہ کسی دوسرے کام میں ان کا جی نہ لگتا تھا غرض یہ کہ کیمیاگری کی حسرت بھی وہ اپنے ساتھ ہی لے گئے۔

پٹودی کے زمانۂ قیام میں وہ بحیثیت شاعر خاص انداز سے منظر عام پر نہیں آئے تھے پٹودی ایک بہت ہی چھوٹی سی ریاست تھی جہاں کی ادبی دلچسپیاں بہت محدود تھیں چنانچہ وہاں مخمور صاحب اپنے فن کے جوہر کیسے دکھا سکتے تھے لیکن تقسیم ہند کے بعد دہلی کے مستقل قیام کے زمانے میں حالات سنبھلنے کے بعد جب یہاں ادبی مشاغل اور علمی محفلوں کا سلسلہ شروع ہوا تو انھوں نے احباب کے کہنے سننے سے یہاں کے

Marfat.com

مشاعروں میں شرکت شروع کی، ان کی خاص نشستوں، عام ادبی جلسوں اور اندرونی وبیرونی مشاعروں میں شرکت سے شہرت ومقبولیت کے دروازے رفتہ رفتہ کھل رہے تھے یہاں تک کہ انھیں عظیم اور نمائندہ مشاعروں کی دعوتیں ملنی شروع ہوئیں اور اس طرح نیک نامی کے ساتھ ساتھ مالی آمدنی بھی ہونے لگی اور اس طرح آمدنی اور گھر کے اخراجات کا بڑا ذریعہ ان کے لیے مشاعرے بن گئے تھے۔

تقسیم ہند کے بعد دہلی کے اکثر ارباب کمال اور مشاہیر فکروفن پاکستان چلے گئے تھے دلّی کی وہ روشن روایات جن کے دم سے دلّی ہمیشہ دلّی تھی وہ متنزلزل ہونے لگی تھیں شعروسخن کی محفلوں، علمی ادبی مشغلوں اور ثقافتی دھوم دھام کا وہ رنگ پھیکا پڑ گیا تھا جو دلّی کی مجلسی زندگی سے عبارت تھا اور ان فضاؤں میں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے آزادی کے بعد ایک نیا ماحول تو ضرور پیدا ہوا ہے لیکن وہ مولوی مدن والی بات غائب ہوگئی ہے جس طرح اٹھارویں صدی عیسوی کے زمانے میں رفتہ رفتہ سب اساتذہ فن دہلی سے لکھنؤ سدھار رہے تھے لیکن خواجہ میر دردؔ نے دلّی کو خیرباد نہ کہا تھا بعد کے زمانے میں بہت سے دوسرے اہل کمال دلّی چھوڑتے رہے لیکن مومنؔ اپنی بے نیازی سے کہیں نہیں گئے اور استاد ذوقؔ نے دکن میں قدرسخن کے باوجود دلّی کی گلیوں کو نہ چھوڑا اسی طرح تقسیم ہند کے بعد حضرت بیخودؔ دہلوی بھی ایک ایسی ذات تھی جو دہلی میں موجود رہی اور جن کے دم سے داغؔ اسکول اور اساتذہ دہلی کا نام برقرار رہا وہ مرتے دم تک دہلی ہی میں جمے رہے اور انھوں نے بچے کھچے دلّی والوں کے ساتھ دلّی کی شمع کو جلائے رکھا انہی دنوں میں مخمورؔ صاحب غزل کی ایک نئی آواز لے کر بساط دلّی پر ابھرے اور وہ بھی جو داغؔ کے بعد خالص غزل کے میدان میں برسوں سے محسوس کی جارہی تھی اس کی تلافی کا سبب بنے ——

Marfat.com

مخمور صاحب نے غزل میں اپنے مخصوص رنگ و آہنگ اور نرالے اسلوب بیان سے ایک بہت ہی قلیل عرصے میں دنیائے شعر و ادب کو اپنی طرف کچھ اس طرح متوجہ کیا کہ ان گنت دلوں کو مسخر کر لیا اس طرح اُن کی دور دور دھوم ہو گئی اور وہ ہندوستان بھر کے مشاعروں میں مدعو کیے جانے لگے بیمار وہ ویسے بھی رہتے تھے آئے دن کے سفر کی صعوبتیں، شب بیداری، کھانے پینے میں بے احتیاطیاں، اور رات کی بے اعتدالیاں، مسلسل چائے نوشی اور بیڑی سگریٹ کی لت ان سب نے مل کر اُن کی صحت کو بے حد خراب کر دیا تھا ویسے دیکھنے میں وہ تندرست نظر آتے تھے لیکن جسم کے اندر کی بیماریوں سے کھوکھلے ہو چکے تھے اور آمدنی کم اخراجات زیادہ کے نفسیاتی احساس، گھریلو ذمہ داریوں کے غیر معمولی بوجھ، ذہنی انتشار، دماغی خلفشار اور طبیعت کی پراگندگی کے سبب سے ہمیشہ روحانی کش مکش میں مبتلا رہتے تھے جسم کو جب تکلیف ہوتی ہے تو روح پر اثر پڑتا ہے اور روح جب اذیت محسوس کرتی ہے تو اس کا دل و دماغ اور جسم سب پر اثر پڑتا ہے یہ تھی وہ زندگی جس سے مخمور صاحب زور آزمائی کر رہے تھے لیکن پھر بھی ہنستے کھیلتے موج حوادث سے گزرتے رہے کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ آسانیاں زندگی کو دشوار کر دیتی ہیں اس لیے جتنی دشواریاں ملیں انھیں قبول کرتے جاؤ اور رنج کے ایسے خوگر ہو جاؤ کہ جتنی مشکلیں پڑیں سب آسان ہو جائیں۔

مخمور صاحب چونکہ اپنا شریک غم کسی کو نہیں بناتے تھے اپنے دل کا حال کسی سے نہیں کہتے تھے اس لیے اندر ہی اندر گھل رہے تھے آدمی دل کی بھڑاس نکال کر ہلکا ہو جاتا ہے ان میں یہ عادت نہ تھی کہ فاقوں میں بھی کسی سے بھوک پیاس کی شکایت کریں یا کسی سے کچھ طلب کریں اُن کی اس مستقل گھٹن نے انھیں دل کے عارضے میں مبتلا کر دیا تھا وہ اس کا ذکر بھی

Marfat.com

کسی سے نہ کرتے تھے جاننے والے جب اس کا ذکر کرکے ان سے احتیاطوں کے لیے توجہ دلاتے تو وہ ٹال جاتے تھے وہ اسی عالم میں اپنے شب و روز اس لیے کاٹتے رہے کہ کسی طرح اپنے بچوں جن کے وہ باپ، ماں اور سب کچھ تھے پرورش و تعلیم و تربیت کے لیے انتظام کرسکیں مگر ان کی شب و روز کی مصروفیتوں یعنی مشاعروں میں شرکت، اس کے لیے تازہ شعر کہنے، شاگردوں کے کلام کی اصلاح کرنے، کارخانے کا حساب کتاب دیکھنے، ہومیوپیتھی کے دواخانے کو چلانے اور حد تو یہ ہے کہ دوسروں کو حق محنت پر اور بعض اوقات پر بنائے دوستی و تعلق شعر کہہ کر دینے سے گونا گوں کاموں کے سبب دن بدن ان کی حالت بگڑتی رہی اور انجام جو ہونا تھا وہی ہوا کہ ان کو اپنی زندگی کی آس نہ رہی چنانچہ انھوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ غالباً اب وہ زیادہ دن زندہ نہ رہ سکیں اس لیے اپنے بچوں کو وصیت کی کہ میرے بعد کیمیا گری سے متعلق جو کتابیں ہیں ان سب کو نذر آتش کر دینا اس مُردا شوق میں مبتلا نہ ہونا اور زندگی میں ہمیشہ خودداری، سچائی، محنت، ایمانداری اور نیک نیتی کے اصولوں کو پیش نظر رکھنا تاکہ دنیا و آخرت میں سرخرو ہوا ور خاندان کے نام کی رسوائی نہ ہو۔

وہ مالیر کوٹلے کے مشاعرے سے واپس ہو رہے تھے کہ اچانک دل کا دورہ پڑا، سفر میں بڑی تکلیف اٹھائی، کئی کئی جگہ بسیں بدلیں، راہ میں شدت کی سردی تھی اُسے بھی جھیلا، گھر آتے آتے حالت اور بگڑی اور خون تھوکنے لگے۔ اسی دوران دل کا دوسرا دورہ پڑا دوائیں کی گئیں لیکن کوئی کارگر نہ ہوئی انھی دنوں دلّی کلاتھ مل کا مشاعرہ ہو رہا تھا جس میں مخمور صاحب کو بطور خاص مدعو کیا گیا تھا ایسی حالت میں اُن کا شریک ہونا قطعاً ناممکن تھا لیکن منتظمین کے بے حد اصرار اور اپنی ضرورت کے پیش نظر اپنے صاحب زادے بدر جاں کو مشہور غزل سے

اب تو گھر جلنے لگا نوبت یہاں تک آگئی　　بڑھتے بڑھتے آتش گل آشیاں تک آگئی

دے کر مشاعرے میں اپنی طرف سے پڑھنے کے لیے بھیجدیا بدر غزل پڑھ کر جب واپس ہوئے تو مخمور صاحب آرام کر رہے تھے بدر نے غزل کی کامیابی کا ذکر کیا تو غنودگی میں ہوں ہاں کر کے رہ گئے بدر اُن کے قدموں میں لیٹ گئے اور ان کی آنکھ لگ گئی تو اچانک مخمور صاحب کی بڑی صاجزادی نسیمہ نے بدر کو جگا کر مخمور صاحب کے شاگرد حاجی یاسین صادق کو بلانے کے لیے بھیجا حاجی صادق آئے تو اس وقت تک مخمور صاحب ہوش میں تھے صادق صاحب سرہانے سے ہٹنا نہیں چاہتے تھے کہ انھیں تسلی دے کر مخمور صاحب نے خود کہا کہ آپ جائیں ضرورت ہوگی تو بلالیا جائے گا بعد اصرار صادق صاحب جیسے ہی گھر پہنچے تو پیچھے سے بدر نے اطلاع دی کہ مخمور صاحب تو بے حس و حرکت پڑے ہیں کچھ بولتے ہی نہیں، صادق نے واپس جاکر دیکھا تو مخمور صاحب کی روح پرواز کرچکی تھی اور اس طرح وہ ۲۶ رفروری ۱۹۵۶ء کی صبح چار بجے بعمر ۵۶ سال اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔

مخمور صاحب دراز قد، چھریرہ جسم، کشادہ پیشانی، ہلکی سانوی رنگت موٹی مناسب ناک، کلین شیو کے ساتھ ہلکی مونچھیں، تصور و تفکر سے بھرپور آنکھیں، دلکش خط و خال، سنجیدہ و پر وقار چہرہ، لب خاموش لیکن ہزاروں سوال لیے ہوئے، ہمہ وقت کسی نہ کسی سوچ میں ڈوبے ہوتے، نحیف و کمزور جثے والے متین، گمبھیر اور ہر طرح متناسب الاعضا شخصیت کے مالک تھے۔

عام طور پر قمیض، پاجامہ، واسکٹ پہنتے اور سر پر کپڑے کی مختلف ہلکے رنگوں کبھی فیروزی اور کبھی سفید ٹوپی ہوتی تھی کبھی کبھی سگریٹ اور زیادہ تر بیڑی کا شوق تھا تمباکو نوشی کے ساتھ چائے بھی لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی تھی۔

عام طور پر ان کی دو تین نشست گاہیں تھیں ایک تو عبدالحکیم مرحوم کا

Marfat.com

ہوٹل تھا جو حکیم جی کے ہوٹل کے نام سے مشہور تھا یہ ہمدرد دوا خانے کے بالکل سامنے تھا آج کل اس میں سینٹری اور بلڈنگ مٹنگ کا سازو سامان بکتا ہے دوسری نشست گاہ فیل ہوٹل تھی جو کوچہ پنڈت کے قریب لبِ سڑک واقع تھی اور تیسری جگہ وہ ہوتی تھی جہاں بیٹھ کر وہ شطرنج کھیلتے تھے یہ کوئی بھی جگہ ہوسکتی جہاں انھیں شطرنج اور اس کے شوقین مل جائیں ان مقامات پر وہ اخبار بینی، شعرائے سے ملاقاتیں، شاعری پر بات چیت شاگردوں کو اصلاحیں اور مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے نظر آتے تھے غالب انداز گل افشانی گفتار پیمانہ وصہبا کے آگے ڈھاتے تھے مخمور صاحب کو سگریٹ بیڑی اور چائے کی بہت لت تھی وہ عام طور پر حکیم جی کے ہوٹل میں بالکل اندر والی سیٹ پر گھٹنے پیٹ سے لگا کر بیٹھتے تھے اور ہر بات کا جواب نہایت دھیمی آواز میں دیتے، کبھی بہت سنجیدہ ہوتے کبھی نارمل اور کبھی تبسم زیر لب کی کیفیت ہوتی جب وہ محو گفتگو ہوتے تو لوگ بصد احترام ان کی باتیں سنتے — بے تکلف دوستوں اور ملاقاتیوں سے وہ نہایت باغ و بہار ہوکر ملتے تھے۔

مخمور صاحب میرے استاد بھائی تھے ۱۹۵۰ء تک میں اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول، اجمیری گیٹ دلی کا طالب علم تھا ۱۹۵۱ء میں جب مسلم یونیورسٹی میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم ہوکر علی گڈھ گیا تو دہلی میں مخمور صاحب کا طوطی بول رہا تھا اس زمانے میں استاد بیخود بھی حیات تھے میرا دہلی آنا جانا رہتا استاد بیخود کی خدمت میں حاضر ہونا اور یہاں کے مشاعروں میں شرکت برابر رہتی تھی اسی دوران مخمور صاحب سے ملاقاتیں باتیں اور مختلف علمی و ادبی عنوانات پر دل چسپ گفتگو رہتی تھی وہ تلامذۂ بیخود میں مجھ سے بڑا خلوص رکھتے تھے میری درخواست پر دہلی کے مختلف مشاعروں میں شریک ہوتے اور کبھی کبھی باہر جاتے، ان کے تلامذہ میں

Marfat.com

حاجی محمد یاسین صادق دہلوی تو اولیت رکھتے ہیں اس کے بعد دوسرا نمبر صوفی خلیق کا ہے جو آج کل جے پور میں مقیم ہیں یہ حضرات تو مخمور صاحب کے براہ راست شاگرد ہوئے لیکن آنجہانی ڈاکٹر پریم لعل شفا دہلوی جن کا مطب بارہ ٹوٹی صدر بازار میں تھا پہلی بار حکیم جی کے ہوٹل لال کنویں مخمور صاحب سے ملنے میرے ساتھ گئے میں نے ہی ان کا تعارف مخمور صاحب سے کرایا شفاؔ صاحب کو مخمور صاحب کی ذات سے شاعری سے گہری عقیدت تھی انھوں نے مخمور صاحب کے آگے زانوے ادب تہہ کرنے اور شاگردی اختیار کرنے کی درخواست کی جس پر مخمور صاحب خاموش ہو گئے کیونکہ وہ بھی استاد بیخودؔ کی طرح آسانی سے کسی کو اپنا شاگرد نہیں بناتے تھے لیکن شفا صاحب کی علمیت، ذوق شاعری اور گہری عقیدت کے پیش نظر اصلاح دینے پر آمادہ ہو گئے ان کا یہ سلسلہ تادم آخر قائم رہا اور شفا صاحب نے بھی زندگی بھر اپنا حق شاگردی نبھایا۔

یوں تو مخمور صاحب کو کئی مشاعروں میں لیجاتے، پڑھواتے اور متعدد جگہ زحمت دینے کے موقعے پیش آئے لیکن ایک دو واقعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن سے اُن کی عظمت، عزت اور مرتبے کا پتہ چلتا ہے ۱۹۵۳ء میں علی گڈھ یونیورسٹی اسٹوڈنس یونین کا سالانہ جلسہ اسٹریچی ہال میں منعقد ہوا اس کی انتظامیہ کمیٹی میں میں بھی شامل تھا میری تجویز پر مخمور صاحب کو اس مشاعرہ میں مدعو کیا گیا مشاعرے کے دن مخمور صاحب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ اور ساحر ہوشیارپوری کے ساتھ علی گڈھ آئے اور شریک مشاعرہ ہوئے علی گڈھ کے مشاعروں کی روایات سے جو لوگ واقف ہیں انھیں معلوم ہے کہ ان مشاعروں میں عظیم سے عظیم شاعر اڑا دیا جاتا تھا اور نیا زمند سے نیازمند شاعر کی ہوا بندھ جاتی تھی مذکورہ مشاعرہ میں اس زمانے کے نامور شعرا ڈائس پر موجود تھے مخصوص سامعین میں وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین،

Marfat.com

پروفیسر رشید احمد صدیقی اور مختلف شعبوں کے پروفیسروں، ریڈروں کے علاوہ بیشتر اساتذہ کرام تشریف فرما تھے مشاعرہ اپنے شباب پر تھا کہ مخمور صاحب کا نام پکارا گیا مخمور صاحب مائک پر آئے تو طلبا نے ایک نحیف و کمزور آدمی کو سادہ لباس میں دیکھ کر شور و غل برپا کر دیا سیٹیاں بجنے لگیں اور ہال میں سوائے شی شی کی آوازوں کے اور کچھ سنائی نہیں دیتا تھا کہ مخمور صاحب نے جیسے ہی مطلع سے

دوئی کا تذکرہ توحید میں پایا نہیں جاتا　　جہاں میری رسائی ہے میرا سایا نہیں جاتا

آپ نے خداداد موسیقی رمز ترنم سے پڑھنا شروع کیا تو ہال میں سناٹا چھا گیا اور فضا اک دم بدل گئی اور پھر تو یہ عالم تھا کہ داد و تحسین اور تالیوں کی گونج میں ہر شعر کئی کئی بار پڑھوایا جاتا اور بعد میں فرمائشی غزلیں سنی گئیں مخمور صاحب غزلیں پڑھ پڑھ کر پسینہ پسینہ ہو گئے اور یہ مشاعرہ انہی کے ہاتھ رہا۔

دہلی میں ان کے دوستوں کی کمی نہ تھی لیکن اُن میں کچھ ان کے حریف اور کچھ دوست نما دشمن بھی تھے جو مشاعروں میں انھیں بے پناہ داد دیتے لیکن پس پشت ان سے جلتے، اُن میں نت نئے عیب نکالتے اور اُن کے شعروں پر اعتراض کرتے، ایک بار صدر بازار باڑہ ہندو راؤ میں میرے خصوصی احباب نے ایک شاندار مشاعرے کا اہتمام کیا جس میں بیرونی شعراء کے علاوہ دہلی کے نمائندہ شاعروں میں مخمور صاحب کا نام سرفہرست تھا مشاعرے میں معترضین مخمور بھی باقاعدہ ٹولہ بنا کر شریک تھے مشاعرہ شروع ہوا جب یہ اپنے شباب پر پہنچا تو اس وقت فضاؤں میں مخمور صاحب کی مترنم آوازیں ان کے اشعار گونج رہے تھے پھر کون کس کو سنتا، مخمور صاحب اس قدر چھائے کہ سارا ماحول ہی مخمور ہو گیا۔ اسی طرح ایک بار ادارۂ تعلیم و ترقی کے زیر اہتمام صدر ہی کے علاقے میں ایک مشاعرہ اس زمانے کی

Marfat.com

اسٹیٹ کے وزیر تعلیم مولانا شفیق الرحمٰن قدوائی کی صدارت میں ہوا، اس مشاعرے کے اہتمام میں میں پیش پیش تھا میں پروگرام کے مطابق مخمور صاحب کو اپنے ہمراہ رکشا میں لارہا تھا کہ اچانک ان کا ہاتھ میرے ہاتھ سے مس ہوا اور مجھے محسوس ہوا کہ اُنھیں شدت کا بخار ہے میں نے ان سے لاکھ کہا کہ وہ مشاعرے میں شریک نہ ہوں آرام کریں میں منتظمین سے اظہار معذرت کر دوں گا لیکن وہ نہ مانے اور کہنے لگے کہ ایک تو وعدہ اور وہ بھی خصوصی احباب سے وعدہ، پھر لوگ نہ جانے کب سے منتظر ہونگے میں اپنے بارے میں غلط رائے پیدا کرانا نہیں چاہتا، اس لیے کسی حالت میں میں بھی جاؤں گا وہ آئے، مشاعرہ اور بھی شاندار انداز سے پڑھا، احباب برابر فرمائشیں کرتے رہے اور وہ لگاتار پڑھتے رہے اور کسی کو پتہ تک نہ ہونے دیا کہ ان کی کیا حالت ہے مشاعرہ ختم ہونے پر گھر پہنچے تو نڈھال ہو چکے تھے اور تقریباً پندرہ روز تک بستر پر دراز رہے۔

شعرا میں ایک صاحب کو اپنی علمیت وہمہ دانی پر بڑا ناز تھا وہ تمام شاعروں میں کچھ نہ کچھ عیب نکالتے رہتے تھے، موئے تفصیل الفاظ، فارسی ترکیبیں، مشکل مضامین اور سخت زمینوں میں شعر کہنے کا ان کو ہوکا تھا اور ہر مشہور شاعر پر شعر کہہ کہہ کر شہر میں گشت کراتے تھے، مشاعروں میں بحر، وزن اور سکتہ اور گرامر کی گردان کیا کرتے تھے کبھی کبھی سازشیں کر کے طرحی مشاعروں کے ایسے مصرعے دیا کرتے تھے جس سے بھولے اور شریف شعرا کی آزمایش مقصود ہوتی اور حد یہ تھی کہ اساتذۂ فن تک میں بھی وہ عیب نکالا کرتے تھے ایک بار جامع مسجد کے علاقے میں ایک طرحی مشاعرہ ہوا جس میں نومشقوں کے علاوہ اساتذہ نے بھی اپنی غزلیں پڑھیں کوئی بھی ان کے حربے سے نہیں بچا ان کی نظر میں کسی کا وزن ساقط، کسی کا بحر سے خارج، کسی کے مضمون میں لقمہ، کسی کے شعر میں ذم کا پہلو اور کسی کے یہاں

Marfat.com

کچھ بھی نہیں تھا مخمور صاحب جب اس ہنگامی فضا میں ڈائس پر آئے تو سامعین یہ سمجھ کر کہ اب کیا ہونے والا ہے ہمہ تن چشم وگوش ہو گئے انھوں نے اپنے طرحی اشعار پڑھے از مطلع تا مقطع غزل کیا تھی سراسر گلستاں تھی مخمور صاحب مکرّر سہ کرّر کے شور میں مسلسل غزل پڑھ رہے تھے اور شاعر موصوف کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے جاتے تھے اور ادھر سامعین بھی یہ تماشا دیکھ رہے تھے شدت کی سردی میں شاعر موصوف کے ماتھے پر پسینہ آرہا تھا اور شرمندگی سے گردن جھکی جارہی تھی اس طرح ان کی ہمہ دانی ہوا میں اڑکر رہ گئی تھی مخمور صاحب نے پوری غزل اس فضا میں ختم کی اور داد وتحسین کے شور میں وہ اپنی مسند پر آکر بیٹھے کہ اچانک معلوم ہوا کہ شاعر موصوف مشاعرے سے غائب ہو گئے ہیں اور پھر وہ ایسے غائب ہوئے کہ مدتوں کسی مشاعرہ اور بالخصوص مخمور صاحب کے مشاعرے میں کبھی نظر نہ آئے۔

ان واقعات کے علاوہ اور بہت سی داستانیں ہیں جو ان کے شعرو ادب سے متعلق نشستوں، مشاعروں اور علمی وادبی معرکوں سے بھری ہوئی ہیں جن کے لیے ایک الگ وقت درکار ہے مخمور صاحب کو ویسے تو دہلی کی شعری محفلوں میں شرکت کے مواقع ان کی آمد دہلی ہی سے ملنے شروع ہو گئے تھے لیکن ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۶ء یعنی ان کے انتقال تک وہ دلی وبیرونی دلی کے مشاعروں میں مسلسل شرکت کرتے اور کامیاب ہوتے رہے اور اس طرح شب وروز ان کی مقبولیت اس قدر بڑھی کہ کوئی بڑا مشاعرہ اُن کے بغیر بے جان معلوم ہوتا تھا اور ان کی موجودگی کسی بے جان مشاعرے کے قالب میں روح کا کام کرتی تھی۔

استاد بیخود دہلوی کے بارے میں اتنی بات سب جانتے ہیں کہ وہ طبیعت کے سخت غصیل اور نازک مزاج واقع ہوئے تھے اُن کے ذہن پر

Marfat.com

جو بات ذرا گراں گزرتی قیامت آجاتی تھی ان کا سنبھالنا اور سنبھلنا ایسے عالم میں قطعاً ناممکن تھا ان کا یہ تعلق ان کے ہم عصروں میں کم و بیش سب کے ساتھ مساوی تھا وہ شعر و فن اور زبان و ادب کی بحثوں میں اپنے خواجہ تاشں بھائی تو کیا بعض اوقات جہاں استاد حضرت داغؔ دہلوی سے بھی اُلجھ جاتے تھے مخمور صاحب ہر چند کہ استاد بیخودؔ کے چہیتے شاگردوں میں تھے لیکن کچھ حاسدوں نے مخمور صاحب سے کچھ قصے وابستہ کرکے بیخودؔ صاحب کو ان کے خلاف بدظن کر دیا تھا جس کی وجہ سے بیخودؔ صاحب ان سے ناراض ہو گئے تھے ایک عرصے تک یہ حاسد اِدھر کی اُدھر اور اُدھر کی اِدھر لگاتے رہے اور معاملے کو طول دیتے رہے، میں ہفتے میں دو چار بار استاد بیخودؔ صاحب کی خدمت میں اصلاح کی غرض سے حاضر ہوتا رہتا تھا اور کوشش رہتی تھی کہ کسی طرح مخمور صاحب اور ان کے درمیان جو غلط فہمیاں حاسدوں نے پھیلا رکھی ہیں اُنھیں دور کیا جائے مگر بیخودؔ صاحب کے سامنے بات کرنے کے لیے ہمت کی ضرورت تھی جو آسان کام نہ تھا بہرحال میری کوششیں جاری رہیں اس سلسلے میں میں نے ابن بیخودؔ حضرت سیّد دہلوی المعروف چھدری کو بھی اپنا ہم خیال بنایا، یہ زمانہ مخمور صاحب کی شاعری کا دورِ شباب تھا میں بیخودؔ صاحب کی خدمت میں موقع محل پاکر مخمور صاحب کے مقبول و پسندیدہ شعر سنایا کرتا جس سے رفتہ رفتہ ان کے دل میں مخمور صاحب کی محبت جاگ گئی اور پھر جب حاسدوں کی اڑائی ہوئی باتوں اور غلط فہمیوں کے پردے چاک کیے گئے اور بیخودؔ صاحب کو اصلیت کا علم ہوا تو استاد و شاگرد کے فاصلے اتنے کم ہوئے کہ ایک اور موقعہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں انھیں بیخودؔ صاحب کی خدمت میں لے گیا دیکھتے ہی ٹوٹ کر ملے، بے اختیار گلے سے لگا لیا، اپنے قریب بٹھایا تازہ شعر سنے اور بے حد تعریف کی، بیخودؔ صاحب کو اپنے شاگردوں سے بے حد محبت تھی

Marfat.com

انھوں نے اس سلسلے میں کہا ہے ؎

ہم جانتے ہیں بیتاب ہیں سارے شاگرد　　اللہ نے بخشے ہیں یہ پیارے شاگرد
جس طرح سے ہم داغ کے شیدائی تھے　　عاشق ہیں اسی طرح ہمارے شاگرد

انھیں مخمور صاحب اور بالخصوص اپنے دوسرے سینئر شاگردوں سے واقعی اس قدر محبت تھی کہ وہ ان پر ناز کرتے تھے اور دم بھر ان کو اپنی نظر سے جدا کرنا نہ چاہتے تھے انھوں نے ایک رباعی میں اس بات پر روشنی ڈالی ہے جس سے اُن کی چاہت اور مخمور صاحب سے محبت اور اسی تخلص ایک اور شاگرد (مخمور) سے گہرے دلی لگاؤ کا پتہ چلتا ہے ملاحظہ ہو۔

قیصرؔ ہو قمرؔ ہو یا ہو اس میں مسرورؔ　　میکشؔ ہو، بشیرؔ ہو کہ دونوں مخمورؔ
فاورؔ سہی، ناقدؔ سہی یا قدرؔ سہی　　دم بھر نہیں رہے گا مرے دل سے کوئی دور

حضرت بیخودؔ دہلوی نے ۲ ر اکتوبر ۱۹۵۵ء کو انتقال فرمایا اس موقع پر مخمور صاحب بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے اپنے کاندھوں پر بیخودؔ صاحب کو قبرستان درگاہ خواجہ باقی باللہ پہنچا کر آئے انھیں کیا معلوم تھا کہ یہ فراق زیادہ طویل نہیں وہ خود بھی ۲۶ ر فروری ۱۹۵۶ء یعنی صرف پانچ ماہ بعد استاد بیخودؔ کے قریب ہی میں درگاہ خواجہ باقی باللہ کے قبرستان میں پیوند خاک ہو گئے۔

مخمور صاحب کے انتقال کے بعد ان کی بیش قیمت کتابیں ان کے دوست کرامت اور بوٹا سنگھ نے اِدھر اُدھر کر دیں چھوٹے بھائی ضمیر احمد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے مخمور صاحب کی ایک بیاض اڑا لی اور کچھ عرصے تک وہ اس کے بل پر شاعر بنے رہے ایک خاتون جو تادم آخر ان کے کلام کی خوشہ چیں رہیں کچھ ان کے بھی ہاتھ لگا اسی طرح کچھ عرصے وہ اپنی شاعری چمکاتی رہیں مخمور صاحب کو کشتہ سازی کا بھی شوق تھا ان کے انتقال کے وقت جو کشتے تیار تھے وہ مال غنیمت کے طور پر کچھ احباب اڑا

Marfat.com

لے گئے غرض یہ کہ جو کچھ ان کا اثاثہ تھا وہ سب اس طرح خرد برد ہو گیا اور ان کی اولاد نامراد، محروم اور مفلس و متلاشی رہ گئی جس کی ترقی و خوشحالی کے نہ جانے کتنے خواب وہ اپنے ساتھ لے گئے وہ ایک اچھے باپ کی طرح اپنے دکھی بچوں کو خوش و خرم اور عزت و عظمت کے مینار پر دیکھنا چاہتے تھے انھوں نے زندگی میں کئی بار اس کا اپنے بچوں سے بھی کھل کر اظہار کیا کہ وہ ان کے لیے کچھ نہ کر سکے مخمور صاحب کے بعد ان کی اولاد بھی نت نئے ناگفتہ حالات کا شکار رہی مخمور صاحب کی حیات میں جن وقتی مطلب پرستوں نے ان کو گھیر لیا تھا اُن کی موت کے بعد بھی وہ جونک بن کر اولاد کو چمٹے رہے ان کی اولاد میں بدر کی تعلیم پہلے کریم الدین کے بڑے داماد حبیب صاحب کی سرپرستی میں جامعہ میں ہوئی پھر انھیں پروفیسر مجیب نے اپنی سرپرستی میں لے لیا اور اس کے بعد بخشی غلام محمد سابق وزیر اعظم جموں کشمیر کی غیر معمولی دل چسپی اور نوازشوں کے طفیل اولاد مخمور کی تعلیم و تربیت اور کفالت کی صورت پیدا ہوئی نسیمہ نے دسویں جماعت تک تعلیم پائی ان کی پہلی شادی ایک زور زبردستی کا نتیجہ تھی جس سے نجات حاصل کر کے ماشاء اللہ آج وہ نہایت خوشحال و متمول ہیں ان کے شوہر ایک مشہور آرکیٹکٹ اور شہرت یافتہ شخص ہیں جنھوں نے ہندوستان کی مختلف مشہور عمارتوں کی منصوبہ بندی کی ہے بدر مخمور نے کمرشل آرٹ میں نیشنل ڈپلومہ کیا ہے دہلی یونیورسٹی سے بی اے کیا ہے، آرٹ میں امتیازی خصوصیت حاصل کر کے گولڈ میڈل پایا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ چودھویں صدی ہجری کا ڈاک ٹکٹ بھی انہی کا ڈیزائن کیا ہوا ہے یہ آج کل ٹریڈ فیئر اتھارٹی آف انڈیا میں جوائنٹ منیجر (ٹیکنیکل) ہیں اور ہر طرح آسودہ حال ہیں لیقہ نے علی گڈھ سے اردو ایم اے کیا ہے اور اب کریسنٹ پبلک اسکول دہلی میں اردو کی استاد ہیں فخر نے معمولی تعلیم پائی ہے اور وہ محنت مزدوری کر کے

Marfat.com

اپنا گھر چلا رہے ہیں مجموعی اعتبار سے مخمور صاحب کی اولاد خوش وخرم اور بہتر زندگی گزار رہی ہے نسیمہ اور بدر اچھے شاعر ہیں اور لیقہ بہت اچھا گاتی ہیں۔

مخمور صاحب کا شمار اُن خوش قسمت شعرا میں کیا جا سکتا ہے جن کو قدرت اچھے شاگردوں سے نوازتی رہے حاجی یاسین صادق دہلوی ان کے پہلے شاگرد ہیں جو ماشاءاللہ حیات ہیں مشہور صوفی ہیں اچھا شعر کہتے ہیں اور کیونکہ مخمور صاحب کے ترنم میں بڑے والہانہ دسنانہ انداز سے پڑھتے ہیں ان کی کسی زمانے میں گلی قاسم جان میں سوڈا واٹر کی دکان تھی جہاں میں نے مخمور صاحب اور ان کے صاحبزادے بدر کو حساب کتاب میں مصروف دیکھا تھا اس کے بعد جب صادق نے اپنا کارخانہ شروع کیا تو مخمور صاحب کی نشست وہاں بھی رہنے لگی مخمور صاحب کی حیات تک صادق صاحب ایک محنتی کارخاندار اور ان کے نیازمند شاگرد تھے یہ ان کے آڑے وقت میں ہمیشہ کام آتے رہے اور صوفی ہو جانے کے بعد بھی استاد کی اولاد کے ساتھ ان کا سلوک قابل تعریف رہا جس کا اعتراف اولاد مخمور کو بھی ہے صادق صاحب آج بھی شعر کہتے ہیں روحانی محفلوں میں شرکت کرتے ہیں۔ اور ملک میں اُن کے ہزاروں مرید ہیں ان کے دوسرے شاگرد مولانا خلیق ہیں جو خوش نویسی کے فن میں ماہر ہیں تصوف سے گہرا رشتہ قائم ہوا تو صادق دہلوی کی طرح حضرت شاہ محمد حسن (بھنوڑی شریف) کے حلقہ ارادت سے وابستہ ہوئے اور آج کل چاندپول دروازے جے پور کی ایک مسجد کے امام ہیں شعر اب بھی کہتے ہیں اور مشاعروں میں بھی برابر شریک ہوتے ہیں ان کی علمیت، لیاقت اور شعر گوئی قابل تعریف ہے۔

ڈاکٹر پریم لعل شفا دہلوی جن کا ذکر گذشتہ سطور میں ہو چکا ہے مخمور صاحب کے تیسرے شاگرد تھے جو شروع میں نظم کہتے تھے مخمور صاحب

کے مشورے پر غزل کی طرف مائل ہوتے یہ کئی زبانوں انگریزی، ہندی، فارسی، اردو، روسی، جرمنی، فرانسیسی اور اطالوی کے عالم تھے پشکن اور میکم گورکی کے کئی تراجم انھوں نے اردو میں کیے حاجی صادق اور مولانا فلیق کی طرح ان کی طبیعت بھی تصوف کی طرف مائل تھی اور بہت ڈوب کر کہتے تھے صادق صاحب کی طرح یہ بھی صاحب دیوان شاعر تھے ان کا کلام نسخۂ شفا کے نام سے شائع ہو چکا ہے، ان کا ایک شعر تو زبان زد خاص و عام ہے ؎

یا تو دیوانہ ہنسے یا تم جسے توفیق دو ورنہ اس دنیا میں رہ کر مسکرا سکتا ہے کون

ابھی دو سال قبل ان کا انتقال ہوا ہے مخمور صاحب کو ان سے بڑا لگاؤ تھا وہ شفا صاحب کے مشاعروں، محفلوں اور ادبی پروگراموں میں بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے اور ڈاکٹر شفا بھی ان کی عزت و تکریم باپ سے زیادہ کرتے تھے وہ مخمور صاحب کی بیماری کے دوران ان کے علاج کی طرف بھی خاص توجہ دیتے تھے شفا صاحب کا مطب بارہ ٹوٹی، صدر بازار ٹیگور اکاڈمی بلڈنگ کی نچلی منزل میں تھا جہاں آج کل ان کے لڑکوں کا اسٹین لیس اسٹیل کا کاروبار نہایت اعلا پیمانے پر چل رہا ہے۔

ان کے علاوہ بھی مخمور صاحب کے دو شاگرد اور تھے ایک محمد اختر نجیب آبادی جن کا مجموعۂ کلام اصلاح کے لیے مخمور صاحب کے پاس تھا جسے انھوں نے اصلاح دے کر اپنی موت سے کچھ عرصے قبل اختر صاحب تک پہنچانے کے لیے حاجی صادق کے حوالے کر دیا تھا اختر صاحب کا اب انتقال ہو چکا ہے — دوسرے مسلم گورکھپوری ہیں جو ڈاکٹر محمود قادری اسعد گورکھپوری سابق ایڈیٹر روزنامہ 'الجمعیت' کی معرفت مخمور صاحب کے شاگرد ہوتے تھے انھوں نے اپنے کلام پر اصلاح لی ہے اور یہ ابھی بقید حیات ہیں اس کے علاوہ بھی مشورۂ سخن کے لیے بہت شعرا ان کی خدمت میں آتے لیکن شاگردی کا تعلق صرف

Marfat.com

مذکورہ حضرات سے ہی رہا۔

مخمور صاحب کا پہلا مجموعہ کلام ' بادۂ مخمور ' کے نام سے جنوری ۵۲ ۱۹ء میں شائع ہوا تھا اسی کے ساتھ ان کی شہرت بھی ملک بھر میں پھیل گئی تھی اور ان کی مشہور غزلوں کے بیشتر اشعار دلدادگان شعر و ادب کی زبانوں پر جاری رہتے تھے بادۂ مخمور میں ان کا تعارف ان کے استاد بھائی اور جاں نثار دوست ڈاکٹر معین احمد سرشار دہلوی نے تحریر کیا تھا۔ اور شاعری پر اپنی بیش قیمت رائیں، نوح ناروی، مانی جائسی، مولانا واصف دہلوی کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور مولانا حفظ الرحمٰن نے دی تھیں اس دیوان کی اشاعت میں ان کے قدیم مربی و ممدوح نواب افتخار علی خاں والئ پٹودی نے گہری دلچسپی لی تھی ' بادۂ مخمور ' کی مقبولیت کا ایک زمانے میں یہ عالم تھا کہ کلام داغ و جگر کی طرح مغنی، قوال اور فنکار اسے محفلوں، گلیوں، کوچوں اور بڑے بڑے موسیقی کے پروگراموں میں گا گا کر لوگوں کے دلوں کو برماتے اور روحوں کو گرماتے تھے اور فقیر اور صوفیا ر اسیر درگاہوں اور خانقاہوں میں سر دھنتے تھے۔

مخمور صاحب کے انتقال کے بعد پہلا یوم مخمور ۵۷ ۱۹ء میں عیدگاہ کے وسیع میدان میں بصد اہتمام منعقد کیا گیا تھا اور اس میں مخمور صاحب کے مصرعہ

تعجب ہے ذرا سی روشنی دیکھی نہیں جاتی

پہ طرحی مشاعرہ ہوا مشاعرے کی صدارت سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید نے فرمائی، مہمان خصوصی کے طور پر مشہور انقلابی رہنما ئے جنگِ آزادی ڈاکٹر سیف الدین کچلو شریک تھے بخشی غلام محمد نے افتتاح کے فرائض انجام دیے تھے اس میں دلّی و بیرون دلی سے بیشتر شعراء نے شرکت کر کے طرحی غزلیں پڑھی تھیں اور پھر فنکاروں نے مخمور کا کلام پیش کیا تھا دلّی والوں کے دلوں پر اس یوم مخمور کی یادیں آج تک نقش ہیں اس موقعہ پر منعقدہ طرحی

Marfat.com

مشاعرہ کا ایک گلدستہ بھی بعد میں شائع ہوا تھا یوم مخمور کی منتظمہ کمیٹی اور گلدستۂ یوم مخمور کے انتخاب میں میرا نام بھی شامل تھا اس کے بعد اسی سال دسمبر ۱۹۵۷ء میں ان کا بقیہ کلام جس کا غالب حصہ صوفیانہ رنگ سے مملو تھا 'عرفان مخمور' کے نام سے شائع کیا گیا جس میں شاگردان مخمور نے گہری دل چسپی لی اور بخشی غلام محمد مرحوم کی بھرپور توجہ سے یہ کام تکمیل کو پہنچا، 'عرفان مخمور' کا پیش لفظ ڈاکٹر پربم لعل شفا نے تحریر کیا تھا مولانا احمد سعید دہلوی چونکہ شاعر بھی تھے اور اسیر تخلص کرتے تھے اس لیے ان کی شاعرانہ باریکیوں پر گہری نظر تھی سب سے زیادہ یہ کہ وہ سخن سنج وسخن فہم بلا کے تھے اور مخمور صاحب ان کے محبوب شاعر تھے اس لیے انھوں نے "عرفان مخمور" میں اپنی گرانقدر رائے تحریر کی، ڈاکٹر محمود قادری اسعد گورکھپوری صحافی، نقاد ہونے کے علاوہ سخنور وسخن سنج بھی تھے اوران کا اردو فارسی ادب کے ساتھ انگریزی کا بھی گہرا مطالعہ تھا اس لیے انھوں نے تقریظ تحریر کی تھی اس کے علاوہ کچھ دیگر حضرات نے اپنی بیش قیمت رائیں دی تھیں جو 'عرفان مخمور' میں شامل ہیں۔ بعد میں ایک یوم مخمور ۱۹۵۸ء میں بھی منعقد کیا گیا تھا اس موقعہ پر جو مشاعرہ ہوا وہ بھی طرحی تھا اور طرح مصرعہ ہے

ہم نے توڑا ہی نہیں دستورِ میخانہ ابھی

بھی مخمور صاحب ہی کا تھا اس یوم مخمور کے مشاعرے میں بہت سے دہلی وبیرون دہلی کے شعراء نے غزلیں کہیں و مشاعرے میں پڑھی گئیں یہ گلدستۂ یوم مخمور 'کیف دوام' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد مخمور صاحب کی برسی کے موقعوں پر جو مشاعرے اور پروگرام ہوتے رہے ان کی غزلوں کو "کیف دوام" کے نام سے شائع کیا جاتا رہا اور یہ پروگرام اس قدر یادگار رہے کہ ان کی تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔

یوں تو مخمور صاحب کے شیدائیوں، معتقدوں اور چاہنے والوں کی فہرست تیار کی جائے تو بے شمار نکل آئیں گے لیکن وہ شخصیتیں جو کسی نہ کسی اعتبار سے مخمور صاحب کی پرستار، مداح اور مربی رہیں ان میں نواب علی خاں

Marfat.com

والیٔ پٹودی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، بخشی غلام محمد، پروفیسر مجیب، ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا احمد سعید، اور مولانا ابوالکلام آزاد کے علاوہ لالہ سری رام، شنکر لعل و مرلی دھر شاد، بیگم انیس قدوائی، حافظ یوسف دہلوی شنکر پرشاد، حکیم عبدالحمید، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور بیگم حمیدہ سلطان کے اسمائے گرامی بطورِ خاص شامل ہیں۔ شاعروں میں حضرت جگر مرادآبادی، حضرت نوح ناروی، منشی تلوک چند محروم، پنڈت ہری چند اختر، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد اور پاکستانی شاعرہ زہرہ نگاہ سرِ فہرست تھے۔

خود محمور صاحب کے پسندیدہ شاعر میر درد، غالب، داغ، فانی، اقبال، جگر، جوش، اصغر اور عبدالحمید عدم تھے جن کے کلام کے مختلف رنگ ایک گلدستے کی شکل میں، کلامِ محمور، میں جا بجا نظر آتے ہیں اور بادۂ محمور، و عرفانِ محمور، کے بیشتر اشعار مثال کے طور پر اس سلسلے میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

محمور صاحب نے جن حالات میں آنکھ کھولی، ہوش سنبھالا اور زندگی کی ابتدائی منزلیں طے کیں انھیں اعلا تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا پھر بھی وہ فارسی و اردو سے اچھی واقفیت، عربی سے مناسب اور انگریزی کی شُدبُد رکھتے تھے باضابطہ تعلیم ان کی تقریباً ہائی اسکول کے درجے تک تھی لیکن مطالعے، مشاہدے اور تجربے نے تعلیم کی کمی کی تلافی کر دی تھی اور اس پر مزید یہ کہ دین سے شغف اس پر گہری نظر، عالمی مذاہب کے تصورات و نظریات سے واقفیت اور تصوف سے گہرے دلی لگاؤ نے ان میں وہ سب کچھ پیدا کر دیا تھا جو ایک اعلا تعلیم یافتہ شخصیت کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے صوفیانہ جذبات و احساسات نے تو ان کے دل میں گھر ہی کر لیا تھا وہ جن حالات کے پروردہ تھے وہاں اگر کوئی چیز ان کے امن و سکون، تسلّی و تشفی اور صبر و ضبط کا باعث ہو سکتی تھی تو وہ صرف تصوف ہی تھی

مسلک کے اعتبار سے ان کا سلسلہ نظامی، نقشبندی سے قائم تھا وہ صوفی اشتیاق نظامی نقشبندی سے بیعت تھے جو مسجد کٹرہ شیخ چاند (لال کنواں) کی پشت کے دکان میں رہتے تھے اور جن کا مزار درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ میں ہے ان بزرگ کی صحبت صالح اور روحانی فیوض وبرکات سے مخمور صاحب نے تصوف کی منزلیں طے کی تھیں وہ استاد بیخودؔ کی طرح دن کے مخصوص اوقات اور شب کی تنہائیوں میں ہزار دانے کی تسبیح پڑھتے، وظائف و دعا کا ورد رکھتے اور تزکیۂ نفس میں مصروف رہتے تھے ہر چند کہ نماز گنڈے دار پڑھتے، روزوں کے بھی زیادہ پابند نہ تھے لیکن اسلام کے سچے پرستار مگر مذہبی روادار، دنیاوی رسومات کے باغی مگر ادیان عالم کی وحدت کے قائل اور غالبؔ کی طرح موحد قلم کے آدمی تھے وہ صبر ورضا، توکل، قناعت، شکر، وحدانیت، انسان اور انسانیت کے ہمیشہ پرستار اور علمبردار رہے اور یہی ان کا دین وایمان اور یقین اعتقاد تھا، بادۂ مخمور و عرفان مخمور، میں ان کے متصوّرانہ خیالات جابجا نظر آتے ہیں جو ان کے گہرے روحانی احساسات واعلا انسانی اقدار کے آئنہ دار ہیں اور جن سے مخمور صاحب مخمور نظر آتے ہیں۔

شاعری

جس طرح کلیم، کلام میں نظر آتا ہے اسی طرح کلام بھی کلیم کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے اور کلیم اگر صادق ہے تو اس کی زندگی اصلیت کی ترجمانی ہوتی ہے اصلیت، احساس میں گہرائی وگیرائی اور جذبات میں تیزی وتیز رفتاری پیدا کرتی ہے اور اس طرح کلیم وکلام کا یہ رشتہ روحوں کو محو اور دلوں کو مخمور کرکے تاثر گہرے سے گہرا کرتا رہتا ہے 'بادۂ مخمور، اور عرفان مخمور، کے اشعار پر اگر طائرانہ نظر بھی ڈالی جائے تو یہ بات

Marfat.com

اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ مخمور صاحب کے کلام میں دو تین باتیں جو خاص طور پر ابھر کر ہمارے سامنے آئی ہیں ان میں وحدت الوجود یا ہمہ اوست کا وہ نظریۂ وحدانیت ہے جس میں وہ مشیت الٰہی اور جبر و قدر کے فیصلوں کے پابند و قائل دکھائی دیتے ہیں اس نظریہ میں اور پختگی پیدا کرنے کے لیے ان کے متصوفانہ خیالات نے بھی مدد کی ہے وہ فنائی الشیخ کی مجازی منزل سے گزرتے ہوئے فنائی اللہ کی حقیقی منزل میں نظر آتے ہیں وہ راضی رضا تقدیر پر شاکر حکم الٰہی پر عامل، بندۂ عاجز، ذرّۂ ناچیز، فقیر حقیر اور مالک حقیقی کے غلام بے دام بن کر اپنے کلام میں جلوہ گر ہوتے ہیں انھوں نے اپنے اشعار میں مشیت اور مختار و مجبور کے الفاظ کا بار بار استعمال کر کے اپنے عقائد کا جہاں اظہار کیا ہے وہاں اپنا مافی الضمیر نمایا کر دیا ہے ملاحظہ ہو۔

مشیت میں مجال دم زدن توبہ معاذ اللہ
جسے یوسف بناتے ہیں اسے رکھتے ہیں زنداں میں

جلانا ہے ابھی ہے خود مشیت پاسباں میری
مجھے تو ڈھونڈتی پھرتی ہے مرگ ناگہاں میری

کچھ اختیار مشیت کی بات سن اے دوست
کلی کو حکم یہ ہے پھول بن کے مرجھائے

نہ رو مخمور اب ناکامیٔ تقدیر کا رونا
مشیت نے تجھے تقدیر کا قائل بنایا ہے

مری ناکامیوں میں بھی مشیت کار فرما ہے
مشیت میں نہ تھا جس کے لیے مختار ہو جانا

خزاں کا داغ نہاں سینۂ بہار میں ہے
نظام دہر مشیت کے اختیار میں ہے

یہ ایک رباعی بھی ملاحظہ ہو

بے سود ہے یہ فکر کہ قسمت کیا ہے
تنقید کی ناداں ضرورت کیا ہے

تو ہے سر تسلیم جھکانے کے لیے
کوئی نہیں سمجھا کہ مشیت کیا ہے

کچھ جبر و قدر کی مثالیں بھی ملاحظہ ہوں

راضی برضا کیونکر نہ رہوں مختار نہیں مجبور ہوں میں
میں رات بسر کر لیتا ہوں یا رات بسر ہو جاتی ہے

آدمی روز ازل سے جبر کی منزل میں ہے
میری مجبوری بقید امتحاں ہے آج بھی

Marfat.com

مختار کی ہستی بھی پھر واجب و لازم ہے — جب بات پہنچ جاتے مجبوریٔ انساں تک
کسی مختار ہستی کے تصرف کی دلیلیں ہیں — میرا ہر کام میں ہر بات میں مجبور ہو جانا
مجبور سے تو اپنی بھی بگڑی نہ بن سکی — مختار نے تو عالم امکاں بنا لیا
تیرے مختار ہونے کی دلیلیں — کہ ہر اک کام میں مجبور ہیں ہم
مری ناکامیاں شاہد ہیں اس کی — میں اب سمجھا کہ تو مختار بھی ہے
یہ مانتا ہوں کہ مجبور ہے بہت انساں — سر نیاز جھکا تا تو اختیار میں ہے
سمجھو تو سمجھ میں آ جائے تفصیل یہ صبر و قدر کی ہے — مختار پکارا جاتا ہے مجبور پکارا کرتے ہیں

صبر و قدر کے ان خیالات کی رو میں اور مشیت ایزدی کے غیر معمولی غلبے کی بنا پر وہ اس حد تک آگے نکل جاتے ہیں کہ صرف حکم الٰہی کے آگے خود کو ہی بے دست و پا نہیں پاتے وہ حکم خدا کو بھی خدا کا سخت پابند مان کر اعلان کرتے ہیں ؎

بنا چکے ہو جو تقدیر آدمی کے لیے — میرے خیال میں تم بھی بدل نہیں سکتے

مشیت اور صبر و قدر کے ان خیالات کی روشنی میں اگر حیات مخمورؔ کا جائزہ لیا جائے تو کوئی فرق نظر نہیں آتا، وہ زندگی بھر اپنے انہی خیالات کے قائل رہے جن حالات و واقعات، صدمات اور درد و غم کی منزلوں سے وہ گذرتے رہے اس کے نشانات بھی ان کے کلام میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں انھوں نے رضائے الٰہی کے پیش نظر غم کو زندگی اور زندگی کو غم بنا کر پیار کیا ملاحظہ ہو

غم نے اب اس مقام پر پہنچا دیا مجھے — کوئی مرے سوا نہیں پہچانتا مجھے
بڑے سکون سے مخمور زندگی گزرے — غم حیات سے انساں اگر نہ گھبرائے
ہجوم غم مری فطرت بدل نہیں سکتا — میں کیا کروں مجھے عادت ہے مسکرانے کی
ہو گیا مخمور اس آغاز کا انجام بھی — میں نے غم کھا تو لیا لیکن مجھے غم کھا گیا
کہے گا کون غم کی داستاں جب ہم نہیں ہونگے — محبت کس کو روئے گی جب ہم نہیں ہونگے

یہ ایک رباعی بھی ملاحظہ ہو

ہر عیش سے دنیا کے کنارا کر لے ۔ غم کھا کے محبت میں گزارا کر لے
ملتا ہے اگر دوست کے ہاتھوں سے تجھے ۔ تو زہر ہلاہل بھی گوارا کر لے

مخمور صاحب کے یہاں خودداری، استغنا، بے نیازی، غیرت، شرافت، نیک نیتی بدرجہ اتم موجود تھی اور فقیری میں بھی کچھ مانگنے، طلب کرنے یا اپنی غرض کا اظہار کرنے کا نشان تک موجود نہیں وہ جس طرح اپنی زندگی میں غیور انا پرست اور حال مست رہے اور خوشامد، چاپلوسی اور جاہ پرستی سے دور رہے وہی وہ اپنی شاعری میں بھی ملتے ہیں ان کے یہ اشعار ان کے عمل پر دلالت کرتے ہیں۔

مخمور یہ کوشش یہ تمنا کیا ہے ۔ کس خبط میں ہے تو تجھے سوجھا کیا ہے
ممکن ہے کہ دنیا تجھے حاصل ہو جائے ۔ لیکن یہ بتا حاصل دنیا کیا ہے
فقیری میں بھی مجھ کو مانگنے سے شرم آتی ہے ۔ سوالی ہو کے مجھ سے ہاتھ پھیلایا نہیں جاتا
نفس کی تحریک پر شرم و ندامت کے سوا ۔ مل گیا دنیا کے آگے ہاتھ پھیلانے سے کیا
دنیا سے کوئی امید نہ رکھ دنیا تجھے کیا دے سکتی ہے ۔ وہ پاؤں نہیں پھیلا سکتے جو ہاتھ پسارا کرتے ہیں
فقیر وہ ہے جو دست طلب نہ پھیلائے ۔ ہزار شکر مجھے عادت سوال نہیں
زیست کا کیا ہے بہر صورت گزر ہی جائے گی ۔ فقر کو دست کرم سے آشنا ہونے نہ دے

محبت کے مضمون کو کم و بیش سبھی شاعروں نے اپنے انداز سے باندھا ہے اور اس لفظ کو نت نئے معنی پہنا کر اس کی عظمت و رفعت کے مختلف روپ پیش کیے گئے ہیں ذرا مخمور کے تجزیہ محبت کا بھی ان اشعار سے اندازہ لگائیے۔

محبت جس کو دیتے ہیں اسے ہم کچھ نہیں دیتے ۔ اسے سب کچھ دیا ہے جس کو اس قابل نہیں سمجھا
محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں ۔ یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا
کبھی زبان قلم سے بیاں نہیں ہوتا ۔ وہ حادثہ جو محبت میں ناگہاں گزرے

Marfat.com

منتخب جس کو کیا چشم کرم نے تیری اس کو کچھ بھی نہ دیا درد محبت کے سوا
محبت جس کو کہتے ہیں چھپائے سے نہیں چھپتی خلوص دل کسی تدبیر سے پنہاں نہیں ہوتا
محبت جذبۂ ایثار سے پروان چڑھتی ہے خلوص دل نہ ہو تو دوستی سے کچھ نہیں ہوتا

اور ایک یہ مشہور غزل کا مطلع ؎

محبت میں شب تاریک ہجراں کون دیکھے گا ہمیں دیکھینگے یہ خواب پریشاں کون دیکھے گا

غالبؔ کے مشہور ترین شعر

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق ہے مکرر لب ساقی پہ صدا میرے بعد

کو سامنے رکھتے ہوئے اور یادگار غالب میں مولانا حالی کی شرح کے ساتھ اگر صرف پڑھنے کی کوشش کی جائے تو جو لطف غالبؔ کے شعر میں آئے گا اُس مزے سے غالباً مخمور کا یہ مطلع بھی خالی نہ ملے گا۔

جو شخص دنیادار، جاہ پرست اور غرض مند نہیں ہوتا وہ بے لاگ، بے باک نڈر اور حق گو ہوتا ہے مخمور صاحب کی زندگی کے کئی گوشے سے اس بات کا اظہار نہیں ہوتا کہ انھوں نے کبھی اپنے ان اوصاف حمیدہ کو ہاتھ سے جانے دیا ہو اس کی جھلک ان کے اشعار میں بھی ملتی ہے۔

اگر حق بات کہنے پر ہم آئے تو اپنے وقت کے منصور ہیں ہم
کون دہرائے گا آکر قصۂ دار و رسن کوئی اس خدمت پر اب مامور ہو سکتا نہیں
دھوکا نہ دے سکیں گے ہم اپنے ضمیر کو عیبوں کو اپنے لاکھ چھپائیں ہنر سے ہم

مخمور صاحب کو زندگی میں بیگانے تو بیگانے اپنوں سے جس قدر تلخ تجربے ہوئے انھوں نے مخمور کو درد و غم اور رنج والم کے سوا کچھ نہ دیا لیکن انھوں نے اُف نہ کی اور خاموشی سے ان سب کو مسکراتے ہوئے جھیلتے چلے گئے ان کے مجموعہ ہائے کلام میں اپنوں کی بے رخی اور دوستوں کی بے وفائی کا ذکر بڑے سلیقے سے ملتا ہے ملاحظہ ہو۔

کون ہے ان کا دیکھنے والا پوچھ لے آنسو رونے والے

Marfat.com

اپنے پہچان ہی ہے — وقت پڑے تو آنکھ چُرا لے
ہے مرا ضبط و تحمل بھی داد کے قابل — کہ دشمنوں سے نباہی ہے دوستی میں نے
اللہ نہ ڈالے وقت بُرا یہ ایسی گھڑیاں ہوتی ہیں — اپنے ہی نہیں ہوتے اپنے یہ تجربہ میرا ذاتی ہے
ہم میں ہی نقص ہے ہم میں ہی تو عیب — جس نے کرم سے دیکھ لیا اس کے ہو گئے

اپنوں کی غیریت ، بیگانوں کی دشمنی کے سبب مخمور صاحب کی زندگی نے جو تاثر قبول کیا اس کا عکس ان کے یہاں یاسیت کی حد تک گہرا نظر آتا ہے ۔ وہ کہتے ہیں۔

ہجوم یاس میں ایسے بھی وقت آئے ہیں — کبھی کبھی مجھے تیرا بھی آسرا نہ رہا
اب مرے لیے غم اور خوشی دو لفظ ہیں وہ بھی بے معنی — ہنسنے پہ کبھی رو دیتا ہوں رونے پہ ہنسی آجاتی ہے
تیرہ بختی کو کسی طرح چھپایا نہ گیا — دو قدم چھوڑ کے مجھ کو میرا سایا نہ گیا
ہو گیا مخمور اس آغاز کا انجام بھی — میں نے غم کھا تو لیا لیکن مجھے غم کھا گیا

مخمورؔ کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے آسان، سہل، سادہ، صاف و شفاف اور کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی اور روزمرہ و محاورے سے سجی سجائی زبان میں اپنے افکار و خیالات کا اظہار کیا ہے ان کے یہاں بوجھل ترکیبیں، مشکل مفاہیم پیچیدہ مضامین عطف و اضافت کی بھرمار نہیں ہے جیسے ان کی زندگی بیخودی و ہشیاری کا نمونہ تھی اسی طرح اُن کے اشعار بھی سادگی و پرکاری کی زندہ مثال ہیں اگر کلام مخمور سے زبان و روزمرہ محاورہ کی مثالیں تلاش کی جائیں تو ایک اچھا خاصا انتخاب تیار ہو سکتا ہے جسے طوالت کے خوف سے ہم یہاں نظر انداز کر رہے ہیں۔

وہ سیدھی سچی دل کی باتیں دل کی زبان سے دل کے کان رکھنے والوں کے لیے کچھ اس انداز سے کہہ جاتے ہیں کہ دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے ان کے یہاں روایتی مضامین بھی موجود ہیں شرب و شراب، مے و میخانہ، شمع و پروانہ، گل و بلبل کا ذکر بھی ملتا ہے لیکن کلام کا غالب حصہ اس قسم کے اشعار پر مشتمل

Marfat.com

ہے جس کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا ہے وہ مخمور ضرور تھے لیکن شراب وحدت کے انھوں نے شراب کا ایک قطرہ بھی کبھی نہیں چھوا اُن کے استاد صوفی صافی کی حیثیت سے اگر بیخود تھے تو وہ مخمور کیوں نہ ہوئے غالباً بیخود کی رعایت سے ہی وہ مخمور بنے اور انھوں نے اپنے اس تخلص سے بھی کلام میں فائدہ اٹھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

یہ میرے ساقی کے فیضان نظر کی بات ہے — عمر بھر پیتا رہے مخمور ہو سکتا نہیں
حشر کے دن مخمور اٹھیں گے — ان کی آنکھوں کے متوالے

جیسے کئی اشعار اس کا زندہ ثبوت ہیں۔

یوں تو کلام مخمور کا بیشتر حصہ منتخب الانتخاب کی حیثیت رکھتا ہے ایسی چند غزلیں تو قیامت کی ہیں۔

محبت میں شب تاریک ہجراں کون دیکھے گا — ہمیں دیکھینگے یہ خواب پریشاں کون دیکھے گا
کسی سے میری منزل کا پتہ پایا نہیں جاتا — جہاں میں ہوں رشتوں سے وہاں جایا نہیں جاتا
نہیں میکدے میں بھی آشنا کوئی رند میرے مقام سے — اسے اور پی کے بہک گئے جو چھلک گئی مرے جام سے
دنیا کے مسافر خانے میں مہمان بدلتے رہتے ہیں — قصہ تو وہی فرسودہ ہے عنوان بدلتے رہتے ہیں
نئے رندوں کو راس آئی نہ صہبائے کہن ساقی — کہ ہے بہکی ہوئی سی انجمن کی انجمن ساقی
خدا جب تک نہ چاہے آدمی سے کچھ نہیں ہوتا — مجھے معلوم ہے میری خوشی سے کچھ نہیں ہوتا

اور ایک غزل

کہے گا کون غم کی داستاں جب ہم نہیں ہونگے — محبت کس کو روئے گی یہاں جب ہم نہیں ہونگے

تو اس بلا کی ہے کہ اسے غالب کے 'میرے بعد' والی غزل کے آئینے میں رکھ کر دیکھا جا سکتا ہے

غزلوں کے علاوہ ان کے یہاں نعتیں، سلام، منقبتیں اور مختلف النوع اشعار بھی ملتے ہیں جو ان کی ذاتی عقیدت وارادت اور جذباتی رشتے کے آئینے دار ہیں۔

مخمور صاحب ۱۹۰۰ء میں پیدا ہو کر ۱۹۵۶ء میں وفات پائی وہ بہت کم جیسے ۱۹۴۷ء تک پٹودی میں رہے تقسیم ہند کے بعد حالات نے انھیں دہلی پہنچا دیا

Marfat.com

ان کی شاعری کی شہرت کا آغاز ۱۹۵۱ء سے ہوا اور ۱۹۵۶ء میں ان کی حیات تک رہا یعنی ان کی شاعری کا سورج ۱۹۵۱ء میں طلوع ہو کر ۱۹۵۶ء میں غروب ہو گیا کسی شاعر کی شاعری کا یہ زمانہ بہت ہی کم ہے لیکن اس چھ سال کے عرصے میں مخمور صاحب کی شہرت نصف النہار پہنچ گئی تھی اگر وہ چند ہی سال اور زندہ رہتے تو شاید اپنی عظمت کے اعتبار سے داغ کے بعد جو خلا دہلی میں پیدا ہو گیا وہ پُر ہو جاتا وہ زندگی بھر یہ کہتے رہے ؎

غم نے اب اس مقام پر پہنچا دیا مجھے — کوئی میرے سوا نہیں پہچانتا مجھے

اور جب لوگوں نے ان کے کلام کے آئینے میں جھانک کر ان کی پہچان شروع کی تو وہ گویا ہوئے

میرے مقام سے واقف ہیں صرف دیوانے — خدا کرے مجھے دنیا کبھی نہ پہچانے

وہ دنیائے شعر و شاعری میں دل کے فکر و فن، زبان و بیان، محاسن و خصوصیات کلام اور افکار و خیالات کی ایک ایسی شمع روشن بن کر ابھرے تھے کہ ان کے جاتے ہی محفل کے اجالے بھی رخصت ہو گئے اور فضاؤں میں ایک بار پھر ان کی یہ گونج سنائی دینے لگی ؎

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل
بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لیے

Marfat.com

سید ضمیر حسن دہلوی

خلیفہ نورو

غالباً خلیفہ نورو کی پیدائش پر دلّی والوں کی حسِ مزاح پھڑک ہو گی، اِدھر وہ دنیا کے تختے پر وارد ہوئے، اُدھر یار لوگوں نے پھبتی کس دی۔ صورت سے بے چارے نور" علیٰ نور تھے۔ لمبا سلیپر کی وضع کا چہرہ، چُندی چُندی آنکھیں، بدڈول ہاتھ پاؤں، بھونرے پڑی تنگ پیشانی، بجھری طوطے جیسی ناک اور رنگ ایسا جیسے تمباکو کا پینڈا۔ اس شکل پر خدا جانے کس من چلے نے نام رکھ دیا۔ نور الٰہی، اللہ دے اور بندہ لے۔ بڑے ہونے پر آدھا نام تو رواج کی نذر ہو گیا اور آدھے میں حرف صدا کا اضافہ ہوا تو وہ نورالٰہی سے نورو ہو گئے۔ بھلی شکل ہوتی تو شاید لوگ پکارنے کے لیے کوئی عُرفیت بھی گھڑ لیتے کیونکہ اس کے بغیر دلی والوں کو چین نہ آتا تھا مگر جب دیکھا کہ صورت شکل نے خود ہی بگاڑ پیدا کر دیا ہے تو اپنے تئیں صاف بچا گئے، جو گُڑ کھا کے مرے اسے زہر کیوں دیا جائے، آنکھوں کے اندھے نام نین سُکھ، سننے والے سنتے تو منہ بھینچ بھینچ کر ہنستے تھے۔ خیر اب ان باتوں کو دہرانے سے کیا حاصل ہے۔ وہ بے چارے مر گئے، ہم سے اچھی بگہ ہیں، اور ہمیں بھی ایک دن وہیں جانا ہے۔ جتنی غیبت

Marfat.com

کریں گے اتنے ان کے گناہ دُھلیں گے اور ہمارے سر نا حق بُرائی آئے گی۔ خدا بخشے اچھے تھے یا بُرے، شکل سے کیا لینا ہے، مٹی میں ملی تو مٹی ہوگئی البتہ آدمی اپنے گنوں سے جانا جاتا ہے اور گُن میاں نورو کے ایسے تھے کہ اب اُن کی جوڑ کا دوسرا ڈھونڈئے تو سوا مایوسی کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

میر بھکاری کے چھتّے میں ان کی اماّں کا چھوٹا سا مکان تھا۔ چھجّے پوبارے سب گرے ہوئے، بس ایک دالان جس کی کڑیوں کے پیٹ نکل رہے تھے ثابت تھا۔ باہر بڑی سی انگنائی کے ایک کونے میں جا ضرور تھی نہ باورچی خانہ، نہ غسل خانہ، ایک طرف دیوار تلے چار اینٹوں کا چولہا بنایا اور پکار بندھ لیا، دوسری طرف دو چار پائیاں کھڑی کر کے ان پر پردے ڈالے اور بیچ میں بیٹھ کر نہا لیے، اللہ اللہ خیر صلاّ، زیادہ جھمیلا بڑھانے سے فائدہ ہی کیا، آج مرے کل دوسرا دن، بزرگوں نے کہا ہے سنگین مکان بنانے سے دل بھی سخت ہو جاتا ہے۔ اسی لیے مکان بنانے پر بھلے لوگ کم توجہ دیتے تھے۔ گذر گئی گذران، کیا جھونپڑا، کیا مکان۔ اللہ وہاں کی اچھی کرے جہاں جا کے ہمیں اور آپ کو سدا کی رہائش اختیار کرنی ہے۔

خلیفہ نورو دیکھنے ہی میں ہٹے نہ تھے، نصیبوں کے بھی ہٹے تھے۔ انھیں پیدا ہوئے مشکل سے دو برس گذرے ہوں گے کہ باپ بیچ ہتّے نے ہیضہ کر کے انتقال کیا۔ کھڑے کھیت پہ لُو کا پھرا، ماں غریب نے محنت مزدوریاں کر کے فلیدنی کو پالا تھا۔ پیٹ سے کاٹھ کی روڈ باندھی مگر انھیں مدرسے ضرور بھیجا مثل مشہور ہے کہ ساری جوانی ڈھالے تب ایک لال پالے نور الٰہی کی اماں نے کیا کیا پٹن پیٹے اور کیسا کیسا اپنی جندری کو گھسا تھا، تب یہ ماشا اللہ شہنیر سے مردوے بنے۔ اس پر بھی افسوس

Marfat.com

یہ ہے کہ نصیبوں پٹی کو ایک دن بھی سکھ کا نہ ملا۔ رنڈاپا اسی امید پہ کاٹا تھا کہ خیر سے بچّہ کسی لائق ہوگا تو پیٹ بھر روٹی ملے گی، غریب کا بس یہی سہارا تھا۔ چھوٹی آنکھ کا ایک ہی دیدا، نور الٰہی نے اپنی حیثیت جوگا پڑھ بھی لیا تھا، اردو انگریزی میں چار لفظ لکھنے کے لائق ہوگئے تھے۔ چاہیئے تھا کسی دفتر میں چھوٹی موٹی اسامی ڈھونڈ لیتے، گھر بھر کے دلدر دور ہوتے مگر ان کے دماغ میں تو کچھ اور ہی خناس سما گیا تھا۔ اُن دنوں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ انگریز دشمنی کا دور دورہ تھا۔ بے سوچے سمجھے یہ بھی اُس رُو میں بہہ نکلے۔ چوہا بل میں سماتا نہیں اور دم سے باندھ لی چھاج۔ سمجھانے والوں نے بہترا سمجھایا کہ میاں یہ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ بہکائے سکھائے میں نہ آؤ، وقت پر گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے۔ اپنا ہاتھ دبا ہوا ہے۔ شحنہ رے شحنہ، مجھے تیرے گاؤں رہنا، اونٹ بلّیا لے گئی تو ہاں جی ہاں جی کہنا۔ کوئی سمجھ کی بات ہی نہیں نکلتی، اِن موئے حرُوں نے یونہی غُل مچایا ہے استبدادی، استبدادی ...... استبدادی نہ ہوئے بنشادی ہو گئے، سمجھ دار زمانے کا رنگ دیکھ کر کام کرتے ہیں توقع کے موافق بات کرنی چاہئے۔ اپنا بھلا کون نہیں جانتا البتہ جس نگوڑے کے دل کا کونا سرک گیا ہوگا وہ آنکھ بند کر کے منہ کھول بھائیں بھائیں کرنے لگے گا آخر مصلحت بھی کوئی چیز ہے، بیٹا بن کے ہر کوئی لیتا ہے، باپ بن کے کوئی نہیں لیتا، واہ صاحب یہ بھی کوئی بات ہے کہ اٹھ دوڑی بازار دل میں ایسی آئی۔ تم سری کے نادان آگے جوتیاں کھاتے ہیں، چار چوٹ کی مار پڑتی ہے رعیت اور بادشاہ میں فرق ہوتا ہے حکومت سے اڑو گے تو وہ میخ پہ رکھ کے تمہاری بوٹیاں اڑا دے گی۔ بھول گئے کم بخت پنجاب میں بھاڑ بھون دیا تھا۔ بناؤکس کے دیدوں گھٹنوں کو روئیں، کرموں

Marfat.com

جلیبوں والے باغ میں کھڑی باڑھ ماری تھی سنا ہے وہاں مرد نام کا بچہ نہیں رہا تھا۔

خلیفہ نورو دیکھنے میں تو سڑ بلّلے سے آدمی تھے۔ مگر جانتے سب کچھ تھے۔ اسکول کی پڑھائی نے دماغ کے دریچے کھول دیے تھے۔ کہتے تھے اُکے لاٹھ نے پان سو جولاہوں کے ہاتھ کٹوائے تھے کہ ہندوستان سے باریک کپڑے کی صنعت ماری جائے، ڈھکے لاٹھ نے فلاں نواب سے عہد و پیمان کیے اور ان کو بالائے طاق رکھ، علاقہ دبا لیا تھا۔ فُلانے کرنیل نے بڈھے بادشاہ کی داڑھی پکڑ کے ہلائی تھی فُلانے جرنیل نے ظفر کے بیٹے پوتوں کے سر اتارے تھے۔ سارا ہندوستان ان کم بخت انگریزوں کے ہاتھوں پریشان ہے۔ ہڈیاں ہم پیلیں اور پیسہ اُدھر کھنچ جاتے۔ ولایت سے موٹی سوت کی دھجیاں آئیں اور باپ کے مول بکیں، ملک کی ساری دولت لوٹ لی ہے، دیسی غریب کنگلے ہو گئے، دو انگل کی لنگوٹی تک نہ رہی ایک ہاتھ آگے اور ایک ہاتھ پیچھے، بھلا دیکھو تو سہی کس دہاڑے نیچے گئے۔ جہاں کندلہ گلتا ہے وہاں انگریزی پہرہ بیٹھ گیا ہے۔ تارکش حیران دیکھیے پریشان سارا مال ولایت سے آتا ہے اور نرا کھوٹ، کرخندار ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں فاقوں کی نوبت آگئی ہے۔ جو نوکر پیشہ ہیں اُنھوں نے ہٹی ڈالی کہ تنخواہ بڑھاؤ، تنخواہ بڑھاؤ انگریزوں نے کڑاجی کر کے تنخواہ تو بڑھادی مگر نت نئے ڈنڈ اور لگان لگا دیے کرائے بڑھا دیے ہوا تک پر محصول لگا ہے۔ کھڑکی کھولو تو راج ڈنڈ بھگتو۔ تنخواہیں بڑھیں تو کیا، میاں کی جوتی میاں کا سر رہا پہلے پیسہ میں چار سودے آتے تھے اب آنے میں بھی جنم جلی چیز نہیں آتی۔ اللہ رکھے اس راج کی بدولت ایسی برکت ہوئی ہے کہ دیکھنے سے جی خوش ہوتا ہے اور دل سے دعا نکلتی ہے " جُگ جُگ رہے فرنگی راج "

خلیفہ نورو بڑے ضدی آدمی تھے۔ سب ہی نے کہا کہ اب گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا حاصل ہے۔ جو مر گئے سو مر گئے تمہیں کاہے کا غم ہے کیا وہ تمہارے سگے تھے، تم کیا خدا کی فوجدار بن کے آئے ہو۔ جس نے برا کیا ہے، اُس کے گور گڑھے ہیں، پرائے کارن اپنی لعل سی جوانی کو عذاب لگاؤ گے تو تمہیں کے رکعت کا ثواب ہوگا۔ آدمی کو چاہیئے پہلے اپنی ڈاڑھی کی آگ بجھائے پھر خلقِ خدا کی خدمت کا بیڑا اٹھائے مگر اُن کے دل کو جو لگ گئی تھی، لگی رہی۔ نصیحتوں کا اثر الٹا ہوا۔ محمد علی کی تقریر کے جھونکے میں آتے تو نکل نہ سکے۔ انھیں دنوں کچھ قومی رہنما خود کفیل پیشے اپنانے کی ترغیب دے رہے تھے خلیفہ پر اُن کا جادو چل گیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ محلّے کے نائی کی دکان پر جا کے قینچی اُسترا سنبھال لیا اور حجامت بنانے لگے۔ پیٹ بھرنے کا آسرا تو ہوگیا مگر ماں بے چاری اِس صدمے سے بنا موت مرگئی۔ ہے ہے اسے بچے کو نگوڑا نائی بنانا ہوتا تو اپنی آنکھوں کا تیل کیوں نکالتی۔ جوانی میں کمر کیوں دہری کرتی اور اس حال کو کیوں پہنچتی کہ ابھی پچاس کے پیٹے میں ہے اور قبر میں پاؤں لٹکا لیے۔ محلے کے بچے اس کے مکان کے آگے سے گذرتے تو لہک لہک کے گاتے تھے۔ نائی کے بے نائی کے، طبلہ بجائی کے، طبلے میں طوطا، نائی میرا پوتا" یہ سن کے نورو کی ماں کا کلیجہ کٹتا تھا۔ افسوس کیسا نالائق بیٹا نکلا ہے مرے باپ کو گالی پڑے اور اس کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ اولاد تین طرح کی ہوتی ہے پوت، سپوت اور کپوت، سو ہمارے نصیب میں کپوت لکھا تھا۔ سچ پوچھیے تو یہ مدرسے کی پڑھائی کا بجوگ ہے انگریزوں نے مہین حرفوں کی پڑھائی اسی لیے تو نکالی ہے کہ لوگ پڑھ پڑھ کے دیوانے ہو جائیں۔ اب پچھتانے سے کیا حاصل ہے میں نے خود اپنے پاؤں پر

Marfat.com

کلہاڑی ماری ہے۔ کسی کو کیا درش دوں، چور کی ماں اوکھلی میں سر دے اور روئے۔

سچ پوچھو تو خلیفہ نورو کے دماغ کی کوئی چول ڈھیلی ضرور تھی۔ حجامت بنانے وقت بھی قینچی سے زیادہ اُن کی زبان چلتی تھی۔ کسی پر تنقید کیے بغیر نہ رہتے تھے لونڈے لاروں سے کہتے تمہیں شرم نہیں آتی یہ کیا لباس پہنتے ہو۔ انگریزی کی ریس میں لینڈی کتوں کی طرح جورو کو ساتھ لیے پھرتے ہو۔ جاؤ ان کی حرص میں ننگے ناچنے لگو۔ لمبی کا کلوں والوں کا مذاق اڑاتے کہ یہ کیا مخنث کی شکل بنا رکھی ہے ڈاڑھی والوں سے کہتے میاں یہ ڈاڑھی ہے یا دہال کا چھتنہ۔ دھوکے کی ٹٹی اسے ڈاڑھی مونڈاؤ گے تو ایسے نکل آؤ گے جیسے کہ تم ہو۔ آدمی کی اصلیت کھل جاتی ہے بال اتروا کے، مولوی ملا خط بنوانے آتے تو ان کی لبیں لیتے تھے۔ حجامت بنانے کو جو آیا نائی تو حجامت بناتے ہی مانگی رضائی، تن پہ نہیں لتا، پان کھاؤں البتہ۔ ڈاڑھی رکھنا تمہارے جیسوں کا کام نہیں ہے۔ ساری کمائی ڈاڑھی کی نذر ہو جائے گی۔ بھلا دیکھیے تو سہی کوئی وضع ہی نہیں نہ گول نہ چوکھونٹی، نہ بیضوی، اللہ توکل بڑھتی چلی جاتی ہے الجھی الجھائی جیسے قبرستان میں ٹینٹ کی جھاڑیاں۔ کبھی لب سوزنے کا ہوش نہ ہوا مونچھیں بڑھتے بڑھتے منہ میں گھسی جاتی ہیں۔ چل چل میاں تجھے کس وہم نے گھیرا ڈاڑھی کو منڈا ڈال اور مونچھیں سمجھ بکھیڑا۔ کسی پر طعن مارتے کہ ڈاڑھی چندے کے لیے موافق ہوتی ہے۔ تھیلیاں ہضم کر جاؤ اور کانوں کان خبر نہ ہو مزے سے مونچھوں پہ تاؤ دو۔ کہنے والے کہتے ہیں ایک دن گاندھی جی کسی جلسے میں آتے تو یہ بھی اُن سے ملنے پہنچ گئے۔ کہنے لگے مہاراج! اب کے کانگریس میں اعلان کرا دو کہ کُل قوم پرست عورتوں کی چوٹیاں کاٹی جائیں ورنہ جب سوراج ملے گا تو یہ نفا ختیاں برابر کا حق مانگیں گی اور ایسا دق کریں گی جیسا کہ ولایت والیاں کرتی ہیں۔

Marfat.com

کبھی موج میں آ کے نبکارتے تھے۔ کرزن کون تھا، فرنگی، لیڈی نے ڈاڑھی مونچھیں منڈا دیں تو لاٹھ ہوگیا۔ ولایت میں کیا ہوتا ہے مجرم کے کے بال مونڈے جاتے ہیں تاکہ پہچان کر پکڑ لیا جائے۔ مجاہد سر اور ڈاڑھی سب کا صفایا کرتے ہیں جب میدان مارتے ہیں۔ پاپ دھونے کے لیے یاتری مونڈن کراتے ہیں۔ رسول شاہیوں کو دیکھیے چارا برو صاف، پھر چیخ چیخ کر کہتے تھے۔ فرنگیوں کے سر پر استرا چلا دو دنیا سے ظلم وستم نیست نابود ہو جائے گا۔ خدا نے چاہا تو میرا استرا سب پر چلے گا۔ انگریزی سرکار پر بھی چلے گا نہ کسی بادشاہ کا سر بچے گا نہ کسی ملکہ کی چوٹی۔ کالے پہاڑ پہ ٹلوا ناچا! کیوں بے ٹلوے توکیوں ناچا! کیوں بے ٹلوے توکیوں ناچا، ہات تری کی، بھاگ یہاں سے۔ انگریزوں ہندوستان چھوڑدو......!

نائی کی دکان نگوڑوں کے ٹکنے کی جگہ ہوتی ہے۔ دس بیس جنے ہرہم خلیفہ نورو کی دُکان پر بھی براجمان رہتے تھے وہ خلیفہ کو جان جان کر چھیڑتے اور ان کی بے تکی باتوں کا مزا لیتے تھے۔ غدر کے زمانے سے دلی میں یہ بدعقیدگی رواج پا گئی تھی کہ جو کچھ ہوگا کسو پیر فقیر کے طفیل ہی ہوگا۔ لوگوں کو ہاتھ ہلانے کی ضرورت نہیں۔ جسے بے معنی اور بے ربط باتیں کرتے دیکھتے دلی والے اس کے پیچھے لگ لیتے تھے کوئی کہتا میاں بڑے پہنچے ہوتے بزرگ ہیں۔ ان کی باتیں سمجھنا آسان نہیں ہے۔ کوئی کہتا بھائی اللہ نے چاہا تو ایک دن انھیں کے ہاتھوں ہماری کشتی پار لگے گی، فرنگی کم بختوں کا ستیا ناس ہوگا۔ فقیروں کی آڑ میں انگریزی سرکار نے بھی کچھ جاسوس چھوڑ دیے تھے وہ طرح طرح کے سوانگ بھر جاتے تھے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے ہمیشہ دوچار فلنگ تعینات رہتے تھے۔ ایک شخص سیاہ کفنی پہنے لمبی لمبی ڈگیں مارتا تھا دس

Marfat.com

قدم چل کے یوں رکتا جیسے غیب سے رکنے کا حکم آیا ہو۔ اڑنگ بڑنگ نہ جانے کیا کیا بولتا تھا آوازیں بہت پیدا ہوتی تھیں اور مطلب یکسر ندارد۔ تماش بین دلّی کے فراٹے چلتی ہوا سے اٹھکیلیاں کرنے والے، چھیڑ خانی سے باز نہ آتے تھے۔ وہ چلتے تو پیچھے سے آواز آتی۔ راست، چپ، راست، چپ، راست! وہ رکتے تو ان کے پیچھے بچوں کا ایک پورا قافلہ رک جاتا تھا۔ کسی لمڈے نے آگے بڑھ کے دامن کھینچ لیا۔ کوئی بکٹا بھر کے بھاگا، کسی نے اس زور سے دھول جمائی کہ سائیں کو چھٹی کا کھایا یاد آگیا۔ اپنی دانست میں لوگ انگریزی کارندوں سے بل کی لیتے تھے کہ یہ بولیں اور وہ جھاڑ کے کانٹے کی طرح لپٹ جائیں۔ خوب کندی کریں۔ مگر وہ بھی کچّی گولیاں کھیلے ہوئے تھوڑی تھے۔ پہلے خوب آزمائش کرلی جاتی تھی پیچھے مامور کیے جاتے تھے۔ بازار کی گالی ہنس کے ٹالی۔ بڑے بڑے صدمے خنداں پیشانی کے ساتھ سہہ جاتے تھے۔ اپنے کام میں کسر نہ کرتے گلی گلی کے حُرّیت پسندوں کی نشاندہی انھی جاسوسوں نے سرکاری دفتروں میں کی تھی۔ پل پل کی خبر دیتے تھے بچے بچے کی نگرانی کی جاتی تھی۔ اس پر بھی یہ حال تھا کہ اندر ہی اندر لاوا پکا کیا۔ آزادی کے متوالے جان دینے پر تل گئے تھے۔ بس ایک اشارے کی دیر تھی۔ مگر خدا جانے کیا اسرار تھا کہ بڑے بوڑھوں نے عدم تشدد کو اپنایا اور لاکھوں خدا کے بندوں کی جانیں بچالیں۔

کہتے ہیں گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ قضا کی مار یہ بہروپیا جاسوس ایک دن خلیفہ نورو کی دُکان میں آگیا۔ دل میں تو خدا جانے کیا تھی اور کیا کیا کنسوئیاں لینی تھیں مگر ظاہر یہ کیا کہ خط بنوانے آیا ہوں۔ پہلے تو خلیفہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ کنپٹیاں لپ لپ کرنے لگیں، ہاتھ پیروں پر تشنج کی سی کیفیت طاری ہوگئی ایسا خیال ذہن میں

Marfat.com

آیا کہ آپ ہی آپ ہنس پڑے۔ پھر بڑی ملائمت سے کہا، بیٹھیے شاہ جی میں آپ کا خط بناؤں گا۔ صدقے جایئے اس پروردگار کے، آج محنت سپھل ہوگئی۔ شاہ جی بیٹھے تو ان کے ہاتھ میں دستی آئینہ پکڑا دیا اور قینچی کی نوک سے کنپٹیاں سدھارنے لگے۔ اتنے میں خدا جانے کیا ہلولا اٹھا کہ پہلے تو خلیفہ جی نے اس نامراد کی لٹوں کو جگہ جگہ سے کاٹ دیا پھر ڈاڑھی اور سر کے بالوں میں بلیاں ڈالیں اور جتنی دیر میں اسے ہوش آیا اتنی دیر میں اُسترا اٹھا اس کی شہ رگ کاٹ دی۔ ساری دکان خونم خون ہوگئی شاہ جی کٹے مرغ کی طرح تڑپنے لگے۔ اب جو لوگ پہنچے اور سارے محلے میں ان کے ذبح کیے جانے کی خبر پھیلی تو تھانے سے دنادن پولیس آن پہنچی۔ خلیفہ نورو کو کھڑے کھڑے ہتھکڑیاں لگادی گئیں۔ بعد میں مقدمہ چلا اور حاکم نے انھیں دیوانہ ٹھہرا کے عمر قید کی سزا دی۔ جب چھوٹ کے آئے تو سوراج مل چکا تھا۔ سب اپنے اپنے حلوے مانڈے میں لگے تھے۔ خلیفہ جی کی اماں ان کے پیچھے مرکھپ گئی تھیں اور کوئی مرا جیتا ان کا تھا نہیں، سو وہ بھی خدا جانے کدھر نکل گئے۔ محلے والوں نے ایک دو دن دیکھا ہوگا۔ پھر یوں ہوا کہ خلیفہ نورو چھلاوا ہوگئے۔ بس ان کی کہانی رہ گئی۔

کہتے ہیں جانوروں میں کوّا اور آدمیوں میں نوّا سب سے زیادہ سُرتا ہوتا ہے۔ خلیفہ نورو جس دکان پر کام کرتے تھے آزادی کے کچھ دنوں بعد وہاں انکوائری آئی۔ وطن پرستی کے اس کارنامے پر سودیشی سرکار نے انعام دینے کی تجویز کی تھی۔ دُکاندار نے سوچا خلیفہ نورو خدا جانے کہاں روپوش ہوگئے پتہ نہیں مرگئے یا زندہ ہیں۔ انھیں کون ڈھونڈتا پھرے گا۔ لاؤ اپنا نام لکھوا دوں کہ میں نے یہ کام

Marfat.com

کیا تھا۔ لو جی اُس کی تو چاندی ہو گئی۔ نہ جانے کیا کیا انعام ملا خوب شہرت ہوئی۔

بے چارے خلیفہ نورزد کو آج ہمارے سوا کوئی نہیں جانتا اور ہم بھی کیا جانتے ہیں۔ یہی نا کہ وہ سرپھرے سودائی اور سزا یافتہ بدمعاش تھے۔

Marfat.com

سید غلام سمنانی

ڈاکٹر سیّد محمود

(عاقبتش محمود باد! ڈاکٹر صاحب مرحوم و مغفور کا ذکر جب آتا ہے تو کسی عارف کا یہ قول بھی یاد آجاتا ہے:

"چناں مبرکہ بدعا ارزی وخیال زی کہ بہ ثنا ارزی۔"

ایک انسان کے فوز و فلاح اور کامرانی و فیروزمندی کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ جب وہ زندہ رہے تو تعریف و تحسین کا مستحق قرار دیا جائے اور جب وہ اس عالم آب وگل کو خیرباد کہے تو اس کی موت کو ایک نقصان تصور کیا جائے اور اُس کے لیے دعائے خیر کی جائے، ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندگی پر نظر جاتی ہے تو اُن کی شخصیت مشرق کی ان اخلاقی اقدار عالیہ سے عبارت نظر آتی ہے جن کو برت کر، انسان خواہ مادی منفعتوں سے محروم رہ جائے، اپنی شخصیت کو خیر و برکت کا ایک ایسا سرچشمہ بنا لیتا ہے جس سے ہر عارف و عامی سیراب ہوتا ہے، مدارات و تواضع، مرحمت و مکرمت، دل سوزی و دل نوازی، تلطف و فیض رسانی، حلم و بردباری اور سیرچشمی و فیاضی ہی تو ایسی خصوصیات ہیں جو کسی شخص کو ممتاز و مُفتخر کرتی ہے) آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کو قریب سے دیکھا ہوگا، وہ اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ مرحوم ان تمام اوصاف حمیدہ سے متصف تھے، ڈاکٹر صاحب کا انتقال کم و بیش بیاسی ۸۲

Marfat.com

سال کی عمر میں ہوا لیکن اُن کی کمی انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے محسوس کی گئی، انفرادی طور پر ہم ایک مربی، شفیق اور سرپرست سے محروم ہو گئے اور اجتماعی اعتبار سے ملکی و قومی قیادت کا وہ سلسلۃ الذہب جو پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مسز سروجنی نائیڈو پر مشتمل تھا اس کی آخری کڑی ڈاکٹر سیّد محمود تھے، ان کی موت سے وہ آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی اور اب صرف وہ یادیں باقی ہیں جو ان کی ذات سے وابستہ تھیں ؎

یادگارِ ما دریں منزل غمِ بسیار ماند
رفت اگر آتش، نشاں دود بر دیوار ماند

ڈاکٹر سید محمود صاحب کا شمار ہمارے ملک کے ان قائدین اور جدوجہد آزادی کے اُن مجاہدین میں ہے جو صف اوّل میں رہے ہیں اور جنھوں نے برطانوی استعمار سے براہ راست ٹکرلی، یہ وہ لوگ ہیں جن کے ذکر کے بغیر ہماری جنگِ آزادی کی تاریخ نامکمل رہے گی) لیکن یہ ایک عجیب بدنصیبی اور المیہ ہے کہ چند خوش قسمت افراد کے علاوہ ہم نے بڑی آسانی سے ضمیر کا کوئی کرب محسوس کیے بغیر، سب کو بھلا دیا، سید فضل الحسن حسرتؔ موہانی کو اردو شعر و ادب نے رئیس المتغزلین کی حیثیت سے تو یاد رکھا لیکن کتنے لوگ یہ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں آزادیِ کامل کی تجویز پیش کرنے والے وہ پہلے شخص ہیں، ہم نے "مشقِ سخن" کو "چکی کی مشقت" سے بالکل الگ کر دیا، حکیم اجمل خاں کو طب یونانی کی تاریخ نے "مسیح الملک" کی حیثیت سے تو زندہ رکھا لیکن شیدا کو بالکل نظر انداز کر گئے اور جنگِ آزادی میں اُن کی کارگزاریوں کو پس پشت ڈال دیا، مولانا محمد علی جوہرؔ کو ایک آتش بیاں مقرر کی صورت میں تو سب نے جانا لیکن ان کی شوخیِ تحریر جنگ آزادی میں ان کی گوناگوں خدمات اور اردو انگریزی میں ان کی صحافیانہ صلاحیتوں کی کس نے قدر کی، ہاں، اقبالؔ نے ان کے سانحۂ ارتحال پر یوں اپنا نذرانۂ عقیدت پیش

Marfat.com

کر کے ضرور حق ادا کیا ؎

خاک قدس او را بہ آغوش تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

کم و بیش یہی صورت مختار احمد انصاری اور بیرسٹر آصف علی کے ساتھ پیش آئی یہ سب کے سب شخصیت کو خانوں میں تقسیم کرنے والی ہماری عادت کا شکار ہو کر رہ گئے، پھر ڈاکٹر صاحب اِس سے کیونکر محفوظ رہتے' یاد رکھیے قوموں کا اپنے اسلاف اور پیش رؤوں کے کارناموں کو بھلا دینا حال و مستقبل کی نیرہ بختی پر حجت ہے' ایسے نازک دور میں جب تاریخ کو مسخ کرنے اور نئی نسل کی ذہن شوئی کی کوششیں تیز تر کر دی گئی ہیں ہمارے لیے ماضی سے باخبر ہونا ازبس ضروری ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر سید محمود صاحب مرحوم و مغفور کا مسقط الراس، مشرقی اتر پردیش کا ضلع غازی پور ہے' وہ وہاں کے ایک قصبہ سید پور بھتری میں ۱۸۸۹ء میں ایک معزز اور مقتدر خاندان میں پیدا ہوئے تھے' ان کے والد مولوی محمد عمر صاحب ایک بڑے زمیندار تھے' بچپن کا زیادہ حصّہ جونپور میں گذرا' اُن کے بچپن کا جونپور آج کا ویران اور برباد جونپور نہ تھا بلکہ اس کے شیراز ہند ہونے کی کچھ خصوصیات اس وقت تک باقی تھیں' اگر ایک طرف خانقاہ رشیدیہ روحانی تزکیہ و تطہیر کا مرکز تھی تو دوسری طرف منشی امام بخش کا قائم کردہ مدرسہ امامیہ حنفیہ علم و فضل کا سرچشمہ تھا جہاں مولانا فضل حق خیر آبادی کے شاگرد رشید مولانا ہدایت اللہ خاں درس و تدریس میں مصروف تھے جن سے فیض حاصل کرنے والوں میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا سید محمد ہادی حسن، مولانا سید سلیمان اشرف بہاری اور مولانا آزاد سبحانی سرِ فہرست ہیں' یہیں انھوں نے ابتدائی تعلیم سرشاہ محمد سلیمان کے ساتھ مولانا سید محمد ہادی حسن کی زیر نگرانی حاصل کی' ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ایک اردو تحریر نظر سے گزری جس میں انھوں نے اس حقیقت کی

Marfat.com

طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کی زندگی پر اُن کے پیرو مرشد حضرت مولانا عبدالعلیم آسی سکندرپوری، سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ، جونپور اور اُن کے استاد مولانا سید محمد ہادی حسن کا بہت زیادہ اثر رہا ہے اور بچپن کے ہی وہ اثرات تھے جو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت پر زندگی بھر حاوی رہے، ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد ۱۹۰۱ء میں انھیں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڈھ (موجودہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی) بھیج دیا گیا، جہاں وہ ۱۹۰۸ء تک رہے، ان کے علی گڈھ کے معاصرین میں تصدق احمد خاں شیروانی، عبدالرحمٰن بجنوری، سید حسین، حسین شہید سہروردی اور سیف الدین کچلو جیسے طلبا تھے، ڈاکٹر صاحب کو وہاں اُن کی سرگرمیوں کی وجہ سے "محمود القوم" کے خطاب سے یاد کیا جاتا تھا، طلبا کا یہ وہ گروہ تھا جو اپنے سیاسی شعور کے اعتبار سے قوم پرستانہ رجحان رکھتا تھا، ۱۹۰۷ء میں علی گڈھ میں طلبا کی ایک ہڑتال ہوئی اور اس کی پاداش میں ڈاکٹر سید محمود، تصدق احمد خاں شیروانی اور عبدالرحمٰن بجنوری کا کالج سے اخراج عمل میں آگیا، اکتوبر ۱۹۰۸ء میں کالج سے اخراج کے بعد سید محمود لندن چلے گئے اور وہاں اُنھوں نے لنکنس ان میں بیرسٹری کے لیے داخلہ لے لیا، بعد میں ڈاکٹریٹ کے لیے "مغلوں کے نظام سیاسی" پر مقالہ لکھنے کی تیاری کرنے لگے، اِسی دوران وہ ولفرڈ اسکون بلنٹ Wilfrid Scawen Blunt اور پروفیسر ای، جی براؤن (E. G. Browne) کے پان اسلامزم (Pan Islamism) کے خیالات سے بہت متاثر ہوئے، برطانیہ ہی میں ۱۹۰۹ء میں ان کی ملاقات جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی سے ہوئی، ۱۹۱۲ء میں اُنھوں نے جرمنی سے اپنے مقالہ پر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی اور ۱۹۱۳ء میں پٹنہ آکر بیرسٹری کرنے لگے اور اب ہندوستان ان کی سیاسی و معاشرتی سرگرمیوں کی جولانگاہ بن گیا، پٹنہ میں مولانا مظہر الحق کی شخصیت نے بھی انھیں متاثر کیا اور پھر انھیں کے خاندان میں شادی ہو جانے کی وجہ سے یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔

Marfat.com

۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس ہوئے جس میں ڈاکٹر سید محمود نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی نمائندگی کی، ۱۹۱۷ء میں آل انڈیا ہوم رول لیگ میں شمولیت حاصل کی، ۱۹۱۸ء میں جب مغربی طاقتوں کے ہاتھوں خلافت عثمانیہ کا سقوط عمل میں آیا تو بجا طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ خطرہ لاحق ہوگیا کہ مبادا باقیماندہ ترکی بھی ترکوں کے ہاتھوں سے نکل جائے، ایک تو خلافت عثمانیہ کے سقوط ہی نے مسلمانوں پر ضرب کاری لگائی تھی، دوسرے اس خطرہ نے انھیں اور بھی تشویش میں مبتلا کر دیا، اس کے نتیجہ میں تحریک خلافت ابھر کر سامنے آئی، اور ۱۹۲۰ء میں یہ تحریک کانگریس کی تحریک ترک موالات میں ضم ہوگئی، ڈاکٹر سید محمود اس سیاسی حرکت واضطراب کے پورے عمل میں فعّال رہے، ۱۹۲۱ء میں انھیں مرکزی خلافت کمیٹی کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا اور اس منصب پر وہ ۱۹۲۶ء تک فائز رہے اور یہی وہ وقت تھا جب مہاتما گاندھی نے برطانوی استعماریت سے ترک موالات کی دعوت دی، ڈاکٹر سید محمود نے اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے بیرسٹری کو ترک کر دیا، اب وہ پورے طور پر کھل کر ہندوستان کے سیاسی کارزار میں داخل ہو گئے، ۱۹۲۲ء میں انھیں گرفتار کر لیا گیا، ۱۹۲۳ء میں انھیں پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ کانگریس کا جوائنٹ جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۹ء کے درمیان ہندوستان کے سیاسی حالات نے کئی کروٹیں لیں، اسی دوران میں فرقہ وارانہ کش مکش بھی ابھر کر سامنے آئی، ڈاکٹر سید محمود مسلمانوں کی علیحدگی پسندی کے مؤید نہیں تھے، اُن کا یہ پورا یقین تھا کہ کانگریس ہی میں مسلمانوں کا ایک مضبوط بلاک ہونا چاہیے اور یہی مسلمانوں کے تحفظ کا ضامن ہو سکتا ہے، کانگریس سے وفاداری نے انھیں خود مسلمانوں کی نگاہ میں معتوب کر دیا لیکن وہ ان تمام باتوں سے ہراساں نہیں ہوئے اور آخر کار انھوں نے ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے ساتھ مل کر کانگریس میں مسلم نیشنلسٹ پارٹی کی بنیاد

Marfat.com

رکھ دی اور اسی سال انھیں کانگریس کا جنرل سکریٹری بھی منتخب کرلیا گیا اور یہ منصب اُن کے ہاتھوں میں ۱۹۳۶ء تک رہا، ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کے جرم میں انھیں گرفتار کرلیا گیا اور وہ چھ ماہ تک نینی سنٹرل جیل الہ آباد میں، پنڈت موتی لال نہرو اور جواہرلال نہرو کے ساتھ قید رہے، آنے والے برسوں میں وہ ہندو مسلم اتحاد کی کوشش میں مصروف رہے، اس سلسلہ میں وہ جواہرلال سے مختلف نظریہ رکھتے تھے اور ہندوستان کی آزادی سے قبل ہی وہ اس مسئلہ کا حل تلاش کر لینا چاہتے تھے، ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۹ء میں وہ بہار کی کانگریسی وزارت میں وزیر تعلیم و ترقیات رہے، ۱۹۴۲ء میں جب "ہندوستان چھوڑو" تحریک شروع ہوئی تو وہ دوسرے کانگریسی قائدین کے ساتھ گرفتار کرکے قلعہ احمد نگر بھیج دیے گئے، اگست ۱۹۴۴ء میں وہ قید فرنگ سے رہا ہوئے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا اور ساتھ ہی ساتھ تقسیم ملک کا روح فرسا سانحہ بھی پیش آیا، آزادی کے بعد وہ بہار کی کابینہ میں لے لیے گئے، ۱۹۵۴ء میں پنڈت نہرو نے انھیں مرکزی وزارت خارجہ میں شامل کیا اور اس عہدہ پر وہ ۱۹۵۷ء تک فائز رہے، ۱۹۵۵ء کی بنڈونگ کانفرنس میں جس میں "پنج شیل" کا اصول ابھر کر سامنے آیا ڈاکٹر سید محمود بھی موجود تھے، انھوں نے مشرق وسطیٰ کے ممالک، مصر، سعودی عرب، ایران اور عراق کا بھی دورہ کیا اور باہمی خیر سگالی و خوش اندیشی کی فضا پیدا کرنے میں بڑا موثر کردار ادا کیا۔

دسمبر ۱۹۴۷ء میں ہندوستانی مسلمان قائدین کی ایک کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر سید محمود نے مولانا آزاد سے اتفاق کرتے ہوئے مسلم لیگ اور دیگر فرقہ وارانہ تنظیموں کے ختم کرنے کی اپیل کی لیکن ۱۹۶۴ء میں خود انھوں نے ایک علیحدہ مگر غیر سیاسی مسلم تنظیم آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کی بنیاد رکھی دراصل ہندوستان کی آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں نے بشمول ڈاکٹر سید محمود، حکومت کے سیکولرازم اور مساوات کے اعلان کے باوجود، یہ محسوس کیا کہ ہندو اکثریت، ہندوستان کی مسلم اقلیت کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کررہی ہے، دیگر

Marfat.com

مسائل کے ساتھ ۱۹۶۱ء میں جبلپور کے بھیانک فرقہ وارانہ فسادات نے اور بھی رہی سہی امیدوں پر پانی پھیر دیا، جون ۱۹۶۱ء میں لکھنؤ میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر سیّد محمود نے کی، اس کنونشن پر تین سال گذر گئے اور حالات بد سے بدتر ہو گئے اور ۱۹۶۴ء میں کلکتہ، رڑکیلہ اور جمشید پور کے فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے، اب خود ڈاکٹر سید محمود نے ایک کنونشن کی دعوت دی جو اگست ۱۹۶۴ء میں لکھنؤ میں انعقاد پذیر ہوا، یہ کنونشن مختلف الخیال اور مختلف مسلک کے ماننے والے مسلمانوں کا ایک نمائندہ کنونشن تھا جس کا بنیادی مقصد ایک مرکزی مسلم قیادت کا پیدا کرنا اور مسلمانوں کی روزافزوں زبوں حالیوں کا سدّباب تھا، اس کنونشن کے نتیجہ میں جو تنظیم عالم وجود میں آئی وہ "مسلم مجلس مشاورت" کے نام سے منسوب ہوئی، جس خلوص نیت، جس وحدت مقصد اور جن پاک عزائم کے ساتھ اس تنظیم کا قیام عمل میں آیا تھا اگر اُن کی تکمیل ہو جاتی تو یقیناً ڈاکٹر صاحب مرحوم بھی اس عالم کون وفساد کو خیرباد کہتے وقت مطمئن ہوتے لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا اور بالآخر اپریل ۱۹۶۸ء میں اس سے مستعفی ہو گئے اس کے بعد تین سال زندہ رہ کر انھوں نے ۲۸ ستمبر ۱۹۷۱ء کو دلی ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا؛

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندگی کے یہ وہ اعداد و شمار ہیں جن کو سامنے رکھ کر ان کی مجموعی شخصیت کے ادراک وعرفان میں مدد ملتی ہے لیکن انھیں کو سب کچھ نہ سمجھ لینا چاہیئے، یہ تو ان کی ہمہ گیر وہمہ جہت شخصیت کا صرف ایک پہلو ہے جو ان کی بنیادی شخصیت کے مظاہر میں سے ایک ہے اور جس کو غیر اہم بھی نہیں کہا جا سکتا ہے، دراصل انسان سب سے پہلے انسان ہوتا ہے، اس کے بعد کچھ اور، درحقیقت کسی بھی شخصیت کو خانوں میں تقسیم کر کے مجموعی شخصیت پر محاکمہ نہیں کیا جا سکتا، ایک انسان کی زندگی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور اُن مختلف پہلوؤں کے مابین

Marfat.com

باہمی تاثیر و تاثر کا عمل غیر شعوری طور پر جاری و ساری رہتا ہے، اگر ہم اس عمل کو اپنی گرفت میں لے لیں تو اس شخصیت کے ساتھ انصاف ہو سکتا ہے اور اس کو سمجھنے میں آسانی ہو سکتی ہے، یہاں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کو بحیثیت انسان اور ان کی ذاتی زندگی میں کیسا پایا!

یوں تو ڈاکٹر صاحب کو قریب سے دیکھنے کی سعادت ۱۹۶۴ء میں اس وقت حاصل ہوئی جب مرحوم مسلم مجلس مشاورت کی تشکیل کے بارہ میں سوچ رہے تھے لیکن خط و کتابت کا سلسلہ بہت پہلے سے تھا، مجھے افسوس ہے کہ وہ خطوط میرے پاس محفوظ نہ رہ سکے، خاندانی تعلقات اس سے بھی زیادہ پرانے تھے، جونپور جو میرا وطن ہے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے خیالوں میں بسا رہتا تھا، ان کی بچپن کی یادیں اُس سے وابستہ تھیں، عہد شاہجہانی کے مشہور بزرگ و عالم جید حضرت دیوان عبدالرشید[۱] کی قائم کردہ خانقاہ رشیدیہ جہاں اُن کے عالم طفلی کے شب و روز گذرے تھے ان کا روحانی مرکز تھی اور جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اسی خانقاہ رشیدیہ کے سجادہ نشین حضرت مولانا عبدالعلیم آسی[۲] تھے جن سے ڈاکٹر صاحب کو بیعت کا شرف حاصل تھا، آئندہ زندگی میں اپنی تمام تر سیاسی مصروفیات کے باوجود انھوں نے جونپور سے یہ رشتہ کسی طرح منقطع نہ ہونے دیا اور عمر بھر قائم رکھا، انھوں نے یہ وصیت بھی کی تھی کہ ان کا انتقال کہیں بھی ہو لیکن انھیں جونپور ہی میں دفن کیا جائے. لیکن نہ جانے کن مصلحتوں کی بنا پر ان کی اس وصیت پر عمل نہیں کیا گیا، اعظم گڈھ

---

[۱] یہ وہ بزرگ ہیں کہ جب شاہجہاں جیسے جلیل القدر بادشاہ نے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تو آپ نے انکار کر دیا (عمل صالح)

[۲] حضرت آسی اردو کے بہت اچھے شاعر بھی تھے، دبستان ناسخ سے تعلق تھا، آپ کا مجموعہ کلام "عین المعارف" شائع ہو چکا ہے، وفات ۱۹۱۷ء میں ہوئی، مزار غازی پور میں ہے۔ (س، غ، س)

Marfat.com

ضلع میں ایک موضع میں سوگھرپور ہے، وہاں ڈاکٹر صاحب کی جائداد تھی، جب کبھی اپنی جائداد کے مسائل و معاملات کے سلسلہ میں سوگھرپور آتے تو جونپور آکر خانقاہ رشیدیہ میں حاضری دیتے اور اپنے پیران سلسلہ کے حضور اپنا ارمغانِ عقیدت پیش کرتے، اگر کبھی جونپور آنے سے معذور رہتے تو کسی سے کہلوا دیتے، جونپور سے کافی لوگ ان سے ملاقات کی غرض سے سوگھرپور جاتے، ان لوگوں میں اکثر میں بھی ہوتا۔

میں مارچ ۱۹۶۴ء میں مستقل قیام کی غرض سے دِلّی آیا، میرے دِلّی آنے میں دیگر باتوں کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی بھی کشش کو دخل حاصل تھا، یہاں آنے پر سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ میں مرحوم سے ملا، وہ ۲۰ تغلق کریسنٹ میں رہتے تھے اور میں فیروزشاہ روڈ پر، میں کلکتہ سے دلّی آیا تھا، وہاں فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے تھے، رڑکیلا اور جمشید پور میں یہ آگ لگی ہوئی تھی، ان فسادات کے نتیجے میں مسلم قائدین کے سامنے ہندوستان میں مسلم اقلیت کا وجود ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا، کلکتہ میں جو قتل و غارت گری ہوئی اور جس بہیمت و بربریت کا مظاہرہ کیا گیا اس کا عینی شاہد میں خود تھا، اسی پر دوسرے مقامات کے فسادات کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے، ظاہر ہے ایسے حالات میں کوئی بھی ذی حس اور ذی شعور انسان مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتا تھا، پھر ڈاکٹر صاحب جیسا انسان جس کے نزدیک ہندوستان کی آزادی سے زیادہ ہندو مسلم اتحاد ضروری تھا، وہ ایسے آزاد ہندوستان کو پسند نہیں کرتے تھے جو باہمی آویزشوں کی جولانگاہ ہو اور اسی لیے وہ تقسیم ہند کے بھی مخالف تھے، ان کی دوربیں نگاہوں نے منقسم ہندوستان کی تیرہ بختیوں کو بخوبی دیکھ لیا تھا، ان فسادات نے ان کے دل و دماغ پر بڑا اثر ڈالا اور وہ ایک ایسی تنظیم کے قیام کے بارہ میں سوچنے لگے جو عملی سیاست سے تو الگ ہو لیکن جس کا بنیادی مقصد ہندو مسلم اتحاد و آشتی ہو، غلط فہمیوں کا ازالہ ہو، ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے، افہام و تفہیم کی راہیں ہموار ہوں،

Marfat.com

ہماری تاریخ کی صحیح تعبیر کی جائے اور پورے ہندوستان میں ایک ایسی فضا پیدا ہو جائے کہ ہر شخص مجبور ہو کر یہ کہہ اٹھے: "دھرتی کے باسیوں کی مکتی بریت میں ہے۔"

یہی وہ عظیم و جلیل مقاصد تھے جو مسلم مجلس مشاورت کے قیام کا باعث ہوئے، ڈاکٹر صاحب نے مختلف الخیال، مختلف مسلک کے ماننے والے اور مختلف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے مسلم قائدین کو ایک مرکز پر جمع کیا اور انھیں سیاسی و ملکی وفاداریوں سے بالاتر ہو کر مثبت خطوط پر سوچنے اور عمل کرنے کی تلقین کی ــــــ آغاز کار سے لے کر لکھنؤ کنونشن میں مسلم مجلس مشاورت کے قیام تک جو مراحل بھی پیش آئے میں ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ رہا اور ہر جزو و کل کا بغور مطالعہ کرتا رہا، اُس وقت تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دلوں کے غبار دھل گئے ہیں خلوص کے نور نے سب کے سینوں کو روشن کر دیا ہے، ذہنوں کی کشادگی نے ایک وسیع میدان کار عطا کیا ہے، ایثار و قربانی کے جذبہ نے سب کو سرشار کر دیا ہے، غلط فہمیوں کے سیاہ بادل چھٹ گئے ہیں اور کچھ ایسا یقین ہونے لگا تھا کہ محبت و اخوت اور امن و آشتی کے یہ پیغامبر، ہندوستان کے شہروں کو تو کیا اس کے دشت و صحرا کو بھی اپنے نفس گرم کی نکہتوں سے معمور کر دیں گے ــــــ اور فی الواقع ایسا ہوا بھی، مسلم مجلس مشاورت کے وفد نے جو اسلامیان ہند کے قائدین پر مشتمل تھا ہندوستان کا دورہ کیا اور یہ لوگ بطور خاص ان فسادات زدہ علاقوں میں گئے جہاں کی فرقہ وارانہ فضا کا تکدر و انتشار اپنے نقطہ کمال پر تھا، اپنی پیرانہ سالی اور دوسری معذوریوں کے باوجود ڈاکٹر صاحب مرحوم بھی اس وفد کے ساتھ ہوتے تھے، یہ سفیران امن و آشتی ملک کے جس گوشے میں بھی گئے ان کا خیر مقدم کیا گیا، ان کے پیغام کو گوش ہوش سے سنا گیا، بعض مقامات پر ہندو مسلم اتحاد کے ایسے مناظر دیکھنے میں آئے کہ انھوں نے تحریک خلافت کا زمانہ یاد دلا دیا اور یہ قوی امید پیدا کر دی کہ ہندوستان اپنے اُس مرض سے نجات پا جائے گا جو اس کا اصل مرض ہے اور جس نے ہماری ہیئت اجتماعیہ کو ایک جسد بے روح بنا کر رکھ دیا ہے۔

Marfat.com

آپ خواہ جو کچھ بھی کہیں، میرا تو یہی خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے، آپ نے غالباً کامیابی کے مادّی معیار مقرر کر رکھے ہیں لیکن سب کچھ یہی نہیں، کامیابی کا ایک معیار اخلاق و معنوی بھی ہوتا ہے، ڈاکٹر صاحب مرحوم ایثار و بے نفسی کا مجسمہ تھے، وہ یہ سب کچھ اپنی عمر کی اس منزل میں پہنچ کر رہے تھے جو ذاتی اغراض سے ماورا ہوتی ہے، جو ترک و عزلت اور بے نیازی کی زندگی ہوتی ہے. انھیں جن بلندیوں کو چھونا تھا چھو چکے تھے، اب یہ سب کچھ جو تھا وہ "گامے بطریقِ آشنائی" تھا ملک و ملت سے تعلق خاطر کی بنا پر تھا اور ان کی شرافت نفس پر مبنی تھا ــــــ روایتی پیرایۂ بیان اگر اختیار کروں تو یوں کہہ سکتا ہوں کہ فلک تفرقہ پرداز کو یہ ایک آنکھ نہ بھایا کہ خلوص و محبت کا یہ کارواں اپنی منزل پر پہنچے اور اتحادِ ملّی کی یہ قبا جو بکھرے ہوئے تار و پود کو یکجا کر کے بنائی گئی تھی ثابت و سالم رہے، ــــــ مسلم مجلس مشاورت کا وجود آج بھی برقرار ہے، کبھی کبھی ہندوستان کی پرشور اور ہنگامہ آفریں زندگی میں اس کی نحیف و ناتواں آواز بھی سنائی دیتی ہے لیکن وہ جوش و جرأت اور وہ جلال وہ جسارت کہاں جو کسی قوم کے تن مردہ میں جان ڈال سکے، مجھے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ڈاکٹر صاحب کی روح یہ سرگوشی کر رہی ہو سہ

پیش تو نہادہ ام دل خویش
شاید کہ تو ایں گرہ کشائی

اوپر جو کچھ کہا گیا وہ ڈاکٹر سید محمود صاحب مرحوم کی گوناگوں ملکی و ملّی خدمات کے چند نمونوں پر مشتمل تھا، اب ذرا آپ یہ بھی ملاحظہ فرماتے چلیں کہ ان کی روزمرہ زندگی کیسی تھی ؟ اگر صرف ایک جملے میں کہنا چاہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک سچے اور اچھے مسلمان تھے ــــــ آپ میرے اس اظہار یا انکشاف پر چونکیں نہیں، میں نے ان پر کوئی تہمت نہیں رکھی ہے، ایک سچی بات کہی ہے، میرے نزدیک ایک سچا اور اچھا مسلمان ساری مصیبتوں سے بالاتر ہوتا ہے، حق و انصاف

Marfat.com

کے معاملہ میں وہ مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کرتا، یہی نہیں کہ وہ غیر مذہب کے ماننے والوں سے رواداری برتتا ہے بلکہ محبت واحترام کے ساتھ پیش آتا ہے، وہ "مقام آدمی" سے باخبر ہوتا ہے اور "احترام آدمی" کو آدمیت کی شرط قرار دیتا ہے —— ڈاکٹر صاحب کو میں نے ان کی روزانہ کی زندگی اور اس کے متعلقات میں انھیں اصول پر کاربند پایا، وہ سارے مذہبی فرائض نہایت پابندی کے ساتھ ادا کرتے تھے خواہ سفر میں ہوں یا حضر میں، اور وظائف میں بھی مصروف رہتے لیکن اُن کے یہ سارے اشغال ان کے معاملات پر اثر انداز نہ ہوتے تھے اُن میں تقشف نام کو نہ تھا، اُن کے ملنے والوں میں ہر مذہب، ہر مسلک اور ہر طبقہ خیال کے لوگ تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی ان پر تنگ نظری کا الزام نہیں لگا سکتا تھا، اگر کسی شخص کو ان کی مدد کی ضرورت ہوتی تو وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر اس کی مدد کرتے اور اس امر کی کوشش کرتے کہ اس کی مقصد برآری ہو جائے۔

ان کی پوری زندگی سادگی ودرویشی سے عبارت تھی، ان کی غذا بہت سادہ اور کم تھی اور ان کے لباس میں ایک شان فخر پائی جاتی تھی، وہ بہت پڑھے لکھے انسان تھے اور انھیں دنیاوی منزلت بھی حاصل ہوئی لیکن ان کے کردار کا دامن ان عزائم سے بالکل پاک تھا جو منصب وجاہ کا نتیجہ ہوتے ہیں، ان کا مزاج حلم وبرد باری کی نکہتوں سے معمور تھا، میں نے کبھی بھی ڈاکٹر صاحب مرحوم کو بلند آواز سے بات کرتے ہوئے نہیں سنا، ان کا لہجہ بہت نرم اور شیریں ہوتا، اپنے مخاطب کی پوری کفتگو بڑی دلجمعی کے ساتھ سنتے اور پھر نہایت دھیمے انداز میں نہایت ٹھہر ٹھہر کر اس کی بات کا جواب دیتے اور اس کو مطمئن کرتے، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے ان کو غیظ وغضب کے عالم میں دیکھا ہو، اگر انھیں کوئی بات ناگوار بھی گزرتی تو اس کا اظہار بھی بڑے سنجیدہ انداز میں کرتے، یہ ان کے مزاج کی عمومی کیفیت تھی۔ میں نے انھیں عمر کی جس منزل میں دیکھا اس میں بالعموم انسان کا مزاج جادہ اعتدال سے ہٹ جاتا ہے، اس میں ایک طرح کی زود رنجی پیدا ہو جاتی ہے، قوت برداشت

Marfat.com

کم ہو جاتی ہے، وہ چند بے ربطیوں کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کے اعصاب کمزور پڑ جاتے ہیں، لیکن میں نے ڈاکٹر صاحب کو ان تمام خامیوں سے پاک اور مبّرا پایا۔

بڑے انسان کی ایک خصوصیت اس کا عجز وانکسار بھی ہوتا ہے، اُس کا دل و دماغ اپنی بلندی اور دوسرے کی پستی کے خیال سے عاری ہوتا ہے، ڈاکٹر صاحب اس صفت کا پیکر تھے، ان کے کسی جملے سے، کسی انداز سے اور کردار کے کسی رخ سے بڑائی کا اظہار نہ ہوتا تھا، ان کا یہ رویہ صرف انھیں لوگوں کے ساتھ نہ تھا جو اُن سے ملنے آتے تھے بلکہ گھر کے ملازمین کے ساتھ بھی وہی برتاؤ ہوتا، ان کی کوشش یہ ہوتی کہ اپنا کام خود کریں اور اگر اس سلسلہ میں انھیں کئی کئی بار بھی اٹھنا پڑتا تو اس سے گریز نہ کرتے، کوئی مسئلہ خواہ اس کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو اس پر اپنے خُردوں سے بھی مشورہ کرتے اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ اس کو قبول بھی کرتے، اُن میں احقاق حق اور ابطال باطل کی پوری جرأت موجود تھی لیکن انھوں نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ ان کی ہر بات قبول ہی کر لی جائے، بعض مسائل ایسے ضرور تھے جن پر وہ کوئی مصالحت کرنے پر تیار نہ تھے، تقسیم ہند پر وہ کبھی بھی راضی نہ ہوئے، اسی طرح ہندو مسلم اتحاد کو وہ ہندوستان کی آزادی پر مقدم سمجھتے تھے اور س موضوع پر ان کو اپنے ہم چشموں سے اختلاف بھی رہا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنے علم وفضل کے اظہار میں بھی بہت انکسار برتتے تھے، لیکن اگر کوئی علمی مسئلہ آجاتا تھا تو اس وقت ان کی وسعتِ علم کا اندازہ ہوتا، وہ بنیادی طور پر تاریخ کے موضوع سے تعلق رکھتے تھے اور یہی سبب تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد جب مرکزی وزارت تعلیم نے تاریخ تحریک آزادی لکھنے کے لیے ایک بورڈ کی تشکیل کی تو ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اس کا چیرمین بنایا گیا ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری اُن کے مقالہ "مغلوں کے نظامِ سیاسی" پر ملی تھی،

اُسی زمانہ میں جب وہ لندن میں اپنا مقالہ لکھ رہے تھے انھوں نے اورنگ زیب عالم گیر پر مولانا شبلی نعمانی کے سلسلۂ مضامین کو انگریزی میں منتقل کرکے شائع کیا[۱] مولانا شبلی کے یہ مقالات جو بعد میں کتابی شکل میں "عالم گیر پر ایک نظر" کے نام سے شائع ہوکر بہت مقبول ہوئے اورنگ زیب پر انگریزوں کی الزام تراشیوں کا جواب تھے، اس سے ہم بخوبی یہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب شروع ہی سے ہندوستان کی تاریخ کو مثبت انداز میں ازسرنو ترتیب دینے کے حق ہی میں نہ تھے بلکہ اس پر مُصر تھے، ۱۹۲۲ء میں جب وہ بکسر جیل میں تھے تو انھوں نے اردو میں مسلم دورِ حکومت کی تاریخ مرتب کی تھی، اس کا انگریزی ترجمہ ۱۹۵۷ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا، ۱۹۴۱ء میں اُنھوں نے ہندو مسلم کلچرل اکارڈ (Hindu-Muslim Cultural Accord) کے نام سے ایک مقالہ لکھا جو ۱۹۴۹ء میں کتابی شکل میں شائع ہوکر مقبول ہوا —— اِن کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی بہت سی انگریزی اردو تحریریں بکھری پڑی ہیں جنھیں یکجا کرکے شائع کرنے کی ضرورت ہے —— جب وہ قلعہ احمد نگر میں تھے تو پنڈت نہرو اپنی کتاب "دریافت ہند" (Discovery of India) لکھ رہے تھے، مولانا آزاد "غبارِ خاطر" میں مصروف تھے اور ڈاکٹر صاحب مختلف اردو شعرا کے اشعار کا ایک گلدستہ مرتب کررہے تھے، انھوں نے اپنے ایک استاد عبدالمجید کاتب صاحب کا دیوان شائع کرایا، نظامی پریس بدایوں سے "دیوان غالب (اردو) کی اشاعت بھی ڈاکٹر صاحب ہی کی توجہ کی ممنون ہے، خانقاہ رشیدیہ جونپور کے کتب خانہ میں آج بھی چند بڑے قیمتی اور تاریخی اعتبار سے اہم مخطوطات موجود ہیں مثلاً گنج ارشدی، گنج فیاضی" اور حضرت دیوان عبدالرشید کا فارسی مجموعۂ کلام "دیوان شمسی"، اول الذکر اسی خانقاہ کے ایک بزرگ شاہ طیب بنارسی کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، یہ مخطوطہ معام

---

[۱] حیات شبلی: سید سلیمان ندوی، ص ۵۴۴

Marfat.com

تاریخ پر بہت کافی روشنی ڈالتا ہے، ڈاکٹر صاحب مرحوم اس مخطوطہ کو اردو میں ترجمہ کرا کے شائع کرانا چاہتے تھے، انھوں نے ترجمہ کا کام شروع بھی کرا دیا تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ رُک گیا، اگر وہ کتاب ترجمہ ہو کر شائع ہو جاتی تو ہندوستان کے تاریخی سرمایہ اور صوفیانہ ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہو جاتا، یہ باتیں میں نے صرف اس لیے پیش کیں کہ آپ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے علمی وادبی ذوق کی بلندی سے آشنا ہو جائیں۔

تعلیم کے ابتدائی دور کو چھوڑ کر، ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندگی کا بیشتر حصّہ انگریزی ماحول میں گزرا، انگریزی بولنا، انگریزی پڑھنا اور انگریزی لکھنا بلکہ انگریزی میں سوچنا بھی، ہندوستان کی جنگ آزادی بھی انگریزی ہی میں لڑی گئی لیکن اس تمام عرصے میں ڈاکٹر صاحب نے اردو زبان وادب سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کیا جیسا کہ سطور بالا میں وضاحت کی جا چکی ہے، شاید بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم ہی نے مسز کملا نہرو کو اردو سیکھنے اور پڑھنے کی طرف راغب کیا تھا اور انھوں نے اس زبان میں اتنی دستگاہ بہم پہنچالی تھی کہ باقاعدہ اردو میں خطوط لکھنے لگی تھیں، میں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے نام مسز کملا نہرو کے بہت سارے خطوط اردو میں لکھے ہوئے دیکھے ہیں، ڈاکٹر صاحب کے کاغذات میں وہ خطوط آج بھی مو ود ہوں گے، پنڈت نہرو کا ایک خط نظر سے گزرا جس میں انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے یہ فرمائش کی ہے کہ وہ علامہ اقبال اور مولانا حسرت موہانی کا کلام مسز نہرو کے پاس بھیج دیں۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد شمالی ہند کی بعض ریاستوں میں جہاں پورے طور پر، بغیر کسی تفریق کے اردو کو پڑھا، لکھا اور بولا جاتا تھا اس زبان کے ساتھ جو رویہ اپنایا گیا وہ بہت تکلیف دہ رہا ہے، ڈاکٹر صاحب اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، ان کو اردو زبان وادب سے محبت تھی اور اس زبان کے بارہ میں ان کے نظریات بہت واضح تھے، اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب مرحوم اور

ڈاکٹر سمپورنانند کے درمیان جو مراسلت ہوئی ہے وہ دلچسپ بھی ہے اور معلومات افزا بھی، وہ ہندی اور اردو کو ایک ہی بنیادی زبان کا دو وسیلۂ اظہار سمجھتے تھے۔

میرے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا رویہ بہت مشفقانہ تھا، اس سلسلہ میں جملہ معترضہ کے طور پر یہ عرض کر دوں کہ کسی بھی فرد سے ملاقات و تعارف کے معاملے میں میرا طرز عمل بہت مختلف ہے، میں دو اندازوں کے طریقہ کو پسند نہیں کرتا، اگر اتفاقی طور پر ملاقات ہو گئی تو خیر، ورنہ میں خود اس امر کی کوشش نہیں کرتا، ایسا بھی ہوا ہے کہ یہی اتفاقی ملاقات دیرپا تعلقات کی بنیاد بھی بن گئی ہے، اس میں حاشا کسی طرح کے کبر و نخوت کو کوئی دخل نہیں بلکہ اس کا سبب میری کم آمیزی اور عزت نفس ہے، میری خلوت، میری جلوت ہے، میری تنہائی میری انجمن ہے، بیدل کے لفظوں میں "حنائے توکل" اس راہ میں مانع ہوتی ہے، عام حالات میں میرا یہی رویہ ہے، بڑے لوگوں کے سلسلہ میں اور بھی احتیاط برتتا ہوں، آپ میرے اس طریقۂ کار کو جس طرح چاہیں تعبیر کریں اور میرے لیے نفسیات کی جو اصطلاح چاہیں وضع کر لیں —— یہ تو قطعاً یاد نہیں کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم سے پہلا تعارف کب ہوا لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میرا وطن جونپور ہے اور اُن کے استاد مولانا سید محمد ہادی حسن صاحب مرحوم میرے جدّ کلاں تھے تو بہت خوش ہوئے اور بیش از بیش شفقت سے پیش آئے، وہ زمانہ میری طالب علمانہ زندگی کا تھا اور اُسی زمانہ میں ڈاکٹر صاحب مرحوم سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی شروع ہوا، شاید ہی میرا کوئی ایسا خط رہا ہو جس کا مرحوم نے جواب نہ دیا ہو، اگرچہ ضعف بصارت کی وجہ سے لکھنے سے معذور تھے لیکن بیشتر خطوط ان کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہوتے تھے، ۱۹۶۴ء میں جب میں مستقل طور پر دِلّی آ گیا تو میرے لیے ان کی تاکید تھی کہ میں اپنا زیادہ سے زیادہ

وقت ان کے پاس گزاروں، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "تم سے گفتگو کر کے طبیعت بہت خوش ہوتی ہے" اگر دو تین روز کا وقفہ گزر جاتا اور میں کسی وجہ سے حاضری نہ دے سکتا تو فون پر خیریت معلوم کرتے، غالباً ۱۹۷۶ کی بات ہے۔ اہلیہ مرحومہ ایک موذی و مہلک مرض میں مبتلا تھیں اور دلّی ہی میں زیر علاج تھیں، میں نے اپنی اس پریشانی سے ڈاکٹر صاحب کو بے خبر رکھا تھا اور اسی وجہ سے ان کے ہاں کی آمد و رفت میں کمی آگئی تھی، کسی ذریعہ سے ڈاکٹر صاحب کو میری اس پریشانی کا علم ہوگیا، ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ مرحوم خود میری قیامگاہ پر بغرض عیادت و مزاج پرسی تشریف فرما ہیں، مجھے بہت ہی بزرگانہ و مشفقانہ انداز میں اس بات پر زجر و توبیخ کی ہیں نے انھیں حالات سے بے خبر کیوں رکھا، کافی دیر تک بیٹھے رہے اور مریضہ کے حالات اور علاج کی تفصیلات دریافت کرتے رہے، اور اس طرح میرے دل پر اپنی شفقت اور محبت کا دیرپا نقش چھوڑ گئے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی بلند ظرفی کا ایک واقعہ اور یاد آتا ہے، ڈاکٹر صاحب کا ایک ملازم تھا جو اُن کے پاس بچپن سے رہتا چلا آرہا تھا اور بوڑھا ہوگیا تھا۔ دراصل اس کا تعلق میرے گھر سے تھا، اس کی ماں زندگی بھر میرے ہی گھر رہی اور وہیں اس کا انتقال بھی ہوا، بچپن ہی میں یہ ملازم ڈاکٹر صاحب کے ساتھ چلا گیا اور ان کے ساتھ رہتا رہا، اس طرح کے ملازم خود کو ملازم نہیں سمجھتے بلکہ اُن کا انداز مالکانہ ہوتا ہے، ایک روز کسی بات پر خفا ہوگیا اور میرے پاس چلا آیا، مجھے بڑی حیرت ہوئی، بہر حال میں جب ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے مطلع کیا کہ "فلاں ملازم میرے یہاں ہے اگر آپ فرمائیں تو اس کو بھیج دوں" ڈاکٹر صاحب نے فوراً جواب دیا اور کہا کہ "اگر وہ کہیں اور گیا ہوتا تو میں اس کو بلانے کی کوشش کرتا لیکن مجھے خوشی ہے کہ وہ تمہارے ہاں سے میرے ہاں آیا تھا

Marfat.com

اور پھر تمہارے ہی پاس گیا"۔ کچھ دنوں بعد ایک المناک حادثہ کے نتیجہ میں بچوں کے ساتھ میں نے اُسے بھی جونپور پہنچا دیا۔ چند برس پہلے اس کا بھی انتقال ہوگیا۔

ایک روز ڈاکٹر صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا تو اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد فرمانے لگے کہ "میں تمہیں آج تاشقند کے تازے انگور کھلاؤنگا"۔ مجھے حیرت ہوئی کہ تاشقند کے انگور تازے اور پھر دلّی میں، فرمایا کہ "آج حسیب[1] کی خوشدامن اور خسر تاشقند سے آئے ہیں"۔ بہرحال، انگور آئے اور کھائے گئے، واقعی بہت لذیذ اور شیریں تھے، پھر فرمانے لگے کہ "یہ لوگ خالص ترک ہیں اور انھیں کی زبان خالص ترکی زبان ہے"۔

یہ باتیں ہیں تو بڑی ہی معمولی لیکن ہیں بہت اہم کیونکہ انھیں سے انسانی کردار کا تعین ہوتا ہے!

مسلم مجلس مشاورت سے مستعفی ہونے کے بعد، ڈاکٹر صاحب نے اپنی سیاسی واجتماعی زندگی سے کم وبیش بالکل کنارہ کشی اختیار کرلی تھی، راجیہ سبھا کی رکنیت کے دوران وہ ۲۰ - تغلق کریسنٹ پر قیام پذیر رہے اس کے ختم ہونے کے بعد علی گڈھ چلے گئے تھے لیکن کچھ دنوں بعد پھر دلّی واپس آگئے تھے اور اب ان کا قیام مہادیو روڈ پر تھا، مجھے بخوبی یاد ہے کہ جس رات وہ صاحب فراش ہوئے اس شام بڑی دیر تک میں ان کی خدمت میں حاضر رہا اور روانہ ہونے سے قبل ان کو مکان کے اندر پہنچایا، یہی مجھ سے اُن کی آخری ملاقات تھی، اُن کے انتقال کے وقت اتفاق سے میں دلّی میں موجود نہیں تھا، مجھے اس روح فرسا حادثہ کی اطلاع اخبار کے ذریعہ ملی —— ان کی سرگرمیوں کا مرکز ۲۰ - تغلق کریسنٹ تھا، اب بھی میرا گزر

---

[1] ڈاکٹر صاحب مرحوم کے منجھلے صاحبزادے سید حسیب صاحب جن کی اہلیہ تاشقندی ہیں وہ بھی بعارضۂ قلب اللہ کو پیارے ہوگئے۔

اس طرف سے اکثر و بیشتر ہوتا ہے اور ہر بار مجھے ڈاکٹر صاحب مرحوم یاد آتے ہیں جن کی ذات معلوم نہیں کتنی سرگرمیوں کا سرچشمہ اور کتنی امیدوں کا محور و مدار اگرچہ ڈاکٹر صاحب اپنی عمر طبعی تک پہنچے، زندگی کے مختلف نشیب و فراز سے گزرے اور لیل و نہار کی متعدد کروٹیں دیکھیں لیکن جب وہ گئے تو اپنے ساتھ پوری ایک روایت لے گئے، پوری ایک تہذیب لے گئے اور زبان حال سے یہ کہتے ہوئے گئے ؂

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

محمد مسلم دہلوی

مولوی بشیر الدین احمد
ایک مورخ تاریخ کے جھروکے سے

دلی ! غریب نواز۔ دلی ! تہذیب و تمدن کا حسین گہوارہ ! دلی ! علم و ادب کا مخزن ! دلی ! گنگا جمنی طرز حیات کا مرکز ! دلی ! رواداری۔ خلوص، صلح پسندی۔ ایمان دھرم۔ پیار محبت۔ حفظ مراتب کی سرزمین۔ کبھی تھی تو ضرور۔۔۔ مگر آج نہ تو دلی میں دلی والے ہیں نہ دلی میں اس کی تاریخی منفرد خصوصیات ہیں ایسا کیوں ہے ؟ صدیوں کا رنگ پھیکا کیسے پڑگیا ؟ دلی کی بہار کہاں چلی گئی۔ دلی کی سنگین عمارتوں میں آج کونسی ایسی تبدیلی آئی کہ در و دیوار سے حسرت ہی حسرت ٹپکتی ہے۔ ایسا احساس ہوتا تو ہے۔ مگر کن کو ہو پرانے دلی والوں کو۔۔۔ نئے دلی والے تو بیچارے جمعہ جمعہ آٹھ دن سے دلی میں آکر بسے ہیں۔ انھوں نے تو دلی کو جب دیکھا جب یہ اجڑ چکی تھی۔ دلی کے گلی کوچے آبادی کی کثرت سے ایک ہنگامہ معلوم ہوتے ہیں۔ سڑکوں پر نکلتے دم نکلتا ہے۔ مجبوراً نکلنا ہی پڑے تو سر سے کفن باندھ کر ہی نکلنا ترین مصلحت ہے۔ امن و امان کی دلی میں آج ہر طرف ہڑبونگ کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ پرانے دلی والے ! ماضی کو روتے روتے قبر کے کنارے پر جا بیٹھے۔ ان کی سنو تو ہر بات افسانہ۔ مبالغہ ہی مبالغہ

Marfat.com

معلوم ہوگی۔ مگر ہائے کس کو سمجھائیں؟ کون سمجھے؟ کہ دلّی والا تو مبالغہ کے نام سے تو واقف تھا مگر افراط و تفریط کی دنیا سے وہ پیدائشی طور پر ہی الگ تھا بھی اور ہے بھی پتھر کا کلیجہ ہو تو کوئی ان سے سنے جو دلّی میں پیدا ہوئے اور دلّی میں ہی مرنے کے بعد دو گز زمین کی تمنا میں مرے جاتے ہیں۔ وہ سنائیں گے تم کو کہ دلّی کیا تھی؟ کیا ہوگئی؟ یہ تو سب دیکھ رہے ہیں چند سال کی بات ہے۔ یہ ستر سے بہتر سے لوگ سدھارے اور دلّی کی داستان ان کے ساتھ قبروں میں چلی جائے گی یا آگ کی نذر ہو جائے گی۔ ماتم۔ نوحہ کرنے والے ابھی تو ہیں لیکن بہت جلد یہ سب آگے پیچھے اللہ کو پیارے ہوں پرہوں ان میں سے ہی ایک ہم ہیں۔ زندگی کے آخری مرحلوں میں تاریکیاں ہمارا مقدر ــــ ہم تو جانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ مگر دل نہیں مانتا اور مجبور کرتا ہے کہ دلّی کے حسین چہرے سے انقلاب کا نقاب سب نہیں تو تھوڑا سا بھی سرکا دیں تاکہ آج نہیں تو کل۔ کل نہیں تو پرسوں شاید کوئی بھولا بسرا اس مرثیہ کو پڑھ کر مجسمہ حیرت بن جاتے ــــ اس لیے کچھ لکھنے کو کبھی کبھی جی چاہتا ہے۔ شاید کسی کے کان میں بات پڑی رہے اور کبھی کسی کام آجائے۔

چل رے خامے بسم اللہ!

غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے کے لوگ اپنی نئی نسل کو اجڑے دیار کی داستانیں سنایا کرتے تھے۔ اسی لیے اس ایک ہزار سالہ حکمرانی کا افسانہ تقریباً ایک صدی تک لوگ سنتے رہے۔ سر دھنتے رہے اور دلّی کی خصوصیات کو مضبوطی سے پکڑے رہے۔ اسی نسل کے گوشہ نشین زندہ لوگ مردوں سے بدتر ضرور ہیں مگر حق کہنے میں ان کو باک نہیں۔ اب کوئی سنے یا نہ سنے۔ کہنے کی بات کہہ دی جائے تب ہی اچھا ہے۔ ورنہ دل کی دل میں رہ گئی تو یہ کیا کم بڑا المیہ ہوگا۔ اس عمر میں جب کہ زندگی آخری منزل میں داخل

Marfat.com

ہو چکی ہو اور قبر کا گڑھا سامنے نظر آرہا ہو تو کیا منہ سے نکلا کوئی فقرہ۔ یا قلم سے نکلی کوئی بات مبالغہ آمیز ہو سکتی ہے؟ نہیں نہیں! ہرگز نہیں شاید استاد ذوق رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا ؎

دلی کے نہ تھے کوچے۔اوراق مصور تھے ۔۔۔ جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

یہ بات ذوق نے یوں ہی نہیں کہدی تھی۔ ایک واقعہ بیان کیا تھا جو چشم دید تھا۔ حقائق سے بھرپور! کیسے کیسے نامور لوگ۔ کیسے کیسے علم وحکمت کے پہاڑ اسی سرزمین پر پیدا ہوتے۔ اس کی تفصیل کا موقعہ ہی کہاں ہے؟ کس کو دلچسپی ہے اُن واقعات سے؟ چلو اطمینان اس کا تو ضرور ہے کہ ہزار میں خواہ ایک ہی کیوں نہ ہو۔ وہ یہ داستان غم سن لے تو ہمارا مقصد پورا ہوا۔ اس لیے آج دلّی کی ایک عظیم ہستی کی آپ کو یاد دلانی ہے تاکہ آپ تاریخ کی ضخیم کتابوں کی ورق گردانی سے بچ جائیں ——— وہ ہستی ہے مولوی بشیرالدین احمد مرحوم کی جو اسی دلّی کی سرزمین پر پیدا ہوئے۔ یہیں پلے بڑھے اور اسی سرزمین نے ان کو ہمیشہ کے لیے اپنی آغوش میں چھپالیا۔ ۱۹۲۷ء کے اگست میں یہ آفتاب علم وادب غروب ہوگیا ایک کم ساٹھ سال ہو چکے۔

دلّی کے گلی کوچے واقعاتی طور پر تاریخ کے اوراق ہیں۔ کسی محلہ میں چلے جائے۔ کسی گلی کوچہ میں جاکر معلوم کیجیے۔ ایسی ایسی عظیم المرتبت ہستیوں کا آپ کو علم ہوگا کہ آپ سراپا حیرت بن کر رہ جائیں گے۔ اسی دلّی کا مشہور ترین بازار چاندنی چوک ہے۔ لال قلعہ سے چلیے ——— چاندنی چوک کا بازار فتح پوری مسجد پر آکر ختم ہوگا۔ اس بازار سے لگا ہوا کھاری باؤلی کا کاروباری علاقہ ہے۔ اس بازار میں ایک گلی ہے جس کو گلی بتاشان کہتے ہیں۔ اس گلی بتاشان میں ایک تاریخی کوچہ آج بھی ہے کوچہ نواب مرزا۔ بہت بڑی تین برجوں والی ایک مسجد شیر شاہ سوری کے زمانہ کی اس محلہ

Marfat.com

میں ہے۔ اس مسجد میں وضو کرنے کے آنے کے لیے کھاری باؤلی بنائی گئی تھی جو آج ایک عظیم الشان منڈی بن گئی۔

قلعہ کی موتی مسجد کس نے نہ دیکھی ہوگی؟ اس مسجد کو موتی مسجد کہتے ہیں۔ شاہان وقت اس میں نماز پڑھتے تھے۔ اس مسجد کے امام — شاید آخری امام مولوی عبدالقادر صاحب تھے بڑے نامور گھرانے کے بڑے نامور عالم۔ متقی پرہیزگار۔ یہ اس مسجد کے امام ہی نہ تھے شاہزادوں اور شہزادیوں کے دینی اتالیق بھی تھے۔ وہ اس کوچہ نواب مرزا میں رہتے تھے۔ یہ مولوی عبدالقادر صاحب دو بھائی تھے۔ دوسرے کا نام مولوی عبدالرب تھا جن کا قائم کردہ مدرسہ عبدالرب آج بھی ہملٹن روڈ کشمیری دروازہ پر جاری ہے۔ اور ان ہی بزرگ نے سہارنپور کی عالیشان جامع مسجد بھی بنوائی تھی۔ غرضیکہ یہ گھرانا تمام کا تمام مثل آفتاب تھا۔ مرد ہوں یا عورتیں سب عالم۔ حافظ قرآن۔ متقی پرہیزگار — کوچہ نواب مرزا کی مسجد دلی میں واحد مسجد ہے جس میں مولوی عبدالقادر صاحب کی صاحبزادی رمضان المبارک میں تراویح میں قرآن مجید سناتی تھیں — مقتدی عورتیں ہی ہوتی تھیں۔ بڑی جید حافظ قرآن تھیں۔

مولوی عبدالقادر صاحب کی ایک صاحبزادی مولوی نذیر احمد صاحب سے بیاہی گئی تھیں راقم الحروف کی دادی تھیں۔ بڑی نیک باشرع بیوی تھیں۔ ان کی اولاد میں بیٹیوں کے علاوہ ایک بیٹا تھا۔ مولوی بشیرالدین احمد ڈپٹی نذیر احمد کیونکہ خود عالم بے مثال تھے اس لیے قلعہ کے مولویوں نے ان کی قدر دانی کی اور اپنا داماد بنایا۔ مولوی نذیر احمد کے والد مولوی سعادت علی بھی بڑے عالم تھے مگر کیونکہ بجنور کے باہر انھوں نے قدم نہ رکھا اس لیے ان کی شہرت نہ ہوئی۔ مولوی سعادت علی کے بڑے صاحبزادے مولوی علی احمد بھی علم و دانش میں یکتائے روزگار تھے

Marfat.com

مگر بجنور نے ان کو کبھی نہ چھوڑا اور وہ بھی گمنامی میں پڑے رہ گئے۔ مگر ان کے چھوٹے بھائی مولوی نذیر احمد نے بجنور چھوڑا۔ دلی آئے اور اپنی علمی کاوشوں سے آسمانی علم وادب پر مثل قمر چمکے۔ ان کے واحد فرزند تھے مولوی بشیرالدین احمد جنھوں نے حیدرآباد دکن میں اعلا ملازمتوں کے بعد اپنے والد کی ہی روش پر قدم بقدم چل کر بڑی ہی عظیم الشان خدمات علم و ادب کی دنیا میں انجام دیں۔ یہ دور سارا علم کی روشنی سے معمور تھا بڑے بڑے علم والے آفتاب بن کر چمک رہے تھے۔ اور مولوی بشیرالدین احمد صاحب کے تو والد محترم نے ہی علم کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا اس لیے مولوی بشیرالدین احمد کو میدان ہموار ملا۔ ان کی تصانیف کی فہرست دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ورثہ میں مال و دولت ہی نہیں علم وادب میں بھی حصہ ملتا ہے مولوی نذیر احمد نے تعلیم نسواں کے سلسلہ میں اپنے گھر سے ہی کام شروع کیا تھا۔ بنات النعش۔ اور مراۃ العروس ان کی مشہور و نام کتابیں آج بھی ہر جگہ چھپ رہی ہیں۔ اس لیے مولوی بشیرالدین احمد نے بھی قلم تھامتے ہی پانچ کتابیں امور خانہ داری پر دلچسپ انداز میں عورتوں کے لیے ان ہی خطوط پر لکھیں جو مولوی نذیر احمد نے تیار کیے تھے۔ اقبال دلہن۔ حسن معاشرت اصلاح معیشت لخت جگر دو حصے۔ فغان اشرف۔ یہ کتب پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی۔ ممالک متحدہ آگرہ واودھ اور بمبئی میں بطور درس پڑھائی جاتی تھیں اصلاح معیشت اور لخت جگر پر تو حکومت سے انعام بھی ملا تھا۔

یہاں یہ موقعہ نہیں کہ ان کتب پر اظہار خیال کیا جائے۔ لیکن یہ تو ماننا ہی ہوگا کہ نفس مضمون اور زبان کے لحاظ سے یہ کتب اردو ادب کا بہترین اصلاحی سرمایہ ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کی اصلاحی کتب میں بچوں کے لیے حرز طفلاں جوانوں کے لیے نشاط عمر ضعیفوں کے لیے عصائے پیری بہت ہی مشہور کار آمد کتب آج بھی مانی جاتی ہیں۔ بچیوں سے دو دو باتیں

Marfat.com

عزم بالجزم۔ مثنوی درد دل۔ دیوان بشیر۔ انشائے بشیر بھی علمی دنیا میں اپنا نام پیدا کر چکی ہیں علم و ادب میں آدمی کو دل چسپی ہو تو جس طرح نثر میں اس کا قلم دوڑتا ہے نظم میں بھی اڑان بھرتا ہے مولوی بشیر الدین احمد کی شاعری وجہ امتیاز نہیں مگر معیاری ضرور ہے۔ مگر ان کی تصانیف میں جو مقام ان کی تاریخی کتب کو حاصل ہے وہ شاید بیسویں صدی میں کسی کو نہ ملا ہو۔ یوں تو سرسید اور شمس العلماء مولانا ذکار اللہ کا نام بھی بحیثیت مورخ کے بہت اونچا ہے مگر مولوی بشیر الدین احمد کا نام فن تاریخ نویسی میں اپنا منفرد اور مخصوص مقام رکھتا ہے۔ حیرت ہے کہ علم دوست حضرات نے آج ان تصانیف کو نظروں سے اوجھل کیوں کر دیا جب کہ ان کتب کا متبادل نہ کوئی ہے اور نہ شاید آیندہ ہو۔ آیئے اپنے دعوے کے ثبوت میں آپ کو مولوی بشیر الدین احمد کے تاریخی کارناموں سے روشناس کرانے کی کوشش کریں۔

واقعات دارالحکومت دہلی

مولوی بشیر الدین احمد مرحوم کا یہ عظیم الشان ضخیم و مستند کارنامہ فن تاریخ میں یگانۂ روزگار ہے اس کتاب کے بارے میں حصہ اول کے خاتمہ صفحہ ۲۵۰ پر مصنف مرحوم فرماتے ہیں:۔

"خیر! عمر عزیز کے دو برس گئے تو ضرور مگر اس خیال سے اس نقصان پر صبر آتا ہے کہ بیکار اور رائے گاں نہیں گئے بلکہ کار خیر میں صرف ہوئے اور نیک لگے۔ میں نے اپنے وطن مالوف کی خدمت کی۔ گو دلّی کی شہرت کسی مزید تقریب کی محتاج نہیں کہ چار دانگ عالم میں اس کا شہرہ ہے۔ مگر میں نے یہ کتاب دلّی کی سوانح عمری لکھی ہے۔ جب سے دلّی کا پتہ چلتا ہے اب تک

Marfat.com

کے حالات بشرح و بسط قلم بند کئے ہیں اور جائز طور پر کہہ سکتا ہوں کہ اپنی طرز میں یہ کتاب دہلی کی پہلی تاریخ ہے۔ مذہبی ہادیوں کی زبانی سحر انگیز تقریروں سے اتر کر کسی قوم کے مردہ دلوں میں جوش پیدا کرنے اور ہمت بڑھانے کا اگر کوئی عمدہ ذریعہ ہے تو وہ تاریخ ہے۔ اور تاریخ بھی کون سی؟ ان کے آباواجداد کی۔ پس اہلِ ہند عموماً اور اہلِ دہلی خصوصاً اس کتاب کو بغور پڑھیں اور دیکھیں کہ مسلمان کیا تھے؟ اور کیا ہوگئے؎

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم ہوگئے خاک انتہا یہ ہے

بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ (یہ کتاب) پڑھیں گے پیچھے پہلے اسے ہاتھ میں لے کر تولیں گے تو شاید ناک بھوں چڑھائیں کہ شہر تو صرف تین حرف کا اور تاریخ کو دیکھیے ڈھائی ہزار صفحے سے بھی اوپر ہی اوپر ——— میں نے بھی اس کتاب پر اپنی جان لڑادی ہے اور کوئی دقیقہ اس کے مکمل اور دلچسپ بنانے کا اٹھا نہیں رکھا۔"

مذکورہ اقتباس سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ دلّی کی یہ تاریخ تین ضخیم حصّوں پر بڑی تقطیع پر چھپی ہے حصہ اول ۱۰۴۰ صفحات پر مشتمل ہے حصہ دوم ۸۷۶ پر اور سوم ۵۲۸ پر — یعنی کل دو ہزار چار سو چوالیس صفحات نفس مضمون اور تصاویر الگ — اس تاریخ کی اہمیت کا اندازہ تاریخ داں حضرات ہی کر سکتے ہیں۔ قیمت پہلے جو ہوگی وہ تو ہوگی اپنے زمانہ میں راقم الحروف نے واقعات دارالحکومت کی تینوں جلدیں عام قیمت صرف دس روپیہ پر فروخت کرنی شروع کی تھیں آہستہ آہستہ اب یہ کتاب مکمل اگر مل سکے تو یہ راقم الحروف دس ہزار بھی اس کی قیمت کم تصوّر کرتا ہے کتاب کی افادیت کا اندازہ لگانے کے لیے اقوام متحدہ کے نمائندوں سے پوچھیے جو اس کتاب کے حوالوں

سے اپنے مطالبات کی اہمیت اور صداقت ثابت کرتے رہے ہیں۔

سرسید کی آثار الصنادید اس سلسلہ کی مستند کتاب مانی جاتی تھیں۔ مگر واقعات دار الحکومت دہلی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل تاریخ واقعات دار الحکومت ہے اور اس کا خلاصہ آثار الصنادید۔ یا یوں کہیے کہ متن آثار الصنادید اور شرح واقعات دار الحکومت دہلی ہے مگر سرسید نے جو گراں بہا خدمت انجام دی اسی کے نتیجہ میں آج مولوی بشیر الدین احمد کی واقعات دار الحکومت ہمارے سامنے ہے۔ اس لیے دونوں کتابوں کا موازنہ کرنا تو بے ادبی ہے۔ ہاں دونوں کی افادیت اپنی اپنی جگہ مخصوص۔ معتبر۔ مستند اور قابل ستایش ضرور ہے۔

دلّی صدیوں کا شہر ہے۔ اور ہمیشہ ہی آفتوں کا شکار رہا ہے۔ اجڑتا رہا ہے۔ بستا رہا ہے۔ جگہ بدلتا رہا ہے اس لیے صدہا گلی کوچے۔ ہزارہا تاریخی عمارتیں یہاں موجود ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ دلّی کی ہر اینٹ تاریخ کا ایک صفحہ ہے۔ اس لیے صدیوں کی تاریخ کو ایک جگہ لاکر جمع کر دینا گویا دریا کو کوزہ میں بند کرنا ہے۔ آج بھی شاہ جہاں آباد والی دلّی کے گلی کوچوں میں سے گذر کر دیکھیے۔ عجیب۔ نادر الوجود۔ جاذبِ نظر عمارتیں نظر آئیں گی۔ ذوق ہو۔ وقت ہو تو اس شہر کو دیکھنے میں تاریخ کے مختلف دور نظروں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ کوئی ساتھ ہو اور بتاتا چلے کہ یہ عالیشان دروازہ کس کا ہے؟ اس حسین عمارت کو کس نے بنایا — اب اس میں کون رہتا ہے؟ پہلے کون رہتا تھا؟ فن تعمیر کے یہ نادر نمونے دعوت دید کے ساتھ اس امر کے بھی متقاضی ہیں کہ ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہوں ۱۹۱۹ء تک کے حالات کی تفصیل ایک جگہ اگر دیکھنی ہو اور دیکھ کر اگر واقعیٔ تفصیل معلوم کرنی ہو تو واقعات دار الحکومت دہلی کے صفحات آپ کے

Marfat.com

اطمینان کے لیے کافی ہوں گے۔ تفصیل بیان ہو اور تشنگی معلومات کا شکوہ نہ رہے تو واقعی راوی کا کمال ہے جس سے اس کے ذہنی کمال کا احساس ہوتا ہے دلّی کا کوئی گلی کوچہ ہو ــــ گلی کوچہ میں کوئی مکان ہو۔ اس میں کوئی رہنے والا ہو خانقاہ ہو۔ درگاہ ہو۔ مسجد ہو۔ مندر ہو۔ گرجا ہو۔ گردوارہ ہو۔ غرض جو بھی ہو اس کی تفصیل مع سن تعمیر آپ کو واقعات دارالحکومت میں ملے گی۔ بات پرانی دلّی کی ہے۔ نئی دلی اور پرانے شہر کے باہر تو نئی نئی بستیاں جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے بنی ہیں اور ان جدید تعمیروں میں تو کشش نام کی کوئی چیز ہے بھی نہیں۔ واقعات دارالحکومت تو ۱۹۱۹ء تک محدود ہے۔

آج کی نام نہاد ترقی یافتہ دنیا میں ہی نہیں ہمارے ملک میں بھی بڑے بڑے مورخ۔ بڑی بڑی ڈگریاں لمبی لمبی سندیں لیے ہوئے یونیورسٹیوں میں شعبۂ تاریخ کے سر پر بیٹھے ہیں۔ کچھ ریڈر ہیں۔ کچھ وقت کے ساتھ شعبہ کے صدر ہیں ــــ مگر کتنے ہیں جن کو یہ معلوم ہے کہ دلّی کی سرزمین نے بھی ایک بڑا مورخ پیدا کیا تھا جو بیسویں صدی میں اپنا منفرد اعلا مقام فنِ تاریخ میں رکھتا ہے۔ مولوی بشیرالدین احمد ــ! شاید کوئی ہو جس کو معلوم ہو کہ واقعات دارالحکومت، تاریخ بیجا پور۔ تاریخ بیجا نگر فرامین سلاطین جیسی کتابیں بھی اپنے ہی ملک کے ایک نامور سپوت نے لکھی اور چھاپی ہیں یہ افسوس ناک صورت حال ــــ اس کی وجہ ایک ہو تو بتائی جائے۔ نہ یہ موقعہ ہے کہ اس تفصیل کی طرف توجہ دی جائے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ مذکورہ کتب کی زبان اردو ہے اور ـــ

زبانِ یار من ترکی ! و من ترکی نمی دانم

اردو اپنے مولد میں دفن ہو چکی ــــ عرصہ ہوگیا ــــ اس کا ادب دیمک

Marfat.com

کی نذر ہوگیا۔ کچھ باقی ہے دار المطالعوں میں! مگر یہاں بھی اردو کتابوں کو جگہ گھیرنے والی فضول کتابیں سمجھ کر الماریوں میں سے نکال کر زمین پر ڈال دینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ آج کے جدید علمی کارناموں کے لیے جگہ چاہیے ـــ ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

واقعات مملکت بیجاپور

یہ بھی تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ صفحات ۱۲۸۷ ـــ یہ ملک دکن کی قابل دید مبسوط تاریخ ہے حسن باطنی کے ساتھ حسن ظاہری کی بھی کمی نہیں۔ لیکن کیونکہ بات دکن کی ہے اور یہ بدنصیب خطہ ۴۸ء سے ہی سیاست وقت کا شکار رہے۔ نیا زمانہ! نئے لوگ! نئی بات! اس لیے کون جانے کہ واقعات مملکت بیجاپور نام کی بھی کسی کتاب کی تین جلدیں کبھی لکھی گئی تھیں اور اچھی بھی تھیں ـــ مگر ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعلم
ثبت بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ ہی کتاب واقعات مملکت بیجاپور اُس وقت کے دکن کے حکمراں اعلا حضرت میر عثمان علی خاں مرحوم کے علم میں آئی تو اس پر از راہ قدردانی ایک ہزار روپیہ انعام دیا اور اس طرح نہ صرف مصنف کی قدر افزائی فرمائی بلکہ اپنے علم دوست ہونے کا بھی ثبوت دیا۔ اس رہبر کتاب کو بھی زمانہ بھول گیا ـــ اب کسی لائبریری میں کوئی نسخہ کہیں ہو تو ہو۔ ورنہ تو کتاب اب نظر نہیں پڑتی ؎

مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے   زمیں کھا گئی اُس سے کیسے کیسے

اس ناقدری کا علم مصنف مرحوم کو اگر ہوتا تو شاید کتابیں نہ لکھی جاتیں نہ چھاپی جاتیں مصنف گیا ـــ تصنیف گئی۔ شعبۂ تاریخ ہر

Marfat.com

یونیورسٹی میں موجود ہے۔ مورخ بھی ہیں تاریخ پڑھانے والے بھی ہیں۔ مگراب استاد تنخواہ کے لیے پڑھاتا ہے۔ علم کی خدمت کے دور ختم ہوئے۔ پیسہ ہی پیسہ اب علم ہے۔ ایمان ہے ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ علم کے جو چراغ برعظیم میں روشن کیے گئے تھے خود جدید نسل کی لاعلمی کے ہاتھوں خاموش ہو چکے مگر ؎

نوشتہ ہی نہ سیہ بر سفید　　　نویسندہ را نیست فردا امید

غور طلب بات یہ ہے کہ یہ ناقدری کا دور کیوں آیا؟ اور اگر آ ہی گیا تو ہم اس کا احساس کب کریں گے کہ ہمارا علمی ذخیرہ تباہ و برباد ہوتا چلا جا رہا ہے۔ بات سچی ہے تو کڑوی بھی ضرور ہوگی برا لگے تو لگے مگر کہنے والا تو کہے گا۔ سنو یا نہ سنو۔ تم خود ہی اپنے بیش قیمت سرمایہ کی احتیاط سے غافل ہوگے تو دوسرا کون ہوگا جو تمہارے مال کی خود حفاظت کرے! اپنے ماضی کو غارت ہونے سے پہلے سوچ لو کہ ماضی گیا تو حال بھی گیا۔ مستقبل کی بات کرنی تو بڑی دشوار بات ہے ؎

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

تاریخ بیجانگر

مولوی بشیرالدین احمد صاحب مولّف واقعات مملکت بیجاپور اور واقعات دارالحکومت دہلی کا انتقال ۱۹۲۷ء میں ہوا۔ کاتب الحروف کو اپنی کم علمی کی وجہ سے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ وہ اس عظیم مورخ کا سب سے چھوٹی نالائق اولاد ہے جو ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ یوں تو مصنف مرحوم نے چھ بیٹے۔ پانچ بیٹیاں چھوڑی تھیں جن میں اب چار

Marfat.com

بیٹے۔ چار بیٹاں حیات ہیں۔ مگر سب چراغ سحری سوائے راقم الحروف کے سب پاکستان کی نذر ہو گئے۔ کیونکہ راقم الحروف سب سے چھوٹا ہے اس لیے وہ معلومات جو بڑے بھائیوں کو ہیں راقم الحروف کو نہیں۔ کیونکہ تقسیم ملک کے بعد راقم الحروف ہی دہلی میں آبائی مکانات میں بحثیت دربان رہتا ہے اس لیے کتابوں کی لوٹ پلٹ میں تاریخ بیجانگر کا قلمی خوش خط نسخہ ضرور نکلا ہے جو محفوظ ہے۔ اب یہ کتاب شائع ہوئی یا نہیں بصد شرم راقم الحروف کو کہنا پڑتا ہے کہ اسے علم نہیں ہے تاریخ بیجانگر کے مخطوطے کے مطالعہ کا ضرور شرف حاصل ہے اور یہ کہنا اظہار حق ہے کہ یہ تاریخ بھی دیگر تواریخ کی طرح نہ صرف ضخیم ہے بلکہ مستند بھی ہے کیونکہ مصنف مرحوم کو تاریخ کی ترتیب کا فن بحد کمال آتا تھا۔

حیات ملکہ وکٹوریہ قیصرۂ ہند

ایک مختصر تاریخی رسالہ جس میں ہندوستان کے لوگوں کو ملکہ موصوفہ کے حالات سے کما حقہٗ واقف کرایا گیا ہے۔

مذکورہ تاریخی کتب کے اجمالی تعارف کے بعد مولوی بشیرالدین احمد صاحب مرحوم کی ادبی کاوشوں سے بھی روشناس کرانا ضروری ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ مولوی بشیرالدین احمد صاحب مرحوم نے ادبی ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ اپنے والد مولوی نذیر احمد دہلوی کی علمی خدمات نے ان کے ذہن کو اپنے والد کے طرز فکر پر ڈھال دیا تھا۔ اصلاح حال کے لیے ناول نویسی کا جو ذریعہ مولوی نذیر احمد مرحوم نے اپنایا تھا وہ ان کی زبان دانی نے ایسا موثر کر دیا تھا کہ علم و ادب کی دنیا ان کے زور قلم کی معترف ہوگئی تھی۔ اس لیے ان کے فرزند ارجمند نے اپنے والد محترم کی حیات میں ہی

قلم سنبھال لیا تھا اور ان کے ابتدائے ناول اقبال دلہن وغیرہ تو خود
مولوی نذیر احمد مرحوم کے زیر نظر آکر داد تحسین حاصل کر چکے تھے۔
مولوی نذیر احمد مرحوم علمی دنیا ہی میں نہیں معاملات دنیا میں بھی
لاگ لپیٹ سے کام لینے کو معیوب سمجھتے تھے اس لیے مولوی بشیرالدین
احمد کے ناول ان کی نظر میں معقولیت رکھتے تھے اس لیے انھوں نے
صرف ادبی حثیت سے ان ناولوں پر اپنا اظہار خیال بے لاگ کرتے
ہوئے بھی مولوی بشیرالدین احمد کے قلم کو سراہا ہے۔ یہ بات علم دوست
حضرات کے ہاتھ میں ہے کہ وہ مولوی بشیرالدین احمد کے ناول دیکھ کر
مولوی نذیر احمد مرحوم کی رائے سے اتفاق کریں یا پھر دلائل کے
ساتھ اختلاف کریں۔

تاریخ بیجا نگر

واقعات دارالحکومت کی ضخیم تین جلدیں۔ واقعات مملکت بیجاپور
کی مکمل تین جلدیں قلم بند کرنے کے بعد مولوی بشیرالدین احمد کا قلم یہاں
بھی نہیں رک گیا۔ مصنف نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور اپنا رخ
بیجا نگر کی طرف موڑلیا ۔ یہ کتاب اتنی جامع اور ضخیم تو نہیں ہے جتنی
پہلی دو کتابیں ہیں پھر بھی بیجا نگر کی یہ تاریخ مصنف کا ایک نادر کارنامہ ہے۔

فراین سلاطین خود مصنف مرحوم نے فراین سلاطین کے دیباچہ
میں صفحہ ۸ پر فراین سلاطین کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

دہلی جو کسی زمانہ میں سلاطین مغلیہ کا دارالسلطنت تھا
اور زیادہ شاہجہاں آباد کے نام سے مشہور تھا یہ ہی
مرکز فراین واحکام کی اجرا واشاعت کا تھا۔ اس سرزمین

Marfat.com

سے سارے ہندوستان کی کل مروڑی جاتی تھی۔ وہ لوگ جو اس ملک پر حکمراں تھے مدتیں ہوئیں کہ مر کھپ گئے۔ اب ان کی اولاد تک باقی نہیں ـــــــ جب ان لوگوں (حکمرانوں کی اولاد) کے ذرائع آمدنی ہی مسدود ہوگئے یہ کاغذ کے ٹکڑے (شاہی فرامین) ان کے کس کام کے رہے؟ ـــــــ یہ ہی وجوہ ہیں کہ ان فرامین کی نگہداشت نہ ہوئی اور ان کا بڑا حصہ ناکارہ ہونے سے ضائع ہوگیا۔ جو (فرامین) بچ رہے تھے وہ ۵۷ء کے غدر میں جانوں کے ساتھ تلف ہوئے ـــــــ اس طرح خدا جانے کتنے فرامین تلف ہوئے۔

مصنف مرحوم مزید فرماتے ہیں:

"جب سرکار عالی نظام خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کی ملازمت (صدر تعلقدار) میں تھا تو مجھے تحقیقات عطیات اور فصل خصومات میں بہت سے فرامین دیکھنے کا اتفاق ہوا ـــــ اور آخر زمانہ ملازمت میں کچھ فرامین جمع کیے اور جب سے اب تک متلاشی ہوں۔"

اس عبارت سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ باوجود اعلیٰ سرکاری ملازمت کے انہماک کے مصنف کو فرامین جمع کرنے کی لگن لگی رہی جو آخر فرامین سلاطین کے نام سے شائع ہوئے ـــ مواد اتنا جمع ہوتا چلا گیا کہ فرامین کا دوسرا حصہ بھی مرتب ہو سکتا تھا ـــ مگر مہلت حیات نے کام ختم کرا دیا۔ اور صرف ایک ہی حصہ شائع ہوسکا اور ۱۹۲۷ء میں مولوی صاحب موصوف اللہ کو پیارے ہوئے۔ اکبر سے لے کر ظفر تک جو بھی فرامین دستیاب ہوئے ان کو کتابی صورت میں شائع کر کے مصنف مرحوم نے زبردست کام کیا ہے؟ مگر

Marfat.com

واہ رے ناقدری! آج اس نادر نمونۂ فرامین کی اشاعت کا بھی لوگوں کو علم نہیں۔ اگر آج کے ڈگری والے مورخ توجہ فرماتے تو مولوی بشیر الدین احمد کی خدمت تصنیف و تالیف کے جملہ گوشے تحقیق کرنے والے صفحۂ قرطاس پر لا چکے ہوتے اور یہ بڑا ہی نادر الوجود کارنامہ ہوتا پھر بھی آج نہیں تو کل اس ضرورت کا احساس پیدا تو ہوگا مگر ہم نہ ہوں گے۔ ہمارے ہونے سے کچھ تھوڑے بہت کام آسان ہو جاتے! جو ہمارے پاس مواد ہے وہ بھی حاضر کر دیتے جو ہمارے بعد ہاتھ نہ آئے گا۔ کام تو پھر بھی ہوگا مگر تشنہ رہے گا۔ مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ!

Marfat.com

سرور تونسوی

دیوان آنند کمار بار ایٹ لا

زباں پہ بارے خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نُطق نے بوسے مری زباں کے لیے

انگریزی حکومت میں پہلے ہندوستانی ڈویژنل کمشنر لاہور راجہ نریندر ناتھ کے ہاں فروری ۱۸۹۴ء میں بسنت کے دن دیوان آنند کمار کا جنم ہوا۔ سنٹرل ماڈل سکول لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۳ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے پیمبروک کالج میں اعلا تعلیم حاصل کرنے چلے گئے۔ اُن دنوں ڈاکٹر اقبال اور جسٹس دین محمد بھی کیمبرج یونیورسٹی میں ہی زیرِ تعلیم تھے۔ دیوان صاحب فرماتے تھے کہ ڈاکٹر اقبال ان سے دو سال سینئر تھے۔

جب دیوان صاحب نے بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کی تو جلسۂ تقسیم اسناد میں پیمبروک کالج کے پرنسپل نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا کہ میری زیرِ نگرانی ہزارہا غیر ملکی طالب علموں نے ڈگریاں حاصل کیں مگر جس شریفانہ، فرماں بردارانہ اور عقیدت مندانہ انداز میں مسٹر کمار نے اپنا زمانۂ طالب علمی اس یونیورسٹی میں گزارا ہے وہ ایسا مثالی تھا کہ جس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، ہندوستان میں زمانۂ قدیم میں مذہبی، روحانی یا اخلاقی تعلیم حاصل کرنے والے سٹوڈنٹ اپنے اُستادوں کو گرو کا درجہ دیتے ہوں گے اور ان کی تعظیم اپنے ماں باپ کی طرح

Marfat.com

کرتے ہوں گے۔ مسٹر کمار کا یہ رویّہ اُن ہندوستانی راجاؤں۔ نوابوں اور خان بہادروں کے فرزندوں کے لیے مشعل راہ ہونا چاہیئے جو یہاں تعلیم کے حصول کی آڑ میں ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں جن پر یہاں کے باشندوں کو بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ پرنسپل پیمبروک کالج کا یہ تعریفی سرٹیفکٹ دیوان صاحب کے وارثان کے ہاں اب بھی موجود ہے۔

جب دیوان صاحب بار ایٹ لا بن کر لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو ان کا سامان تو ان کی کوٹھی (جو آج کل فاطمہ جناح میڈیکل کالج کا ہوسٹل ہے) پر بھجوا دیا گیا اور ان کی والدہ محترمہ اپنے بیٹے کو کار میں سیدھے ہر دوار لے گئیں اور انھیں گنگا اشنان کرانے اور گنگا جل پلانے یعنی شدھ کرانے کے بعد گھر لائیں۔

ابھی دیوان صاحب کیمبرج یونیورسٹی میں ہی زیر تعلیم تھے کہ پنجاب میں جلیانوالہ باغ کا سانحہ رُونما ہو چکا تھا۔ اور اس سانحۂ روح فرسا سے دیوان صاحب کے دل میں انگریزی حکومت سے متعلق نفرت پیدا ہوئی۔ چنانچہ جب گورنر پنجاب نے راجہ نریندر ناتھ سے کہا کہ وہ اُن کے صاحبزادے کو ایک اعلیٰ عہدے پر متمکن کرنے والے ہیں اور راجہ صاحب نے یہ خوشخبری اپنے فرزند ارجمند کو دی تو آنند کمار صاحب نے انگریزی حکومت کی ملازمت سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں تو درس و تدریس میں دل چسپی رکھتا ہوں اور ایک ماہ بعد ہی انھیں پنجاب یونیورسٹی میں زُولاجی پڑھانے کی ملازمت مل گئی۔

راجہ نریندر ناتھ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو اُن کی ہر دلعزیزی کے باعث عوام نے اُنھیں اپنا لیڈر بنا لیا اور راجہ نریندر ناتھ کی حیثیت پنجاب کی سیاسیات میں اس مُہرے کی ہوگئی جس کے بغیر کوئی بھی سیاسی گُتھی حل ہونا مشکل تھی۔ یونینسٹ پارٹی کے سربراہ سر سکندر حیات خاں۔ چودھری چھوٹو رام اور دیگر اکابر راجہ صاحب کو اپنا دستِ راست سمجھتے تھے۔ پنجاب کے ہندوؤں نے راجہ

Marfat.com

صاحب کو پہلے پراونشل مہاسبھا اور پھر آل انڈیا مہاسبھا کا صدر منتخب کیا۔ راجہ جی راونڈ ٹیبل کانفرنس میں مدعو کیے گئے۔ غرضیکہ پنجاب کی حکومت سازی بھی اُن کے مشورہ کے بغیر عمل میں نہیں آسکتی تھی۔ سر منوہر لال کو وزیر بنانے والے راجہ صاحب ہی تھے۔

اُس وقت کا ہر بڑا لیڈر خواہ وہ آل انڈیا کانگریس کا ہو یا مہاسبھا کا قیام لاہور میں راجہ صاحب کا ہی مہمان ہوتا تھا۔ دیوان آنند کمار نے سُن رکھا تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد دخترِ رز کے رسیا ہیں۔ چنانچہ جب مولانا ابوالکلام آزاد راجہ صاحب کے ہاں مہمان ہوئے تو شام کو آنند کمار صاحب مولانا آزاد کے پرسنل سکریٹری اجمل خاں صاحب کو ڈائننگ ہال میں لے گئے اور ایک الماری کھول کر کہنے لگے اجمل صاحب غیر ملکی شراب کے بیسیوں برانڈ آپ کے سامنے ہیں مولانا جونسا برانڈ پسند کرتے ہوں یہاں سے لے لیجیے گا۔ اس پر اجمل خاں صاحب مُسکرائے اور فرمایا دیوان صاحب آپ کو غلط اطلاع ملی ہے۔ دیوان صاحب فرماتے تھے کہ اس کے بعد جب بھی اجمل خاں صاحب سے ملاقات ہوتی تو یہ واقعہ لامحالہ دونوں کے ذہن میں تازہ ہو جاتا اور دونوں ہی مُسکرا دیتے۔

۱۹۴۷ء کی تقسیم مُلک کے بعد دیوان آنند کمار بھی ۱۹ کروڑ کی جائیداد چھوڑ کر ہندوستان آگئے اور پہلے کچھ دن سولن میں اپنے عزیزوں کے ہاں رہے اور پھر ۴۔ سکندرہ روڈ نئی دہلی میں اپنے خُسر کی کوٹھی میں آگئے اور یہیں سب سے پہلے بیگم حمیدہ سلطان صاحبہ نے مجھے اُن سے متعارف کرایا۔

دیوان صاحب نے ہندوستان آکر کیمپ کالج۔ دیال سنگھ کالج دہلی اور دیال سنگھ کالج کرنال جاری کیے۔ راوز ایونیو کی بلڈنگ خرید کر اس میں دیال سنگھ پبلک لائبریری کا اجرا کیا۔ یاد رہے کہ ۱۹۱۰ء کے بعد دیال سنگھ لائبریری لاہور میں راجہ نریندر ناتھ نے بنائی تھی اور ایسی لائبریری ایشیا بھر میں اس لحاظ سے نہیں تھی کہ اردو، فارسی اور عربی کی نایاب اور مشہور عالم کتابوں کا جو ذخیرہ اس

Marfat.com

لائبریری میں تھا کسی اور لائبریری میں نہیں تھا۔ دیال سنگھ کالج کی بلڈنگ لودھی کالونی میں بنائی اور بڑی شان وشوکت سے یہ کالج جاری رہا مگر سٹاف کی آئے دن کی ہڑتال اور ناجائز مطالبات نے دیوان صاحب کو بددل کر دیا اور انھوں نے یہ کالج ۱۹۷۲ء میں دلی یونیورسٹی کی تحویل میں دے دیا۔ کرنال کا دیال سنگھ کالج اب بھی دیوان آنند کمار صاحب کے فرزندِ ارجمند دیوان گجندر کمار صاحب کی چیرمین شپ میں چل رہا ہے اور ہریانہ میں ایک خاص مقام کا حامل ہے۔ دیال سنگھ لائبریری راوز ایونیو کی بلڈنگ کا بہت بڑا حصہ دلی حکومت نے اکوائر کرلیا اور چھ آنے فی مربع فٹ سے کرایہ مقرر کیا گیا جو ہر ماہ ۶۶۶۶.۶۶ روپیہ ملتا ہے۔ اس کرایہ سے لائبریری کے اسٹاف کی تنخواہیں اور لائبریری کی دیکھ ریکھ مشکل سے ہو رہی ہے اب جب کہ دلی میں فی مربع فٹ چودہ روپیہ کرایہ مقرر ہے مگر اس لائبریری کو وہی چھ آنے مربع فٹ ہی کرایہ دیا جارہا ہے جو کہ ۱۹۵۰ء میں مقرر کیا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پچھلے چار پانچ سالوں میں اس لائبریری میں ایک بھی کتاب نہیں خریدی جاسکی اس کے باوجود یہ لائبریری اس لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے کہ اردو فارسی اور عربی کی نایاب اور نادر کتابیں جو اس لائبریری میں موجود ہیں وہ دلّی کی کسی دوسری لائبریری میں نہ مل سکیں گی۔

دلی کے سابقہ لیفٹیننٹ گورنر جناب جگ موہن نے اس لائبریری کا کرایہ بڑھانے کے لیے سلسلہ جنبانی کی تھی مگر ان کے تبادلہ کے بعد یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ کاش ہمارے موجودہ لیفٹیننٹ گورنر جناب کپور صاحب تک یہ آواز پہنچ سکے اور وہ دیال سنگھ لائبریری کے ساتھ انصاف کرسکیں تاکہ یہ نامور لائبریری زندہ رہ سکے۔

انگریزی کتابوں کا جو بہترین کلیکشن اس لائبریری میں ہے، شاید پارلیمنٹ کی لائبریری میں بھی نہ ہو۔ ہندی کتابوں کے بارے میں دیوان صاحب فرماتے تھے کہ ہندی ادب کو اس کے مصنفین نے اپنی قابلیت کے مظاہرے کے لالچ میں ایسی عجیب وغریب زبان کو جنم دیا ہے جسے کم سے کم ہندی نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ یہ زبان کسی دوسری

Marfat.com

دنیا کی زبان معلوم ہوتی ہے چنانچہ ہندی کی کتابیں اس لائبریری میں شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھیں تاہم ہندی ادب کی ہر اچھی کتاب موجود ہے۔

دیوان صاحب بیسیوں بڑے بڑے اداروں کے مینجنگ ڈائرکٹر۔ ڈائرکٹر۔ اور چیرمین تھے۔ جن میں تھاپر گروپ جگجیت ملز۔ دیال سنگھ ٹرسٹ اور دیگر درجنوں تعلیمی ادارے تھے۔

پنڈت موتی لال نہرو نے اپنی صاحب زادی محترمہ لکشمی پنڈت کا رشتہ دیوان آنند کمار سے کرنا چاہا مگر دیوان صاحب نے انکار کر دیا۔ جس سے پنڈت جواہر لال نہرو ہمیشہ ان سے کھچے کھچے رہے۔ یہاں تک کہ جب دیوان آنند کمار کے داماد کرنل اٹل پاکستان کی پہلی لڑائی میں کشمیر کے محاذ پر کام آئے تو پنڈت جواہر لال نہرو اظہار افسوس کے لیے مسز اٹل کے ہاں دیوان صاحب کے مکان پر تشریف لائے تو بھی دیوان صاحب سے محض رسمی اظہار افسوس کرنے کے بعد مسز اٹل یعنی دیوان صاحب کی صاحب زادی سے ایک گھنٹہ تک اظہارِ افسوس کرتے رہے۔

ہندوستان کی مشہور خاتون محترمہ رامیشوری نہرو دیوان آنند کمار کی بہن تھیں اور گجرات کے سابقہ گورنر جناب بی۔ کے۔ نہرو دیوان صاحب کے نواسے ہیں۔

پنڈت نہرو کی مخالفت کے باوجود مولانا آزاد نے دیوان صاحب کو پنجاب یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا دیا اور جس صحیح انداز سے پنجاب یونیورسٹی کی خدمت دیوان صاحب نے انجام دی شاید ہی پنجاب یونیورسٹی کو ایسا وائس چانسلر کبھی نصیب ہوا ہو۔

روس میں ہمارے سفیر پروفیسر نورالحسن جب وزیرِ تعلیم تھے تو انھوں نے ایک ایسی محترمہ کو سفارشی خط دیوان صاحب کے نام دیا۔ جسے دیوان صاحب جانتے تھے کہ محکمۂ تعلیم میں ایسی عورت کا ہونا بدنصیبی سے کم نہیں دیوان صاحب نے یہ سفارشی خط پڑھنے کے بعد اپنے سکریٹری، جو ایک سردار صاحب تھے کو

حکم دیا کہ ابھی دلّی نورالحسن صاحب سے ٹیلی فون کی لائن ملائیں۔ فون پر دیوان صاحب نے پروفیسر نورالحسن صاحب سے کہا "یہ سفارشی خط لکھتے وقت اگر آپ نے اپنی پوزیشن کا خیال نہیں رکھا تو کم از کم میری پوزیشن کا ہی خیال رکھ لیا ہوتا" اور انتہائی غصہ سے فون کا ریسور کریڈل پر پٹک دیا۔

دیوان صاحب نے پنجاب یونیورسٹی میں پھر سے ادیب۔ ادیب عالم۔ منشی۔ منشی فاضل کے امتحانات کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے اپنی کوٹھی ۴۹ سندر نگر میں قاضی سجاد حسین صاحب۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی۔ جناب اجمل خاں صاحب وغیرہ ہم اہم ہستیوں کو کھانے پر مدعو کیا اور مشورہ کیا کہ کن کن حضرات کو ان امتحانات کا ممتحن مقرر کیا جائے۔ قاضی سجاد حسین صاحب کا فرمان ہے کہ جب انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد سے کہا کہ آج ہم نے ایک عجیب شخص سے ملاقات کی۔ اس شخص میں تعصب نام کی بدعت کہیں نظر نہ آئی۔ انسانیت اور شرافت کا نمونہ۔ اردو، فارسی، عربی کا شیدائی اور اب جب کہ اردو۔ فارسی وغیرہ کا نام لیوا پنجاب میں ڈھونڈے سے نہیں ملتا یہ شخص پنجاب یونیورسٹی میں اورینٹل لنگویجز کے امتحانات شروع کرنا چاہتا ہے۔ تو مولانا آزاد نے فرمایا قاضی صاحب آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس شخص کے آبا و اجداد مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر خزانہ آفیسر آف اسٹیٹ اور مہاراجہ کی فوج خاص کے جنرل رہ چکے ہیں ایسے لوگوں کے چشم و چراغ ان صفات کے حامل نہیں ہوں گے تو پھر اور کون ہوگا۔

کالج میں چند آسامیاں خالی ہوئیں تو امیدواروں سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے کہ آپ میں سے ہندو اور سکھ صاحبان تشریف لے جائیں آپ کے لیے تو سارا ہندوستان موجود ہے جہاں آپ کو کام مل سکتا ہے۔ مگر مسلمانوں کے لیے اب ایسی سہولت نہیں رہی لہٰذا مسلمان امیدواروں کو ہی میں ملازم رکھوں گا۔

دیال سنگھ کالج میں مسلمان طالب علموں کے لیے نصف فیس کی معافی کا تو عام اعلان تھا اور اگر کوئی طالب علم اردو پڑھنا بھی اپنے مضامین میں شامل کرتا تو اس کی

Marfat.com

ساری فیس معاف کی جاتی اور اکثر حالات میں تو ایسے طالب علموں کو کتابیں بھی دیوان صاحب خرید کر دیتے تھے۔

جناب شارب ردولوی جب ترقی اردو بورڈ کے ڈائرکٹر ہوئے تو وہ دو سال کی رخصت لے کر دیال سنگھ کالج کے شعبۂ اردو سے ترقی اردو بورڈ میں گئے۔ خیال تھا کہ اب شارب صاحب دیال سنگھ کالج میں واپس نہیں آئیں گے لہٰذا ان کی جگہ اردو پڑھانے والے کے لیے آسامی پر کرنے کے لیے ایڈورٹائز کیا گیا۔ جناب عزیز اندوری کی خواہش تھی کہ وہ دہلی آجائیں۔ لہٰذا میں نے انھیں دلی بُلا لیا اور ان کی درخواست بھی بھجوادی گئی۔ دیوان صاحب کا یہ احسان تھا کہ وہ مجھ نیازمند پر اعتماد کرتے تھے۔ کئی سالوں تک شام کی سیر میں میرا اُن کا ساتھ رہا۔ اور ہر روز صبح سات بجے سے نو بجے تک بھی میں اُن کی خدمت میں حاضر رہتا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھ ایسے ہیچ مداں کو وہ عزت بخشتے تھے اور اکثر معاملات میں مشورہ بھی طلب فرماتے تھے۔ قدرت کا کرم تھا کہ میں اُن کے بتائے ہوئے مسئلے پر جو اچھا بُرا مشورہ دیتا وہ عین اُن کے سوچے سمجھے نتیجے کے مطابق ہوتا۔ چنانچہ انھوں نے شارب صاحب کی جگہ رکھے جانے والے امیدوار کے لیے بھی مشورہ چاہا تو عرض کیا کہ صاحب صاف بات تو یہ ہے کہ میں اس جگہ عزیز اندوری کو رکھوانا چاہتا ہوں۔ آپ یقیناً عزیز اندوری میں وہ سب صفات پائیں گے جو ایک اچھے اور مناسب اردو لیکچرار میں ہونی چاہیئے۔ میری عرضداشت پر فرمانے لگے اچھا بھئی عزیز اندوری کو یہاں لانا۔ حافظ محمد یوسف دہلوی مرحوم بھی مجھ نیازمند پر کرم فرماتے تھے لہٰذا انھوں نے میری گزارش پر عزیز اندوری کو دفتر شمع میں معقول تنخواہ پر ملازم رکھ لیا تھا۔ ایک روز میں عزیز اندوری صاحب کو دیوان صاحب کے ہاں لے گیا۔ قدرت نے یاوری کی دیوان صاحب نے جو کچھ عزیز اندوری سے دریافت کیا اس کا جواب عزیز صاحب نے بہت ہی اچھے انداز میں دیا۔ اور دیوان صاحب نے وعدہ فرمایا کہ عزیز اندوری کو ہی رکھا جائے گا۔ اب معاملہ انٹرویو کا آیا۔

Marfat.com

دلّی یونیورسٹی سے مسٹر راؤ ابزرور تھے۔ ڈاکٹر قمر رئیس اور دوسرے کچھ حضرات انٹرویو بورڈ کے ممبران تھے۔ انٹرویو میں جواہر لال یونیورسٹی کا ایک امیدوار جن کا نام غالباً مسٹر اصلاحی تھا۔ ایسا امیدوار تھا کہ جسے کسی طور پر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا اصلاحی صاحب کو کثرتِ رائے سے منتخب کر لیا گیا۔ ڈاکٹر قمر رئیس اپنی کار میں عزیز اندوری کو دیال سنگھ کالج سے دریا گنج تک اپنے ساتھ لائے اور عزیز اندوری منہ بسورے ہوئے میرے ہاں تشریف لائے اور مردہ سی آواز میں کہنے لگے سرور صاحب وہاں تو کسی اور کو رکھ لیا گیا ہے۔ میرے لیے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ دیوان آنند کمار وعدہ کریں اور ایفا نہ ہو۔ لہٰذا میں اسی وقت عزیز اندوری کو ساتھ لیے دیوان صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ حسب معمول دیوان پر فرشتوں کی سی لبوں پر مسکراہٹ لیے بیٹھے تھے۔ دیکھتے ہی فرمانے لگے آؤ سرور آؤ۔ اور پھر اپنے دیرینہ ملازم کالو کو آواز دی کہ مٹھائی لائے۔ کالو آن واحد میں تین پلیٹیں اور ایک طشتری میں مٹھائی لے آیا۔ دیوان صاحب نے خود پلیٹوں میں مٹھائی رکھ کر پہلے عزیز اندوری کو اور پھر مجھے دی اور فرمایا کہ منہ میٹھا کر لو عزیز صاحب کا کام ہو گیا۔ عزیز اندوری جو نیم مُردہ حالت میں تھے کچھ سنبھلے اور میں نے عرض کیا دیوان صاحب یہ تو کہہ رہے ہیں کہ انھیں نہیں رکھا گیا بلکہ کوئی دوسرا اُمیدوار مسٹر اصلاحی کو رکھا گیا ہے۔ دیوان صاحب نے ایک روایتی قہقہہ لگایا اور فرمایا بھئی اصلاحی ایسا امیدوار تھا کہ میرٹ کے لحاظ سے وہ باقی کے سب امیدواروں کو پڑھا سکتا تھا لہٰذا میں یہ ظلم نہیں کر سکتا تھا کہ اصل حق دار کی جگہ عزیز کو رکھ لیتا۔ میں نے خدا کے حضور بھی اپنے آپ کو ناانصافی کا مرتکب نہیں ہونے دیا لہٰذا اصلاحی کو بھی رکھ لیا اور عزیز اندوری کو بھی آپ آرڈر دیکھ سکتے ہیں۔ اصلاحی کو مارننگ کالج میں اور عزیز کو ایوننگ کالج میں اردو کا لیکچرار رکھا گیا ہے تاکہ عزیز دن کے وقت دفتر شمع کی ملازمت بھی کرتا رہے اور شام کو کالج میں پڑھا دیا کرے۔ اس کی اجازت میں تحریری طور پر دے دوں گا۔ عزیز

Marfat.com

سے فرمایا کہ جائیے کالج جاکر اپنا تقرری نامہ لے لیجیے۔

۲۸ رمئی ۱۹۸۱ء کو یہ بلبل ہزار داستاں ہارٹ فیل ہونے کے باعث ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا دیوان آنند کمار سے متعلق دس پندرہ منٹ میں تو اُن کا ابتدائی تعارف بھی ناممکن ہے چہ جائیکہ خاکہ لکھا جا سکے۔ (یہ چند سطور محض رسم پورا کرنے اور چار صد روپیہ معاوضہ حاصل کرنے کے لیے لکھ دی گئی ہیں۔)

Marfat.com

محمد صابر بن دہلوی

ڈاکٹر مرزا احمد علی

دہلی کی سماجی اور سیاسی شخصیتوں میں ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں انسانی فطرت ہے کہ وہ شہرت کا دلدادہ ہوتا ہے۔ شہرت کے لیے وہ ہر آن جتن پہ جتن کرتا ہے مگر پھر بھی نصیب نہیں ہوتی مرزا جی مرحوم کی بات کچھ ایسی تھی کہ شہرت سے وہ جتنا پیچھا چھڑاتے رہے شہرت اُتنی ہی ان کے قدم چومتی رہی۔ مرحوم میں جو اوصاف تھے میں نہیں سمجھتا وہ دوسروں میں نہ ہوں لیکن مرزا جی کے وہ اوصاف مجھے اس لیے زیادہ عزیز ہیں کہ وہ مرزا جی مرحوم کے اوصاف تھے جنھوں نے ان کی ذات کو عوام میں ہر دلعزیز اور بے حد مقبول بنا دیا تھا۔ دہلی والے تو بس اُن پر جان دیتے تھے۔ درمیانی قد، سانولہ رنگ، چوڑا چہرہ، چہرہ پر سنجیدگی، قدرے پھیلی ہوئی ناک، خش خشی چوڑی مونچھ، بڑی بڑی آنکھیں جن میں بے پناہ خلوص، تیوریں شرافت، درمیانی عمر، انداز میں خود اعتمادی سر پر گاندھی کیپ نما ٹوپی اوڑھتے اور اکثر کرتا پاجامہ اور شیروانی زیب تن کیے رہتے تھے۔ مرزا جی مرحوم سے میں کچھ واقف تو تھا مگر میری پہلی ملاقات ۱۹۵۶ء میں ان کے صاحبزادے مرزا صدیق علی کے توسل سے ہوئی تھی۔ اس وقت تک میں ان کی

Marfat.com

ذات اور صفات دونوں سے کم آشنا تھا۔ بعد میں مرحوم کی شخصی خوبیوں کو بہ چشم خود دیکھنے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم ۲۰ر مئی ۱۹۰۳ء کو گلی چاہ شیریں، فراشخانہ، دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد محمد علی ملٹری ڈاکٹر تھے جو ارون اسپتال میں پہلے میڈیکل آفیسر کے عہدے پر فائز کیے گئے تھے۔ ۲۵ر جنوری ۱۹۳۶ء کو ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم کی شادی حکیم محمد اسحاق خاں صاحب کی صاحبزادی رفیق جہاں بیگم، ساکن گلی چاہ شیریں، فراشخانہ، دہلی سے ہوئی تھی۔ ۱۹۳۹ء میں مرحوم کا عقدِ ثانی رشید جہاں بیگم سے ہوا۔ پہلی بیوی کے بطن سے چھ لڑکے اور دو لڑکیاں اور دوسری بیوی سے پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں۔

ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم نے ابتدائی تعلیم اینگلو عربک کالج میں حاصل کی تھی۔ ان کے ہم جماعتوں میں مرزا محمود بیگ مرحوم، پدم شری حکیم عبدالحمید اور مشہور سوشل ورکر مسٹر اسماعیل کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ اسکولی تعلیم کے دوران ۱۹۱۵ء یا ۱۹۱۶ء سے تقریباً تین سال تک گورنمنٹ ہائی اسکول مہرولی میں بھی مرحوم زیرِ تعلیم رہے۔ اس اسکول میں چودھری بنسی لال، سابق ڈونل اسسٹنٹ کمشنر، سٹی زون، دہلی کارپوریشن دہلی، چودھری پریم سکھ اور چودھری فتح سنگھ سابق ایگزیکٹو کونسلرز، دہلی ان کے کلاس فیلو رہے ہیں۔ مرحوم نے ہائی اسکول اینگلو عربک کالج ہی سے کیا تھا۔ ہائی اسکول کی تعلیم کے دوران وہ اینگلو عربک کالج میں بہترین ایتھلیٹ بھی قرار دیے گئے تھے۔

مرزا جی مرحوم نے ۱۹۲۴ء میں اوورسیر اور ۲۸-۱۹۲۷ء میں پولٹری فارم سے متعلق امتحانات بھی پاس کیے تھے۔ ۴۰-۱۹۳۹ء میں مرحوم کو باقاعدہ طور پر گورنمنٹ کنٹریکٹر برائے تعمیرات منظوری حاصل ہوگئی تھی۔ موجودہ گول مارکیٹ، نئی دہلی کی تعمیر مرحوم ہی کی مرہونِ منت ہے۔ ۱۹۴۱ء میں مرحوم نے

طبیہ کالج، دہلی سے حکمت کی تعلیم بھی حاصل کرنا شروع کردی تھی۔ تقریباً تین سال صرف کرنے کے بعد انھوں نے اس میں بھی کامیابی حاصل کی۔۱۹۴۴ء میں مرزا جی مرحوم باقاعدہ سرکاری ملازمت سے منسلک ہوئے اور نظام الدین، دہلی میں پولٹری سپروائزر کے عہدہ پر فائز کردیے گئے۔ حکمت میں شوق کی وجہ سے مرحوم نے حکیم محمود احمد خاں کی زیر سرپرستی انھیں کی جایداد واقع بلّی ماران، دہلی میں "پیام حیات" کے نام سے دواخانے کی بنیاد بھی ڈالی تھی۔ طبعاً مرحوم حکمت کی جانب رجوع نہیں تھے اس لیے مشق جاری نہ رکھ سکے۔ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم سے ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم کے تین رشتے تھے۔ عزیزداری اور رشتہ داری کے ساتھ ساتھ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کی صحبت کا شرف بھی مرزا جی کو حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حکمت نہ کرنے کے باوجود بھی مختلف النوع امراض کے سلسلہ میں مرزا جی کی تشخیص بے حد معتبر تھی۔ مرحوم، سوچیتا کرپلانی، سابق وزیر اعلا، یوپی، گووند ولبھ پنت، سابق وزیرِ داخلہ، حکومتِ ہند اور مہارانی گائتری دیوی، سابق ممبر پارلیمنٹ کے معالجِ خاص رہے ہیں۔

ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم کم گو، سادہ طبیعت، منکسر المزاج اور کسی قدر خوش اخلاق تھے۔ فجر کی نماز کبھی قضا نہیں کرتے تھے۔ نماز کے بعد وظیفہ کا وِرد، وظیفے کے بعد ہلکی سی ورزش مرحوم کے معمولات میں سے تھے۔ گھریلو معاملات میں وہ عموماً لاپرواہ ہی نہیں تھے بلکہ گھر میں اجنبیوں کی طرح زندگی گزارتے تھے۔ سارا گھر اُن کی دونوں بیویوں نے علاحدہ علاحدہ سنبھال رکھا تھا۔ مرحوم نے اپنے گھر کی نیچے کی منزل پر اپنی بیٹھک بنا رکھی تھی۔ وہ صبح کے وقت اکثر اسی بیٹھک میں بیٹھا کرتے تھے اور شام کو اپنے گھر کے سامنے ہی احسان خاں عرف چچا پتلی کی دُکان کے تختے پر خدمتِ خلق کے لیے براجمان رہتے تھے۔ شب دو بجے تک دُکان کے اسی تختے کو سنبھالے رہتے اور پھر آرام فرماتے۔

اب اگر کوئی مصیبت کا مارا پھر آن درآمد ہوتا تو اُٹھ کھڑے ہوتے اور اس کی مدد کو چل پڑتے۔ مرزا جی مرحوم کا مشن دراصل بے لوث خدمتِ خلق تھا۔ عام لوگوں سے ملنے ملانے، اُن کے دکھ تکلیف اور پریشانیوں کو سننے کے لیے وہ اکثر اپنی بیٹھک یا پھر مذکورہ دُکان کے تختے ہی پر بیٹھا کرتے تھے۔ بیٹھنے کے لیے عمدہ کرسی یا صوفے وغیرہ سے مرحوم کو کوئی غرض نہیں تھی۔ بڑا آدمی بھی کیوں نہ آجاتا وہ بھی سڑک ہی پر کھڑا رہتا۔ مرحوم کے اِرد گرد مجمع کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ سب کی پریشانیوں اور مصیبتوں کا حل صرف مرزا جی کے پاس ہی ہے۔ مرحوم لوگوں سے براہِ راست مخاطب ہوا کرتے تھے۔ اجنبیوں سے اکثر خوش اخلاقی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے اور ملاقاتیوں سے ایک خاص انداز سے پیش آتے تھے مثلاً میاں کہاں ہو، بڑے عرصے کے بعد دکھائی دیے، ناراض تو نہیں ہو وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کے علمبردار تھے۔ اونچ نیچ، ادنا و اعلا کے تصور کا ان کے ہاں گزر نہیں تھا۔ انھوں نے کسی کو نہ کبھی ہندو کی نظر سے دیکھا اور نہ کبھی مسلم کی، نہ عیسائی اور نہ سکھ کی۔ مرحوم سب کے حامی تھے۔ سب کو اپنا سمجھتے تھے۔ سب کی پریشانی کو اپنی پریشانی مانتے تھے اور سب کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوتے تھے۔ قومی گیت، قومی ترانے، آزادی کی نظمیں اور وطن پرستی پر بے شمار اشعار ان کی زبان پر ازبر تھے جنھیں وہ اکثر بار بار دہراتے اور گنگناتے رہتے تھے۔ مرزا جی پکے ہندوستانی تھے اور ہندوستان سے پیار کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ۱۹۴۷ء میں سرکاری طور پر اُن سے دریافت کیا گیا کہ آپ کہاں رہنا چاہتے ہیں آیا ہندوستان میں یا پاکستان میں۔ یہ بات چونکہ تحریری طور پر معلوم کی گئی تھی لہٰذا مرحوم نے بھی تحریری جواب کے ذریعہ حکومت کو آگاہ کیا کہ میں تو ہندوستانی ہوں، ہندوستان ہی میں رہوں گا۔

Marfat.com

ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم ہندوستان کی آزادی کے بڑے حامی تھے۔ وہ آزادی کی فکر کرتے تھے۔ آزادی کے لیے دل سے کوشاں تھے۔ وہ وطن پرستی اور مجاہدِ آزادی کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ تقسیم ملک سے قبل حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم آل انڈیا نیشنل کانگریس کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے ملک کے سیاسی اور سماجی رہنماؤں کے ساتھ مل کر حصولِ آزادی کے بڑے حامی تھے۔ وہ آزادی کی جدوجہد میں لگے تھے۔ انھوں نے نجی طور پر کانگریس کی میٹنگیں شریف منزل، بلی ماران میں منعقد کرنی شروع کردی تھیں۔ مرزا جی مرحوم نے بھی حکیم اجمل خاں صاحب کے ساتھ آزادی کی اس تحریک میں شامل ہو کر نمایاں رول ادا کیا تھا۔ وہ موتی لال نہرو، مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد بیرسٹر آصف علی، پنڈت جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، مولانا حسرت موہانی، دیش بندھو گپتا، راج کماری امرت کور اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری وغیرہ کے شانہ بہ شانہ ان میٹنگوں میں شریک ہو کر جی جان سے آزادی کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔

۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہوا تو اسی کے ساتھ ساتھ ملک کی تقسیم بھی عمل میں آئی۔ تقسیم کے وقت ملک میں بڑے پیمانے پر فسادات کا بازار گرم ہوا تو راجدھانی دہلی بھی اس کے اثرات سے نہ بچ سکی۔ اس وقت دہلی میں ریلیف کا کام مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم کی قیادت میں شروع کیا گیا تھا۔ مولانا کے رفقارِ کار میں نواب سلطان یار خاں، مولانا احمد سعید، حافظ عبدالعزیز، میر مشتاق احمد، عبدالحق پراچہ، حکیم سید حسن، سکندر بخت اور مسز سبھدرا جوشی کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم بھی شب و روز ریلیف کے کام میں جٹے ہوئے تھے۔ ریلیف کے سلسلہ میں بھی مرحوم کی خدمات بے مثال رہی ہیں۔

آزادی کے بعد کے پُرآشوب دور میں ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں

Marfat.com

میں بے حد خوف وہراس پیدا ہوگیا تھا۔ وہ اپنی جان و مال کے عدم تحفظ کے باعث پریشان تھے۔ ایسے نازک وقت میں مرزاجی مرحوم نے عوام کی اور بالخصوص مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی اور اُن کے زخموں پر مرہم رکھا۔ فسادات کے لامتناہی سلسلہ نے جب دم توڑا تو ہندوستان کے مختلف صوبوں سے نکل نکل کر مسلمان دہلی آنے لگے تھے۔ مرزاجی مرحوم ان کی بھی داستانِ غم سنا کرتے تھے اور بعد میں حکام اعلا سے رابطہ قائم کرکے مصیبت زدگی، پریشان حالی اور فساد زدگی کے شکار لوگوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ محکمۂ کسٹوڈین کی کارکردگی کی وجہ سے اُس وقت مسلمانوں کو اپنی شہریت کو باقی رکھنے اور اپنی جائیداد کے مالکانہ حقوق وغیرہ کو برقرار رکھنے میں بڑی دشواریاں پیش آنے لگی تھیں۔ ان پریشانیوں سے نجات دلانے میں بھی مرزاجی مرحوم نے شب و روز ایک کرکے عوام کے لیے جو بے لوث خدمات انجام دی تھیں۔ انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم نے ملک اور عوام کی خدمت کے لیے کانگریسیوں کے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔ مرزاجی کے اوصاف نے دہلی کی سماجی اور سیاسی زندگی میں مرحوم کو اتنا مقبول بنا دیا تھا کہ کانگریس کے بعض بااثر لیڈر ان کے حریف بن بیٹھے تھے۔ اس کے باوجود مرحوم آزادانہ طور پر عوامی خدمات انجام دیتے رہے۔ اپنی زندگی میں وہ کبھی کسی سیاسی پارٹی میں شامل نہیں ہوئے اور نا ہی کبھی انھوں نے کانگریس کی مخالفت کی۔

ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم کی سیاسی زندگی کا آغاز دراصل ۱۹۵۲ سے ہوا تھا جب مرحوم پہلی مرتبہ حلقہ لال کنواں، فراشخانہ سے میونسپل کونسلر کے لیے آزاد امیدوار کی حیثیت سے میونسپل کمیٹی کے الیکشن میں کھڑے ہوئے تھے۔ وہ اس الیکشن میں کامیاب نہ ہوسکے۔ مدت پوری ہونے کے بعد ۱۹۵۶ء میں میونسپل کونسلر کے انتخابات دوبارہ عمل میں آئے تو مرحوم

آزاد امیدوار کی حیثیت سے پھر الیکشن میں کھڑے ہوگئے اور انھوں نے شاندار کامیابی حاصل کی ۔ ۱۹۵۷ء میں میونسپل کارپوریشن دہلی کا قیام عمل میں آیا تو نئے سرے سے میونسپل کونسلروں کے انتخابات بھی عمل میں لائے گئے۔ مرحوم اس موقعہ پر بھی آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن میں کامیاب ہوئے تھے۔

ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم اپنے والد، والدہ اور اپنے بڑے بھائی حکیم مرزا یوسف علی خاں 'نانا ری' ریٹائرڈ چیف سینیٹری انسپکٹر، دہلی کارپوریشن دہلی کا بے حد احترام کیا کرتے تھے۔ ان کا کہا کبھی نہ ٹالتے تھے۔ ایک مرتبہ دہلی اسمبلی کے انتخابات عمل میں آئے۔ حلقہ اجمیری گیٹ، لال کنواں، فراشخانہ سے جناب شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم کو کانگریس کے امیدوار کی حیثیت سے ٹکٹ ملا تھا۔ ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم ان کے مقابلہ پر آزاد امیدوار کی حیثیت سے اس الیکشن میں کھڑے ہوگئے۔ کچھ ہی روز کے بعد عوامی سطح پر مرحوم کی شہرت اور مقبولیت کا ڈنکا بجنے لگا۔ آنجہانی پنڈت جواہرلال نہرو کو شفیق الرحمٰن صاحب کی کامیابی خطرے میں پڑتی دکھائی دینے لگی تھی۔ آخرکار نہرو جی نے حلقہ چاندنی چوک کے کانگریسی ممبر پارلیمنٹ رادھا رمن کو مرزا جی مرحوم کے پاس بھیجا۔ رادھا رمن جی نے مرزا جی کو سارا احوال کہہ سنایا اور پھر اصرار کیا کہ وہ شفیق الرحمٰن صاحب کے حق میں دستبردار ہو جائیں یا پھر اپنا نام واپس لے لیں۔ مرزا جی مرحوم اس پر قطعی رضامند نہ ہوئے۔ بار بار اصرار کرنے پر بھی جب وہ کسی قیمت پر راضی نہ ہوئے تو رادھا رمن جی نے مرحوم کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا جس سے وہ بہ خوبی واقف تھے۔ رادھا رمن جی نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی والدہ تک رسائی حاصل کی اور انھیں کسی نہ کسی طرح راضی کرلیا۔ آخرکار اپنی والدہ کے کہنے پر مرزا جی مرحوم نے الیکشن سے صرف چوبیس گھنٹے پہلے شفیق الرحمن صاحب کے حق میں

دستبرداری کا اعلان کردیا۔ اس کے باوجود مرحوم سماجی خدمات برابر انجام دیتے رہے۔ شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم اس وقت انڈونیشیا میں تھے۔ مرزا جی کی دستبرداری اور الیکشن میں ان کے تعاون کے باعث ہندوستان میں اپنی غیر موجودگی کے باوجود انھیں شاندار کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ کچھ ہی عرصے کے بعد شفیق الرحمٰن قدوائی کا اچانک انتقال ہوگیا۔ ۱۹۵۸ء میں راجیہ سبھا کی مذکورہ سیٹ کے لیے انتخابات عمل میں آئے۔ اس بار نہرو جی کی خواہش پر مولانا احمد سعید صاحب مرحوم کانگریسی امیدوار کی حیثیت سے انتخابات میں کھڑے ہوئے۔ کانگریس پارٹی نے اس مرتبہ بھی مرزا جی مرحوم کو امیدوار کی حیثیت سے نظرانداز کردیا تھا۔ اپوزیشن پارٹیوں نے موقع کو غنیمت سمجھا اور مرزا جی مرحوم کی حمایت کا اعلان کردیا۔ مرزا جی مرحوم نے چودہ رُکنی یونائیٹڈ انڈی پنڈنٹ فرنٹ کے امیدوار کی حیثیت سے اس الیکشن میں حصہ لیا۔ بھارتیہ جن سنگھ، سی، پی، آئی، ہندو مہاسبھا، پرجا سوشلسٹ پارٹی وغیرہ جیسی سیاسی جماعتیں مرزا جی کے نام پر متحد ہوگئی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ آزاد امیدوار بھی مرزا جی کے حق میں دستبردار ہو گئے تھے۔ اس الیکشن میں مرحوم کا سیدھا مقابلہ مولانا احمد سعید صاحب مرحوم سے ہوا اور مرزا جی مرحوم نے کامیابی حاصل کی۔ وہ ۲/ اپریل ۱۹۶۴ء تک راجیہ سبھا کے ممبر رہے۔ راجیہ سبھا کی ممبری کے دوران مرزا جی مرحوم نے جو بہترین کارنامہ انجام دیا ہے وہ ہے شاہجہاں آباد شوپنگ سینٹر کا پلان، جامع مسجد اور اس کے اطراف کا منصوبہ۔ یہ دونوں منصوبے مرحوم ہی نے تجویز کیے تھے۔ نیو شاہجہاں آباد کا تصور بھی دراصل مرحوم ہی کا پیش کیا ہوا تھا اور منٹو روڈ کمپلیکس ٹرانزٹ کیمپ کی تجویز بھی مرزا جی مرحوم نے رکھی تھی موجودہ دوجانہ ہاؤس اور پائی والان کمپلیکس سے متعلق اسکیمیں بھی مرزا جی مرحوم ہی نے تجویز کی تھیں۔ ملاحظہ فرمائیے کہ بیک وقت کس خوبی کے ساتھ ڈاکٹر

Marfat.com

مرزا احمد علی مرحوم بحیثیت ایک انجنیر کے، میڈیکل ڈاکٹر کے، خادمِ قوم، محبِ وطن، سیاسی رہنما اور مجاہد آزادی کے ملک اور قوم کے لیے بے لوث خدمات انجام دے رہے تھے۔

ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم جب بھی کسی کام کے لیے نکلتے لوگوں کا ایک ہجوم ان کے ساتھ ہو لیتا تھا۔ لہذا کبھی اس سے بات کرتے جاتے کبھی اس کی بات کا جواب دیتے رہتے اور کبھی رُک کر کسی کے لیے سفارشی خط لکھتے اور ساتھ ہی ساتھ مُہر بھی ثبت کرتے جاتے تھے۔ مہر ہمیشہ مرحوم کی جیب ہی میں پڑی رہتی تھی۔ جہاں کہیں اور جب کبھی مُہر کی ضرورت پڑتی اس کا استعمال کرتے تھے۔ مرزا جی کے ہمراہ صرف علاقے کے افراد نہ ہوتے تھے بلکہ مختلف علاقوں کے لوگ ہوتے تھے۔ ان سبھی لوگوں کی ضرورت، پریشانی اور کام کی نوعیت بھی جُداگانہ ہوتی تھی لیکن مرزا جی مرحوم کی ذات میں وہ خوبیاں تھیں اور ان کی بات میں وہ جادو تھا کہ ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ بس اب اس کے کام کو کوئی نہیں روک سکتا۔ دراصل یہ حقیقت بھی تھی یہی وجہ ہے کہ مرزا جی مرحوم کے سبھی اسیر تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی شخص ایک بار ان سے ملے اور دوسری بار ملنے نہ آئے۔ ایسی پرکشش شخصیت کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم کی زندگی کا ایک پہلو یہ تھا کہ جس کی سفارش کرتے اس کے بارے میں کبھی کچھ جاننے کی کوشش نہیں کرتے تھے اور جس پر سفارش لکھتے اُسے کبھی نہ پڑھتے تھے۔ مرحوم کا ایک قصہ اس سلسلہ میں بڑا دلچسپ ہے آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

ایک مرتبہ دو فریق باہم جھگڑا کرنے کے بعد آگے پیچھے مرزا جی مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مرزا جی نے حسبِ عادت دونوں کے حق میں تھانہ حوض قاضی کے ایس۔ ایچ۔ او کے نام الگ الگ سفارشی خط تحریر کر دیے۔ تنازعہ نے اتنا طول پکڑا کہ معاملہ عدالت تک پہنچ گیا۔ جھگڑے کی فائل جو پولیس نے

Marfat.com

عدالت میں پیش کی تھی اس میں متنازعہ دونوں افراد کے حق میں مرزا جی مرحوم کے سفارشی خطوط بھی منسلک تھے۔ مجسٹریٹ نے جب ان خطوط کو پڑھا تو بڑا حیران ہوا۔ مرحوم اس وقت ممبر پارلیمنٹ تھے۔ فیصلہ سے قبل عدالت کو مرزا جی مرحوم کی ضرورت پیش آئی لہذا اس ضرورت کے پیش نظر مرحوم کے نام عدالتی سمن جاری ہوا۔ مقررہ تاریخ اور وقت پر وہ عدالت میں پیش ہو گئے۔ مجسٹریٹ نے مرزا جی مرحوم کو دونوں خط یکے بعد دیگرے دکھائے اور دریافت کیا کہ ان دونوں میں کون سا خط آپ کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم بولے "یہ دونوں خط میرے ہی لکھے ہوتے ہیں"۔ اس پر مجسٹریٹ نے کہا "ان دونوں افراد میں کوئی تو غلطی پر ہوگا مرزا صاحب! آپ نے تو دونوں ہی کے حق میں سفارش فرمادی ہے' اب فیصلہ کیسے کیا جائے؟ ڈاکٹر صاحب مرحوم بولے' "سرکار یہ تو عوام کا خادم ہوں' میرے لیے تو دونوں ہی عزیز ہیں۔ دونوں کی بھلائی اور بہتری چاہتا ہوں اسی لیے تو دونوں کے حق میں سفارشی خطوط لکھ دیے تھے۔ میرا جو کام تھا سو میں نے کر دیا تھا اب معاملہ آپ کے روبرو ہے جو صحیح سمجھیں فیصلہ کر دیں"۔ ایسے وقت مرزا جی مرحوم بڑے معصوم لگتے تھے۔ یہ معصومیت بھی دراصل ان کی شخصیت کی بڑی پہچان تھی۔

ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم کی آمدنی کم اور خرچ زیادہ تھا۔ اپنی حیثیت سے زیادہ مدارت کرتے تھے۔ وہ کنبہ پرور کم اور مہمان نواز زیادہ تھے۔ ان کے گھر اکثر کوئی نہ کوئی مہمان رہتا تھا۔ مرحوم کی زندگی میں ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ دو چار اجنبی یا مہمان نہ موجود ہوں۔ جس کا جی چاہے چلا آتے' رہے سہے' جو کچھ حاضر ہے کھائے پیئے چلا جائے۔ یہ سلسلہ مرزا جی مرحوم کے دم سے خوب قائم رہا۔ آج بھی ایسا کبھی کبھی دیکھنے میں آتا ہے۔

ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم بچوں کی تعلیم و تربیت میں خاص دلچسپی لیتے تھے۔ عام زندگی میں وہ ہندی کی تعلیم کے حق میں تھے اور اپنی زبان اُردو کے محسن

Marfat.com

تھے۔ مرزا جی مرحوم شعر بھی کہتے تھے اور مسکینؔ تخلص فرماتے تھے۔ مرحوم مشق سخن کو جاری نہ رکھ سکے البتہ ۶۱ - ۱۹۶۰ء میں انھوں نے دہلی میں " نوح اکیڈمی " قائم کی تھی۔ اکیڈمی کے پلیٹ فارم سے وہ ادبی نشستیں اور مشاعرے وغیرہ منعقد کیا کرتے تھے۔ مدارس میں اُردو زبان وادب کی تعلیم وتدریس کی عام حالت وکیفیت سے اکثر باخبر رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی میں اردو زبان کی ترقی وترویج کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔

ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم طالب علموں کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ مرحوم طالب علموں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ وہ طالب علموں کی وجہ سے دہلی پبلک لائبریری اور ہارڈنگ لائبریری کی کتابوں کے سلسلے میں اکثر جُرمانے کے سزایافتہ رہتے تھے۔ طلبا لائبریری کی کتابیں واپس نہیں کیا کرتے تھے۔ ہر سال مرزا جی مرحوم کو کثیر رقم کتابوں کی قیمت کے بطور جُرمانے کی صورت میں ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس کے باوجود مرزا جی نے کبھی طالب علموں کی ممبرشپ کے لیے لائبریری کارڈوں پر تصدیق بند نہیں کی تھی۔

ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم نے دہلی کی معاشرتی اور تہذیبی قدروں کی تعمیر کے لیے بھی اپنی زندگی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ مرزا جی مرحوم ہندوستانی میلوں اور تہواروں میں عوام کے ساتھ پیش پیش رہتے تھے۔ مہرولی میں پھول والوں کی سیر ہو یا نظام الدین میں سترھویں شریف ہو، عید میلادالنبی کا جلوس ہو یا ہندوؤں کا کوئی تہوار ہو، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کا عرس ہو یا خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کا عرس شریف مرحوم سبھی میں دل چسپی کے ساتھ شرکت کیا کرتے تھے۔ اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین سے مرزا جی مرحوم کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ باربار خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت خواجہ باقی باللہ رح

Marfat.com

حضرت خواجہ نصیر الدین روشن چراغ دہلوی اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی زیارت کے لیے ان کے آستانہ شریف پر حاضری دیا کرتے تھے۔ حضرت غریب نواز خواجہ معین الدین چشتیؒ کے بے حد عقیدت مند تھے۔ کہیں ہوں، کسی حالت میں ہوں ہر ماہ چاند کی چھ تاریخ کو اجمیر شریف جاتے، نذرانۂ عقیدت پیش کرتے اور بارگاہِ الٰہی میں بدست دعا ہوتے اور واپس چلے آتے۔ زائرین اجمیر کے لیے دہلی میں کیمپوں کا سلسلہ بھی مرزا جی مرحوم ہی کی کوششوں سے شروع ہوا تھا۔ بعد میں رفتہ رفتہ دہلی ایڈمنسٹریشن نے سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے کے بعد مسلمانوں میں زبردست خوف وہراس پیدا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے وہ صرف مسلم آبادی والے علاقوں ہی میں سمٹ کر رہ گئے تھے۔ بہت سے جلسے اور جلوس ممنوع قرار دے دیے گئے آزادی کے بعد حضرت نصیر الدین روشن چراغ دہلیؒ کے عرس شریف کا سلسلہ مرزا جی مرحوم ہی کی کوششوں سے دوبارہ شروع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ۱۲ ربیع الاول کا جلوس بھی ۱۹۴۷ء کے بعد پہلی مرتبہ ۱۹۵۷ء میں مرحوم کی کوششوں سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ وہ بذات خود جلوس کمیٹی کے صدر تھے۔ اس جلوس کا خاص مقصد اس وقت مسلمانوں کے دلوں سے ڈر اور خوف کو دور کرنا تھا۔

ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم زندگی کے بہت سے نشیب و فراز سے گزرے تھے۔ طرح طرح کی صعوبتیں دیکھی تھیں لیکن مرحوم نے انسان دوستی اور پاسِ وضع کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ہندو مسلمان، سکھ عیسائی ان کو عزت اور محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ امتیاز دہلی کے بہت سے لیڈروں اور سیاسی رہنماؤں کو نصیب نہیں ہوسکا۔ مرحوم غریبوں، مسکینوں، یتیموں اور بیواؤں کی بڑی خبرگیری کرتے تھے۔ ان سے عزت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ اُن کی دقتوں اور پریشانیوں کو سمجھتے تھے اور ان کی زیادہ

Marfat.com

سے زیادہ مدد کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مرزا جی مرحوم کی اس کمزوری سے بہت سے پیٹ بھرے بھی اپنے آپ کو غریب بتا کر اُن سے فائدہ اٹھانے لگے تھے۔ سائل مرحوم کے در سے کبھی خالی ہاتھ نہیں جاتے تھے۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کو حرکتِ قلب کے بند ہو جانے سے مرزا جی کی وفات کیا ہوئی گویا اُن کی موت سے بے شمار لڑکے لڑکیاں یتیم، طلبہ اور بیوائیں لاوارث اور نوجوان بے دست وپا ہو گئے تھے۔ رفقار سکتے ہیں آ گئے تھے اور اعزا و اقربا کے دل بیٹھ گئے تھے۔ مرزا جی کے دم سے نہ جانے کتنے لوگوں کی ضرورتیں پوری ہو رہی تھیں اور اُن کے کام چل رہے تھے۔ کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جنھوں نے مرزا جی مرحوم کی طرح لوگوں کی مدد دریا دلی کے ساتھ کی ہو گی۔ شاید ہی کوئی ہو جس نے اُن سے اپنی ضرورت پوری نہ کی ہو گی اور اپنی پریشانی حل نہ کی ہو گی۔ ایسے مواقع بھی آئے جب خود وہ تنگ دست رہتے تھے لیکن ان کی زندگی میں سماج کے مختلف طبقے اور مختلف سطح کے وہ افراد جن کے کفیل مرزا جی تھے تنگ دستی سے دوچار نہیں ہوئے۔ اُن میں سے بعض تو آج تک ایسے ہیں جن کے لیے مرزا جی کا انتقال گویا ہوا ہی نہیں تھا۔

ڈاکٹر مرزا احمد علی مرحوم کا انتقال ہوئے تقریباً اٹھارہ برس ہونے کو آئے مگر ایسا لگتا ہے جیسے یہ ہستی ہمارے گرد و پیش ہی کہیں زندہ جاوید ہے۔ کیوں نہ ہو، مرحوم نے جس انداز سے عوام کی خدمت کی تھی کوئی دوسرا ان سے آگے نہ نکل سکا۔ یوں بھی مرزا جی کی یاد ہمیشہ باقی رہے گی کہ مرحوم کی خوبیاں ان کے صاحبزادے مرزا محمد عثمان، میونسپل کونسلر، دہلی کی شکل میں زندہ ہیں اور مرحوم کی نیکیاں ان کے بیٹے مرزا صدیق علی، ممبر میٹرو پولیٹن کونسل، دہلی کی صورت میں باقی ہیں جن سے دہلی والوں کو اب بھی مسلسل فیضیاب ہونے کا شرف حاصل ہے۔

Marfat.com

نور جہاں ثروت

بہو اماں

دہلی جہاں اپنی تہذیب، بود و باش اور علوم و فنون کے لیے عالم میں مشہور رہی ہے۔ وہیں اس سرزمین نے ایسی ایسی شخصیتوں کو جنم دیا ہے جو اپنے عہد میں نمایاں اور آج باعث فخر ہیں۔ نامور اشخاص اور عظیم ہستیوں کا ذکر تو دہلی کی تاریخ کے کسی نہ کسی باب میں مل جاتا ہے، مگر ایسے لوگ جنھیں نہ اکابر کہا جاسکتا ہے اور نہ رہبر جو نہ شاعر ہیں اور نہ مصنف، اتالیق ہیں اور نہ عالم — پھر بھی دہلی کے مذاق و مزاج کا چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ دلّی والوں کے مزاج اور ان کے تہذیبی آداب سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہوں گے کہ یہاں سودا بیچنے والوں کو بھی چچا میاں کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا۔ اسی طرح خاندانی سقّہ، خاندانی نائی اور منہیاری کو بھی کسی نہ کسی لقب سے نوازا جاتا تھا۔ بچوں کی مجال نہ تھی کہ وہ اپنی توتلی زبان سے بھی 'تو' تو بڑی بات ہے 'تم' بھی کہہ سکتا یہ لوگ بھی اتنے جانثار ہوتے تھے کہ اپنی گودوں کے کھلائے ججمانوں کو اپنے بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے اور ان کے پسینے کی جگہ اپنا خون بہانے کو ہر دم تیار رہتے۔

اس وقت میں جس کردار کا احاطہ کر رہی ہوں وہ معمولی ہونے کے باوجود

Marfat.com

غیر معمولی ہے۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا بھوا اماں کی حیثیت گھر کے ایک بزرگ کی سی پائی۔ بوٹا سا قد، فراخ پیشانی، جس پر ابھری ہوئی موٹی موٹی شکنیں۔ طوطی کتارے جیسی نوکیلی گدری ناک اس میں تین نگوں کی سونے کی لونگ۔ خاصا بڑا دہانا، صحت مند ہونٹ ۔ باچھوں سے پان کی پیک باریک باریک جھریوں میں اس طرح پھیل جاتی جیسے سوکھے کھیت میں آبپاشی کی گئی ہو۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی۔ ان پر گوشت کی موٹی تہہ ــــ چوڑی پیشانی اور ابھرے ہوئے رخساروں کے درمیان دو چھوٹی چھوٹی دھنسی ہوئی بے رونق آنکھیں، جن پر سرمہ بھی اثر نہ کرتا تھا اس تیزی سے گردش کرتیں کہ بھوا اماں کی طراریٔ طبع کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ گردن کوتاہ گویا چوڑیوں کا ٹوکرا اٹھاتے اٹھاتے کندھوں میں دھنس گئی ہو، ہاتھ بھدے اور کھردرے چھوٹی انگلی کی طرف کی کلائی کی ہڈی باہر نکلی ہوئی، جس نے ہاتھ کی ساخت کو اور بھی بدوضع کر دیا تھا۔ یہی حال پیروں کا تھا۔ بالکل سپاٹ، زمین میں پیوست ہو جانے والے تلوے اندر کی طرف جھکتا ہوا ٹخنہ ــــ انگوٹھے پٹی کی چپل پہنے کھس کھس کرتی سر پر چوڑیوں کا ٹوکرا اٹھائے، اٹنگی شلوار، چھینٹ کی قمیص اور ململ کا ساڑھے تین گز ا دوپٹہ اوڑھے، گلے میں ہنسلی کے بجائے چھالیہ زردے کا بٹوہ لٹکائے وہ اس طرح نمودار ہوتیں گویا اپنے ہی گھر میں داخل ہو رہی ہوں۔ ان کی آمد کا اثر سب سے پہلے ہماری امی پر ہوتا، گویا بھوا اماں نہ آئی ہوں ہماری دادی جان تشریف لائی ہوں۔ اگر سر سے دوپٹہ ڈھلکا ہوتا تو فوراً اسے نیم گھونگھٹ کی طرح پیشانی تک اوڑھ لیتیں۔ کھڑے ہو کر نہایت ادب سے سلام کرتیں اور پھر باری باری سب بچے یہی عمل دہراتے۔ بھوا اماں ٹوکرا کھسکا کر پالتی مارے بیٹھی ہوتیں اور سب کے سلام کا جواب باری باری

Marfat.com

دیتی جاتیں اس کے بعد موسم کے مطابق ٹھنڈے، گرم سے ان کی تواضع کی جاتی اگر کھانے کا وقت ہوتا تو سب سے پہلے خوان ان کے سامنے آتا۔ تب کہیں بھوا ماں اپنے ٹوکرے کا پردہ اٹھاتیں بہت سے رنگ برنگے چوڑیوں کے لچھے نظر آتے۔ وہ سب سے پہلے دلھن (یعنی ہماری امّی) کو پکارتیں ہماری امّی اس دبے لیے انداز سے ٹوکرے کے پاس آتیں گویا آج ہی بیاہ کر آئی ہوں۔ بھوا ماں ان کا نازک سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مہارت سے دباتیں اور پرانی چوڑیاں کلائی سے اتارنے کے بعد اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں لٹکی ہوئی چوڑیوں میں سے تین تین چوڑیاں نکالتیں اور اس چابک دستی سے چڑھاتیں، کہ ایسا محسوس ہوتا کہ آہستہ آہستہ ہاتھ سہلا رہی ہیں یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ بھوا ماں جس رنگ کی چوڑیاں امی کے ہاتھ سے اتارتیں اسی رنگ کی چوڑیاں، ڈیزائن کے ذرا سے فرق سے پھر پہنا دیتیں۔ یہ رنگ عموماً آسمانی ہوتا۔ بھوا ماں مرتے مرگئیں نیلا رنگ روایت کی طرح ہماری امی کی کلائی سے چپکا رہا، اس معاملہ میں ہماری امّی شاید اپنا پتا مار چکی تھیں۔ جب ہم لوگ اس قابل ہوئے کہ رنگوں میں امتیاز کر سکیں اور اس طرف توجہ دلائی تو امّی نے نہایت معصومیت سے جواب دیا۔ میں جب اس گھر میں بیاہ کر آئی تھی تب سے اب تک میں نے بھوا ماں کی پسند کو قبول کیا ہے اگر انھیں میرے لیے یہی رنگ پسند ہے تو میں ٹوک کر کیا کروں۔

بوڑھاپے کی ہیئت جو ہم نے دیکھی۔ بھوا ماں کی جوانی شاید اتنی بدہیبت نہ تھی۔ اپنے زمانے میں طرح دار رہی ہوں گی اسی لیے ایک رئیس کا ان پر دل آگیا شاید آگ دونوں طرف برابر کی لگی تھی۔ بھوا ماں نے بھی سر تسلیم خم کرلیا اور اپنے رئیس عاشق کی چوڑیاں پہن لیں وفاداری کی پاداش میں برادری باہر ہوئیں۔ یوں بھی شاید ان کا قریبی رشتہ دار کوئی نہ تھا۔

Marfat.com

رئیس موصوف نے اپنی جائداد میں سے ایک دکان بھوااماں کو دے دی لیکن سماج میں برابری کا درجہ نہ دے سکے۔ جب تک زندہ رہے، بھوااماں اچھے حالوں رہیں۔ ٹوکرا خود نہ اٹھاتیں ایک چمارن ساتھ ہوتی۔ ہمارے گھر کے علاوہ شاید کہیں اور نہ جاتیں عورتیں ان کی دکان پر ہی چوڑیاں پہنے آتیں۔ لیکن جیسے ہی ان کے عاشق کی آنکھیں بند ہوئیں بھوااماں کا وظیفہ بھی بند ہوگیا مگر تھیں جیالی فوراً اپنے ڈھرے پر آگئیں — وضع داری کا یہ عالم تھا کہ کسی کے بچے نہ جیتے تھے، خود لاولد تھیں جیسے ہی ججمان کے ہاں بچی پیدا ہوئی کہا — یہ میری ہے۔ ان کے نصیب سے وہ بچی جی گئی اور زندگی بھر بھوااماں اس کی عیدی بقریدی کرتی ہیں۔

دہلی کی ایک وضعداری جو شاید آج بدعت سمجھی جائے۔ وہ یہ کہ جب بھوااماں کو ہمارے ہاں سے تہواری بھیجی جاتی یا کسی تقریب کا حصہ جاتا تو وہ ہاتھ کے ہاتھ برتن واپس نہ کرتیں کبھی کبھی برتنوں کی واپسی میں پندرہ دن بھی لگ جاتے پھر اچانک بھوااماں اپنی اسپیشل چال سے، سر پر خوان رکھے آموجود ہوتیں موسم کے پھل ہوتے یا پھر کوئی میٹھی چیز — امی لاکھ منع کرتیں مگر وہ جواب دیتیں یہ اپنے بچوں کے لیے لائی ہوں اور امی رخصتی سلام کے ساتھ ان کی مٹھی میں چپکے سے کچھ تھما دیتیں۔ بات صرف اتنی تھی کہ دلی میں خالی برتن لوٹانے کا رواج نہ تھا۔

ہم لوگ جب بڑے ہوگئے اس قابل کہ گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹا سکیں ایسے موقع پر کہ [illegible] ں کام کر رہی ہوتیں اور بھوااماں آجاتیں، تو ہم سب [illegible] رسے چیختیں کہ ہم دم بخود رہ جاتے لیکن ان کی بے جا [illegible] علت اب [illegible] بری لگنے لگتی تھی، حالانکہ ہم لوگ اپنے اپنے حصہ کا کام کر چلے ہوتے تھے لیکن کیا مجال کہ ان کے سامنے لب کھول سکیں۔

بھوااماں کی دلی خواہش اس لڑکی کا جسے وہ اپنا کہہ چکی تھیں، سہرا

دیکھنا تھا۔ وہ اس فرض سے سبکدوش ہونے سے پہلے کسی طرح مرنا نہیں چاہتی تھیں یوں زندگی سے انھیں کوئی لگاؤ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ خود کہتی تھیں میرا کیا ہے میں تو پکا پان ہوں۔ پھر جیسے ایک دم ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی۔ ہاتھ اوپر اٹھا کر نہ جانے کیا کیا بدبداتی رہتیں۔ ایک دن بھوا ماں نے بتایا کہ ان کی بیٹی کا رشتہ سمندر پار سے آیا ہے۔ خوش بھی تھیں اور بیٹی کو دور بھیجنے کے خیال سے آٹھ آٹھ آنسو رو بھی رہی تھیں آخر انھوں نے فیصلہ کر لیا، نا بابا میں اپنی پھول سی بچی کو اتنی دور نہیں بھیجوں گی۔ بھوا ماں کو اونچ نیچ سمجھائی گئی رشتہ کے روشن پہلوؤں پر توجہ دلائی گئی تو بادِل نخواستہ راضی ہوئیں اور سارا سارا دن جہیز کی تیاریوں اور مشوروں میں صرف کرنے لگیں۔ ایک جوڑا اپنی طرف سے دلہن کے لیے بنوایا بارات آئی۔ دوڑی دوڑی دولھا کو دیکھنے گئیں اور اتنی خوش ہوئیں کہ سمدھنوں کو جی بھر کے گالیاں دیں۔ وہ ہنس ہنس کر ان کے نایاب تحفے قبول کرتی رہیں۔ وداع کے بعد بھوا ماں کے لب و لہجہ سے پتہ چلتا تھا کہ بہت بڑا بوجھ ان کے سر سے اتر گیا ہے۔ دلھن جب پہلی بار میکے آئی تو بھوا ماں کو پیغام بھجوایا گیا۔ پتہ چلا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بخار میں پھنک رہی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ بھوا ماں رکشہ سے اتر رہی ہیں ہاتھ میں کچھ لفافے ہیں۔ آج خوان نہیں تھا۔ پھل اور چوڑیاں لڑکی کو دیں کانپتے ہاتھوں سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور ایک ڈبے کو سینے سے لگائے آگے بڑھیں۔ ہمارے ہاں آئیں اور امی کو وہ ڈبہ تھما کر کھڑی رکشہ واپس جانے لگیں۔ روکا تو بولیں میرے پاس وقت کم ہے۔ ان کے جانے کے بعد امی نے ڈبہ کھولا اس میں وہی نیلے رنگ کی چوڑیاں تھیں امی کے ہونٹوں سے خفیف سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ تیسرے دن پتہ چلا بھوا ماں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

Marfat.com

محمد شفیق

بھائی جمّا

کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا نہ کوئی جشنِ سالگرہ ہوتا ہے اور نہ کوئی یومِ وفات۔ ایسی شخصیتیں اِن دونوں کی محتاج بھی نہیں ہوتیں۔ بلکہ اُن کی یاد دِلوں میں اِس طرح پیوست ہو جاتی ہے جیسے ہرن کے نافے میں مُشک۔

بھائی جمّا کی شخصیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اُن کا نام جمیل احمد خاں ہوتا یا عبدالودود، کہلاتے وہ پھر بھی بھائی جمّا ہی۔ ہماری اور اُن کی عمر میں لگ بھگ چالیس برس کا فرق تھا پھر بھی وہ ہمارے بھائی جمّا ہی تھے اُن کی کوٹھی کے آس پاس گھروں میں رہنے والے بچوں کے بھی وہ دادا، نانا نہیں، بھائی جمّا ہی تھے۔

جس طرح چاٹ یا گول گپّوں کا ذکر سُن کر ہمارے منھ میں پانی بھر آتا ہے اُسی طرح بھائی جمّا کے نام کے ساتھ ہی ہم میں سے اکثر کی زبان تر ہو کر تالُو سے لگ جاتی ہے۔ یا بقول شخصے روزے دار کے سامنے بھائی جمّا کا نام آ جائے، تو یہ کمبخت منھ کا پانی روزہ ہی مکروہ کرا دے۔

بات کالج کے زمانے ہی کی سہی۔ لیکن آج بھی وہ سماں یاد آتا ہے

Marfat.com

تو نظروں میں بھائی جمّا کی شخصیت اُتر آتی ہے۔ اجمیری گیٹ کے بالکل سامنے، اینگلو عربک اسکول کے مغربی سِرے پر واقع بھائی جمّا کی یہ کوٹھری نما دکان، چھت پر ٹنگا پنکھا، جس سے گرمی میں گرم ہی ہوا ملتی، سردی سے بچاؤ کے لیے دونوں اطراف میں پڑی ترپالیں، یا ٹاٹ کے پردے۔ درمیان میں اُونچی سی تپائی پر بیٹھے بھائی جمّا۔ آگے خوانچے میں سجے پھل، ڈبّوں میں مصالحے۔ پھر چاروں طرف سے بلند ہوتی صدائیں۔

"اُف، بھائی جمّا، آپ نے تو یہ ہری مرچ بہت ہی تیز ڈال دی۔ سُو ۔ ذرا کوئی میٹھا قتلہ ہی دے دیجیے"

"بھائی جمّا (ذرا کھینچ کر) آلو کی چار کُلیاں ذرا جلدی بنا دیجیے، بیل ہونے والی ہے"

دیوار کی اُوٹ سے کوئی مترنّم آواز۔ "دیکھیے بھائی جمّا، اِتنی دیر ہو گئی بیٹھے بیٹھے۔ آپ نے تین پتّے نہیں دیے۔ دیکھیے مصالحہ تیز نہ ہو جائے۔ اور ہاں نیبو بھی نچوڑ دیجیے گا۔

لنچ میں کچھ دوسری آوازیں بھی شامل ہو جائیں۔

"بھائی جمّا ۔ چار کُلچے گرم کر دیجیے، دو پلیٹیں چھولوں کی بھی بنا دیجیے گا"

بھائی جمّا۔ وہ ہمارا لنچ بکس کہاں رکھّا آپ نے"

" وہ۔ اُدھر کنستری کی اوٹ میں رکھّا ہے ۔ اٹھا دینا بیٹے...

فرمائیے، آپ کے لیے کیا بناؤں؟"

"بھائی جمّا کِتنے پیسے ہوئے؟"

"کیا کیا لیا آپ نے ....؟"

"دو کُلچے دو پلیٹیں چھولوں کی اور آلو کی دو کُلیاں ...."

Marfat.com

"شاید آپ نے کیلے بھی تو لیے ہیں؟"

"اوہ — وہ تو بھول ہی گیا"

غرض کتنی ہی بھیڑ ہو، کتنی ہی آوازیں، بھائی جمّا کی وہی پرسکون شخصیت۔ مجال جو تیوری پر کوئی بل آجائے۔ کس کو کیا کیا دیا ہے۔ کس نے کیا کیا مانگا ہے۔ کس نے پہلے آرڈر دیا اور کس نے بعد میں۔ بھائی جمّا کی ہر چیز پر نظر رہتی تھی۔ چاہے وہ کسی کا حساب کر رہے ہوں یا آرڈر لے رہے ہوں یا کسی کی بات کا جواب دے رہے ہوں۔ آپ کے ہاتھ اُسی طرح مصروفِ کار رہتے جیسے کسی ماہر موسیقار کی انگلیاں ستار پر یا نامور رقاصہ کے پنجے طبلے کی تھاپ پر۔ پہلے پتّے یا پلیٹ کو کپڑے سے صاف کرنا، پھر مشاق ہاتھوں سے پھلوں کو قتلوں کی شکل دینا۔ اُس پر نپے تُلے انداز سے مصالحوں کی آمیزش۔ یہی اُن کی چاٹ کا خاصّہ تھی۔

آفتابی چہرہ، سانولا رنگ، خوبصورت گھنی سُرمئی سفید داڑھی، تنومند جسم، میانہ قد، سادہ لباس، سر پر رنگین ٹوپی، خوش اخلاق، خوش کلام اور اُس پر دِلّی کی ٹکسالی زبان۔ بالکل اُن کے مصالحوں اور چاٹ کی طرح لطیف اور چٹ پٹی۔

انہی سب محاسن نے یکجا ہو کر جس شخصیت کو جنم دیا وہ بھائی جمّا کی شخصیت تھی۔

دراصل بھائی جمّا کی کامیابی اور مقبولیت کا راز ان کے سلیقے اور اُن کے منظّم طریقۂ کار میں مضمر تھا۔ دکان میں قدم رکھنے والے پر اٹھنے والی ان کی خیر مقدمی نظریں، چٹوروں کی پسند ناپسند، مطلوبہ چاٹ کا حدود اربعہ، یعنی مقدار، پھلوں کا استعمال، مصالحہ ہلکا ہو یا تیز، کھٹائی زیادہ ہو یا کم، چھولوں میں دال سیو کی آمیزش، وغیرہ وغیرہ

Marfat.com

اِس سارے عمل کے بعد بھائی جمآ کے ہاتھ سے چاٹ کا جو پتّا نکلتا وہ طالبِ علمی کی زندگی کے بعد بھی اُن کی کوٹھری یا دُکان کا طواف ضرور کراتا تھا۔

ویسے تو بھائی جمآ کی دکان، ماسٹر جی کے ڈر سے بھاگے لڑکوں اور منچلے طلبار سے صبح ہی آباد ہو جاتی تھی لیکن دن چڑھنے کے ساتھ ساتھ جس طرح الیکشن میں ووٹنگ میں تیزی آنی جاتی ہے ٹھیک اسی طرح اسکول کی تفریح کے وقفے تک یہاں بھی ۶۰ فی صد "حقِ رائے دہندگی" کا استعمال ہو ہی جاتا ہے۔ اُس کے بعد رہی سہی چالیس فی صد کی کمی کالج کی طالبات پوری کر دیتی تھیں۔ اور تو اور... بھائی جمآ کی چاٹ، خاص کر آلو شکرقند کی کُلیاں ان استادوں اور لیکچرارز کی زبان کی زینت بنتے اسٹاف روم تک پہنچ جاتیں جنھیں ان کی کوٹھری تک آتے شرم محسوس ہوتی۔

بھائی جمآ کے اِرد گرد نازک اندام طالبات کا جھُرمٹ دیکھ کر بہت سے منچلوں میں 'بھائی جمآ' بننے کی آرزو جنم لیتی، لیکن بے سُود.....!

بھائی جمآ کی باتیں بھی دل چسپ ہوتیں۔ کسی کی آواز آئی —

"اوفوہ — یہ ہری مرچ ہے یا تتیّا"۔

بھائی جمآ گویا ہوئے۔

'اللہ رے یہ نزاکت آپ کی۔ میاں" آپ تو ابھی بچے ہیں، ہمارے آج بھی آنکھوں میں مرچیں جھونک دیجیے، پتہ بھی نہ چلے۔ بیٹا جب ہم آپ کی عمروں کے تھے، تو یہ ہری مرچیں یوُں ہی چبا ڈالتے تھے، وہ بھی خالص بیور۔ آج کل کی ملاوٹی نہیں... بیٹا اِس میں

Marfat.com

آپ کا بھی کوئی قصور نہیں ۔۔۔ یہ سب اِس ڈالڈا کی دین ہے۔ گُدّی میں عقل آئی نہیں کہ آنکھوں پر چشمہ لگ گیا۔ تیس سال کے ہوئے نہیں کہ کمر جھک گئی۔ میاں اگر یہی حال رہا تو ہماری عمروں تک کیسے پہنچیں گے۔۔۔ پُوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں۔

آج بھائی جمّا ہمارے بیچ نہیں، لیکن گھر گھر میں موجود، اُن کا مصالحہ" فروٹ چاٹ" آج بھی اُن کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ رکھے ہوئے ہے۔

Marfat.com

طیبہ خاتون

تیمور جہاں بیگم

بٹوہ سا گول مول مسکراتا ہوا چہرا، چوڑی پیشانی، گورا رنگ، گول گول مگر گہری اور روشن آنکھیں جن سے محبت ٹپکتی تھی۔ آنکھوں پر ہمیشہ کالا چشمہ جسے بہت کم اُترے ہوئے دیکھا۔ چھوٹی سی ناک، چاندنی چوک کی مشہور دکان پان برانڈ کے یہاں کا زعفرانی زردہ کھاتی تھیں۔ پان کی کثرت سے دانت مِسّی لگے دانتوں کی مانند کالے، قدرے بڑا دہانہ جسے ہر وقت سکیڑے رہتیں، بوٹا سا قد، نحیف و نزار جسم، چادر نما کریم رنگ یا پیازی رنگ کا برقع پہنے ہوئے اکثر دریا گنج اور جامع مسجد کے اِرد گرد آتے جاتے دیکھا تھا۔ چہرے کے علاوہ پورا جسم اس برقع سے اس طرح ڈھکا ہوا کہ لباس کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کیا پہنی ہوئی ہیں لیکن پاؤں میں پہنی ہوئی سلیم شاہی جوتی پر نظر ضرور ٹھہر جاتی جس میں وہ نمایاں دکھائی دیتیں تھیں۔ چہرے سے ٹپکتا ہوا دبدبہ و وقار، چال میں بلا کا اعتماد، دور سے پہچانی جاتیں کہ تیمور جہاں بیگم تشریف لا رہی ہیں۔

تیمور جہاں کی پیدائش ۱۹۱۰ء میں بتائی جاتی ہے ان کا انتقال

Marfat.com

دو سال کی طویل بیماری کے بعد نومبر ۱۹۸۴ء کو ہوا۔ ان کا آبائی مکان تورنگ محل اور چاندنی محل بتایا جاتا ہے لیکن وہ اپنی والدہ کے مکان "قیصر منزل" کوچہ چیلان "گلی مرزا سلیم محمد شاہ" میں رہتی تھیں یہ کوچہ پہلے چہل امیراں کے نام سے مشہور تھا ان کا حسب نسب شاہ عالم ثانی سے ملتا ہے مرزا ہدایت افزا عرف مرزا الٰہی بخش بہادر شاہ کے سمدھی تھے۔ مرزا الٰہی بخش کی بیٹیاں بہادر شاہ ظفر کے لڑکوں سے منسوب تھیں۔ ان کے دو لڑکے تھے بڑے لڑکے مرزا سلیمان جاہ تھے اور مرزا ثریا جاہ ان کے چھوٹے بیٹے کا نام تھا۔ تیمور جہاں کی والدہ مرزا سلیمان جاہ کی صاحب زادی قیصر جہاں تھیں اور مرزا ثریا جاہ کے بیٹے مرزا سلیم محمد شاہ ان کے والد تھے اور خود تیمور جہاں کی چار اولادیں ہیں دو لڑکیاں اور دو لڑکے۔

مرزا الٰہی بخش نسبتاً عالمگیر ثانی کی اولاد تھے۔ بہادر شاہ سے ان کی غداری کی بات کو اللہ ہی زیادہ جانتا ہے جہاں تک پرانے لوگوں سے معلومات کا تعلق ہے اس سے اس نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے کہ مرزا الٰہی بخش خود یہ محسوس کر چکے تھے کہ حکومت تو ہاتھ سے نکل چکی ہے اور کمپنی بہادر کے قبضے کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی ان سے اگر غلطی ہوئی تو وہ یہ کہ وہ انگریز کرنل کی سازش میں آکر یعنی اس کے ورغلانے سے بادشاہ کو یہ مشورہ دے بیٹھے کہ بادشاہ اپنی جاں بخشی کرالیں یا بعض کے اقوال کے مطابق کہ بادشاہ عافیت کے ساتھ قلعے سے نکل جائیں بادشاہ جو حالات زمانہ سے متاثر تھے اس مشورے کو قبول کر بیٹھے اور پھر بہادر شاہ کی گرفتاری کہاں اور کس طرح عمل میں آئی اسے سبھی جانتے ہیں۔ مرزا الٰہی بخش کو انگریزوں نے بھی غدار ٹھہرایا اور انھیں بھی غدر کے بعد شہر چھوڑ کر نظام الدین میں سکونت اختیار کرنی پڑی بنگلے والی مسجد"

Marfat.com

جس میں آج تبلیغی جماعت کا مرکز ہے ان کے رہائشی مکان کی مسجد تھی یہاں کے قیام کے دوران مرزا الٰہی بخش مولانا اسماعیل صاحب سے جو بانئ تبلیغ ہیں بیعت ہوگئے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان کے بیعت ہونے کے بعد ان کی توبہ قبول ہوئی اور مرکز کے توسط سے یہ دینی کام عالم دنیا تک پھیل سکا۔ خود تیمور جہاں کی والدہ قیصر جہاں بیگم نے مولانا اسماعیل صاحب سے دینی تعلیم حاصل کی۔ مولانا کے صاحب زادے مولوی الیاس صاحب ان کے ہم مکتب تھے اسی تعلق سے مولوی الیاس صاحب اور ان کے بیٹے مولوی یوسف صاحب قیصر بیگم اور تیمور جہاں سے بہت قریبی مراسم رکھتے تھے ہر تقریب میں ایک دوسرے کے یہاں آمد و رفت تھی۔

تیمور جہاں بیگم اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں بڑے لاڈ و پیار اور ناز و نعم سے پلی تھیں مزاج کی تیز لیکن دل کی نرم تھیں اُن کی زندگی میں بہادری اور ہمت کے بہت سے واقعات ملتے ہیں بچپن ہی سے غیر معمولی مشاغل تھے پتنگ وہ اڑاتی تھیں، نانا کے ساتھ مہرولی جاکر گھوڑا سواری وہ سیکھتی تھیں، اور بندوق وہ چلاتی تھیں اور کیوں نہ سیکھتیں آخر اپنے نانا، دادا اور والدین کی آنکھوں کا سرمہ تھیں۔ مس جسرورڈ کے ایما پر کوئن میری Queen Marry سے ۲۵-۱۹۲۴ء میں میٹرک پاس کیا لیکن اس شرط پر کہ وہ پردہ میں رہ کر تعلیم حاصل کریں گی۔ جلد ہی والد کے انتقال کے بعد ان کی شادی مرزا دارا بخت سے کر دی گئی جن کا خاندان مرزا جہاں دارا بخت سے ملتا ہے اور ننہالی خاندان ٹیپو سلطان سے ملتا ہے دارا بخت کی یہ دوسری شادی تھی دونوں کی عمر میں بڑا تفاوت تھا تقریباً بیس سال کا فرق بتایا جاتا ہے انھیں اپنی بے میل شادی کا ہمیشہ احساس رہا لیکن اپنی ازدواجی زندگی بڑی خوش اسلوبی سے گزاری انھیں ایک سگھڑ عورت کہا جا سکتا ہے گھرداری کے سارے کام جانتیں

Marfat.com

تھیں لیکن روزانہ کے باورچی خانے کے کام نہیں کیا کرتی تھیں وہ کہتی تھیں "جب خادمائیں موجود ہیں تو ہم اپنی انگلیاں کیوں جلائیں" لیکن شوہر کی من پسند چیزیں شاہی ٹکڑے اور سیخ کے کباب اپنے ہاتھ سے بناتی تھیں اور بہت اچھے بناتی تھیں۔ شوہر چونکہ سرکاری ملازم تھے اس لیے ان کی سیاسی سرگرمیوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ عورت کو گھر کی زینت سمجھتے تھے وہ ان کا باہر رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن مزاج کی وہ ضدی تھیں تریاہٹ بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی جب ۱۹۴۶ کے قریب جنگِ آزادی کے سلسلے میں ارونا آصف علی، سروجنی نائیڈو بیگم ہارون اور مردولہ سارا بھائی وغیرہ سے ملتی جلتیں تو ان کے شوہر اُن کے آنے جانے پر اعتراض کرتے کہ "تم ضرور میری نوکری ختم کرا کے دم لوگی" اس لیے وہ سیاسی زندگی سے چند سالوں کے لیے کٹ سی گئیں تھیں لیکن شوہر کے انتقال کے بعد ۱۹۵۲ سے پھر باقاعدہ اپنے سوشل ورک میں مصروف نظر آنے لگیں۔ وہ عورتوں کی ہمیشہ طرفدار رہیں۔ امراٗ کی بیواؤں اور اپنی دوست بیواؤں کی شادیاں کرنے کی خواہش مند رہتیں تھیں وہ مرتے دم تک اس بات کی کوشاں رہیں کہ شرع محمدیہ کے مطابق عورتوں کے حقوق کا تحفظ ہونا چاہیئے۔ وہ اس کے لیے بھی ہر ممکن کوشش کرتیں کہ عورت کو طلاق دینے کی نوبت نہ آنے پاتے اگر طلاق ہو بھی گئی تو وہ شریعت کے حکم کے مطابق انھیں رجوع کرا دیا کرتیں "تیموریہ انیسویں سیشن" میں باقاعدہ ۱۹۴۷ تک مشاعرے منعقد کراتیں، رفیع احمد قدوائی کے حلقہ میں بھی جانی پہچانی جاتی تھیں نواب مرزا اسماعیل خاں سبیرسٹر (مرحوم) میرٹھ اور نواب سلطان جہاں بیگم والئ بھوپال سے ان کی والدہ اور ان کے اچھے مراسم تھے انھوں نے اپنے مکان اسی "قیصر منزل" میں نظامِ حیدرآباد کی ترکی بہوؤں درِ شہوار اور نیلوفر کو مدعو کیا ان کے شایانِ شان

Marfat.com

دعوت کا اہتمام بڑے سلیقے سے کیا گنگا جمنی سکے نچھاور کیے جن میں اشرفیاں بھی شامل تھیں۔ انھیں نذریں بھی دیں انھیں اپنے گھر کو سجانے وسنوارنے کا بے حد شوق تھا وہ خود تو مغل تہذیب کا بجھتا ہوا چراغ تھیں لیکن اپنے ڈرائنگ روم کو انگریزی وضع سے آراستہ رکھا اس میں چند قدیم چیزوں کے علاوہ نئی طرز کا فرنیچر آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ آزادانہ فکر کی مالک تھیں روشن آرا کلب کی ممبر تھیں جن کو زنانہ پردہ کلب کہا جاتا تھا۔ ہندوستان کی سرزمین سے انھیں بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ تیمور جہاں کی پھوپھی بادشاہ جہاں بیگم نے تقسیم ہند کے بعد جب وہ لاہور جا رہی تھیں ان سے بھی پاکستان چلنے کے لیے کہا تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا "دلی کی مٹی میرا سہاگ ہے اور یہی میرا خاندان ہیں پاکستان نہیں جاتی" نئی دہلی میں وہ اچھی طرح رہ سکنے کے قابل تھیں لیکن انھوں نے اپنے اس مکان "قیصر منزل" کو جو کسٹوڈین کی تحویل میں چلا گیا تھا مسلسل پانچ سال مقدمہ لڑنے کے بعد حاصل کیا اور پرانی دہلی میں رہ کر ہی وہ بڑی خوش وخرم نظر آتی تھیں۔

شوہر کے انتقال کے بعد وہ اقتصادی مشکلات کا شکار ہوئیں لیکن اپنا انداز سوسائٹی میں اس طرح بنائے رکھا کہ کوئی ان کی اقتصادی کمزوری سے واقف نہ ہو۔ انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں اور بیٹیوں کو اعلا تعلیم دلائی۔ اپنی زندگی کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ تنگی وترشی کے باوجود ان کی تعلیم وتربیت میں کبھی کمی نہیں آنے دی لیکن انھیں اپنی اولاد سے وہ تسکین حاصل نہ ہو سکی جس کی وہ متمنی تھیں وہ ایک باشعور عورت تھیں اپنے مرتبے کا ہمیشہ لحاظ رہا۔ اسی کے مطابق سب سے سلوک کیا۔

بڑائی کا لاکھ احساس سہی لیکن تیمور جہاں غریب عورتوں سے ملنے میں کبھی اجتناب نہیں کرتی تھیں بلکہ وہ تو غریب ونادار عورتوں اور

Marfat.com

بچوں سے اس طرح گھل مل کر باتیں کرتیں جیسے وہ ان کی اپنی ہی ہیں ان کی باتیں بڑی توجہ اور دلسوزی سے سنا کرتیں سب کے ساتھ ان کا جان چھڑکنے والا انداز قابل دید ہوتا تھا جنتا حکومت کے زمانے میں وقف بورڈ کے چیئرمین (مرزا اقبال شاہ) کے پاس بار بار جاتیں اور طرح طرح سے محتاجوں اور بیواؤں کو سلائی کی مشینیں وغیرہ دلانے کی سبیل کرتیں۔ ان کے دکھ درد کو بانٹتیں مظلوم عورتوں کے بگڑے اور اجڑے گھروں کو پھر سے بسانے کی ہر ممکن کوشش کیا کرتیں ان کی ہر دم ہنستی ہوئی نگاہیں ان عورتوں کو زندگی کا حوصلہ دیتیں سب سے بے تکلف دوستوں کا سا برتاؤ کرتیں بات کرتے ہوئے ہمیشہ بے تکلفی کی فضا برقرار رکھتیں ان کی باتوں میں دراصل جادو تھا۔ ہر ایک ان سے اپنا دکھ درد کہہ کر اپنا دل ہلکا کر لیتا غریب پرور اس قدر کہ سڑک کی لائٹ میں پڑھتے ہوئے بچوں کو اپنے گھر لا کر انھیں آرام سے پڑھنے کے لیے موقع دیتیں تنگ نظری اور تعصب کو دور کرنے کی تمام عمر کوشش کرتی رہیں مہترنی تک کے بلانے پر اس کے گھر شادی میں جاتیں وہاں بیٹھ کر اس کی دل جوئی کے لیے شربت پانی وغیرہ پیتیں اور اس کے ہاتھ میں لفافہ دے کر چلی آتیں۔ وضعداری تیمور جہاں کی گھٹی میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ہر میدان میں یکتا بیوی، ماں، عورت، سماجی رکن اور شہرت سب میں مثالی تھیں، نماز کی ہمیشہ پابند رہیں پردہ کو مرتے دم تک کلیجے سے لگائے رکھا ورزش بڑی باقاعدگی سے کیا کرتی تھیں صحت کا بڑا خیال رکھتی تھیں چہرے پر پسے ہوئے بادام اور ملائی کا لیپ بڑھاپے تک لگاتی رہیں گلال چند جوہری مل۔ کے یہاں کے عطریات بہت پسند کرتی تھیں گرمیوں میں عطر خس، سردیوں میں حنا برسات میں کیوڑا اور جوہی۔ کھانے پینے میں بھی صحت کا بے حد خیال رہتا تھا۔ وہ ہر ہر رسم کو اسی

Marfat.com

اہتمام کے ساتھ مناتی تھیں جیسا کہ ان کے زمانے کے لوگ منایا کرتے تھے۔ صدیوں پرانی دلکش رسوم کو باقی رکھنے اور کرنے میں فخر محسوس کرتی تھیں۔ جشنِ نوروز کو بڑے دھوم دھام میں مناتیں ایک بار کیا ہوا کہ جشنِ نوروز کا رنگ سفید نکل آیا ان پر فکر دامنگیر تھی کہ سہاگنیں اور لڑکیاں بالیاں سفید لباس کیسے زیب تن کریں آخر یہ طے پایا کہ کسی وہم کو دل میں لائے بغیر سفید ملبوسات پر زعفران کا چھینٹا دے کر پہن لیں اور اس کے ساتھ ہیرے کے زیورات کے بجائے سچے موتیوں کے زیورات پہنے جائیں کہ وہ زیادہ صاف اور پاک ہوتے ہیں۔

تیمور جہاں کو میں نے سب سے پہلے ان کے چھوٹے بیٹے محترم بخت عالی جاہ کی شادی میں دیکھا تھا عالی بھائی کی شادی ہماری پھوپھی زاد بہن نصرت آپا سے ہوئی تھی چونکہ یہ قریبی شادی تھی اس لیے تیمور جہاں بیگم کو قریب سے دیکھا اس شادی سے پہلے بھی ان کے متعلق کیا کیا سنتے رہتے تھے جب دیکھا تو بہت کچھ سمجھا بہت کچھ پایا۔ عالی بھائی کی شادی میں تو جیسے انھوں نے اپنے دل کے تمام ارمان نکالے تھے۔ شبِ برات، رمضان، عید، بقرعید، محرم، بارہ وفات ہر ہر موقع پر لڑکے والوں کے یہاں سے کچھ نہ کچھ چلا آرہا ہے لڑکی والے چاہے اس کا پلٹا وا کریں یا نہ کریں تیمور جہاں کی بلا سے وہ تو اپنے دل کے ارمان نکال رہی تھی۔ ایک ہر ہر رسم کو کیا۔ خاص طور سے ساون کے آتے ہی "ساونی" کا آنا میں نے اپنے ہوش میں اس سے پہلے دیکھا نہ سنا۔ معلوم یہ ہوا کہ دلھن کو جھولا جھلانے آرہی ہیں۔ اس کی پوری تیاری تھی۔ چاندی کی پٹریاں، ریشم کا رسّا دلہن کا دھانی جوڑا، پرس، گھڑی وغیرہ کیا نہیں تھا اور ہاں برسات منائیں اور چھتریں نہ لائیں یہ کیسے ممکن تھا دلہن کی پچرنگی چھتری بھی تھی برسات کی رعایت سے دلہن کو کھلاتے

کے لیے بارہ تیرہ سینپول میں مٹھائی کے علاوہ، کسی سینی میں سیال ہے تو کسی میں اندرسہ کی گولیاں، کسی میں پالک کے پتے تلے ہوئے ہیں تو کسی میں گلگلے اور پھُلکیاں، کسی سینی میں جامنیں ہیں تو کسی میں آم وغیرہ یہ سب سینیاں گاتی ہوئی ڈومنیوں کے سروں پر ہیں وہ بڑی لہک لہک کر برساتی گیت گاتی چلی آرہی ہیں، تو کبھی شب برات پر دیگوں میں چوٹی دار زردہ بھرا ہوا آرہا ہے اس پر پچرنگی مٹھائی کے علاوہ کھوپرے کے چاند اور تارے کاٹ کاٹ کر لگاتے ہوئے یہ دلہن کے لیے۔ تو کبھی محرم پر بلور کی ڈھکنے والی سیکڑوں ڈشوں میں کھیر جما کر بھیج رہی ہیں تو کبھی سیکڑوں ہاتھوں سے سلے ہوتے دیکھنے سے تعلق رکھنے والے بٹوے جسے بقول خود ان کے راتوں کو بیٹھ بیٹھ کر سیا ہے کپڑے یعنی کنٹرنوں کے یہ بٹوے اس نفاست اور ضیا کاری سیسے تھے کہ کوئی لائن اور کوئی پھول ٹیڑھا سیدھا نہ ہونے پائے۔ ہاتھ میں بلا کی صفائی الغرض دریا دل کے سبب اس شادی میں دونوں ہاتھوں سے خوب لٹایا اور کیوں نہ لٹاتیں خدا کا دیا سب ہی کچھ تھا آنا جانا ملنا جلنا سب سے ہی ہمیشہ نبھایا۔

دہلی کے سربراہان حکومت سے ان کا تعلق عموماً گھریلو ں سا ہوتا تھا یہ صرف دفتر تک ہی نہیں زنان خانے تک بھی تھا۔ بعض افسران کے وہ راکھی باندھتی تھیں اور نیگ حاصل کرتی تھیں۔ دہلی کے نامور ہندو خاندانوں میں خواہ وہ لالہ جھنامل والوں کا خاندان ہو خواہ سلطان سنگھ جین کا، الولی پرشاد کا ہو یا لالہ شام ناتھ کا، لالہ اونکار ناتھ لالہ شنکر لال اور پوکیشور دیال وغیرہ کا خاندان ان کا سب خاندانوں سے مساویانہ تعلق تھا اور وہ ان سب کے خاندانوں میں ایک خاندانی فرد کے طور پر نظر آتی تھیں دہلی کے قدیم نامور خاندانوں

Marfat.com

ہیں " سادات عرب سرائے " خاندان مفتیان شاہ عبدالحق محدث دہلوی اور شریفی خاندان (حکیم اجمل خاں) ریاست لوہارو خاندان میں اگرچہ ان کی کوئی قرابت داری نہیں تھی لیکن راہ ورسم قریب ترین عزیزوں کی طرح تھی ۔ تیمور جہاں اُن کے مرتے جیتے شادی بیاہ سب میں ایک خاندانی سربراہ کی حیثیت سے شریک ہوتی تھیں ۔

ہر سوسائٹی میں ان کا بڑا احترام کیا جاتا تھا ۱۹۷۶ء میں کسی پارٹی نے ان سے الیکشن میں کھڑے ہونے کے لیے کہا تو انھیں یہ کہہ کر خاموش کردیا کہ آندھی میں پتے اڑتے ہیں پتھر نہیں " گفتگو کرتے ہوئے ان کی زبان میں بڑی روانی پائی جاتی تھی زبان سے بے تکان روزمرّہ محاورہ اور اشعار نکلتے رہتے تھے خود شاعرہ تھی حجاب تخلص تھا ۔ ایک بار " یوم بیخود " کے موقع پر انھوں نے اپنی جب یہ غزل سنائی تو لوگ داد دیے بغیر نہ رہ سکے اس غزل کے چند اشعار یہ تھے :

سمجھ کر دل کا آئینہ لگا ہوں کو زباں کہدوں
چھپا رکھی ہے میں نے ان کہی اک داستاں کہدوں
گلوں کی ہی نہیں توہین ہے سارے گلستاں کی
اگر میں چند تنکوں کو مکمل آشیاں کہدوں
کرم گہر ستم کی سخت منزل سے گزر جاؤں
حجاب ان سے ایسی صورت میں اپنی داستاں کہدوں

مشاعرے ہوں یا جلسے وجلوس ، شادی ہو یا غمی اکیلی عورت ہوتے ہوئے اپنی بساط سے بڑھ کر ہر جگہ شرکت کرتیں ۔ ان کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ افسران سے ملنے میں وہ بڑی بے تکلف تھیں بات کرنے میں ہرگز جھجکی نہیں کھاتی تھیں اور ہر سوال کا جواب وہ ترکی بہ ترکی دیتیں اگر کسی بات پر کسی سے اختلاف ہو جائے تو چاہے وہ ڈپٹی کمشنر ہو یا

Marfat.com

کمشنر یا چیف کمشنر مسائل میں بہت ہی نڈر ہوکر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر دیتی تھیں۔ غصہ جلدی آجایا کرتا تھا اگر کسی۔ اے۔ ڈی۔ ایم نے نامناسب انداز میں گفتگو کی ہے تو وہ فوراً اس کی شکایت کمشنر و چیف کمشنر سے کردیا کرتی تھیں۔ ان کے خاندانی وقار کی بنا پر ایسے افسران کا تبادلہ عمل میں آجایا کرتا تھا۔

کبھی کبھی تیمور جہاں کے ساتھ ایسا بھی ہوا ہے کہ خوشامد پسند ہونے کی وجہ سے دھوکہ کھا گئیں یہ ان کے مزاج کی سب سے بڑی کمزوری تھی کہ چاپلوسی سے متاثر ہوکر نتائج سے بے نیاز اس کے مشورے پر عمل کر بیٹھیں اور اس میں کھلا دھوکہ کھاتیں پھر اس سے انتقام لینے کی قوت نہیں رکھتی تھیں کلیجہ مسوس کر رہ جاتی تھیں اگر وہ شخص کبھی سامنے آجاتا تھا جس سے انھوں نے دھوکہ کھایا اس سے تبادلہ خیال کرتے ہوئے چٹکیاں ضرور لے لیتیں کہ وہ یہ محسوس کرلے کہ تیمور جہاں اس کی چالاکی اور بدروش کو سمجھتی ہیں بعض وقت جو منھ میں آتا وہ کہہ جاتی تھیں، بے ربط جملے بول جاتی تھیں، ان کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان تھی ضلع جگت پر انھیں بڑی قدرت تھی گفتگو کرنے میں سیاق و سباق کی پرواہ کیے بغیر بے تکان بولے جاتیں۔ اگر کہیں اپنی غلطی کا اعتراف کرلیتی تو دوسرے کو معافی و تلافی کے بعد پر جانے سے بھی گریز نہ کرتی تھیں۔

مرزا الٰہی بخش اور ان کے دونوں بیٹوں اور قیصر جہاں کی قبریں درگاہ نظام الدین کے مشرق میں ایک حصّہ میں ہیں جو حجرہ جہانگیر کے نام سے معروف ہے اور والد کی قبر حدودِ درگاہ سے باہر انھوں نے اپنے والدین کی قبریں سنگ مرمر کی بنوادی تھیں خود ان کی قبر بھی اپنی ماں کے قدموں میں نظام الدین ہی میں ہے یہ حصّۂ جائیداد جس میں ان کے والدین کی قبریں ہیں ارونا آصف علی کی خواہش پر ۱۹۵۵ میں آصف علی ٹرسٹ کو

Marfat.com

منتقل کر دیا تھا۔

مغل بادشاہوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی رواداری کی روایت ہے آج تک ہندوستان میں ہر طبقے اور فرقے کے لوگ ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں شریک ہوتے ہیں۔ ہولی، دیوالی، دسہرہ "روزہ افطار" "عید ملن" وغیرہ کے علاوہ "سیر گل فروشاں" دہلی میں بڑے جوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔ پنڈت نہرو اور اندرا گاندھی کے زمانۂ حکومت میں "روزہ افطار" کے موقعہ پر ہمیشہ تیمور جہاں سب سربراہوں کے آگے آگے نظر آتی تھیں۔ اسی طرح 'عید ملن' منانے کے اہتمام میں لگی رہتیں اور "سیر گل فروشاں" جیسے "دلی والوں کی سیر" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اس میں تو وہ اس انہماک سے کام کرتیں کہ لگتا وہ ہی اس کی کرتا دھرتا ہیں اس میلے کو دوبارہ شروع کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔

دہلی کی وہ نمائندہ اور وضعدار خاتون تھیں وہ رواداری اور دہلی کی تہذیب کی زندہ چلتی پھرتی تصویر معلوم ہوتیں مغل تہذیب کی نام لیوا تھیں جو ابھی ڈیڑھ سال پہلے ہی ہمارے درمیان سے اٹھ گئیں ہیں۔

Marfat.com

شریف حسین قاسمی

مجاہد ملّت رحمتہ اللہ علیہ

مولانا حفظ الرحمٰن

اس دور کی جس عظیم شخصیت کے بارے میں اس وقت آپ حضرات کی خدمت میں نہایت اختصار کے ساتھ اپنے احساسات پیش کر رہا ہوں، اسے میں نے دیکھا ضرور ہے اور بارہا دیکھا ہے، لیکن بچپن میں اور اسی طرح کبھی اس سے ہم کلامی کا شرف بھی حاصل نہیں ہوا۔ اس کے باوجود اس کی زندگی اور پُر افتخار کارناموں کا ذکر خود اپنے والد محترم جناب مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی اور اپنے دوسرے بزرگوں کی زبانی تواتر کے ساتھ سُنتا رہا ہوں۔ اس محترم شخصیت کا اسم گرامی حضرت مولانا حفظ الرحمٰن اور لقب مجاہد ملّت تھا۔ جب کبھی مجاہد ملّت یا ان کے بعض ہم عصر بزرگوں اور رفقائے کار کی سرگذشت سنتا یا پڑھتا ہوں اور اپنے ارد گرد کا جائزہ لیتا ہوں تو بے ساختہ نظیری کا یہ شعر زبان پر آتا ہے جس میں اس نے اپنے دور میں برگزیدہ اشخاص کی کمیابی کا شکوہ کیا ہے:

مجلس چو برشکست، تماشا بما رسید — در بزم چون نماند کسی جا بما رسید

آیئے نہایت اختصار کے ساتھ مجاہد ملّت کی عظیم شخصیت کے بارے میں گفتگو کریں۔

Marfat.com

ماضی قریب ہی کی بات ہے کہ گلی قاسم جان، دہلی کی ایک عمارت میں جمعیتِ علمار کا مرکزی دفتر واقع تھا۔ دفتر کیا تھا، ایک خانقاہ تھی، جہاں سارے ہندوستان سے آتے ہوئے ضرورت مند اور مصیبت زدہ لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اس دفتر نے دہلی کے بزرگ صوفی مشائخ کی خانقاہوں کی یاد تازہ کردی تھی۔ اس خانقاہ کا ایک سربراہ بھی تھا۔ یہ سربراہ دیکھنے میں نحیف، ضعیف اور اکہرے بدن کا ایک نورانی شکل کا انسان تھا لیکن درحقیقت اس انسان میں ایک باہمت، بے لوث خدمتگار اور انتھک جدوجہد کرنے والی شخصیت پنہاں تھی۔ اور وہ شخصیت تھی مجاہد ملت کی۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارہ کے رہنے والے ایک مستند عالم دین تھے۔ ملک کے مشہور محدث مولانا انور شاہ کشمیری کے عزیز شاگرد تھے۔ مولانا کشمیری نے دارالعلوم، دیوبند چھوڑ کر جب گجرات میں اپنی تعلیمی سرگرمیاں منتقل کیں تو ان کے ہمراہ گجرات جانے والے شاگردوں میں مجاہد ملت بھی شامل تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد آپ نے مختلف عربی مدارس میں ایک کامیاب استاد کی حیثیت سے درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ کلکتے میں قیام کے دوران مجاہد ملت نے وہاں کی جامع مسجد میں درسِ قرآنی کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کا درس قرآن زورِ خطابت، معقول اور دل نشین انداز بیان اور تفسیر قرآن کے گہرے لطائف و نکات کے بیان کا بہترین نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ مولانا کو تعلیم و تدریس کی نسبتاً پرسکون زندگی کو خیر باد کہنا پڑا اور وہ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ شامل ہوگئے۔

مجاہد ملت تحریک آزادی کے سرفروش قائد ثابت ہوئے۔ آزادی ہند کی تحریکات میں قید و بند کے مصائب برداشت کرنے میں آپ پنڈت جواہر لعل نہرو

Marfat.com

اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ رہے۔ ایک شعلہ بار خطیب و مقرر کی حیثیت سے آزادی کی تحریک میں وطنی جوش و خروش پیدا کرنے والے مسلمان رہنماؤں میں جہاں مولانا آزاد کا نام سرفہرست ہے وہاں مولانا حفظ الرحمٰن کا اسم گرامی بھی جلی حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ تقسیم وطن کے خلاف ملک کے کونے کونے میں مولانا کی تقریروں نے وطنی دوستی اور قومی یک جہتی کی فضا پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

وقت کی یہ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ جن لوگوں نے مادر وطن کی آزادی کے لیے ہر طرح کی مشکلات کا سامنا کیا تھا، اپنی زندگیوں کا بہترین زمانہ قید و بند کی صعوبتوں میں گذار دیا تھا، وہ آزادی کے بعد بھی چند گھڑیاں چین سے نہ گذار سکے بلکہ غیر متوقع سنگین حالات سے دوچار ہوئے۔ کوئی شک نہیں کہ ان حضرات نے اپنی ذمہ داریوں سے منھ نہیں موڑا۔ ہمت نہیں ہاری۔ جس عزم و حوصلے سے وطن عزیز کی آزادی کے لیے سرفروشانہ جدوجہد کی تھی، اس سے کہیں زیادہ ہمت اور جرأت سے آزادی کے بعد رونما ہونے والے ہولناک حالات اور وحشت ناک صورت حال کا مقابلہ کرنے میں لگ گئے۔

تقسیم وطن کے نتیجے میں ملک کے گوشے گوشے میں فرقہ پرستی کا جنون جاگ اٹھا تھا۔ مادر وطن سے ہجرت نہ کرنے کا فیصلہ کرنے والے مسلمانوں میں اس ہولناک فرقہ پرستی نے مایوسی اور شکست کے آثار پیدا کر دیے تھے۔ یہ بڑی آزمائش اور ابتلاء کا دور تھا۔ اس وقت ضروری تھا کہ کوئی صاحب عزم و حوصلہ آگے آئے اور شکستہ دل اور مظلوم مسلمانوں کی ہمت بندھائے۔ انھیں فرقہ پرستی کے جنون سے نجات دلائے۔ ہندستان کے سیکولر نظام زندگی کو بے معنی ہونے سے بچائے۔ مجاہد ملت نے یہ ذمہ داری جس تدبر اور عزم کے ساتھ نبھائی، اس کے شاہد اور قدردان

Marfat.com

الحمد اللہ ابھی بقیدِ حیات ہیں گلی قاسم جان کے آس پاس رہنے والوں نے خاص طور پر اور دہلی کے عوام نے عام طور پر انھیں ایک جیپ میں اپنے ڈرائیور محمد یونس کے ساتھ بیٹھے ایک دن میں بارہا آتے جاتے اور لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں سرگرم عمل ضرور دیکھا ہوگا۔

بہرحال اس فرقہ پرستی کی آگ کو بجھانے کے لیے جن رہنماؤں نے رات دن ایک کیے، صبح و شام بھاگے پھرے، ان میں مولانا کی انسان دوستی، اخلاص اور پیہم جدو جہد کا جوہر کھلا اور دنیا نے دیکھا کہ مولانا حفظ الرحمٰن درحقیقت مجاہد ملت ہیں۔ مجاہد ملک و ملّت ہیں۔

مجاہد ملت کی شخصیت، زندگی، مذہبی اور سیاسی خدمات، مولانا کا سیاسی ماحول، مولانا کی علمی وادبی خدمات یہ چند ایسے عنوانات ہیں جن پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ ابھی تک مولانا کے بارے میں باقاعدہ غالباً کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ مولانا کی زندگی اور کارناموں کی تاریخ دراصل اس صدی کے مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی اور سماجی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔

مجاہد ملت کی تقاریر وہ مذہبی ہوں یا سیاسی نوعیت کی، ان کے زور خطابت کا بے مثال نمونہ تھیں۔ مولانا نے خطابت کے ساتھ تحریر و انشاء کے میدان میں بھی اپنا گہرا نقش چھوڑا ہے۔ آخری دور کی تقاریر و خطابت میں جو ادبی چاشنی ہمیں مولانا کے ہاں ملتی ہے، وہ آپ کی متعدد تصانیف میں نظر نہیں آتی۔ قصص القرآن، اسلام کا اقتصادی نظام، اسلام کا فلسفۂ اخلاق، یہ چند ایسی اہم تاریخی، اور مذہبی کتابیں ہیں جن میں مولانا نے تحقیق و تنقید کا حق ادا کرنے کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کو ٹھیٹ مولویانہ نہیں بننے دیا ہے بلکہ ادبی لطافت اور شگفتگی پیدا کرنے کی

Marfat.com

کامیاب کوشش کی ہے۔

میرے والد محترم کو مجاہد ملت کے ہمراہ کام کرنے اور ان کے ساتھ سفر وحضر میں شریک رہنے کا شرف حاصل ہے۔ والد محترم فرماتے ہیں کہ ۴۷ء کے ہنگامی انتشار میں مجاہد ملت اردو کے معیاری افسانے اپنے مطالعے میں رکھتے تھے۔ مولانا کی تقاریر کے ادبی حسن اور بیان کی شگفتگی میں ان اردو افسانوں کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مجاہد ملت کے وصال کے بعد آپ کے رفیق خاص مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے اپنی ساری صلاحیتیں مولانا کے سپرد کر دی تھیں، لیکن سچ یہ ہے کہ مجاہد ملت کا تدبر اور ان کا عارفانہ اخلاص علمائے کرام کو جوڑے ہوئے تھا۔ اس وجہ سے اس جماعت کا وقار بھی قایم تھا جو معاف کیجیے گا، مرحوم کے بعد قائم نہ رہ سکا۔

یہ مجاہد ملت کا خلوص، عزم اور حوصلہ تھا کہ مظلوموں کی امداد کے کاموں میں جہاں ان کے دینی رفقاء، علمائے کرام ان کے شریک تھے، وہاں جدید تعلیم یافتہ اور روشن فکر اشخاص کا بھی ایک معقول اور با اثر طبقہ ان کا معاون و ہم کار رہا۔

آزاد ہندستان میں مسلم کنونشن کا انعقاد مسلمانان ہند کے ملّی تشخص کا پہلا مظاہرہ تھا۔ یہ کنونشن مرحوم کی سرپرستی میں تشکیل دیا گیا تھا۔ آج کے حالات کی روشنی میں اس کنونشن کو مولانا کی سیاسی دور اندیشی اور دینی حمیّت وغیرت کا ناقابل انکار ثبوت قرار دیا جانا چاہیے۔ مولانا نے یہ کنونشن اس وقت کی بااثر حکمراں شخصیتوں کی شدید مخالفت کے باوجود منعقد کیا تھا۔ اسی کنونشن نے مسلمانان ہند کو اپنی ملّی حیثیت کو قائم رکھنے کی جدوجہد کا راستہ دکھایا تھا۔

مجاہد ملّت جس جماعت سے وابستہ تھے، مولانا ابوالکلام آزاد بلاشبہ اس کے فکری قائد تھے، لیکن مولانا آزاد کی گوشہ نشین طبیعت سے علمی جدوجہد میں

Marfat.com

جو خلاء پیدا ہو سکتا تھا، مجاہد ملت کی عملی سرگرمیوں نے اس کی تلافی کردی۔

بلاشبہ دلّی والا ہونے کی حیثیت سے سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب کے دل میں دلّی کی بربادی کا جو درد پنہاں تھا اور جس کا اظہار ان کی گفتگو سے گاہ گاہے ہوتا تھا، اسے دوسری جگہ تلاش کرنا مناسب نہیں، لیکن سحبان الہند کی بڑھاپے اور امراض میں گھری زندگی، عملی بھاگ دوڑ سے قاصر تھی۔ مجاہد ملت نے بہرحال دلّی والوں کو سحبان الہند کی اس معذوری کا احساس نہیں ہونے دیا وہ بے شک ایک دلّی والے سے زیادہ دلّی کے گلی کوچوں کی حفاظت میں سرگرداں رہے۔ دلّی کی تاریخ اپنے اس محسن کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

یہ بات میں نے دہلی سے اپنے تعلق کے ناطے کہی ہے ورنہ ملک کے ہر کونے میں مجاہد ملت کی سرگرمیوں کے مخلصانہ نشانات موجود ہیں اور مرحوم کو پورا ہندستان احترام وادب سے یاد کرتا ہے اور ہمیشہ یاد کرتا رہے گا۔

Marfat.com

خالد رشید صدیقی

حکیم خلیل الرحمان نآر

کھدر کے سفید کرتے، پاجامے، جواہر کٹ اور اجمل خانی ٹوپی میں ملبوس طویل قدو قامت، سرخ و سفید رنگت اور سفید براق ڈاڑھی کے ساتھ بلامبالغہ ہزاروں افراد میں نمایاں نظر آنے والی شخصیت کا نام تھا حکیم خلیل الرحمان۔ حکیم صاحب مندرجہ خصوصیات اور بھاری بھرکم بلند آواز کی وجہ سے پٹھان کی شبیہ پیش کرتے تھے۔ شدید طور پر حساس اور انسان دوست ہونے کے ساتھ ساتھ حکیم صاحب بے حد معاملہ فہم مگر غصیلے آدمی تھے۔ شاید اپنے غصیلے مزاج اور جوشیلے پن کی وجہ سے ہی بہت ہی موزوں تخلّص منتخب کیا تھا۔۔۔ نآر!

آپ کو حضرت سائل دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا اور استاد کے ایک چہیتے شاگرد تھے۔ حکیم صاحب گو کہ استاد کے پاس کم حاضری دیتے تھے مگر جب بھی موقعہ ملتا آٹھ دس غزلوں کے ساتھ حاضر ہوتے اور اصلاح کے لیے پیش کرتے۔ حضرت سائل ایک نظر ڈال کر فرماتے "میاں تم تو فارغ الاصلاح ہو"۔

نآر صاحب زبان کے ایسے ایسے اشعار نکالتے کہ اُن کے بعد یہ

Marfat.com

وصف میں نے صرف استاد رسا دہلوی میں پایا۔

مشاعروں میں اوّل وقت پہنچتے، نصف شب کے بعد پڑھتے اور آخر شب تک سامعین کا ساتھ دیتے۔

حکیم صاحب ایک شدت پسند مجاہد آزادی تھے اور کٹر کانگریسی۔ ان کی شدت پسندی کا معمولی سا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ مہاتما گاندھی کی کھدر پوشی کی مہم میں شریک ہونے والے اولین حضرات میں سے تھے اور تادم آخر کھدر ہی زیب تن رہا۔

۴۲ء کے آس پاس کی بات ہے کہ آپ کی گرفتاری کے احکامات جاری ہوئے آپ گھر میں روپوش ہو گئے۔ مخبر کے ذریعہ حکومتِ وقت کو علم ہوا کہ وہ اپنے گھر میں ہیں۔ پولیس گھر پر پہنچ گئی۔ حکیم صاحب کو خطرے کی بو پہلے ہی پہنچ چکی تھی وہ گھر کی چھت سے پانچ چھ گھر دور پہنچے اور برقعہ اوڑھ کر ڈولی میں بیٹھ کر نکل گئے مگر یہ فرار کسی ڈر اور خوف کی وجہ سے نہ تھا بلکہ ان کا کہنا تھا کہ آزادی کے پروانوں کے ذریعہ بلاشبہ جیلیں بھری جا سکتی ہیں مگر اس طرح کارکنوں کی کمی بھی ہو جائے گی اور تنظیم کمزور پڑ سکتی ہے اور تحریک آزادی بھی دم توڑ دے گی — نیز مجاہدین آزادی کے لیے ضروری ہے کہ جذبہ کو قائم رکھنے کے لیے روز ہی کوئی نہ کوئی ایسا کام کیا جائے جس سے حکومت مشتعل ہو اور ملک و ملک کے باہر لوگوں کو معلوم ہوتا رہے کہ ہندوستانی ملک کی آزادی کے لیے کس قدر سرگرم ہیں۔ پھر بھی حکم ملنے پر حکیم صاحب نے گھنٹہ گھر چاندنی چوک میں ۴۲ء میں ہی گرفتاری دی۔

حکیم صاحب مرحوم ۵۰ء میں کاونسلر منتخب ہوئے اور مسلسل تین مرتبہ اپنے حریف کو شکست فاش دی۔ یہ علاقہ کے عوام کے زبردست دباؤ کی وجہ سے ہوا ورنہ وہ خود نہ کوئی الیکشن لڑنا چاہتے تھے

اور نہ کسی اعزاز کے خواہاں۔

میں نے انھیں قریب سے ۴۷ء کے مصائب میں دیکھا اور پھر انتقال تک طویل عرصے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اُس دورِ ابتلا میں علاقہ پل بنگش پر واقع کانگریس اور جمعیتہ علما کے دفاتر میں گوپی ناتھ امن صاحب، مسز ارونا آصف علی، دادا الطاف الرحمٰن صاحب مس سبھدرا وتہ (جو اب مسز سبھدرا جوشی ہیں)، مسٹر سکندر بخت حکیم محمد اسماعیل صاحب و حافظ محمد عثمان صاحب وغیرہ وغیرہ موجود ہوتے تھے۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ کسی مسئلہ پر بحث ہورہی ہے دلائل پیش ہورہے ہیں، کافی گرما گرمی کے بعد مسئلہ کا حل نظر نہیں آتا۔ حکیم صاحب خاموش گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے ہیں، محسوس ہوتا ہے کہ اپنے ہی خیالات میں گم ہیں یا نیند کا خمار ہے یا شعر کی آمد ہے اچانک سنبھل کر بیٹھے اور ایک دو جملوں میں مسئلہ کا حل پیش کرکے پھر لاتعلق ہو گئے۔

قطب روڈ کے چوراہے سے مٹھائی کے پل کی طرف سو قدم چل کر ایک سنگھاڑہ بنا ہوا ملے گا وہاں سے تیلی واڑہ کی طرف گھوم کر پورا محلہ پار کرکے چوک محلہ کشن گنج آجاتا ہے۔ اسی چوک پر حکیم صاحب کا مطب تھا جو کچھ تو تحریک آزادی کی نذر ہوا اور بچا کھچا ۴۷ء کے فساد کے مارے انسانوں کی خدمت میں ختم ہوگیا۔

الامان والحفیظ وہ دور ابتلا! ہر شخص پریشان و ہراساں، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن — مجھے یاد آرہا ہے کہ محلہ کشن گنج عزیز گنج فیاض گنج نواب گنج اسلام گنج، نیا محلہ اور بیری والا باغ کے عوام ۴۷ء کے فسادات سے بدحواس ہوکر راہ فرار چاہتے تھے

Marfat.com

موجودہ آزاد مارکیٹ جو اُس وقت نہر سعادت خاں کو بند کر کے ایک میدان بنا دی گئی تھی وہاں بے سروسامانی کے عالم میں آ پڑے۔ حکیم خلیل صاحب نے ہمدردی، محبت اور غصہ ہر حربے کو استعمال کیا مگر جو اکھڑ چکے تھے وہ نہ مانے۔ ان کی فراست کی داد دیجیے کہ جس زبان کو وہ بے سروسامان لوگ سمجھ سکتے تھے وہ استعمال کی۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم کے پاس دوڑے اور انھیں لے کر مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی جی کو مائل کیا، ایک جلسہ ہوا جس میں تینوں لیڈروں نے تقریریں کیں اور کہا کہ ایک دو دن وہ اور حالات کے سدھرنے کا انتظار کر لیں اگر ہمارے انتظامات سے مطمئن نہ ہوں تو جہاں چاہے چلے جائیں۔ گاندھی جی اور مولانا آزاد وہ کام کر گئے جو حکیم خلیل صاحب چاہتے تھے۔ واقعی حالات سدھرتے چلے گئے اور علاقہ پھر آباد ہو گیا۔

حکیم صاحب فرماتے تھے کہ دلی میں فرقہ پرستی نے ۴۲ء کے بعد پر پُرزے نکالے۔ اس سے پہلے یہ عالم تھا کہ ہندو مسلمان شیر و شکر تھے۔ ان آنکھوں نے وہ سماں بھی دیکھا کہ ہندو ارتھی کے ساتھ مسلمان اور مسلم میت کے ساتھ ہندو بڑی تعداد میں ہوتے تھے۔ جامع مسجد میں سوامی شردھانند کی تقریریں ہوتی تھیں۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے کا جھوٹا پانی پی لیتے تھے۔

۱۹۱۹ء میں جمعیتہ علماء ہند کا اجلاس باڑہ ہندو راؤ میں ہوا۔ صدارت حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کو کرنی تھی وہ نہ آ سکے تو مفتی اعظم محمد کفایت اللہ صاحب مرحوم نے صدارت فرمائی یہ اجلاس تین دن چلا۔ برطانوی سامراجی حکومت کے خلاف اس

Marfat.com

جلسے میں کئی تجویزیں پاس کی گئیں جس میں برطانوی حکومت سے عدم تعاون کی اپیل بھی شامل تھی۔ حکومت نے ان تجاویز کو ضبط کر لیا۔ اس اپیل کی ہزاروں کاپیاں شائع ہوئیں اور گھر گھر ہر خاص و عام تک پہونچانے کی ذمہ داری جن لوگوں نے لی ان میں نمایاں شخصیت حکیم خلیل الرحمٰن صاحب کی تھی۔

حکیم صاحب مرحوم کی شخصیت پر قلم اٹھانے کے لیے ان گنت صفحات اور وقت درکار ہے۔ یہاں میں نے کوشش کی ہے کہ دریا کو کوزے میں اتار سکوں مگر میں اپنی ناکامی کا اعتراف خود کرتا ہوں مگر سمجھتا ہوں کہ شاید مورخین کو متوجہ کرنے میں مجھے کسی قدر کامیابی ملے۔

Marfat.com

خمار دہلوی

پنڈت دینا ناتھ زُتشی — ایک عظیم فنکار

پنڈت دینا ناتھ زُتشی میرے سب سے بڑے بھائی اور قادر الکلام علامہ پنڈت تربھون ناتھ زُتشی۔ زار دہلوی کے خلفِ اکبر تھے۔ ان کی پیدائش ستمبر ۱۹۰۱ء میں بمقام لاہور میں ہوئی۔ وہیں اُن کی پرورش، تعلیم و تربیت ہوئی۔ وہیں پنجاب سرکار میں سلسلۂ ملازمت شروع ہوا اور وہیں وہ ادبی، فنی، ثقافتی اور سماجی زندگی میں پروان چڑھے۔

پیش ازاں کہ میں اُن کے بارے میں کچھ وضاحت سے بیان کروں بہتر ہو گا کہ اپنے خاندان کے متعلق مختصراً کچھ عرض کروں چونکہ اس پس منظر میں ہی ان کی زندگی کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ہمارا خاندان شمالی ہندوستان کے سربرآوردہ کشمیری برہمن علما اور اہلِ کمال کا خاندان ہے جو تقریباً تین ساڑھے تین سو سال قبل دورانِ سلطنت مغلیہ کشمیر سے ہجرت کر کے دہلی میں آباد ہوا۔ ہمارے آبا و اجداد اعلیٰ منصبوں پر مامور رہے اور انھیں راجہ، دیوان اور رائے دایاں جیسے خطابات سے سرفراز کیا گیا۔ ان میں سے اکثر علاوہ اور ذمہ داریوں کے شہزادگان کے اتالیق بھی رہے۔ دیوان شنکر ناتھ جو میر پنجہ کش کے ہم عصر اور ٹکر کے خوش نویس تھے، ہمارے ہی بزرگوں میں تھے۔

Marfat.com

انگریزی دور حکومت میں بھی ہمارے بزرگ اعلیٰ عہدوں پر سرفراز رہے ان بزرگوں نے جملہ علوم وفنون میں نیز سنسکرت، عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبانوں میں ید طولےٰ حاصل کیا اور اپنا ایک مقام منوایا۔

غدر کے بعد انگریز حکومت نے دِلّی اور دِلّی والوں سے بدلہ لینے کے لیے نیز اس کی مرکزی حیثیت کو نابود کرنے کی غرض سے اس کو صوبۂ پنجاب کی ایک ڈویژن بنادیا جس کا ہیڈ کوارٹر لاہور قرار پایا۔ اسی وجہ سے دِلّی کے اکثر شرفا کے خاندان، علماء، ادیب تاجر اور ملازمانِ سرکار شدہ شدہ لاہور منتقل ہوتے رہے اور وہاں بستے گئے۔ بہر نہج دلّی سے اپنا تعلق کبھی قطع نہیں کیا اور برابر یہاں آتے جاتے رہے۔ اکثر صاحبانِ حیثیت نے لاہور میں جائدادیں بھی بنالیں کیونکہ کرائے کے مکان میں رہنا ان کی شان کے خلاف تھا۔ دلّی میں تو خیر پہلے ہی ٹھکانہ موجود تھا بلکہ خاندان کے اکثر فرد تو مستقل دلّی میں ہی رہتے تھے۔ اس طرح ان کی جڑیں دلّی میں ہی رہیں اور شاخیں لاہور تک جا پھیلیں۔

ہمارے دادا پنڈت منوہر ناتھ زُتشی اسی سلسلۂ ملازمت میں دِلّی سے لاہور گئے۔ وہ پبلک ورکس سیکریٹریٹ میں اکاؤنٹس آفیسر تھے۔ ہمارے دادا تین بھائی تھے منوہر ناتھ، پرتھوی ناتھ اور جانکی ناتھ۔ پنڈت پرتھوی ناتھ کی اہلیہ کا انتقال جوانی میں ہی ہوگیا۔ انھوں نے دوسری شادی نہیں کی اور اپنے برادر زادے یعنی ہمارے والد پنڈت تربھون ناتھ کو گود لے لیا۔ سلسلۂ تعلیم ختم ہونے کے بعد والد صاحب اور چچا رائے بہادر اونکار ناتھ زُتشی نے بھی لاہور میں ہی سرکاری ملازمت اختیار کی۔ اس طرح ہمارے خاندان کا قیام فی الحال مستقل طور پر لاہور میں ہوگیا جہاں انارکلی بازار کے شروع میں میڈیکل کالج کے سامنے محلہ بانس منڈی میں ایک بڑا رہائشی مکان خرید کر سکونت اختیار کی۔

ہمارے والد پنڈت تربھون ناتھ زتشی۔ زار دہلوی کی دو شادیاں ہوئی

Marfat.com

تھیں۔ پہلی بیوی سے پنڈت دینا ناتھ زتشی پیدا ہوئے۔ ان کے ایام طفولیت میں ہی ماں کا انتقال ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد والد کی دوسری شادی ہوئی۔ دوسری بیوی کے بطن سے ہم باقی بھائی بہن ہیں۔ یہاں یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ ہم بھائی بہنوں میں کبھی کوئی سگے سوتیلے کا فرق نہیں تھا۔ ہم سب دینا ناتھ جی سے بے حد پیار کرتے تھے اور ان کی بزرگی کا احترام بھی۔

پنڈت دینا ناتھ زتشی ایک نہایت وجیہہ اور جاذب النظر شخصیت کے مالک تھے۔ لانبا قد، چوڑا چکلا سینہ، سڈول بھرا ہوا جسم، گورا چٹا رنگ۔ نہایت ذہین، خوش رُو، خوش خُو، خوش پوش، خوش گو، خوش مزاج، وسیع المشرب، فراخدل، بذلہ سنج، لطیفہ گو، خوش مذاق، پرخلوص، ملنسار، ادب دوست اور اہل کمال کی قدر کرنے والے انسان تھے اور سونے پر سہاگہ یہ کہ وہ خود ایک صفِ اول کے فن کار تھے۔ یہ کہنا قطعی غلط نہ ہوگا کہ وہ اپنے وقت کے نکیلے، سجیلے، رنگین مزاج نوجوانوں میں گنے جاتے تھے اور ان کو Ladies Man کہا جاتا تھا جس کا ترجمہ دلبر دلبراں بیجا نہ ہوگا۔

۶ انگلیاں سر د اٹھاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں

پنڈت دینا ناتھ زتشی کی پرورش، تعلیم اور تربیت لاہور میں ہوئی۔ وہاں کے دیگر کشمیری برہمن گھرانوں اور دیگر شرفا (جن میں ہندو، مسلم گھرانے شامل ہیں) کے ہم عمر بچوں کے ساتھ بڑھے اور پڑھے۔

زمانۂ تعلیم سے ہی انھیں ڈرامہ سے خاص لگاؤ رہا گو موسیقی سے بھی دل چسپی تھی۔ گورنمنٹ کالج لاہور جو اس وقت اپنی مثال کا یکتا ادارہ تھا اور جہاں پنجاب کے صاحبِ حیثیت لوگوں کے لڑکے تعلیم پاتے تھے وہیں ان کی اعلا تعلیم ہوئی اور وہیں ان کا ڈرامہ کا شوق پروان چڑھا جو تا حیات قائم رہا۔ لاہور کی ادبی اور کلچرل زندگی میں ان کا منفرد مقام تھا بلکہ یہ کہیے کہ وہ اس کی روحِ رواں تھے۔ کوئی ادبی یا کلچرل اجتماع ہو یا محفل رقص و سرود

Marfat.com

پنڈت دینا ناتھ پیشہ رہتے تھے۔ ان کے حلقۂ احباب میں لاہور کے عمائد کے علاوہ رفیع پیر، غلام بھیک نارنگ، اے۔ ایس بخاری، ڈاکٹر تاثیر، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری اور پنڈت ہری چند اختر جیسے صاحبانِ کمال شامل تھے۔ انھوں نے ڈرامہ کے آرٹ کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اپنے وقت کے بہترین اداکاروں اور ہدایت کاروں میں شمار ہوتے تھے۔ ملک میں ریڈیو کا چلن ہونے کے بعد وہ لاہور اور دیگر ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہونے والے ڈراموں میں حصّہ لیتے رہے اور اس طرح ان کی آواز ملک کے طول و عرض میں ایک جانی پہچانی آواز بن گئی۔

پنڈت دینا ناتھ پنجاب گورنمنٹ کے پریس انفورمیشن بیورو میں بحثیت آرٹیکل رائٹر ملازم ہوئے اور تمام زمانۂ ملازمت اسی محکمہ میں گزار دیا جہاں سے وہ انفورمیشن آفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ مگر سلسلۂ ملازمت میں بھی ان کا یہ شوق جاری رہا اور لاہور ریڈیو اسٹیشن کے ڈراموں میں اداکاری کا حق ادا کرتے رہے جیسے جیسے ریڈیو اسٹیشن بڑھتے گئے وہاں بھی ان کو شرکت کے لیے بلایا جاتا رہا۔ تقسیم ملک کے بعد مشرقی پنجاب کی سرکار شملہ منتقل ہوگئی اور وہ بھی مع اہل و عیال وہاں چلے گئے۔ بعدازاں جب چندی گڑھ بننے پر پنجاب سرکار وہاں آگئی تو وہ بھی وہاں آگئے ملازمت سے سبکدوش ہونے تک وہیں قیام پذیر رہے۔

۱۹۵۶ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد پنڈت دینا ناتھ دِلّی آگئے اور بہم دیگر اہلِ خاندان کے ساتھ اپنے سیتا رام بازار والے آبائی مکان میں رہنے لگے۔ اب ملازمت کے جھنجھٹ سے رُستگاری کے بعد ان کا پورا وقت اپنے شوق میں صرف ہونے لگا۔ دِلّی ریڈیو اسٹیشن سے ان کے ڈرامے متواتر نشر ہوتے رہے اور مقبول خاص و عام ہوتے رہے۔ جب ملک میں پہلی بار ٹیلی ویژن کا انعقاد ہوا تو جملہ ریڈیو آرٹسٹوں کا امتحان ہوا کہ ان میں سے کون ٹیلی ویژن

Marfat.com

ہیں اداکاری کا اہل ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس ٹیسٹ کے بعد اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ سوائے پنڈت دینا ناتھ زتشی کے کوئی آرٹسٹ اس معیار پر پورا نہ اتر سکا۔ آپ اس سے ہی ان کے فنی منصب کا اندازہ لگائیے۔ جب تک تو لوگ محض ان کی آواز سے ہی آشنا تھے مگر اب ان کی صورت سے بھی شناسا ہو گئے۔ اس محاذ پر انھوں نے اتنی ترقی کی اور شہرت حاصل کی کہ اپنی عمر کے اواخر میں وہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے سب سے زیادہ معاوضہ پانے والے اداکار تھے اور ان کو Special Category میں شمار کیا جاتا تھا۔ یہاں بھی انھوں نے اپنا وقار قائم رکھا Station Director اور دیگر اہلکار نیز ساتھ کام کرنے والے آرٹسٹ سب ان کی عزت اور قدر کرتے تھے۔

باوجود اپنی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی مشغولیت اور مصروفیت کے انھوں نے اسٹیج کو خیرباد نہیں کہا بلکہ یہ کہیے کہ وہ اسٹیج کے رسیا تھے۔ انھیں بارہا فلموں میں کام کرنے کی پیش کش کی گئی مگر وہ اس طرف رجوع نہ ہوتے۔ ہاں کسی خاص زور سے مجبور ہو کر انھوں نے بلراج ساہنی کے ساتھ "گرم ہوا" نامی فلم میں کام کیا اور وہاں بھی ان کی اداکاری کو بہت سراہا گیا۔ وہ برابر اسٹیج کے ڈراموں میں اداکاری کرتے رہے اور ہدایت کاری بھی۔ انھوں نے ڈرامہ نگاری کا حق ادا کیا۔ ان کے لکھے ہوئے ڈراموں میں "یاسمین" بہت مشہور و معروف ڈرامہ ہے جس میں انھوں نے اداکاری اور ہدایت کاری دونوں کام سرانجام دیے۔

دلّی آنے کے کچھ برس بعد ان کی شریک حیات کا ساتھ چھوٹ گیا اور وہ اپنے صاحبزادگان کے ہمراہ رہنے لگے۔ ان کی اولاد میں دو لڑکے ہیں، نریندر ناتھ اور مہندر ناتھ۔ بڑے صاحبزادے نریندر ناتھ ہندوستان پیٹرولیم کمپنی میں ملازم ہیں اور آج کل بمبئی میں بہ سلسلۂ ملازمت قیام پذیر ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے ایک ٹریول ایجنسی میں کام کرتے ہیں اور یہیں دلّی میں گرین پارک میں مقیم ہیں۔

آخر میں صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ باوصف اس کے کہ پنڈت دینا ناتھ لاہور میں

Marfat.com

پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی نیز ملازمت کا بیشتر زمانہ گزارا مگر ان کی بول چال، لب و لہجہ، لباس، نشست و برخاست، خورد و نوش اور طرزِ زندگی سے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دلّی والے نہیں ہیں۔ اپنے بزرگوں کے فیض سے دلّی کا رنگ اس قدر رگ و پے میں پیوست تھا کہ ایک عمر پنجاب میں گزارنے کے باوجود وہ دلّی والے ہی رہے۔ وضعداری کا یہ عالم تھا کہ عمر بھر مغربی لباس زیب تن نہیں کیا اور اچکن، پاجامے میں گذار دی۔

افسوس کہ جب پنڈت دینا ناتھ کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا ان کی صحت نے جواب دے دیا اور وہ بعارضہ Lung Cancer اکتوبر ۱۹۷۷ء میں ۷۶ سال کی عمر میں اس دنیا سے راہئ ملک عدم ہوئے۔ ان کے انتقال پُر ملال پر کُل جہان ڈرامہ سوگوار ہو گیا۔ ٹیلی ویژن اور آل انڈیا ریڈیو سے ان کی یاد میں خصوصی پروگرام نشر کیے گئے اور اب تک ان کے احباب اور مدّاح ان کو یاد کرتے ہیں۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

چند قطعات تعزیت ملاحظہ فرمایئے جو ان کی رحلت پر نظم کیے گئے تھے۔

۱ عرفِ زنتشی تھا نام دینا ناتھ — چل دیے ہم سبھی کو کر کے اناتھ
خارؔ ہم کو یقین ہے جنت میں — ان کو لیں گے فرشتے ہاتھوں ہاتھ

۲ اک بزرگِ شفیق تھا نہ رہا — وہ ہمارا رفیق تھا نہ رہا
مختصر یہ کہ مہر و الفت کا — ایک بحرِ عمیق تھا نہ رہا

۳ بے بدل، بے مثل، واحد بے گماں — تھا اداکاروں میں میرِ کارواں
خارؔ بے شک وہ گل بے خار تھا — ہو گیا جو زینتِ باغِ جناں

بندۂ احقر
خارؔ دہلوی

معین اعجاز

راجیندر منچندا بانی

ہم نے اچھے اچھے کج کُلاہ اور خونخوار قسم کے شاعروں کو دیکھا ہے کہ وہ کسی کی زبان سے اپنا شعر سن کر موم کی طرح پگھلنے لگتے ہیں۔ اور جب معاملہ بانی جیسے شریف اور نازک مزاج شاعر کا ہو تو آپ خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ کیا صورتِ حال ہوتی ہو گی! چنانچہ تھیٹر کمیونیکیشن بلڈنگ والے مرحوم کافی ہاؤس میں جب میں پہلی بار بانی صاحب سے ملا اور ان کے سامنے یہ شعر پڑھا۔

میری صدا نہ سہی، ہاں مرا لہو نہ سہی
یہ موج موج اچھلتا ہوا سا کچھ تو ہے!

تو اُن کے چہرے پر ایک ایسی پُرکشش مسکراہٹ رقص کرنے لگی جیسی کسی ایم۔ اے پاس بیکار نوجوان کے چہرے پر اُس وقت نظر آتی ہے جب برسوں کی دوڑ دھوپ کے بعد اسے اچانک اور غیر متوقع طور پر اپوائنٹمنٹ لیٹر مل جاتا ہے۔ لیکن یہ بتا دوں کہ میں نے کوئی ریاکاری نہیں کی تھی بلکہ واقعی اُن کا یہ شعر مجھے پسند تھا۔ اُن کا پہلا مجموعہ "حرفِ معتبر" اُسی زمانے میں شائع ہوا تھا اور اُس میں یہ شعر بھی شامل تھا۔

Marfat.com

یہ ۱۹۶۷ء کے اواخر کی بات ہے میں سنٹرل ہندی ڈائرکٹوریٹ میں اردو ریسرچ آفیسر کی پوسٹ کے لیے انٹرویو کی غرض سے دلی آیا تھا۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ مذکورہ محکمے میں ایک یا دو انار کے لیے بہت سے بیمار آتے ہوئے تھے جن میں کچھ ڈاکٹر بھی تھے۔ اُنھیں میں ایک ڈاکٹر صلاح الدین بھی تھے یہیں اُن سے میری دوستی ہوئی۔ انھوں نے کئی مقامات کی سیر کرائی اور آخر میں کافی ہاؤس لے گئے یہ کہہ کر کہ یہاں شام کے وقت بہت سے شاعر اور ادیب جمع ہوتے ہیں۔ اُسی دن بانی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں اُن کا مدّاح تھا۔ اکثر رسالوں میں اُن کا کلام پڑھا کرتا تھا۔ بہرحال "فیس کی آبرو کا پاس" کرتے ہوئے سنٹرل ہندی ڈائرکٹوریٹ کے انٹرویو میں' میں اور ڈاکٹر صلاح الدین دونوں بحسن و خوبی ناکام ہوئے تھے۔ اور چند ہی روز بعد میں دلّی سے واپس چلا گیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد ریڈیو کی ملازمت کے سلسلے میں۔ میں اب باضابطہ طور پر دلّی آ گیا۔ بانی صاحب سے میری دوسری ملاقات "تحریک" کے دفتر میں ہوئی جو دریا گنج میں واقع تھا یاد رہے کہ بانی ہی کی طرح رسالہ "تحریک" بھی داغِ مفارقت دے چکا ہے۔

دلّی میں بانی صاحب سے اکثر ملاقاتیں ہوتیں۔ کبھی کافی ہاؤس میں اور کبھی مخصوص ادبی جلسوں میں۔ میں انھیں بانی بھائی کہا کرتا تھا اور وہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی اور عزیز سمجھتے تھے۔ زندگی کے بعض ملاقات میں وہ بلا شبہ انتہائی بے نیاز تھے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اقتصادیات جیسے Subject میں ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد وہ صرف اسکول ٹیچر بن کر زندگی نہ گذارتے بلکہ بہت کچھ ہو سکتے تھے۔ لیکن اپنی شاعری کے تعلق سے وہ کچھ زیادہ بے نیاز نہیں تھے۔ ایک بار کافی ہاؤس میں

Marfat.com

انھوں نے اپنے دورۂ جموں کی بات بہت تفصیل سے سنائی۔ اس گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ جموں کے تمام نئے شاعروں پر بانی اور صرف بانی کا اثر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے بعض ہم عصر شاعروں کی تعریف کرنے میں بھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے اور یہ چیز کم از کم شاعروں کے قبیلے میں بڑی حد تک نایاب ہے۔ یہاں مجھے بے ساختہ یوسف ناظم کا ایک جملہ یاد آتا ہے جو انھوں نے حسن نعیم کے بارے میں کہا ہے۔ وہ جملہ یہ ہے کہ حسن نعیم غالب اور میر کو اس لیے بڑا شاعر مانتے ہیں کہ یہ شعراء اُن کے ہم عصر نہیں ہیں۔ بانی کی شخصیت کا یہ پہلو بہت دلنواز تھا۔ وہ اپنے جن ہم عصر شعراء کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے اُن میں مرحوم خلیل الرحمٰن اعظمی کے علاوہ مرحوم زیب غوری اور حکیم منظور کے نام شامل ہیں اور بھی شعراء اُن کی فہرست میں رہے ہوں گے لیکن میں نے ان کی زبان سے زیب غوری اور حکیم منظور کا ذکر بارہا سنا تھا۔ اس صورتِ حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے ایک بار شرارت بھی سوجھی تھی۔ یہ ۱۹۷۸ء کے اوائل کی بات ہے۔ میرے ریڈیو کے ایک دوست اور افسانہ نگار انیس رفیع ایک دن زیب غوری کے ساتھ دلی ریڈیو اسٹیشن تشریف لائے۔ ہم تینوں چائے پینے کی غرض سے Air Canteen میں گئے۔ وہیں زیب غوری صاحب سے کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ وہ یقیناً ایک اچھے شاعر تھے اور اپنی شاعرانہ خصوصیت سے اکثر اپنے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو آگاہ بھی کیا کرتے تھے۔ سو اُس دن بھی صورت حال کچھ ایسی ہی تھی۔ میں نے پوچھا "دلی میں آپ کب تک قیام کریں گے؟" انھوں نے فوراً جیب سے ٹکٹ نکال کر دکھایا اور کہا کہ میں آج ہی شام کانپور واپس جا رہا ہوں۔ یعنی رکنے کی گنجائش نہیں۔ پھر میں نے شرارتاً کہا "آپ اتنے اچھے شاعر ہیں اسی لیے تو ایک روز بانی صاحب کافی

ہاؤس میں لوگوں سے لڑ پڑے۔ کہہ رہے تھے زیب سے اچھا کوئی شاعر اس وقت ہندوستان میں نہیں ہے"۔ یہ سننا تھا کہ زیب غوری بچوں کی طرح کھل اٹھے اور بولے "ہاں ہاں بتاؤ۔ پوری بات بتاؤ کیا ہوا تھا؟" میں نے نمک مرچ کی آمیزش کے ساتھ پھر وہی بات کہی یعنی وہ "آپ کے سوا کسی کو شاعر ہی نہیں مانتے"۔

میرا یہ نفسیاتی تیر شاید ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ کیونکہ دوسرے دن وہ پھر نظر آئے۔ میں نے کہا "جناب آپ تو جانے والے تھے!" انھوں نے کہا "یار ٹکٹ واپس کرنا پڑا۔ بانی سے ملنا ضروری تھا لہٰذا شام کو اُن کے گھر چلا گیا۔ تمہارا ذکر دیر تک رہا۔ وہ تمہیں بہت چاہتے ہیں"۔ افسوس زیب غوری بھی اِس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ وہ بھی غریب الوطنی کے عالم میں!

بانی مزاجاً ایک شریف آدمی تھے۔ ایک بار راجندر نگر میں ایک مخصوص نشست میں بانی بھی شریک تھے اس نشست کا اہتمام کرشن موہن صاحب کے کسی مداح نے کیا تھا۔ نشست میں موجود تقریباً تمام شعرا نے اپنا کلام سنایا۔ بانی نے جو غزل سنائی اُس کا یہ شعر بہت پسند کیا گیا۔

راہ آساں دیکھ کر سب خوش تھے پھر میں نے کہا
سوچ لیجیے ایک اندازِ نظر میرا بھی ہے

جب وہ یہ غزل سنا چکے تو میں نے اُن سے ایک اور غزل کی فرمائش کی، یہ وہ غزل تھی جس کا یہ شعر مجھے بہت پسند تھا۔

کہاں گئے وہ نگر کشادہ
کھلی چھتیں اور گھر کشادہ

انھوں نے یہ غزل بھی سنائی۔ پھر بعد میں کہا "یہ شعر تمہاری کمزوری ہے"

میں نے کہا "ہاں بانی بھائی! ویسے تو آپ کے کئی شعر میری کمزوری ہیں"
انھوں نے بڑے پیار سے کہا۔ "یہ تمہاری محبت ہے!"
جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ بانی کے سامنے میں اُن کے شعر اُنھیں خوش کرنے کے لیے نہیں سناتا تھا بلکہ صحیح معنوں میں وہ میرے پسندیدہ شاعر تھے اُن کے شعروں کے اِس انتخاب نے مجھے اکثر رُسوا بلکہ ذلیل بھی کیا۔ خاص طور سے اُن دوستوں کے سامنے مجھے زیادہ رُسوا ہونا پڑا جو خود بھی شاعر ہیں۔ دو ایک شاعر دوست تو ایسے بھی تھے جنھوں نے اسی وجہ سے مجھ سے قطع تعلق کرلیا اور پھر اُس وقت تک مجھ سے بات نہیں کی جب تک کہ میں نے اُن کے اشعار پر جبراً و قہراً بے تحاشہ داد نہیں دے لی۔

ہمارے معاشرے میں بعض اوقات اچھی صورت ہی نہیں بلکہ اچھی سیرت اور اچھی شاعری بھی "بری شے" بن جایا کرتی ہے کیونکہ اِس کی پاداش میں متعلقہ شخص کو بے وجہ کی دشمنی اور نفرت کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ باؔنی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اُن کے بعض اشعار کا لوگوں نے خوب خوب مذاق اڑایا بلکہ بعض اشعار کی اِس انداز سے تشریح کی کہ، چودہ طبق روشن ہو گئے۔ کافی ہاؤس میں اکثر میں نے بعض دوستوں کو بانی اور اُن کی شاعری کو بُرا بھلا کہتے ہوئے دیکھا گویا اس کے علاوہ ان کے پاس گفتگو کا کوئی اور موضوع ہی نہیں ہوتا تھا۔

پھر کچھ دن بعد ایسا ہوا کہ تھیٹر کمیونیکیشن بلڈنگ کا کافی ہاؤس صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔ اہلِ جنوں کی محفلوں پر اِس کا بہت خراب اثر پڑا البتہ کچھ لوگ موہن سنگھ پیلس والے کافی ہاؤس میں بیٹھنے لگے۔ باؔنی بھی اکثر آتے۔ لیکن بدخواہ دوستوں کی وجہ سے کچھ دن بعد اُن کا آنا جانا بہت کم ہوگیا۔ اور پھر تو وہ بیمار ہی رہنے لگے۔ کافی دن بعد ایک روز غالب

اکیڈمی میں کسی ادبی جلسے میں ملے۔ میں نے پوچھا "بانی بھائی! آج کل آپ نظر کیوں نہیں آتے؟" انھوں نے کہا "طبیعت خراب رہتی ہے" لیکن میں کچھ زیادہ Serious نہیں ہوا کیونکہ اُس وقت تک وہ اتنے کمزور نہیں نظر آرہے تھے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں گٹھیا جیسی بیماری کو کوئی زیادہ مہلک بیماری نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ حالت نازک ہوتی گئی ایک روز اپنے شاعر دوست اقبال عمر کے ساتھ ان کے گھر جانا ہوا۔ وہ واقعی بہت کمزور ہو گئے تھے لیکن ہم دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ بہت جذباتی انداز میں بولے "تم لوگوں کو دیکھ کر گویا میری تکلیف دور ہو گئی۔" اقبال عمر نے اپنے ایک شعر میں اِس صورتِ حال کی عکاسی بھی کی تھی۔ اِس وقت وہ شعر مجھے یاد نہیں ہے۔

اس کے بعد بدقسمتی سے پھر بانی سے ملاقات نہ ہو سکی کئی بار پروگرام بنا لیکن کسی نہ کسی وجہ سے ٹلتا رہا۔ اور پھر ۱۱ر اکتوبر ۱۹۸۱ء کی رات کو وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ دلی کی ادبی دنیا کا ایک روشن چراغ بجھ گیا!

"خوش درخشید ولی شعلۂ مستعجل بود"

"دلّی تہذیب کی جنت ہے"، "دلی کئی بار لٹی اور کئی بار آباد ہوئی" یہ اور ایسے بہت سے جملے ہم اتنی بار سُن چکے ہیں کہ اب کچھ فرسودہ سے لگنے لگے ہیں۔ دلّی پر دلّی والوں کو بجا طور پر فخر کرنا چاہیئے لیکن مخصوص تاریخی اور تہذیبی اہمیت کے اعتبار سے یہ پورے ہندوستان کے لیے بھی باعثِ فخر ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو علامہ اقبال یہ شعر نہ کہتے۔

سوادِ رومتہ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے
وہی عبرت، وہی عظمت، وہی شانِ دلآویزی

Marfat.com

۱۹۶۷ء کے بعد دلی ایک نئے روپ میں سامنے آئی۔ نئی نئی بستیاں آباد ہوئیں۔ لاہور، پشاور، ملتان اور نہ جانے کہاں کہاں کا کارواں جمنا کے کنارے آکر اُترا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے الفاظ میں ”بانی نومبر ۱۹۳۲ء میں ملتان میں پیدا ہوئے اور ان لوگوں میں سے تھے جنھیں تقسیم کی موج بہا کر دہلی لے آئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ دہلی کی ادبی اور ثقافتی زندگی کے طوفان اور تہلکوں اور ولولہ خیزیوں میں بانی خوب شریک رہے۔“

بانی نے ۴۹ سال کی عمر پائی۔ اِن انچاس برسوں کے آخری ۳۳ یا ۳۴ سال دلّی میں گزرے۔ اُن کی شخصیت اور شاعری نے دلّی کی ادبی فضا پر گہرا نقش چھوڑا ہے۔ افسوس اِس بات کا ہے کہ تخلیق کار اور اس کے قاری یا سامع کے درمیان اکثر نقاد پولیس افسر کی مانند کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان ادبی پولیس افسران نے بہت سے تخلیق کاروں کا بیڑہ غرق کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اِس سے بھی زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ خود ایک تخلیق کار دوسرے تخلیق کار کو برداشت نہیں کر پاتا۔ بانی بھی ایک حد تک اِس بے توجہی کا شکار ہوتے۔

خیر بعض نقاد اپنی عادت اور پیشے سے مجبور ہوتے ہیں وہ لفظیات محاکات، صناعی، پیکر تراشی جیسے الفاظ اور اصطلاحات اور مغربی مصنفین کے حوالے سے نہ جانے کیا کیا کہتے رہتے ہیں۔ انھیں کہنے دیجیے۔ شعر یا کسی تخلیق میں دل کو چھو لینے والی بات ہوتی ہے تو وہ خود راستہ بناتی ہوئی تخلیق کار سے قاری یا سامع تک پہنچ جاتی ہے۔ بقول بشیر بدر

پتھر کے جگر والو غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنالے گا بہتا ہوا پانی ہے!

مجیب الاسلام

مولانا زبیر قریشی

ایک چینی مقولہ ہے کہ اگر تمھیں ایک سال کا انتظام کرنا ہے تو گیہوں بوؤ اگر دس سال کا تو درخت بوؤ اور اگر نسلوں کا بندوبست کرنا ہے تو انسان بوؤ۔ یہ مقولہ دتی اور دلّی والوں پر صادق آتا ہے کیونکہ اس نے انسان ہی بوئے ہیں قصور تو کاٹنے والوں کا ہے نہ کہ کٹنے والوں کا۔ ایسے ہی انسانوں میں راقم سات سال کی عمر سے ایک شخص کو دیکھتا چلا آرہا تھا۔ دراز قد، بھاری بھرکم جسم، اجلا رنگ، بڑی بڑی گول بولتی آنکھیں ان پر چشمہ چڑھا ہوا، سفید ترشی ہوئی ذرا بڑی ڈاڑھی، شرعی پاجامہ، صوفیانہ رنگ کی ٹوپی اور شیروانی۔ نہایت اجلا لباس جس پر دھبہ یا سلوٹ نہیں ہر ادا سے تہذیب و شائستگی، رعب دوعب، خود اعتمادی و خود داری نمایاں ہر چیز سے نستعلیقی و نفاست عیاں۔ بعض شخصیتیں ذہن میں ایسی رچی بسی ہوتی ہیں کہ ان سے ملنا ان کا دیکھنا اور سننا زندگی کا ایک معمول بن جاتا ہے اور یہ پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ پہلی مرتبہ اُن کو کب اور کہاں دیکھا تھا۔ میں اپنے والد محترم حافظ عبدالوحید خاں (خلد آشیانی) کے ساتھ جا رہا ہوتا تو اکثر بازار میں اُن سے والد کی علیک سلیک ہوتی میرے والد نہایت ادب کے ساتھ کھڑے ہوتے اور یہ شخص

Marfat.com

مختلف افراد کی خیریت معلوم کر کے چلے جاتے۔ جب میرے شعور نے پر و بال نکالنے شروع کیے اور کچھ اچھا بُرا سمجھنے لگا تو پتہ چلا کہ جس شخص کی چھت پر ہم گھنٹوں اُچھل کود کرتے ہیں یہ مولانا محمد زبیر قریشی ہیں جن کے دادا حضرت صوفی قادری منشی پیر بخش آج سے تقریباً تین سو برس قبل دہلی میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ یہ کٹر مولوی خاندان تھا جو بنت (بلند شہر سے قریب) گاؤں سے دہلی آیا تھا۔ ان تین سو برسوں میں سے ڈھائی سو برس کی علمی و دینی فضیلت اور روایت مولانا کو اپنے اجداد سے ورثہ میں ملی تھی۔ نسب نامہ :

مولانا محمد زبیر قریشی ابن حضرت العلّامہ مولانا مولوی حافظ محمد اسحاق دہلوی خلف آلصدق حضرت شیخ الوقت مولانا محمد حسین فقیر دہلوی۔ ابن ناظم و ناشر مولوی منشی محمد اسماعیل ذبیح دہلوی نقشبندی چشتی۔ ابن صوفی قادری منشی پیر بخش دہلوی۔ ابن منشی محمد انور شہید سامانہ۔ ابن منشی محمد احمد ابن محمد حیدر۔ ابن محمد معظم ابن محمد اکرم ابن محمد طاہر ابن محمد باقر ابن محمد ناظر ابن محمد قاسم ابن محمد ہاشم محمد حیدر ابن محمد محسن ابن زاہد ابن مہدی ابوالحسن ابن ابولطیّب ابن عبدالمالک ابن ابوالقاسم ابن عبدالرحمٰن۔ ابن احمد ابوالحسن ابن یونس ابن ابوالاعلیٰ ابن موسیٰ ابن فصص ابن حبان المعری الیمینی غفراللّٰہم اجمعین۔

مولانا زبیر قریشی کے والد حضرت مولانا مولوی حافظ محمد اسحاق دہلوی نے اپنے بڑے بھائی حضرت مولانا مولوی منشی محمد ابراہیم کے ساتھ کٹرہ گوکل شاہ میں مسجد اور مدرسہ حسینیہ حنفیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس مسجد اور مدرسہ قائم ہونے کی وجہ بھی سن لیجیے۔ آپ نے دلّی والوں کی سیرت اور شخصیت سے متعلق بہت سی باتیں سُنی ہیں۔ جہاں دہلوی حضرات قول اور فعل کے کھرے اترتے ہیں، زندگی سے گہرا لگاؤ، بے پناہ اطمینان کے حامل، غلط بات نہ سنتے ہیں اور نہ ہی برداشت کرتے ہیں۔ مدرسہ حسین بخش (واقع گلی مدرسہ حسین بخش مٹیا محل) سے کون واقف

Marfat.com

نہیں یہاں عرصۂ دراز سے خصوصی بیان کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔ کٹڑہ گوکل شاہ کے مدرسے اور مسجد سے قبل دہلی والے مدرسہ حسین بخش کی مسجد میں بیان سنتے تھے۔ ایک جمعہ کو حضرت مولانا اسحاق دہلوی اجتماع میں تشریف فرما تھے کہ واعظ سے کسی دینی مسئلہ پر اختلاف ہوگیا۔ حضرت مولانا اسحاق دہلوی کے معتقدین نے آستینیں چڑھالیں اور سب نے طے کیا کہ آیندہ اس مسجد میں قدم نہ رکھیں گے اپنی مسجد الگ تعمیر کریں گے۔ ایک جمعہ کو یہ ہنگامہ ہوا دوسرے جمعہ کو کٹڑہ گوکل شاہ میں مسجد اور مدرسہ قائم ہوگیا جہاں حضرت مولانا محمد اسحاق تنتیس (۳۳) برس تک بیان فرماتے رہے۔ آپ نے ۱۹۰۹ء میں ایک مذہبی رسالہ الوعظ جاری کیا جو تیس ۳۰ برس تک پابندی سے نکلتا رہا۔ حضرت مولانا اسحاق دہلوی ایک باعمل عالم شاعر حقیقت بیاں، جید واعظ اور اٹھارہ کتابوں کے مصنف مولف و ناشر تھے۔ داستانِ یوسف، بستانِ اولیا، معراجِ رسول، ملت ابراہیم، جلوۂ طور، فسانۂ آدم، معجزاتِ مسیح، روز محشر، تاجِ سلیمانی، ماہِ صیام، شہادت حسینؑ، قصۂ اصحاب کہف، موت کا منظر، قصۂ یونس، طوفانِ نوحؑ، صبر ایوبؑ، میلاد و وفات، قصۂ جرجیس، ان کتابوں میں حضرت مولانا اسحاق دہلوی نے اُن قصوں کو نظم و نثر میں مرتب کیا ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ ان کے علاوہ جو کتابیں لکھیں اور شائع نہ ہوسکیں ان کی تعداد بتیس (۳۲) کے قریب ہے۔ دولتِ اخلاق، نیکی بدی، جمعہ کی نماز، خوابِ مسلم، دعائے مقبول، دعوت نسواں، رسم و رواج، نمازِ مسلم، اخبار صادقہ، رضوانِ مولا، عشق الٰہی، نعمتِ اخلاص، اکلِ حلال، نکاح مسلم، ثمرہ محبت، اسمِ اعظم، بہارِ علم، تین نصیحتیں، سخاوت و بخل، فکرِ عقبیٰ، ہمارا فوٹو، مقام عبرت، پیام عبرت، مرقعۂ عبرت، اور دیوان، اپنی عمر کے آخری ایام میں حضرت مولانا اسحاق دہلوی سیرتِ مصطفیٰ لکھ رہے تھے کہ ۱۹۵۲ء میں اپنے حقیقی مالک سے جا ملے۔

حضرت مولانا اسحاق دہلوی نے دو شادیاں کیں۔ پہلی زوجہ قادری بیگم کے

بطن سے دو بچے خدیجہ بیگم اور عبدالقیوم (محمد زبیر قریشی) ہوئے۔ قادری بیگم کے انتقال کے بعد دوسری شادی نوشابہ بیگم سے ہوئی اِن سے چار بچے ہوئے۔ محمد عرفان ہاجرہ بیگم، میمونہ بیگم اور انوری بیگم۔ آج صرف میمونہ بیگم اور ہاجرہ بیگم بقیدِ حیات ہیں۔

مولانا محمد زبیر قریشی کی ولادت ۲۹ر فروری ۱۹۰۴ء کو مکان نمبر ۱۰۰ گلی مولوی محمد اسحاق اِن کے آبائی مکان میں ہوئی۔ ان کا نام عبدالقیوم رکھا گیا تھا۔ بچپن میں یہ بہت علیل رہتے تھے۔ ایک رات اِن کے والد حضرت مولانا اسحاق دہلوی کو بشارت ہوئی کہ عبدالقیوم کا نام تبدیل کر دیں تو یہ صحتیاب رہیں گے۔ والد ماجد نے کسی عالمِ دین اور تاریخی اعداد کے مطابق ان کا نام محمد زبیر رکھ دیا۔ اس طرح محمد زبیر بارہ[۱۲] برس کی عمر تک عبدالقیوم کے نام سے پُکارے جاتے تھے، یہ نام کچھ ضرورت سے زیادہ ہی راس آیا۔ ابتدائی مذہبی تعلیم قرآن ختم ہونے تک گھر میں ہوئی اُس کے بعد عقیدت اور روایت کے مطابق دینیات۔ فقہ، حدیث اور شرع والد اور تایا (مولانا عبدالرحمن راسخ دہلوی) سے مدرسہ حسینیہ میں ہی حاصل کی۔ گھر کا ماحول کلیتاً مذہبی تھا والد اور تایا دنیاوی علوم کے زبردست خلاف تھے۔ تایا راسخ دہلوی اکثر یہ شعر پڑھا کرتے۔

؎ تجھ کو انگریزی کے پڑھنے سے بچائے قرآن
ختم قرآن مبارک ہو، الٰہی آمین

شرع کے مطابق معمولی رہن سہن تھا اور اِسی کے مطابق زندگی کو خدا کی امانت سمجھ کر گزارنا اُن کا نصب العین جس میں دنیاداری سے ذرہ برابر بھی لگاؤ نہیں تھا۔ ایسے سخت ترین مذہبی ماحول میں جہاں بندہ اپنے نفس سے گزر کر بھی خدا کی عظمت و جلال کا سکہ اپنے قلب میں جمائے ہوئے تھے چودہ[۱۴] سال تک محمد زبیر کی پرورش ہوئی لیکن مولانا زبیر کے لیے اُن کے اسلاف کا

Marfat.com

نقشِ قدم اور نمونۂ عمل کافی نہیں تھا کیونکہ دنیا میں ہر وجودی اصل کے ساتھ اس کی عدمی ضد بھی لگی ہوئی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے نور کے ساتھ ظلمت، آبادی کے ساتھ ویرانی، حیات کے ساتھ موت، عزت کے ساتھ ذلت، خیر کے ساتھ شر، اسلام کے ساتھ کفر اور دین کے ساتھ دنیا۔

پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آتے ہیں۔ مولانا زبیر کے خیالات بچپن ہی سے آزادانہ اور باغیانہ تھے۔ یہ دنیاوی علوم حاصل کرنے پہ بضد اور وہ اجازت دینے سے عاجز تھے۔ انگریزی راج تھا اور مولانا زبیر انگریزی زبان کی تحصیل کے لیے ہمہ تن کوشاں، ان کی ضد رنگ لائی اور خاندانی روایات کے برخلاف انھیں اینگلو عربک اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں سے مولانا زبیر نے ۲۸-۱۹۲۷ء میں میٹرک پاس کیا کہ حضرت مولانا سے رات دن اختلاف رہنے لگا۔ مولانا زبیر بلا کے ذہین تھے یہی مخالفت اور ذہانت انھیں St. Stephen's کالج لے گئی اور بی۔ اے۔ آنرز فلسفے میں داخل ہو گئے کالج کے ماحول نے مولانا کو پوری طرح اپنے رنگ میں رنگ لیا یہیں انھیں اپنا نام محمد زبیر ناکافی معلوم ہوا تو انھوں نے Third Man کی خواہش میں اپنے نام کے ساتھ قریشی کا بھی اضافہ کر لیا۔ مولانا پورے کالج میں قریشی کے نام سے بلائے جاتے تھے۔ کالج سے گھر واپس آتے تو والد مسجد میں چلنے کی ہدایت کرتے اور مولانا کبھی فٹبال کھیلنے اور کبھی گھوڑ سواری کے لیے نکل جاتے۔ علی الصبح گھر کے سب افراد نماز اور قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول ہوتے اور مولانا اگرسین کی باؤلی میں ہاتھ پاؤں مارتے۔ ایک طرف روحانی مسرت کے شیدائی دوسری طرف حرکت میں برکت کے متلاشی وعظ و نصیحت کو چھوڑ کر مولانا ننھے منھے معصوم پرندوں اور خونخوار جانوروں کا شکار کرتے۔ شکار کا شوق مولانا کو جنون کی حد تک تھا۔ والد اور تایا خدا کے گھر میں بیان کرنے میں قدرت صرف کرتے اور قریشی صاحب کالج میں شیکسپیئر کے ڈراموں کو اسٹیج کرنے میں مصروف ہوتے۔

Marfat.com

حضرت مولانا نے جب صاجزادے کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو ۱۹۲۹ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے وطن (ہاپڑ) میں ایک جاگیردار عالموں کے خاندان میں ان کی شادی طے کردی۔ اُمتل مبین جب ہاپڑ سے رخصت ہوکر دہلی آئیں تو چار مکان اور دو باغ بھی اپنے ساتھ جہیز میں لائیں۔ ۳۱-۱۹۳۲ء میں جب مولانا نے بی۔ اے۔ پاس کرلیا تو روزگار کی کوئی فکر دامن گیر نہیں ہوئی۔ اپنے ذاتی شوق کے لیے مولانا نے انگریزوں کو اردو پڑھانی شروع کردی۔ ان ہی دنوں پیکنگ کے ایک کالج نے مولانا کو درس وتدریس کے لیے اپنے ہاں بلانا چاہا تو انھوں نے جانے سے صاف انکار کردیا۔ ان کی خواہش تھی کہ دلّی کا بچہ بچہ تعلیم حاصل کرے اور وہ خود یہ خدمت انجام دیں۔ بولنے کا یہ شوق مولانا کو سب سے پہلے آل انڈیا ریڈیو لے گیا جہاں انھوں نے انگریزی عربی فارسی سے ترجمے کرنے اور خبریں پڑھنے کے ساتھ ساتھ سیاسی مبصر کی حیثیت سے دوسری جنگِ عظیم تک کام کیا۔ ریڈیو کے فارسی شعبہ میں مذہبی تبصرہ نگاری تو مولانا زندگی کے آخری حصّے تک کرتے رہے، ریڈیو پر انھیں Casual Artist کے طور پر بلایا جاتا تھا۔

۱۹۳۸ء میں اُمتل مبین (پہلی زوجہ) کے انتقال کے بعد مولانا کی دوسری شادی عائشہ بیگم سے ہوئی یہ گھاس کی منڈی دہلی میں رہنے والا وہ خاندان تھا جس سے مولانا کی رشتہ داری بھی تھی۔

۱۹۴۷ء کے اوائل میں اینگلو عربک اسکول نے مولانا کو خاص طور پر انگریزی درس وتدریس کے لیے مدعو کیا۔ مولانا کو پڑھانے میں ملکہ حاصل تھا اُن کے پڑھانے اور سمجھانے کے دل نشیں ڈھنگ نے نہ صرف طلبہ کو بلکہ وہاں کے تمام اساتذہ کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ مولانا اِس وقت تک پانچ زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ عربی فارسی اردو تو گھر کی دین تھی انگریزی زبان پر دسترس کالج کے زمانے میں حاصل ہوگئی تھی اور جرمن زبان انھوں نے ذاتی شوق سے بغیر کسی معلم کے

Marfat.com

آل انڈیا ریڈیو میں تبصروں کے دوران سیکھ لی تھی۔ اسکول اور کالج کے تمام طلبا اور اساتذہ میں مولانا اتنے مقبول ہوئے کہ احترام کے طور پر سب انھیں پروفیسر کہنے لگے۔ بیگ صاحب مرحوم سے اکثر ان کی چشمک رہتی لیکن وہ بھی مولانا کی عزت کیا کرتے تھے۔

مولانا اپنی زندگی کی ابتدائی پانچویں دھائی میں تھے کہ دلی پر ایسی بپتا پڑی جس نے میرؔ اور غالبؔ کے زمانے کی تباہی کو بھلا دیا۔ ستمبر ۱۹۴۷ء ستمگر کا مہینہ ثابت ہوا۔ دہلی میں بیرونِ فصیل کے کچھ علاقوں سے بے شمار بچے جوان بوڑھے مرد اور عورتیں برے حال برے حوال بھوک و پیاس سے دیوانے بھاگم بھاگ علاقہ جامع مسجد اور پرانے قلعے میں پناہ لے رہے تھے۔ اُن کی حالت یہ تھی کہ پرانے قلعے کے قریب مٹکے شاہ کے مزار سے مٹکے اٹھاتے اور جب راشن تقسیم ہوتا تو مٹکوں کو توڑ کر ان کے پیندوں میں چاول ابالتے مٹکوں کے باقی ٹکڑوں سے گلاس کٹورے کا کام لیتے۔ شیر خوار بچے بھوک سے بلبلاتے فاقہ حسرت اور بے بسی بڑوں کے چہروں سے ٹپکتی کیا بچہ کیا جوان کیا ادھیڑ اور کیا بوڑھا سب ایک ہی حمام میں تھے خدا کا قہر دیکھیے کہ بارش بھی اتنی موسلا دھار ہوئی کہ گلیوں کوچوں اور کیمپوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی بھر گیا کھلے آسمان کے نیچے پانی سے لبریز زمین پر انسانوں کا یہ جنگل جانوروں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا اور اپنے بزرگوں کو پکار رہا تھا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر پانچ روپے تولہ سونا بک رہا تھا۔ علاقہ کے بے شمار لوگ جہاں تک ممکن تھا ریلیف کا کام کر رہے تھے مولانا اپنے گھر سے مسجد تک آتے اور مسجد سے واپس گھر چلے جاتے اُن کے معمولات میں شاید کوئی فرق نہیں آیا۔

مولانا ۱۹۵۰ء تک اینگلو عربک سے وابستہ رہے۔ ۱۹۵۲ء سے مولانا کی زندگی کا نہایت اہم باب شروع ہوتا ہے۔ ۱۱ راپریل ۱۹۵۲ء کو ان کے والد حضرت مولانا اسحاق دہلوی نے بیاسی۸۲ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا جس

مکان اور ماحول میں انسان بچپن میں پرورش پاتا ہے اس کے در و دیوار کا اس کے دل و دماغ پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ حضرت مولانا کے انتقال کے بعد بیان کا وہ سلسلہ جو ان کے اجداد نے برسہا برس سے جاری کر رکھا تھا مولانا نے اس خلا کو پُر کیا۔

میں نے ۱۹۶۸ء سے جب میں اسکول میں زیرِ تعلیم تھا اس وقت سے مولانا کا وعظ سننا شروع کیا۔ جمعہ کی نماز سے بہت پہلے میں مسجد میں پہنچ جاتا۔ نماز کے بعد مولانا مسجد میں دائیں طرف لکڑی کے اونچے سے ممبر پر تشریف رکھتے ان کے چھوٹے بھائی حافظ محمد عرفان مرحوم ممبر کے دائیں طرف کھڑے ہوتے۔ مسجد میں تل رکھنے کو جگہ نہیں مسجد کے دائیں اور بائیں طرف اوپر سہ دریوں میں خواتین کے بیٹھنے کا انتظام ہوتا شاید جگہ نہ ملنے پر ان میں کھاسُنی ہو رہی ہوتی مولانا کرخت آوازمیں ان کو ڈانٹتے تھوڑی دیر کے لیے یہ آوازیں بند ہو جاتیں اور مولانا کے بیان کے دوران ہم پھر اُوپر دیکھنے لگتے کیونکہ خواتین کی آوازیں پھر آنی شروع ہو جاتیں۔ مولانا کبھی توحید کبھی حدیث کبھی فقہ اور کبھی مسلمانوں کے تنزل کے اسباب بیان کیا کرتے تھے قرآن مجید کی بے شمار آیت وہ تلاوت کرتے اور ان کا ترجمہ لہک لہک کر اس خوبی سے بیان کرتے کہ تمام حاضرین ٹک ٹکی باندھے مولانا کو بس دیکھتے رہتے تھے۔ اُن کی آواز مسجد میں گونج رہی ہوتی۔ مولانا کی سخن آوری کا سب سے بڑا حسن یہ تھا کہ وہ اسلامی تاریخ۔ فلسفہ، نفسیات، منطق اور جغرافیہ کی مدد سے اپنے بیان کو پُر لطف اور معلومات افزا بنا دیتے۔ باتیں ایسی بچی تُلی کہ کہیں انگلی دھرنے کی گنجائش ہی نہیں۔ ایک جمعہ کو بیان کے دوران حاضرین میں سے ایک بزرگ نے پوچھا " مولانا ہندوؤں میں بت پرستی کہاں سے آئی"؟ ظاہر ہے کسی ادھیڑ عمر نوجوان اور بچے کی تو ہمت ہی نہیں ہوتی تھی کہ وہ کوئی سوال کرے کوئی عمر رسیدہ ہی سوال کر سکتا تھا۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ بیان کے دوران لوگوں پر اتنا خوف طاری ہوتا کہ

Marfat.com

وہ ہلتے جلتے بھی کم تھے. مولانا نے فرمایا ہندوؤں میں تمثیل بنانے کی ایک کہانی کہی جاتی ہے جو حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے واقعے سے بہت ملتی ہے. برہمن کا ایک بیٹا تھا جس کا نام نرادا تھا اس کی صبح و شام رات دن یہی خواہش ہوتی کہ وہ خدا کا جمال دیکھ لے وہ اپنی عادت کے مطابق ایک عصا ہاتھ میں لے کر چلتا تھا جب وہ اس عصا کو زمین پر ڈال دیتا تو وہ اژدھا بن جاتا برہمن کا لڑکا بہت سے کرشمے دکھانے پر قادر تھا، ایک دن وہ اپنی اُسی آرزو میں سرشار چلا جا رہا تھا کہ اس نے دور ایک آگ دیکھی وہ اس کی طرف لپکا آگ میں سے ایک آواز نے اس سے کہا جو کچھ تو مانگتا اور چاہتا ہے وہ ممکن نہیں تو مجھے ہرگز ہرگز نہیں دیکھ سکتا سوائے اس طرح کے جب اس نے اُس آواز کی طرف دیکھا تو اسے کچھ انسانی ہیولا آگ میں نظر آیا اس وقت سے مختلف شکلوں کے بت بنائے جانے لگے.

چھوٹے چھوٹے واقعات دلّی کی زبان میں برجستہ جملوں غیر معمولی مقولوں اور چبھتے ہوئے فقروں کے ساتھ پیش کرتے بالکل اسی طرح جیسے کچھ نہ کہتے ہوئے سب کچھ کہہ جاتے ایک روز مولانا نے فرمایا:

دو دوست شام کے وقت چہل قدمی کے لیے نکلے راستے میں اذان کی آواز آئی تو ان میں سے ایک نے کہا میں نماز ادا کرلوں دوسرے نے کہا جب تک تم نماز پڑھو میں مسجد کے باہر کھڑا ہوں، ایک مسجد کے اندر چلا گیا دوسرا باہر انتظار کرنے لگا، جب نماز ختم ہوئی تو نمازی اپنی اپنی جوتیاں اٹھا کر جانے لگے مسجد خالی ہوگئی، باہر کھڑے دوست کو تشویش ہوئی اس نے دروازے میں سے مسجد کے اندر جھانکا تو دیکھا ان کا دوست ابھی تک بیٹھا ہوا پڑھ رہا ہے اُس نے باہر سے آواز لگائی "اب تو آجاؤ سب جاچکے" دوسرے نے وہیں بیٹھے بیٹھے جواب دیا "جو تمھیں اندر نہیں آنے دیتا وہ مجھے باہر نہیں جانے دیتا۔"

Marfat.com

ایسے بے شمار دل چسپ واقعات مولانا وعظ میں سناتے تھے۔ ایک روز انسان کے طبعی رجحان رحم پر بیان فرما رہے تھے کہنے لگے کیا تم نے غلام سبکتگین کا واقعہ نہیں سنا۔ جب وہ ملازمت کی تلاش میں سفر کر رہا تھا اس نے ایک جگہ جنگل میں قیام کیا لیکن جب بھوک کا غلبہ ہوا تو شکار کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا' اس نے ایک ہرنی کو دیکھا جو اپنے ننھے سے بچے کے پاس کھڑی ہوئی تھی اور بچے کو حفاظت کے لیے زمین میں گڑھا کر کے اس میں بٹھا رکھا تھا۔ سبکتگین نے سوچا ہرنی کے بچے کا گوشت بڑا لذیذ ہوگا۔ ہرنی نے شکاری کو اپنی طرف آتا دیکھا تو بچے کو چھوڑ کچھ دور جا کر کھڑی ہو گئی، سبکتگین نے بچے کو اٹھا لیا اور اپنی قیام گاہ کی طرف واپس جانے لگا ہرنی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی جب غلام سبکتگین نے مڑ کر دیکھا ہرنی کبھی پیچھے کبھی سامنے ہوتی اس طرح جب وہ کافی دور نکل گئے تو اس کی نظر پھر ہرنی کی طرف اٹھ گئی اس نے محسوس کیا کہ ہرنی اپنے بچے کی خاطر اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتی، سبکتگین کو ہرنی پر ترس آیا اس نے بچے کو چھوڑ دیا، ہرنی نے بچے کو اٹھایا اور واپس جانے لگی لیکن بار بار وہ پیچھے مڑ مڑ کر سبکتگین کو دیکھتی تھی بالکل اسی طرح جیسے وہ اس کا شکریہ ادا کر رہی ہو سبکتگین پر اس واقعے کا اتنا اثر ہوا کہ وہ بھوکا سو گیا، اُس رات اُس نے خواب میں جناب رسالت مآب کو دیکھا کہ فرماتے ہیں تم نے ایک جانور کے رجحان مادری پر رحم کھایا اس کے بچے کو ذبح نہ کیا چھوڑ دیا اس کے صلہ میں اللہ تمھیں تخت و تاج عطا کرے گا چنانچہ ایک جانور پر رحم کھانے کی وجہ سے وہ پیادہ سے سُلطان بن گیا۔

آخرت میں کیا ہوگا کیا نہ ہوگا قبر کا حال تو مردہ جانے لیکن مولانا آخرت سے بہت ڈراتے تھے۔ ایک روز فرمانے لگے ایک بزرگ سودا خریدنے پنساری کی دُکان پر گئے مطلوبہ چیزیں خرید کر پیسے معلوم کیے تو دُکاندار نے حساب لگا کر چار آنے بتائے' ان بزرگ نے چونی نکال دُکاندار کو دیدی، دُکاندار نے چونی

Marfat.com

کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور اُن بزرگ سے کہا حضرت یہ تو کھوٹی ہے بزرگ یہ سنتے ہی دوکان کے سامنے دیوار کے پاس جاکر زار و قطار رونے لگے یہاں تک کہ ان کی ہچکی بندھ گئی دُکاندار گھبرا گیا اور اٹھ کر ان کے پاس آیا اور اس طرح رونے کی وجہ معلوم کی، بزرگ نے پہلے کرتے کی جیب سے دوسری چونی نکال کر دُکاندار کو دیتے ہوئے کہا " میاں اگر حشر کے دن میرے تمام اعمال کھوٹے سکے کہہ کر لوٹا دیے گئے تو میں کہاں جاؤنگا یہاں تو دوسری چونی میرے پاس تھی لیکن وہاں اچھے اعمال کہاں سے پیش کرونگا۔

مولانا کسی بھی دینی ادارے سے فارغ التحصیل نہیں تھے لیکن بیان کا انداز چہرے کے اتار چڑھاؤ سمجھانے کا طریقہ خالص مولویانہ ہوتا تھا۔ اسی لیے نہ صرف دہلی میں بلکہ پورے مہاراشٹرا اور ساؤتھ میں مولانا کو اس لیے بلایا جاتا تھا کہ مذہبی تقاریر وہ انگریزی میں اتنی روانی سے کرتے تھے جتنی کہ اردو میں اس لیے مولانا جنوبی ہندوستان میں اتنے مقبول ہو گئے تھے کہ کسی دوسرے کی وہاں دال نہ گلتی تھی۔ کوکنی مسلمانوں میں مولانا اتنے معتبر تھے کہ وہ اپنی بیشتر رسموں میں اُن کی شرکت ضروری سمجھتے تھے اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا کے ہاں پند و نصائح کے تو ڈھیر تھے لیکن کُفر اور شرک کے فتوے تقسیم نہیں ہوتے تھے۔

باہمی تعلقات اور قومی صحبتوں کا میل جول مولانا کو سیاسی میدان میں لے گیا ۱۹۴۶ء میں مولانا نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کارپوریشن کا الیکشن لڑا اور ہار گئے کامیابی حاصل کرنا ان کی فطرت کا ایک اہم عنصر تھا جس نے ۱۹۵۲ء میں پھر انھیں الیکشن لڑنے کے لیے مجبور کیا اس مرتبہ جیت گئے۔ ۱۹۶۲ء میں تیسرا الیکشن لڑا اور ہار گئے۔

Corporator ہونے کے بعد مولانا نے کارپوریشن کے دفتروں میں مسلمانوں کو کلرک اور چپراسی بھرتی کرایا اس سے زیادہ ان کی پہنچ نہیں تھی۔ ان کے

Marfat.com

ہم عصروں میں لالہ شام ناتھ، میر مشتاق احمد، حضرت مولانا محمد سعید، مرزا احمد علی، چودھری عبدالستار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سیاسی اسٹیج پر مولانا قوم میں تنزل کے اسباب بڑی خوبی سے بیان کرتے تھے۔ جامع مسجد پر ایسے ہی ایک جلسے میں جب میں نے مولانا کو دیکھا تو ان کو سننے کے شوق میں وہاں رک گیا۔ مولانا نے یورپ کے جدید وسائل سائنٹیفک ایجادات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا " ہماری اقتصادی تباہی کا اصل سبب ہماری بے اعتدالیاں اور اخلاقی شعور کی طاقت سے محرومیاں ہیں، ہمارے بے جا اِسراف، بدمعاملگی، بے انصافی، نااتفاقی، ظلم و جور بے فکری اور جہالت ہیں لفظ جہالت پر انھوں نے اتنا زور دیا کہ چہرہ سرخ ہوگیا آواز میں گرج کے ساتھ روانی ہاتھوں کو وہ اتنے زور سے جھٹک رہے تھے گویا انقلاب زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہوں میرے قریب کھڑے ایک شخص نے جب مولانا کے یہ تاؤ دیکھے تو اپنے ساتھی سے کہنے لگے دیکھا پرانا چاول ہے میں بھی اپنی لڑکوں سے کہتا ہوں اب پڑھ لو آدمی بن جاؤ گے ورنہ جناور کے جناور رہو گے۔

مولانا کو سیاحت کا بے حد شوق تھا پورا ہندوستان گھوم چکے تھے جغرافیہ پر عبور حاصل تھا بنگال ہو یا مدراس یوپی ہو یا بہار مولانا ان شہروں کی گلیوں کوچوں اور محلوں تک سے بخوبی واقف تھے تقریر کے دوران جغرافیائی معلومات اور سیاحت کے دل چسپ واقعات اس طرح بتاتے کہ سننے والا بن دیکھے ان جگہوں کو دیکھ لیتا۔ نیشنل اور انٹرنیشنل سیاست سے وہ پورے واقف ہوتے کیونکہ رات دس بجے کے بعد مولانا کا خاص شغل تھا کہ وہ آدھی رات گئے تک انگریزی اخبار کی ایک ایک سطر پڑھتے ساتھ ساتھ ریڈیو کی ایک ایک خبر سنتے جاتے تھے۔ ہر صبح قرآن کی تلاوت اتنی اونچی آواز میں کرتے کہ ان کے بچے نیند سے بیدار ہو جاتے گویا ان کی تلاوت گھر کے زیادہ تر افراد کے

Marfat.com

لیے صبح ہونے کا اعلان تھی۔
میں جب بھی اُن کے گھر گیا مولانا کو یا تو مطالعہ میں مصروف پایا یا کسی کی ڈانٹ ڈپٹ کرتے دیکھا۔ غصہ مولانا کی ناک پہ دھرا رہتا تھا۔ پورے گھر میں بس ان ہی کی آواز سنائی دیتی تھی۔ مولانا دوپہر تک ضروری کاموں سے فارغ ہو کر ظہر کی نماز کے بعد سے عصر تک آرام کرتے عصر کے بعد مسجد میں سب سے اوپر والے کمرے میں لڑکے لڑکیوں کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ ٹیوشن وہ عمر کے آخری حصے تک کرتے رہے میں اکثر اپنے گھر کی چھت سے دیکھا کرتا مولانا کی آواز پینتس۳۵ چالیس۴۰ گز کے فاصلے سے صاف سنائی دیتی تھی۔ مغرب کے بعد سے عشا اور رات گئے تک اپنے ہم چشموں ہم نشینوں میں کبھی مولوی سمیع اللہ کبھی مفتی ضیا الحق اور کبھی ڈاکٹر خیری کے ہاں جاتے تھے۔ مولانا کثیرالاولاد تھے۔ فرقت کاکوروی مرحوم فرماتے تھے۔ کل شام میں اپنے گھر سے مچھلی والان تک جانے کے لیے نکلا تو میاں جامع مسجد تک مجھے بارہ۱۲ لڑکوں نے سلام کیا میں نے ان کو جاننے کے لیے سب کی ولدیت معلوم کی تو بارہ میں سے نو نے اپنی ولدیت زبیر قریشی بتائی میں جامع مسجد سے واپس لوٹ آیا۔ سات لڑکے پانچ لڑکیوں کی کفالت کا بوجھ بھی کم نہیں ہوتا سب کے سب اعلا تعلیم سے آراستہ بارہ میں سے نو ایم۔ اے دو آئی۔ اے۔ ایس یہ مولانا کی تربیت تھی ان ہی کے ایما پر بچوں کی تعلیم مکمل ہوئی۔

۱۹۷۶ء میں مولانا نے پورے یورپ کی سیاحت کی اور حج کا فریضہ بھی ادا کیا۔ کون جانتا تھا کہ غیر ملکی سفر وہ اس لیے کر رہے ہیں کہ ان کا آخری سفر بھی عنقریب ہونے والا ہے۔ انتقال سے چھ ماہ قبل ایک رات کسی شادی میں سے واپس آئے تو دل میں درد کی شدید تکلیف ہوئی۔ گھر والوں نے یہ سمجھ کر کہ دردِ قلب کی شکایت تو یہ اکثر کرتے ہیں زیادہ توجہ نہیں دی، اس کے بعد مولانا بالکل ڈھے سے گئے۔ زندگی کے آخری ایام میں چلنا پھرنا حتیٰ کہ

Marfat.com

بات کرنا بھی ان کے لیے دوبھر ہوگیا۔ ۲۷؍ مارچ ۱۹۷۸ء کو ان کے لڑکوں نے اروِن ہسپتال میں داخل کر دیا۔ جب ہسپتال میں E.C.G. کی رپورٹ آئی تو معلوم ہوا کہ چھ ماہ قبل جو وہ درد کی تکلیف سے نڈھال ہو گئے تھے وہ انھیں پہلا Sevior Heart Attack تھا اس کے بعد کئی Minor Altack انھوں نے جھیلے ۳؍ اپریل ۱۹۷۸ء کو پیر کے دن صبح ساڑھے نو بجے اسپتال میں مولانا نے تمام دنیاوی تکلیفوں سے نجات پائی۔

جمعیۃ العلماء کے سرگرم رکن، دہلی فٹبال ایسوسی ایشن D.F.A. کے بانی دہلی پیراکی ایسوسی ایشن کے صدر مولانا مولوی محمد زبیر قریشی مرحوم و مغفور کی تدفین اسی روز شام سات بجے قبرستان مہندیان میں ڈیڑھ ہزار افراد کی موجودگی میں عمل میں آئی۔ مجھے اس بات کا افسوس رہے گا کہ اُن کے آخری سفر میں شریک نہیں ہو سکا جب ان سے کچھ حاصل کرنا ہوتا تو (دینی علوم کے بارے میں) تو جمعہ کی اذان سے بھی پہلے ہی مسجد میں پہنچ جاتا تھا اور جب کچھ دینے کا وقت آیا تو کندھا بھی نہ دے سکا کتنا بخیل ہے آج کا یہ مہذب انسان۔

کسی نے بالکل سچ کہا ہے کہ عالم کی موت عالم کی موت ہوتی ہے۔ مولانا کی وفات نہ ایک ادارے کی موت ہے نہ عہد کا فاتحہ ان کی موت تو ایک عالمِ دین اور انسانیت کی موت ہے۔ مولانا ان وضع دار شخصیتوں میں سے تھے جن پر دلّی کو فخر تھا ان کی ذات روشنی کا ایک مینار تھی جس نے اپنے ہی ذروں کو چمکا کر انھیں آفتاب و ماہتاب کی تجلّی عطا کی۔ آج جب میں ان ذروں میں سے کسی کو دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ ان میں چمک دمک تو ہے لیکن قوسِ قزح کے رنگوں کی وہ آب نہیں جو مولانا کی شخصیت میں نمایاں تھی۔

Marfat.com

فاروق بخشی

حاجی زین العابدین صاحب

قافلہ قافلہ جاتے ہیں چلے کیا کیا لوگ
میرؔ غفلت زدہ حیران سے کیا بیٹھے ہو

شعر نہ معلوم کن ذہنی اور نفسیاتی کیفیات سے دو چار ہوکر کہا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ بزرگوں میں سے جو حضرات بھی اس جہانِ فانی سے رخصت ہوتے جاتے ہیں اُن کا نعم البدل اب مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ حاجی زین العابدین مرحوم بھی جنھیں ہم سب محبت اور عقیدت سے حاجی صاحب کہتے تھے ایسے ہی صاحبِ کمال لوگوں میں تھے۔ مرحوم نے ۱۰ ر فروری ۱۹۰۲ء کو یوپی کے ایک مردم خیز ضلع بلند شہر میں آنکھ کھولی۔ خاندانی پس منظر کسی اعتبار سے بھی کچھ ایسا وسیع نہ تھا مگر والدین تعلیم کی اہمیت اور افادیت سے بخوبی واقف تھے انھوں نے بیٹے کو اعلا تعلیم کے زیور سے آراستہ ہی نہیں کیا اُس میں انسانیت، خلوص، رواداری اور محبت کے جذبات بیدار کیا۔ بلند شہر اور علی گڈھ شہروں میں انھوں نے علم کی پیاس بجھائی۔ اور علی گڈھ کی تعلیم کے اثرات ان کی شخصیت اور زندگی پر

Marfat.com

آخری وقت تک رہے۔ انھوں نے اپنے کیریئر کا آغاز دہلی کے قدیم تعلیمی ادارے اینگلو عربک اسکول سے کیا تھا بعد کو فتح پوری اسکول میں بحیثیت استاد اور پھر یہیں پرنسپل بھی مقرر ہوئے۔ اور زندگی کے آخری سانسوں تک اس ادارے سے وابستہ رہے۔

آج بھی دفتر میں وہ کرسی اسی طرح خالی رکھی ہوئی ہے جس پر وہ ٹھیک ۱۰ بجے تشریف لے آتے تھے۔ پتہ نہیں کیوں آج بھی یہ احساس میرے ذہن و دل کے ساتھ جڑا ہوا ہے جیسے حاجی صاحب ابھی آئیں گے اور اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ وہاں آکر بیٹھیں گے۔ میں جانتا ہوں حاجی صاحب نہیں آئیں گے۔ لیکن آج بھی ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو بے اختیار آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

آج جب میں آپ سے حاجی صاحب کا ذکر کرنے بیٹھا ہوں تو مجھے بے اختیار ان سے اپنی پہلی ملاقات یاد آرہی ہے میرا اور حاجی صاحب کا بحیثیت ایک رفیق کار بمشکل ہی ½ ۵ برس ساتھ رہا مگر انسانی شخصیت کو پرکھنے کے لیے کبھی کبھی صدیاں بھی ناکافی ہوتی ہیں اور کبھی کبھی ایک معمولی سا واقعہ بھی کسی شخصیت کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ اور انسان اپنے تمامتر محاسن اور مصائب کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔ یہ کوئی بہت پرانی بات نہیں اور اپنی یادداشتوں کی عمر بھی کچھ ایسی طویل نہیں کہ واقعات کی چھان پھٹک میں خاصہ وقت صرف کرنا پڑے۔ بات دسمبر ۸۰ ء کی ہے میں یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری لے کر تلاش معاش میں تارکول کی لمبی سڑکوں کو ناپنے میں مصروف تھا مگر ان بخیتہ سڑکوں کا طویل سلسلہ ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ گاہے گاہے والد صاحب اور بھائیوں کی کڑوی کسیلی بھی سننی پڑتی۔ میاں کو لاکھ سمجھایا تھا بھائی ادبیات کا اتنا ہی شوق ہے تو انگریزی میں

Marfat.com

ایم۔ اے کرو مگران کے سر پر تو میرؔ اور فانیؔ کا سودا سوار تھا۔ اب دیکھ لینا انجام۔ انگریزی میں ہوتے تو کچھ کر گزرتے۔ ان لوگوں کی تقاریر اور میری خاموشیوں کا سلسلہ دراز ہوتا جاتا تھا کہ ایک دن الجمعتہ اخبار میں فتح پوری مسلم سینئر سیکنڈری اسکول میں اردو کے استاد کی جگہ کے لیے اشتہار دیکھا۔ اندھیرے میں اجالے کی ایک کرن نظر آئی۔ درخواست بھیج کر انٹرویو کے لیے خود حاضر ہوا۔ انٹرویو میں سوالات کا سلسلہ ہماری تعلیمی قابلیت سے شروع ہوکر شعر و شاعری کے تذکرے تک جا پہنچا۔ چلتے وقت سب نے سمجھا یا تھا کہ ایسے تعلیمی اداروں میں شاعر کو بڑے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ناکارہ آدمی طلبہ کو کیا خاک پڑھائے گا یا تو مشاعروں میں راتیں گنوا کر دن میں طلبہ کے سامنے اونگھے گا یا کلاس میں بیٹھ کر شاگردوں کے کلام پر اصلاح دے گا۔ اُدھر سے سوال ہوا کیا شعر و شاعری سے کوئی دل چسپی ہے میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا "جی شعر موزوں کر لیتا ہوں" اور اتنا کہہ کر مجھے یہ احساس ہو چلا تھا کہ میاں کہاں ان داڑھی والوں میں شاعری کا ذکر کر بیٹھے یہ مولوی حضرات ہیں انھیں شاعری سے کیا علاقہ اور دل ہی دل میں اپنی اس نادانی پر پچھتا بھی رہا تھا اُدھر سے ایک مخصوص انداز میں حکم ہوا "کچھ ہو جائے" میں نے پھر عرض کیا ترنم میں یا تحت میں۔ میرے اس جواب پر مفتی عتیق الرحمان صاحب عثمانی نے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا میرا رہا سہا حوصلہ بھی جاتا رہا اور دل میں پختہ یقین ہو چلا کہ آج کا یہ انٹرویو بھی حسبِ سابق مشاعرہ کی نذر ہو جائے گا۔ حکم ہوا ترنم میں سنائیے۔ اور میں نے دل ہی دل میں تحت آیتہ الکرسی پڑھ کر ترنم سے غزل شروع کی۔ جیسے جیسے غزل کے اشعار میری زبان سے

Marfat.com

نکلتے جاتے تھے داد و تحسین کے شور میں اضافہ ہوتا جاتا تھا حتیٰ کہ اپنی باری کے منتظر دیگر امیدوار گھبراکر انٹرویو روم کی جانب بھاگے کہ خدا خیر کرے یہ انٹرویو کے نام پر کیا ہو رہا ہے۔ مگر وہاں سب خیریت تھی اور مشاعرہ اپنے عروج پر تھا۔ اور آخر کار ہمیں اردو کی تدریس کے فرائض سونپ دیے گئے۔ اور میں جس شخص کو محض مولوی سمجھ رہا تھا وہ اس ادارے کے سالارِ قافلہ تھے الحاج زین العابدین۔ جو شعر فہمی، شاعر نوازی اور ادب پروری میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ حضرات یقین جانیے شاعر اور شاعری کی جیسی عزت میں نے ان کی نظروں میں دیکھی اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

حاجی صاحب بنیادی طور پر بہت نیک انسان تھے اور ان میں وہ تمام محاسن موجود تھے جو نیک اور صالح لوگوں میں ہونے چاہئیں ادب، اور ادیب ان کی خاص دل چسپی کا مرکز تھے اور ان کی تعظیم اور تکریم وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ دہلی کے ادبی جلسوں خصوصاً مشاعروں میں پابندی سے شرکت ان کے مزاج کا ایک حصہ تھی۔ D.C.M اور لال قلعے کے مشاعرے میں جانے کے لیے پروگرام ہفتوں پہلے سے ترتیب دیا جاتا اور حاجی صاحب اپنے اسٹاف کے ہمراہ ہمیشہ اگلی نشستوں پر نظر آتے۔

سامعین میں سے ممکن ہے بہت سے حضرات میری اس بات سے اتفاق نہ کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ ایسے تعلیمی اداروں کے پرنسپل صاحبان ان اداروں کو اپنی جاگیر اور ان میں کام کرنے والے اساتذہ کو اپنا زر خرید غلام سمجھتے ہیں مگر حاجی صاحب کا مزاج اور ان کی شخصیت ان سب سے الگ تھی۔ اپنے اسٹاف کے لوگوں کی ذاتی اور سماجی زندگی کے بارے میں انھیں ایک ایک بات کا علم رہتا

Marfat.com

اور وہ ایک خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے ان کے مسائل کا حل ہی نہیں کھوجتے ان کے غم اور خوشیوں میں بھی برابر کے شریک رہتے تھے۔ اس میں کسی قسم کا کوئی امتیاز کسی کے ساتھ نہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے اسٹاف میں اس طرح گھلے ملے رہتے تھے کہ باہر سے آنے والے شخص کو پرنسپل صاحب کون ہیں یہ پتہ لگانے میں خاصی دشواری کا سامنا ہوتا تھا۔

ایک اقلیتی تعلیمی ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے انھیں اپنی ذمہ داریوں کا بھرپور احساس تھا اور وہ ہمیشہ ایسے پروگرام بناتے رہتے تھے جس سے طلبہ ملک اور قوم کی خدمت کے قابل بن سکیں کبھی کبھی انھیں مختلف مسائل پر اسٹاف کی جانب سے اختلافات کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا مگر وہ معاملات کی نزاکت کچھ اس طرح سے سمجھاتے تھے کہ لوگ ان کی بات کے قائل ہو جاتے اور ان کی تجاویز ماننے پر مجبور ہو جاتے۔

حاجی صاحب دہلی کی مختلف ادبی اور سماجی تنظیموں کے روحِ رواں رہے مگر انھوں نے کبھی اپنی سماجی حیثیت کو اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا۔ اردو اکیڈمی کی ممبری کا زمانہ ہو یا حج کمیٹی کی رکنیت ان کے نزدیک خدمتِ خلق سب سے بڑا کام تھا اور تاحیات اس میں لگے رہے۔

حاجی صاحب نے جب ۱۹۶۸ء میں اسکول کے سربراہ کا عہدہ قبول کیا ادارے کی مالی حالت ناگفتی تھی۔ اساتذہ کو اپنی تنخواہوں کے لیے کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا تھا لیکن یہ حاجی صاحب کا کمال تھا کہ انھوں نے اسکول کو اس مالی بحران سے رہائی دلائی اور میں سمجھتا ہوں یہ حاجی صاحب کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جسے

Marfat.com

دلی والے ہمیشہ یاد رکھیں گے کہ ایک ایسے ادارے کو جس کے پاس مستقل آمدنی کے نام پر کچھ بھی نہ تھا ۱۷ برس تک اپنی ذاتی جدو جہد اور محنت کے بل بوتے پر بخیر و خوبی چلاتے رہے۔ گرمیوں کی تعطیلات میں جب لوگ مئی کی گرمی سے اکتا کر پہاڑوں کا رخ کرتے ہیں حاجی صاحب جون کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں اپنے ساتھی اساتذہ کے ساتھ اہلِ خیر حضرات کے پاس چندہ مانگنے جاتے تھے کئی مرتبہ ایسا ہوتا کہ تیس چالیس منٹ تک انتظار کرنے کے بعد جواب ملتا فلاں تاریخ کو تشریف لائیے۔ مگر حاجی صاحب کا آہنی عزم تھا کہ ان کے ماتھے پر شکن تک نہ آتی تھی۔ اور انھیں یہ فکر کھائے رہتی کہ اساتذہ کو تنخواہیں وقت پر ملنی چاہئیں۔

حاجی صاحب ہر قیمت پر ادارے اور اپنے ساتھی اساتذہ کے وقار کی حفاظت کرنا اپنا فرضِ اولین سمجھتے ہیں۔ اور کبھی کوئی ایسا کام کرنے کی ضد نہ کرتے تھے جس سے کسی کا وقار مجروح ہوتا ہو۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے ادارے میں کسی تقریب کے سلسلے میں محکمۂ تعلیم کے ایک آفیسر آنے والے ہیں مجھے حکم ہوا ان صاحب کی تعریف و توصیف میں کچھ اشعار نظم کیجیے۔ میرا ذہن کبھی ایسے کاموں کے لیے تیار نہیں ہوتا اور میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی شاعری کے لیے ایک مخصوص تربیت یافتہ ذہن کی ضرورت ہوتی ہے میں نے دبے دبے لفظوں میں عرض کی جناب یہ کام فلاں صاحب بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں اور ان لوگوں کو تجربہ بھی ہے۔ مگر حکم ہوا نہیں آپ جدید انداز میں کہتے ہیں۔ اس مرتبہ مدح بھی نئے انداز میں ہونی چاہیے۔ الغرض تقریب کا دن آپہنچا میں شعر نہیں کہہ سکا تھا اور میں نے سرِ محفل نہایت صاف گوئی سے اپنی معذوری کا اظہار بھی کردیا اور اسی کے ساتھ یہ بھی

Marfat.com

کہہ دیا میں آپ سے عقیدت رکھتا ہوں آپ کو اپنا محسن و مربی خیال کرتا ہوں۔ آپ کے لیے چار مصرعے کہے ہیں۔ وہ چار مصرعے جو ان کے لیے تھے مزے مزے لے لے کر سنتے رہے بعد میں مجھے بلایا میری صاف گوئی پر میری پیٹھ ٹھونکی اور کچھ نصیحتیں بھی کیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اس جرأت پر جواب طلب کرتا آئندہ پریشان کرتا مگر حاجی صاحب بڑے صاف ستھرے ذہن کے مالک تھے۔ مجھے خوب یاد ہے اسٹاف کا کوئی ممبر اگر ان سے ناراض ہو جاتا تو باقاعدہ اسے منانے اس کے گھر پہنچ جاتے اور جب تک وہ پہلے کی طرح شیر و شکر نہ ہو جاتے انھیں چین نہ آتا۔ میرے علم میں اسٹاف کے ایسے کئی اساتذہ ہیں جن سے ناراضگی پر حاجی صاحب کی باقاعدہ خط و کتابت ہوتی اور آخر میں جیت حاجی صاحب کی ہی ہوتی تھی۔

حاجی صاحب اپنی وضع قطع کے لحاظ سے نہایت سنجیدہ متین اور بردبار انسان تھے۔ مشکل سے مشکل حالات میں بھی ان کے چہرے پر ایک عجیب طرح کا سکون رہتا تھا۔

مگر شاید بہت کم لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہوگا کہ اس مولویانہ وضع قطع کے پیچھے ایک ایسا انسان بھی چھپا ہوا تھا جس کے یہاں طنز و مزاح کا بڑا لطیف احساس بھی پایا جاتا تھا۔ کرنل محمد خان کی کتاب بجنگ آمد انھیں ازبر تھی اور اس کے واقعات سناتے جاتے تھے خود ہنستے تھے اور دوسروں کو ہنسانے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کسی صاحب کے یہاں پارٹی میں ایک صاحب جو خاصے مقبول آدمی ہیں مگر عادت و اطوار کے لحاظ سے اپنی ساخت کے بالکل الگ ہیں انھوں نے حسب عادت اشیائے خورد و نوش اٹھا اٹھا کر اپنی جیبوں میں ٹھونسنا شروع کر دیں۔ حاجی صاحب ان کی یہ حرکت بڑے

Marfat.com

غور سے دیکھ رہے تھے اور جب ان سے نہ رہا گیا تو بولے جناب برائے کرم چائے جیب میں نہ رکھا لیجیے گا۔ اس جملے پر ان صاحب کی جو حالت ہوئی وہ دیدنی تھی۔

حاجی صاحب روپے پیسے کے معاملے میں بڑے کھرے انسان تھے جس سے بھی لین دین ہوتا اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ میرے تمام روپے کے لین دین کا علم میری اہلیہ کو رہتا ہے۔ اس بات کی تصدیق ان کے انتقال کے بعد ہوئی۔ انتقال کے کوئی ایک ہفتے بعد ان کی اہلیہ محترمہ نے ایک لفافہ مبارک اللہ صاحب کے نام بھیجا۔ پتہ چلا کافی عرصہ پہلے انھوں نے مبارک صاحب سے ایک ہزار روپے ادھار لیے اور انتقال سے کچھ دیر پیشتر یہ بات انھوں نے اپنی اہلیہ کو بتا دی تھی۔ کسے یقین تھا کہ حاجی صاحب اتنی جلدی اس دارِ فانی سے رخصت ہو جائیں گے۔ جانا سب کو ہے مگر حاجی صاحب اتنی جلد چلے جائیں گے یہ یقین نہیں آتا۔ ۲۵ ستمبر ۸۵ء کو ان کے بائیں ٹانگ میں شدید درد اٹھا۔ ڈاکٹروں نے Jhatic Pain بتایا علاج ہوتا رہا مگر افاقہ کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس دوران شگر بھی بڑھ گئی تھی۔ بلڈ پریشر بھی بگڑنے لگا تھا۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ سب وقتی ہے حاجی صاحب عنقریب صحت یاب ہو کر ہمارے درمیان آجائیں گے اور ۲۱ دسمبر کو وہ بیساکھی کے سہارے اسکول آبھی گئے۔ گو طبیعت اب سنبھل چکی تھی مگر ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔ اساتذہ نے یہ طے کیا ہے کہ حاجی صاحب کے جشن صحت کے سلسلے میں ایک پارٹی کا اہتمام کیا جائے ۲۳ دسمبر مقرر کی گئی۔ حاجی صاحب تشریف لائے ایک ایک سے گلے ملے شام تک دفتر کے ضروری کاغذات اور فائلوں پر دستخط کرتے رہے۔ دوپہر کو

مجھے کہیں جانا تھا۔ میں چلنے لگا تو بولے چلد یئے بخشی صاحب میں نے عرض کی کسی سے وقت مقرر ہے۔ کہنے لگے ہاں بھئی اب تم بڑے آدمی ہو گئے۔ مگر آج دوپہر کا کھانا تو ہمارے ساتھ کھالو۔ مگر میری تقدیر میں ان کے ساتھ آخری بار کھانا نہ لکھا تھا کہ پچھلے پانچ برسوں سے میرا دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ چوبیس دسمبر کو ان کی طبیعت بگڑ گئی ہولی فیملی اسپتال میں داخل کرادیا گیا مگر حالت میں سدھار نہ ہوا اور سہ پہر ۳ بجے ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور ۲۵ر دسمبر کی صبح جامعہ کے قبرستان میں تدفین ہوئی ۔ حاجی صاحب آج اس دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کا مسکراتا ہوا چہرہ اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے جسے شاید میں زندگی کے کسی موڑ پر نہ بھلا سکوں گا۔

Marfat.com

انیس دہلوی

مرزا سلطان بیگ سلطان دہلوی

اللہ بخشے! ساقی والے شاہد احمد دہلوی، کہا کرتے تھے کہ عجب بے فکرے تھے یہ دلّی والے بھی! اپنی جان کو کوئی غم نہ لگاتے تھے۔ کہتے تھے۔ "فکر جان کا روگ ہوتا ہے، ہم غم کیوں پالیں؟ پالیں ہمارے دشمن بیری۔ شکر خورے کو شکر" اور موذی کو ٹکر۔ میاں اِسی لیے کماتے دھماتے ہیں کہ آنند کے تار بجائیں۔ ان کی بھلی چلائی جو .... جوڑ جوڑ مر جائیں گے اور مال جنوائی کھائیں گے۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ مرگئے مردود جن کی فاتحہ نہ درود۔ اللہ پیسہ دے پیسے کی محبت نہ دے، ہاتھ کی میل سے محبت کیا؟ میاں ہم تو کوڑی کفن کو لگا کر نہیں رکھتے۔ اپنا آپا کیسا ہے؟ ..... جان ہے تو جہان ہے۔ آپ زندم جہاں زندم، آپ مردم جہاں مردم، کھائیں گے گھی سے نہیں تو جائیں گے جی سے۔" کھاؤ پیو اور موج مارو موت سر پر کھڑی ہے۔ جو دم گزر جائے غنیمت ہے۔"

کچھ ایسے ہی بے فکرے دلّی والوں میں سے ہمارے مرزا سلطان بیگ تھے ــــ وہ ۱۴؍ مئی ۱۸۹۹ء میں گلی اندھیری پہاڑی بھوجلہ کے ایک

Marfat.com

دست کار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ جیساکہ دستکار گھرانوں کا قاعدہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کے بعد بچوں کو کسی پیشے میں لگا دیا جاتا ہے، کچھ ایسا ہی مرزا سلطان بیگ کے ساتھ ہوا۔ مگر خاندانی پیشہ سادہ کاری کے بجائے انھوں نے شہرت حاصل کی شاعری اور فٹ بال میں۔

اب یہی دیکھیے کہاں شاعری اور کہاں فٹ بال۔ ایک طرف غیب سے آنیوالے مضامین اور دوسری طرف ٹھوکروں سے لڑھکتی اُچھلتی گیند۔۔ ایک عرش دوسرا فرش۔ مگر وہ دلّی والے ہی کیا۔ جو انہونی کو ہونی نہ کر دکھائیں۔

چنانچہ مرزا سلطان بیگ نے شاعری اور فٹ بال کو اپنی ذات میں اس طرح ضم کیا کہ وہ لازم وملزوم بن کر رہ گئے کہنے والے کہتے ہیں تو پھر سچ ہی کہتے ہوں گے کہ مرزا صاحب کی آتی جوانی تھی کہ جھومر، جھلنیاں، چمپا کلی، چندن ہار، پائل اور پازیب بناتے بناتے کسی شوخ نگاہ کے گھائل ہوئے اور پھر زلف و کاکل چشم و ابرو رُخ و رخسار لب و دنداں اور قدو قامت کی قصیدہ خوانی کرنے لگے۔ آتش تو بہت پہلے کہہ گئے تھے کہ۔

بندشِ الفاظ جڑنے کے نگوں سے کم نہیں شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

مرزا سلطان بیگ نے ایک طرف زیورات میں نگ جڑے تو دوسری طرف شاعری میں مرصع سازی کی۔ اور آتش کے شعر کو عملاً سچ کر دکھایا۔ ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۱۴ء میں ہوا۔ ابتدا میں آغا شاعر قزلباش اور بزم آفندی سے اصلاح لی۔ بعدازاں صوفی امیر احمد خاں آنگر کے شاگرد بنے۔

دلّی والے جانتے ہیں کہ آغا شاعر قزلباش کتنے آڑھے ترچھے آدمی تھے کبھی دنیا سے بیزار گلے میں گیروا کفنی ڈالے ننگے سر پھرنے لگے اور کبھی جوگی پھیرے سے گھبرائے تو پھر دنیا دار بن گئے۔ کسی کو شاگرد بنایا اور کسی کو بھگا دیا۔ چنانچہ یہی مرزا سلطان بیگ کے ساتھ ہوا۔ وہ مرزا سلطان بیگ کو چاہتے بھی تھے

Marfat.com

اور کہتے تھے کہ تم میرے شاگرد بن کر کیا کرو گے، تمہارا رنگ مجھ سے نہیں ملتا. بزم آفندی کو کلام دکھاؤ۔ مرزا سلطان بیگ انھیں کلام دکھانے لگے تو کسی محفل میں ٹوک دیا۔ میاں! تمہارا رنگ آغگر سے ملتا ہے۔ آئندہ اُسے کلام دکھانا۔ مرزا سلطان بیگ نے بلا چوں چراں یہ بات بھی مان لی. اور پھر انھیں سے اصلاح لی۔

دلّی والوں کا قاعدہ ہے کہ ایک بار جو وضع بنا لی پھر ہمیشہ اُسے نبھایا. وضع داری دلّی والوں کا خاصہ تھی۔ مرزا سلطان بیگ نے بھی اپنی وضعداری کو مرتے دم تک نبھایا۔ انھیں جب بھی دیکھا۔ وجیہہ اور سنجیدہ پایا۔ مرزا صاحب جسمانی اعتبار سے متناسب جسم کے مالک تھے۔ درمیانہ قد، چھری کا پاجامہ، کبھی صدری، کبھی شیروانی، کاندھوں پر ریشمی رومال، مزاج میں نفاست، ملنسار اور خود دار آدمی تھے، لڑکپن میں فٹ بال سے عشق کیا تھا۔ تو جب تک جسم میں طاقت رہی بال اُن کی تابع رہی۔ وہ فٹ بال کے بہترین کھلاڑی تھے اور مغل فٹ بال کلب کے روحِ رواں تھے۔ ہر سال آل انڈیا دہلی دربار ٹورنامنٹ کراتے تھے۔

فٹ بال کے بعد انھوں نے شاعری کو گلے سے لگایا۔ سلطان دہلوی نے جس دور میں شاعری شروع کی پورا عہد داغ سے متاثر تھا۔ شمال تا جنوب داغ دہلوی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ جہاں استاد کے سیکڑوں شاگرد تھے جو خود اپنی جگہ استاد کہلاتے تھے۔ انھیں استادوں اور باکمالوں کی محبت سے سلطان دہلوی فیض یاب ہوئے اور کچھ ہی عرصے میں دبستان دہلی کی روایات کا جیتا جاگتا نمونہ بن گئے۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ "غزل محبت کرنے والوں کی زبان ہے۔ دلّی والوں نے محبت کو زندگی کرنے کے فن سے نوازا ہے اور غزل کو اظہار کا معتبر وسیلہ بنایا ہے۔ مرزا سلطان بیگ دلّی والے تھے. ان کی غزلیں سوزِ عشق

Marfat.com

اور سازِ زندگی سے عبارت ہیں۔ ان کے کلام میں بیان کی لطافت ہے اور زبان کا چٹخارہ ہے۔ ہیرا تراش محاورے ہیں" اور دلّی کا روزمرّہ ہے۔ اُن کے ۴۲ سالہ شعری سرمایہ سے کچھ انتخاب " خوشبوئیاں" کے عنوان سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔

مرزا سلطان بیگ مشاعروں میں اپنے باوقار انداز اور ترنم سے سماں باندھ دیتے۔ دلّی کے ایک مشاعرے میں اساتذہ فن نے ان کے اس شعر پر دل کھول کر داد دی تھی۔

چاہتا تھا میں نکالوں حسرتوں کو عشق کی　　　وہ کلیجے پٹیاں دل بن گئیں جاں ہوگئیں

۵۴-۱۹۵۲ء میں راشٹر پتی بھون میں دو شاندار مشاعرے ڈاکٹر راجندر پرشاد کی صدارت میں ہوئے تھے۔ ان مشاعروں میں مرزا سلطان بیگ بھی مدعو کیے گئے تھے، ڈاکٹر راجندر پرشاد ان کی وضع قطع اور پڑھنے کے انداز سے بے حد متاثر ہوئے اور مشاعرے کے بعد مرزا صاحب سے کہا تھا "مرزا صاحب جب تک میں یہاں ہوں اس عمارت کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی فون کر کے آجایا کیجیے۔" مرزا صاحب نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔" ذرہ نوازی ورنہ میں کس لائق ہوں" مرزا سلطان بیگ کو جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں۔ کہ اُن مشاعروں کے علاوہ وہ کبھی راشٹر پتی بھون نہ گئے۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو صدر جمہوریہ ہند کی اس پیش کش سے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔ مگر دلّی والوں کا مزاج ٹھہرا۔ قلندرانہ زیست بسر کی۔ کسی کے عہدے اور مرتبے کو کبھی خاطر میں نہ لائے۔ اپنی کھال میں مست، منھ چکنا اور پیٹ خالی۔

کہتے ہیں کہ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہتیں، ایک گھر میں دو بیویاں مشکل ہی سے رہ پاتی ہیں۔ مگر مرزا سلطان بیگ نے یہ بھی کر دکھایا۔ وہ فٹ بال گراؤنڈ میں ہمیشہ کھلاڑی نظر آئے اور مشاعروں میں خالص شاعر،

ہم نے کبھی دیکھا نہ سُنا کہ کسی نے فٹ بال گراؤنڈ میں مرزا سلطان بیگ کو کھیلتے دیکھ کر کہا ہو۔ سبحان اللہ۔۔۔۔ مکرر ارشاد ۔۔۔۔ یا مشاعرے میں کلام پر داد دیتے ہوئے سامعین کے ہجوم میں سے کسی نے نعرہ بلند کیا ہو — واہ ! مرزا صاحب کمال کر دیا، کیا زوردار کک لگائی ہے۔

مرزا سلطان بیگ کو مولانا شوکت علی محمد علی، مفتی کفایت اللہؒ، سحبان الہند مولانا احمد سعید اور گاندھی جی سے خاص عقیدت تھی۔ وہ سچے محبِ وطن تھے اور ملک کی تقسیم کے خلاف تھے۔ ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد دہلی میں جو فضا بنی اُس نے ہندو مسلم اتحاد اور اتفاق کو زبردست نقصان پہنچایا۔ ایک عام تاثر تھا۔ کہ مسلمان اس ملک کے تئیں وفادار نہیں۔ کچھ دن بعد جب اس زہریلے پروپیگنڈے کے بادل چھٹے اور مطلع صاف ہوا تو یہ بات واضح ہوگئی کہ جدوجہد آزادی میں مسلمانوں نے کیا رول ادا کیا تھا۔ اسی دلّی میں ایسے کتنے مجاہدوں کے خاندان ہیں جنھوں نے ملک کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دی مگر کبھی کسی صلہ کی تمنا نہیں کی۔ اس ماحول میں جب کہ دہلی کے بچے کھچے مسلمانوں کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جارہا تھا۔ مرزا سلطان بیگ نے ایسے اشعار کہے۔

جو ہوں اس سے منکر تو ہو جائیں کافر — محبت وطن کی ہے ایمان اپنا
ہماری وفاؤں پہ شک کرنے والو — کیا تم نے کھویا ہے ایمان اپنا
نہ ہو ملک تقسیم کہتے رہے ہم — مگر کر گیا کام شیطان اپنا
اصولوں سے گاندھی کے جو بھی پھرے گا — کرے گا حقیقت سے نقصان اپنا
کبھی شہر دہلی میں اپنا مکان تھا — نہ اب کوٹھڑی ہے نہ دالان اپنا
جو ہے ساتھ اپنے وہ اپنا سلطان — نہ ایران اپنا نہ افغان اپنا

مرزا سلطان بیگ نہ بہت پڑھے لکھے عالم فاضل تھے نہ مفکر اور مدبّر۔ اپنی آنکھوں سے جو دیکھا دل نے جو محسوس کیا ذہن نے جسے رد و قبول کیا۔

Marfat.com

اس کا برملا اظہار کر دیا۔

دہلی میں عام طور پر مشاعرے بڑی عمارتوں، حویلیوں اور دیوان خانوں میں منعقد ہوتے تھے۔ لیکن ۱۹۴۷ء سے یہ مشاعرے، عمارتوں سے باہر بازار میں آکر جمہوری ہو گئے۔ جمہوریت میں ہر طرح کی آزادی ہوتی ہے۔ محمود و ایاز کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ مشاعرے کے آداب شائستگی اور وقار میں رفتہ رفتہ کمی آتی گئی۔ اب مشاعرے ذوق کی تسکین کے بجائے تفریح کا سامان بن گیا۔

مرزا سلطان بیگ مشاعروں کی اس بدحالی پر کڑھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا:

> "میاں! اِن چوک اور چوراہوں کے مشاعروں نے شاعروں کو غارت کر دیا، اس فن شریف کو بدنام کر دیا۔ اب شاعر ایسے شعر کہتے ہیں کہ عام آدمی کے ادنا جذبات بھڑکیں اور وہ داد کے ڈونگرے برسادے۔ تاکہ اگلے مشاعرے میں پھر اُنھیں بلایا جائے۔ میاں اب تو ہر چیز تجارت بن گئی ہے۔"

واقعہ یہ ہے کہ دلّی کے مشاعروں کی پُروقار روایت کو ان بازاری اور تجارتی مشاعروں نے مجروح کیا ہے۔ آج کسی بھی مشاعرے میں جائیے اچھا شعر سننے کو کان ترس جائیں گے۔ کبھی کوئی اللہ کا بندہ جسارت کرتا ہے۔ تو بد ذوق سامعین کی بے دادا سے سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ وہ شاعری کرے یا تجارت! اسے زندہ رہنا ہے اور آج کے دور میں خالی پیٹ شاعری نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ تجارت شروع کر دیتا ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی مصنوعات کا ایجنٹ بن کر شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک چکّر لگاتا ہے۔ آج یہاں

Marfat.com

مشاعرہ ہے کل وہاں۔ پرسوں کا ٹکٹ بک ہے۔ اترسوں کی فلائٹ ہے۔ آج کا تجارتی شاعر برائے نام شعر کہتا ہے۔ اس کا زیادہ وقت منتظمین مشاعرہ کے خطوں اور ٹیلی گرام کے جواب دینے۔ اپنا بھاؤ بڑھانے اور دوسروں کے نرخ گرانے میں گزرتا ہے۔ اس افراتفری میں چند لمحے میسر آئے تو اٹھتے بیٹھتے چند شعر ہو گئے۔ اللہ اللہ خیر سلّا۔۔۔!

اب نہ فکرِ سخن ہے نہ وہ پہلے جیسا ذوق اور شوق۔ سیاست اور تجارت کا بازار گرم ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، مرزا سلطان بیگ کا پیٹھ پیچھا ہے۔ مرحوم نے شاعری کی تجارت نہیں کی! اپنا اور بچوں کا پیٹ پالنے اور تن ڈھانپنے کے لیے 'زرگری' کے ہنرِ لطیف سے جو ملا اسی میں گزارہ کیا۔ مرتے دم تک اپنی وضعداری اور خود داری کو نبھایا۔ قدروں کی پاسداری کی۔ روایتوں کو نبھایا۔ اور ۱۶ ستمبر ۱۹۵۶ کے دن داعی اجل کو لبیک کہا۔

آج کے دور میں ڈالر اور ریال کے ہرے نیلے نوٹوں پر صبح و شام گزارنے والے ایسے وضعدار لوگوں کو کم عقل اور بے وقوف سمجھتے ہیں، مگر اس میں ان کی عقل کا قصور نہیں! کیونکہ ان کی اپنی کوئی وضع قطع نہیں جو بھی ہے مانگے کا اجالا ہے۔

جدید دور کے یہی تقاضے ہیں۔ مگر جب وہ دور نہیں رہا۔ تو یہ دور بھی نہیں رہے گا۔ باقی رہے گی ذات اللہ کی۔ اور اس کی پیدا کردہ صفات کی جنھیں وضع داری کہیے یا شرافت۔ دیانتداری کہیے یا انسانیت۔ قناعت پسندی کہیے یا قلندریت۔ خلوص کہیے یا محبت۔ کل بھی انھیں صفات کے تذکرے تھے آج بھی انھیں کے تذکرے ہیں اور کل بھی انھیں کے تذکرے ہوں گے۔

Marfat.com

سراج انور

مولانا سمیع اللہ قاسمی

چھوٹا سا۔ اندازاً پانچ فٹ سے کچھ ہی نکلتا ہوا درمیانہ قد۔ گول مٹول۔ جسم فربہی کی جانب بے تحاشا مائل۔ بھرے بھرے اعضا۔ کافی بڑی اور پھولی ہوئی توند جس پر سے پاجامہ بار بار پھسل کر نیچے آنے لگتا تو گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے اُسے اوپر کھینچتے۔ پاجامے کے ازار بند سے بندھی ہوئی کنجیاں، جن کے وزن کے باعث ازار بند بار بار نیچے گر پڑنا اور لٹکتا رہنا، لیکن اِس بات کا ذرا سا بھی احساس نہیں کہ عجیب سی مضحکہ خیز حالت ہے۔ ازار بند کی چابیاں زمین کو بوسہ دیتی اور جھنکار پیدا کرتی ہوئی اور گھسٹتی ہوئی۔ چال میں عجلت اور گھبراہٹ چلتے وقت جسم کے اوپری حصّے کا آگے کی طرف جھکاؤ۔ عُجلت میں یہ احساس ہی ختم کہ لاؤ ایک بار پھر سے ازار بند نیفے میں اُڑس لیں۔ چال میں اتنی تیزی کہ کشش ثقل بھی کچھ بگاڑنے سے عاری۔ گھٹا ہوا سر۔ ایک ملی میٹر اونچائی تک کے خشخاشی بال۔ سر پر گاندھی ٹوپی۔ موٹے کھدر کے گھر کے دُھلے ہوئے کپڑے۔ پاجامہ، کرتا اور شیروانی۔ سب کھدر کی۔ سر نہ زیادہ بڑا نہ چھوٹا۔ درمیانی، دماغ دُور بینی، سیاسی داؤ پیچ، ہندوستان کے مستقبل کی فکر، سوجھ بوجھ اور انگریزوں کے لیے نفرت سے بھرپور۔ اگر گردن ہوتی تو شاید اِس عظیم سر کا بوجھ نہ سہار سکتی، اس لیے کوتاہ گردن۔ سر کا پورا وزن ناتواں کاندھوں پر پڑا ہوا۔ چہرہ بالکل گول۔ اگر

چھوٹی سی پھولی ہوئی ناک پر پرکار رکھ کر گھمائی جاتے تو چہرے کی پوری گولائی کو احاطے میں لے لے۔ تنگ پیشانی، ماتھے پر نماز کا گٹہ۔ تل چاولی داڑھی۔ مونچھوں پر مشین پھری ہوئی۔ یعنی قطعی شرعی انداز کی داڑھی مونچھیں۔ ننھا سا دہانہ، پتلے پتلے بھچے ہوئے لب۔ ابھرے ہوئے اور پھولے سے گال، جن کے باعث سنجیدہ حالت میں بھی مسکراتے ہوئے سے لگتے۔ چھوٹی چھوٹی چیاں جیسی آنکھیں جو ہنستے وقت تقریباً بند ہو جاتیں اور مخاطب یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ وہ دیکھ کدھر سے رہے ہیں؟ آواز نہ بھاری نہ مہین۔ لہجہ میں بیتابی اور عجلت۔ ایک ہی نام کو اِس عادت کے باعث بڑی روانی سے بار بار بولنے کی عادت۔ پارہ صفت شخصیت۔ ادیبوں اور شعراء کے عاشق۔ دُکان مثل خانقاہ۔ جہاں ہر شخص حاضری دینے چلا آرہا ہے۔ یا پھر ایک کبوتر باز کی چھتری، جس پر ہر نسل اور ہر قوم کا کبوتر آکر بیٹھتا اور ہمیشہ کے لیے گرداں ہو جاتا۔ غریبوں، مسافروں اور یتیموں کے انتہا درجے کے ہمدرد، ہر ایک کے دُکھ درد میں برابر کے شریک۔ سب سے بڑی سعادت حاصل کہ مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے داماد۔ تحریکِ آزادی کے ہیرو۔ قید و بند کی صعوبتوں کے عادی اور ہر وقت جیل جانے کے لیے تیار ـــــ یہ تھے حضرت مولانا سمیع اللہ قاسمی!

مولانا ۱۹۰۷ء میں ضلع ہردوئی کے قصبہ شاہ آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد منشی نسیم اللہ مرحوم ایک سرکاری اسکول میں مدرّس تھے۔ مولانا کم عمری ہی میں دینی علوم کی تحصیل کے لیے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور گئے۔ وہاں مولانا اسعد اللہ صاحب کے خاص شاگرد رہے۔ وہاں سے فارغ ہو کر دیوبند آگئے اور ۱۹۲۷ء میں وہاں سے سندِ فضیلت حاصل کی۔ دارالعلوم میں مولانا کے خاص اساتذہ میں شیخ الہندؒ حضرت مولانا حسین احمد مدنی، علامہ انور شاہ کشمیری، شیخ الادب مولانا اعزاز علی، حضرت علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی، مفتی عزیز الرحمٰن

Marfat.com

اور مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی مرحوم تھے۔ تحصیل علم کے شوق کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ مولانا نے کرنال جاکر سنسکرت بھی سیکھی تھی۔

مولانا نے کانگریس میں شامل ہوکر حکومتِ برطانیہ کے خلاف جوش وخروش سے حصہ لیا۔ بیرسٹر آصف علی، چودھری برہم پرکاش لالہ شام ناتھ، انور دہلوی عبداللہ فاروقی اور مولانا وحیدالدین قاسمی، اُن کے معاصرین اور جنگ آزادی کے ہمدوش سپاہیوں میں تھے۔ کانگریس کے علاوہ مولانا مجلسِ احرار کے بھی سرگرم رکن تھے۔ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور مولانا سید عطاءاللہ شاہ بخاری کے زیرِ قیادت آغا شورش کاشمیری، غلام نبی جانباز، حافظ علی بہادر خاں، چودھری عبدالستار اور حکیم عبدالحفیظ کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ تقسیم ملک کے بعد جب احرار پارٹی کی سیاسی حیثیت برقرار نہ رہ سکی تو احرار خدام خلق کی بنیاد ڈالی اور تازیست اِس کے صدر رہے۔ سیاسی میدان میں مولانا سمیع اللہ بڑی برق رفتاری سے کام کرتے تھے۔ مخالف پارٹیوں کے جلسوں کو درہم برہم کرنے اور برطانوی سامراج کے خلاف ہینڈبل واشتہار تقسیم کرنے میں بڑے ماہر تھے۔ ایک بار کچھ انگریز مخالف اشتہار تقسیم کرنے کے لیے مولانا کو پشاور بھیجا گیا۔ اُن کی انہی آوٹ دور سرگرمیوں کی وجہ سے کانگریس ہائی کمان کی طرف سے مولانا کو یہ ہدایت تھی کہ وہ ایسا کوئی قدم نہ اٹھائیں کہ اُنھیں جیل جانا پڑے۔ ایک عرصہ تک مولانا اور مولانا امداد صابری صاحب پر انگریزی حکومت نے یہ پابندی لگائی کہ وہ ٹرام لائن کو پار کرکے جامع مسجد میں نہیں جاسکتے۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۰ء کو دلّی کے چیف کمشنر کے ایک حکم کے مطابق مولانا کو دہلی کی حدود میں نظر بند کردیا گیا تھا۔ اور ۱۹۴۱ء میں دوسرے آرڈر کے مطابق اُنھیں ۱۴ مئی بدھ کی دوپہر تک دہلی سے غیر حاضر رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ مولانا کی سیاسی سوجھ بوجھ اور صلاحیتوں کے باعث ۱۹۳۰ء کے آس پاس پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک معقول مشاہرے پر

اپنے ساتھ رہ کر کام کرنے کی پیشکش کی تھی جو مولانا نے قبول نہیں کی تھی۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد مولانا جب دہلی آئے تو آپ نے کچھ عرصے تک کتب خانہ رحیمیہ میں کام کیا اور کچھ دن مدرسہ امینیہ اسلامیہ دہلی میں درس دیا۔ مارچ ۱۹۲۷ء میں مولانا نے کتب خانہ عزیزیہ قائم کیا، جس میں کتابوں کے ساتھ ساتھ کھدّر کے تھان بھی رکھے۔ اُنھیں انگریزی لباس اور کپڑے سے سخت نفرت تھی اسی لیے ہاتھ کا بُنا ہوا کھدّر دُکان میں بڑے فخر کے ساتھ رکھتے تھے اس وقت بازار میں صرف ایک دو دُکانیں کتابوں کی تھیں۔ اُردو بازار کا نام مچھلی والان تھا۔ مولانا کی کوشش اور ترغیب سے مزید دُکانیں کھُلیں۔ حضرت خواجہ حسن نظامی اور مولانا سمیع اللہ کی کوششوں سے مچھلی والان کا نام اُردو بازار پڑ گیا۔

مولانا کا نکاح ۲۶ جولائی ۱۹۳۰ء مطابق ۲۹ صفر ۱۳۴۹ھ بروز ہفتہ، حضرت مفتیٔ اعظم مولانا محمد کفایت اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی بڑی صاحبزادی سے ہوا۔ بانیٔ تحریکِ تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے نکاح پڑھایا۔

یہاں میں یہ عرض کردوں کہ میرے والد مرحوم سید جلال الدین بھی مجاہدِ آزادی تھے۔ تحریکِ خلافت میں وہ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب کے ساتھ میانوالی جیل میں رہے۔ میرے والد آصف علی والنیٹر کور میں کپتان کے عہدے پر فائز تھے۔ ۱۹۴۷ء میں والد مرحوم کی کناٹ پیلیس والی دوکان لوٹ لی گئی۔ وہ بے سہارا ہو گئے، اُن کا دِل ٹوٹ گیا اور وہ نقلِ وطن کر کے بھوپال یا ٹونک جانے کی سوچنے لگے۔ یہ مولانا سمیع اللہ قاسمی ہی تھے جنھوں نے والد مرحوم کو اس اقدام سے باز رکھا۔ انھیں بتایا کہ یہ جامع مسجد اور لال قلعہ تمہارے اجداد کے تعمیر کردہ ہیں۔ یہ تمہیں یاد کریں گے۔ اِس کے بعد مولانا نے بڑی تگ و دو کے بعد والد صاحب کو اردو بازار میں ہی دوکان دلوائی جو آج تک قائم ہے۔

مولانا کی دُکان کتب خانہ عزیزیہ پورے ہندوستان کی سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی شخصیتوں کا ایک بے مثال مرکز رہا ہے کتب خانے کے باہر لکڑی کا ایک تخت اور ایک بنچ پڑی ہوئی تھی جس پر ہندوستان کی تقریباً تمام بڑی بڑی شخصیتیں بیٹھ چکی ہیں۔ کوئی شاعر، کوئی ادیب اور کوئی دانشور ایسا نہ ہوگا جسے اس بنچ پر بیٹھنے کی سعادت نصیب نہ ہوئی ہو۔ برِّ صغیر کے مایہ ناز علماء میں سے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب۔ شیخ الحدیث محمد ذکریا، رئیس المبلغین حضرت مولانا محمد یوسف، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، سحبان الہند مولانا احمد سعید، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد منظور نعمانی۔ حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب، دیوان عنایت حسین صاحب سجادہ نشین درگاہ اجمیر شریف، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن خاجی محمد صالح مولانا سمیع اللہ سے خاص انسیت رکھتے تھے۔ ملک کے ممتاز صحافیوں میں سے حافظ محمد یوسف دہلوی، مولانا عبدالوحید صدیقی، حیات اللہ انصاری، اسحاق علمی کانپوری، خوشتر گرامی، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، جمیل مہدی، سلامت علی مہدی، عبداللہ فاروقی وغیرہ سے مولانا کو گہرا قلبی تعلق رہا تھا۔

ادیبوں، شعرا اور دانشوروں میں سے جن حضرات کو میں نے اپنی آنکھوں سے خانقاہ عزیزیہ کی چوکھٹ کی جبہ سائی کرتے دیکھا ہے۔ اُن میں جانشینِ داغ سراج الدین خاں سائل دہلوی۔ وحید الدین بیخود دہلوی۔ مولانا حسرت موہانی۔ جگر مرادآبادی۔ جوش ملیح آبادی۔ فراق گورکھپوری۔ ساحر لدھیانوی مجروح سلطان پوری۔ احمق پھپھوندوی۔ شکیل بدایونی۔ قتیل شفائی۔ حفیظ جالندھری۔ ماہر القادری۔ مولانا انور صابری۔ منوّر لکھنوی۔ ساحر ہوشیارپوری روش صدیقی۔ ساغر نظامی۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ عرش ملسیانی۔ جگن ناتھ آزاد۔ پنڈت ہری چند اختر۔ بسمل سعیدی۔ دھرم پال گپتا وفا۔ پنڈت رام کرشن

مضطر ککوڑوی۔ رفعت سروش۔ سلام مچھلی شہری۔ نریش کمار شاد۔ شمیم جے پوری۔ بلال سیوہاروی۔ فنا نظامی کانپوری۔ نذیر بنارسی۔ سلیم کھتولوی۔ عزیز وارثی۔ بیکل اتساہی۔ خمار بارہ بنکوی۔ استاد رسا دہلوی۔ مجاز لکھنوی۔ کرشن چندر۔ جوہر دہلوی۔ گوپال متل۔ گلزار دہلوی وغیرہ شامل ہیں۔ اِن کے علاوہ دوسرے شعرا اور ادیب بھی گاہے گاہے رونق افروز ہوا کرتے تھے۔ ہندوستان کے ان گنت مشاعروں کی ترتیب اور انتظام یہیں سے ہوا کرتا تھا۔ تقریباً روز ہی دُکان میں محفلِ شعر وسخن منعقد ہوتی اور رات گئے تک جمی رہتی۔ جگر مرادآبادی مشاعرے کے علاوہ کہیں بھی غزل نہیں سناتے تھے مگر دہلی میں قیام کے دوران دُکان میں رات کے دو بجے تک تازہ کلام سناتے رہتے۔ جو نشست جمتی اس میں مخالف وموافق، ہر مزاج اور ہر ذہن کے لوگ آتے اور یہاں بیٹھ کر باہمی رنجشیں بھول جاتے۔ سیاست اور ادب بھی موضوعِ گفتگو بنتے۔ نو آموز حضرات اپنی تحریر یا کلام کے کچھ حصّے سناتے اور حسبِ توفیق یا تو داد پاتے یا تنقید کا نشانہ بنتے۔ مولانا کی دُکان درحقیقت قومی یک جہتی کا گہوارہ تھی جہاں ہر طبقۂ فکر کے لوگ جمع ہوا کرتے تھے۔

۱۹۴۷ء کے بعد جب فرقہ پرستی نے سر ابھارا اور جگہ جگہ بے گناہ انسانوں کی جان ومال کا اِتلاف ہونے لگا تو مولانا بہت دل برداشتہ ہوتے تھے اور پولیس ومقامی حکام کی جہاں جہاں جانب داری اور نااہلیت کو دیکھتے تو اپنی حکومت پر سخت سے سخت تنقید کرنے سے بھی نہ چُوکتے۔ ہندوستان جب آزاد ممالک کی صف میں کھڑا ہوا اور پنڈت جواہر لال نہرو نے مارشل ٹیٹو اور صدر ناصر کے ساتھ مل کر دنیا کو ناوابستہ تحریک سے روشناس کرایا۔

مولانا بے حد زندہ دل، بذلہ سنج اور خلیق انسان تھے، جب کوئی مصیبت کا مارا مسافر ادھر سے گزرتا، تو اُسے دسترخوان پر ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے، جب وہ کھانا کھا لیتا تو اُس سے شہر دلّی وارد ہونے کی داستان سنتے اور فرماتے: بھائی یہ تو دلّی کا مقدر ہے۔ قدیم زمانے سے لے کر اب تک

سبھی دلّی پر دھاوا بولنے کے لیے چلے آرہے ہیں۔ تم نے بھی یہی کیا ہے۔ اب آئے ہو تو کیا کروگے، یہ سوچا ہے؟" نووارد کہتا " جناب ملازمت کی تلاش میں آیا ہوں۔" سوال ہوتا "کوئی ہنر جانتے ہو۔ دلّی تو ہنر مندوں کا شہر ہے۔" وہ نفی میں گردن ہلاتا تو کچھ دیر افسوس کرتے رہتے۔ بار بار اُس کی صورت دیکھتے اور پھر کوشش کرتے کہ اُسے کسی کام پر لگوادیں۔ وہ دعائیں دیتا ہوا جاتا تو اُسے روک کر کہتے "میاں میں بھی تو غرض مند ہوں۔ کوئی مفت میں یہ کام تھوڑے ہی کیا ہے میں نے، اِن دعاؤں کے لیے ہی اتنی محنت کی تھی۔"

عموماً ایسا ہوتا کہ دسترخوان بچھانے کی استطاعت نہ ہوتی۔ جیب خالی ہوتی اور کسی مسافر کی مدد کرنی بھی ضروری ہوتی۔ دائیں طرف رکھے ہوئے لکڑی کے بکس کی تلاشی لیتے تو صرف چند اکنیاں پڑی پاتے۔ فوراً ہی کچھ سوچ کر ایک عزم کے ساتھ بے ساختگی سے اٹھتے موٹے کھدّر کا پاجامہ توند سے نیچے کھسکتا تو گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے نیفے کو اوپر کھینچتے۔ ازاربند زمیں بوس ہوتا رہتا اور وہ اِس بات سے بے خبر دُکان سے نیچے اتر کر جوتی پہنتے۔ پاجامے کو پھر اوپر کھینچتے۔ اتنی فرصت نہ ہوتی کے ازار بند کھول کر دوبارہ کس لیں۔ مسافر کو ساتھ لیے اس انداز سے آگے بڑھتے کہ ایک ہاتھ نیفے کو تھامے ہوئے ہے اور دوسرے سے مسافر کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے۔ کھدّر کی ٹوپی سر پر آڑی جمی ہوئی ہے۔ چال عجلت کے باعث ایسی ہوگئی ہے گویا فٹ بال لڑھک رہی ہے۔ اب ایک ایک دُکان پر مسافر کو لیے لیے پھر رہے ہیں اور لوگوں کو مجبور کر رہے ہیں کہ یہ مسافر ہے۔ اپنے وطن جانا چاہتا ہے۔ چند روپے دو۔ یہ دستِ سوال ہر دکاندار کی طرف دراز ہوتا رہتا۔ لوگ عادت سے واقف تھے۔ اٹھنی یا روپیہ ضرور دیتے۔ جب تھوڑی بہت رقم جمع ہوجاتی تو سوالی کو دے دیتے اور ہدایت کرتے کہ جاؤ۔ آئندہ جب جیب میں رقم ہو تب دلّی کا رُخ کرنا۔ کچھ لوگوں کو مولانا کی یہ عادت پسند نہیں تھی۔ وہ زبان

Marfat.com

سے کچھ نہ کہتے البتہ اعتراض ضرور کرتے تھے۔ ایک دن جب کسی دیہاتی بزرگ کا ہاتھ پکڑ کر وہ میرے پاس آئے تو میں نے دکانداروں کی نمائندگی کرتے ہوئے اعتراض دہرادیا کہ مولانا آخر آپ یہ تکلیف کیوں کرتے ہیں، لوگوں کو خود مانگنے دیجیے۔ مولانا کا جواب ہوتا۔ یہ خود مانگے گا تو کوئی اِسے کچھ نہ دے گا۔ یہ بھکاری نہیں، مصیبت کا مارا ہوا ہے۔ میں اِس کے ساتھ اِس لیے ہو جاتا ہوں کہ دعائیں اور ثواب ملتا ہے۔ میں یہ ثواب اکیلا ہی کمانا نہیں چاہتا۔ سب کو اِس میں شریک کر لیتا ہوں۔"

مولانا کا نعرہ تھا "چائے پیو یا پلاؤ" اور یہ بات ہر خاص و عام کے لیے مخصوص ہوتی تھی۔ مولانا کی جیب میں پیسے ہوتے تو وہ خود چائے پلاتے، نہ ہوتے تو دوسروں سے کہا جاتا کہ وہ چائے پلائیں۔ چند پھکڑ شعرا یا ادیب آگئے تو صورت دیکھتے ہی جان گئے کہ چیل کے گھونسلے میں ماس نہیں ہے۔ چپکے سے ملازم کے کان میں کچھ کہا۔ وہ اٹھ کر چلا گیا اور جلد ہی بڑی سے کیتلی میں چائے اور دس بارہ کپ لے کر آگیا۔ دکان کیا تھی ایک انجمن تھی، ایک دیوان خانہ تھا، اردو ادیبوں کا ایک کلب تھا۔ ادیب دلی کا ہو یا لکھنؤ کا حیدر آباد کا ہو یا پاکستان کا — یہاں سب کا استقبال ہوتا تھا۔ کاروبار کی فکر نہ مالک کو تھی نہ ملازم کو۔ کوئی شامت کا مارا گاہک آگیا تو آئیے تشریف لائیے، جوتیاں اتار کر اندر آجائیے، کہہ کر اُسے بُلا لیا۔ چائے کا دور چل رہا ہے تو اُسے بھی شامل کر لیا۔ وہ حیرت زدہ کہ کیسی دکان ہے جہاں کتاب خریدنے سے پہلے تواضع ہو رہی ہے۔

مولانا سمیع اللہ بیحد متواضع قسم کے انسان تھے اگر اُن کی جیب میں رقم نہ ہوتی تو بعض دفعہ ایسی انوکھی اور عجیب حرکتیں کرتے کہ دیکھنے اور سننے والے دنگ رہ جاتے۔ نیچے چند واقعات لکھ رہا ہوں۔ اگر مولانا کے بارے میں کچھ بھی نہ لکھا جائے تو یہ واقعات اُن کی عادات و اطوار کی مکمل عکاسی کرنے کے لیے

Marfat.com

کافی ہیں۔ دوسروں سے اُن کی ہمدردی، محبت اور برتاؤ کی بہترین مثال ہیں۔ واقعات تو لاشمار ہیں۔ پوری بات لکھی جائیں تو الگ سے ایک کتاب تیار ہو جائے۔ لہٰذا چند چنیدہ واقعات لکھنے پر ہی اکتفا کر رہا ہوں۔ اِن سے مولانا کی شخصیت کا ہر پہلو کھُل کر سامنے آجائے گا۔

جوشؔ ملیح آبادی عموماً فجر کی نماز سے پہلے آجایا کرتے۔ پھر بھبھکتی ہوئی روٹیوں کے ساتھ نہاری کھائی جاتی۔ ایک دن جوشؔ صاحب کو نہاری کھلانے کے لیے رقم نہ تھی، بے حد پریشان تھے کہ کل جوشؔ آئیں گے تو کیا کھائیں گے۔ رواداری کی حد یہ تھی کہ ایک دن پہلے ہی چند قیمتی کتابیں اصل قیمت سے بھی کم میں فروخت کردیں اور جوشؔ صاحب کی معمول کے مطابق دعوت کی۔ لیکن ایسی دعوت کبھی کبھار مہنگی بھی پڑ جاتی اور دوسروں سے بُرا بھلا سننا پڑتا۔ مولانا کے مزاج میں چونکہ مزاح کا عنصر بہت زیادہ تھا اِس لیے وہ بعض اوقات شرارت کی انتہائی بلندیوں کو بھی پھلانگ جاتے۔ برابر ہی میں شبیر احمد جلد ساز کا کارخانہ تھا، اُنھیں معدے کی خرابی کی شکایت رہتی تھی۔ کسی نے کہہ دیا ورزش کرو۔ بیچارے پہلے ہی اکہرے بدن کے تھے۔ ایک بار ورزش کرکے ہانپتے آئے تو مولانا کی دُکان کے سامنے لڑکھڑا کر گر پڑے مولانا سمجھے کہ اُنھوں نے شراب پی رکھی ہے۔ لکڑی اٹھائی اور انھیں دُھن کر رکھ دیا۔ ساتھ ہی ڈانٹا کہ خبیث! داڑھی لگا کر بھی شراب پیتا ہے! حقیقت کا علم ہوا تو بہت شرمندہ ہوئے اور شبیر احمد سے معافی مانگی۔

اُن ہی شبیر احمد کی دُکان میں ایک کاریگر معین الدین بنگالی رہتا تھا جو بے گھر ہونے کے باعث دُکان ہی میں سوتا تھا۔ اگلے دن عید تھی، مولانا کی جیب ہلالِ عید کے درمیانی حصّے کی مانند خالی تھی۔ اور ایک بیوہ کی مدد کرنی بھی ضروری تھی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ چاند رات کے باعث سڑک پر رونق تھی۔ مولانا چپکے سے دوکان سے اُٹھے معین الدین بنگالی کو دیکھا۔ وہ سو رہا تھا۔ آہستہ سے

اس کی جیب کی تلاشی کی۔ تیس روپے نکالے اور آگئے۔ عید کی نماز کے بعد دیکھا کہ معین الدین گالیاں بکتا ہوا جا رہا ہے۔ اُس سے پوچھا کہ ارے گالیاں کیوں بک رہے ہو؟ وہ بولا،" مولوی شاب رات کشی شالا نے ہماری جیب سے پیشہ نکال لیا"۔ اُس وقت تک مولانا کی جیب میں رقم آچکی تھی۔ ہنس کر بولے؛ " ارے میاں وہ شالا میں ہی تھا۔ ضرورت تھی تمھیں اپنا سمجھ کر نکال لیے۔ اب خدا کے واسطے مجھے گالیاں مت دو، یہ اپنے تیس روپے سنبھالو اور عید مناؤ۔

دوسروں کی جیب سے پیسے نکلوا کر چائے پینا اور پلانا مولانا کی فطرت تھی اور انھیں ایسا کرکے ایک خاص لطف حاصل ہوا کرتا تھا۔ ایک بار سب انسپکٹر آگیا۔ اُس نے اعتراض کیا کہ آپ کی دُکان صبح چھ بجے سے رات دو بجے تک کھلی رہتی ہے۔ آپ نے چھُٹّی کا فارم بھی نہیں لگا رکھا۔ آپ کا چالان ہوگا۔ مولانا اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بولے، آپ بیٹھ جائیے اور جیب میں سے دو اکنیاں نکالیے۔ انسپکٹر حیرت زدہ کہ نہ جانے اِس بات کا کیا مطلب ہے۔ وہ مولانا کے اخلاق سے بھی متاثر ہوا تھا۔ اُس نے دوّنی دے دی۔ مولانا نے فوراً چائے منگوائی اور اُسے پلائی۔ بعد میں فرمایا۔" میاں ہم قلندر لوگ ہیں۔ صبح سے رات گئے تک آپ لوگوں کی خدمت کے لیے دکان کھولے رکھتے ہیں۔ آپ تشریف لے جائیے اور جب چائے پینے کی خواہش ہو، جیب میں دو اکنیاں ڈال کر یہاں آ جائیے"۔ انسپکٹر مسکرانے لگا اور ہاتھ ملاکر رخصت ہوگیا۔

کوئی بدمعاش تھا جو جیل سے فرار ہوکر آیا اور بُندو پان والے کی دُکان پر کھڑا ہوکر پان کھانے لگا۔ پولیس نے آکر دھرلیا۔ بدمعاش نے چاقو نکال لیا۔ اِس پر پولیس اُسے گھسیٹتی ہوئی دریا گنج کی طرف لے جانے لگی۔ مولانا کی دُکان کے سامنے پہنچا تو اکڑ دکھانے لگا۔ اس پر پولیس نے اُسے لٹا کر ڈنڈوں سے مارنا شروع کیا۔ مولانا یہ ظلم دیکھ کر برداشت نہ کرسکے اور بدمعاش کے اوپر

Marfat.com

گڑگڑا اُس کی ڈھال بن گئے، منع کرتے رہے کہ مت مارو اتنی بے دردی سے۔ پولیس نے مداخلت کے جرم میں پکڑ لیا۔ علاقے کے لوگوں نے بمشکل چھڑایا۔ جیل جانے کے لیے وہ ہمیشہ تیار رہا کرتے تھے اور اِس مقصد کے لیے ایک بستر اور وضو کا لوٹا ہر وقت تیار رکھتے کہ نہ جانے کب جانا پڑ جائے۔

شکیل بدایونی مرحوم سے مولانا کو خاص لگاؤ تھا اور شکیل بھی اُن کی بہت عزت کرتے تھے۔ شکیل کی نظروں میں مولانا کی کیا قدروقیمت اور اہمیت تھی وہ ایک خط سے عیاں ہے جو شکیل بدایونی نے بیس جنوری ۱۹۵۸ء کو مولانا کو باندرہ بمبئی سے لکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"محبِّ محترم و معظّم مولوی صاحب! وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو! میں وہی ہوں آپ کا شکیل بدایونی جسے ایک ہزار میل کی دُوری نے شاید آپ کے دل سے فراموش کروا دیا ہے۔ آپ کی دُکان جو زائرینِ ادب کے لیے مکّہ سے کم نہیں اب تک میرے تخیل کی دیوار پر نقش ہے۔ کیسے کیسے لوگ آئے اور درِ حضور پر سجدے کر کے چلے گئے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ آغا طاہر مرحوم اور احمق پھپھوندوی اِسی محبت کو لے کے طواف کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ مگر بُرا ہو موت کا جس کو یہ اظہارِ عقیدت گوارا نہ ہوا۔ اور ان کو وہاں پہنچا دیا جہاں سے ہم کو کوئی اُن کی خبر نہیں آتی۔ اقبال مرحوم مرتبۂ اسلام کی جھلک اگر اپنے اِس مصرع میں بیان نہ کرتے ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

تو شاید یہی شعر میں آپ کی دوکان کی شان میں کہہ ڈالتا۔ میرا خیال ہے کہ اِس مصروف اور تیز رفتار زندگی میں اگر مطالعہ کی مہلت نہ مل سکے تو انسان کو چاہیے کہ کچھ دنوں کتب خانہ عزیزیہ میں صرف

تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ آیا کرے۔ مختلف نظریات کے اِس سنگم پر
کیا نہیں ملتا۔ خدا اِسے سلامت رکھے اور آپ کی عمر اتنی دراز ہو کہ
چاند سورج کو بھی آپ پر رشک آنے لگے۔"

ایک بار شکیل اور نابینا شاعر سلیم کھتولوی کسی مشاعرے میں دلّی آئے۔ مولانا نے شکیل سے کہا کہ اپنے معیار کا کوئی مشاعرہ سلیم کھتولوی کو دلوادو کیونکہ انھیں اپنی لڑکی کی شادی کرنی ہے۔ شکیل نے اپنے پاس سے ۵۰۰ روپے دے دیے۔ مولانا نے پوچھا کہ اگر تمہاری دو لڑکیوں کی شادی ہو تو کیا پانچ سو میں ہو جائے گی۔ شکیل نے ایک ہزار کا چیک کاٹ دیا۔ مولانا نے پھر کہا کہ ایک نابینا شیخ کہاں بنک کے چکّر کاٹتا پھرے گا۔ یہ سن کر شکیل نے کچھ رقم اپنے پاس سے اور کچھ دوسروں سے لے کر اُسی وقت سلیم کھتولوی کو دی۔

دلّی میں ایک صاحب ہیں بنارسی لال انھوں نے حضرت جگر مرادآبادی کا کلام بغیر حقوق کی رقم دیے چھاپ لیا جگر صاحب نے مولوی صاحب سے شکایت کی اور کہا کہ میں بنارسی لال پر دعویٰ دائر کردوں گا۔ مولانا نے فوراً بنارسی لال کو بلوایا اور کہا کہ یہ جگر صاحب ہیں اور مقدمہ بھی بڑی بے جگری سے لڑتے ہیں۔ یہ نوبت آنے سے پہلے اِن کے پیر پکڑلو۔ غرض بنارسی نے پیر پکڑلیے اور اِس طرح حقوق ادا ہو گئے۔

اردو بازار کے کچھ من چلوں نے ایک بار مولانا سے کہا تھا کہ حضرت آپ کی کافی عمر ہو گئی ہے۔ نہ جانے کب بلاوا آجائے اِس لیے پہلے ہی سے اپنی وصیت کردیجیے۔ مولانا نے ہنس کر فرمایا تھا، ہم ابھی جانے والے نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں اسّی نوّے سال میں جایا کرتے ہیں۔ پھر بھی وصیت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور وہ یہ ہے کہ ہمیشہ مسافروں کی خبرگیری کرو۔ اُن کے دُکھ درد کو اپنا سمجھو۔ حتی المکان اُن کی مدد کرو اور اُن کی جو بھی ضرورت ہو وہ پوری کرو۔ چونکہ مولانا آخری عمر میں ذیابیطس اور اختلاج قلب کے امراض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ چنانچہ نوجوانوں کو اپنی وصیت سنانے کے عین نو دن بعد انھوں نے ۶ر اگست ۶۹ء۱۹ بروز بدھ رات کے تقریباً آٹھ بجے اپنی محبوب نشست گاہ یعنی

کتب خانہ عزیزیہ میں ہی داعئ اجل کو لبیک کہا اور جامع مسجد کے شمالی دروازے کے نیچے باغیچی میں رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کے پہلو میں سپردِ خاک کیے گئے۔ مولانا کی نماز جنازہ امیر جماعتِ تبلیغ، مولانا محمد انعام الحسن صاحب نے پڑھائی۔

ایسے پیارے لوگ، غریبوں کے ایسے ہمدرد، احباب کی قدر اور بزرگوں کا ادب کرنے والے، بڑوں میں بڑے اور نوجوانوں میں نوجوان بن جانے والے، ہر کس وناکس کے غم خوار اور وضعدار لوگ دلّی میں اب کہاں؟ مولانا سمیع اللہ قاسمی کی یاد اب جب بھی آتی ہے تو بے ساختہ میرؔ کے انداز میں سوچنا پڑتا ہے:

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

Marfat.com

سید تحسین حیدر

مولوی سیّد محمد سلیمان عباس رضوی مرحوم

افسانۂ نگارِ جہاں انتخاب ہے — جو نقش ہے خدا کی قسم لاجواب ہے

اس لیے کہ نقّاس خود واحد و لاثانی ہے۔ اس عالم رنگ و بو سے لاتعداد غنچہ وگل اُبھرتے ہیں جن کی رنگت مختلف، بُو باس جُدا، حالانکہ ایک چمن ایک مالی یا یوں کہیے کہ ایک ماں، ایک باپ، ایک ماحول کے پروردہ، لیکن امزجہ مختلف، آرا متضاد، اور شکل وصورت جُدا۔ اِن حالات کے پیشِ نظر، عالم علوم مشرقی ومغربی مولانا سید محمد سلیمان عباس رضوی مرحوم کی خاکہ نگاری آسان نہیں۔ اس مختصر وقت میں اُن کی ہمہ گیر شخصیت کو احاطۂ تحریر میں لانا اور چند اوراق پر ان کے واقعات وکردار کی تصویر کھینچنا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے تاہم میر تقی میرؔ کے مشہور شعر سے مولانا مرحوم کے خاکے کی ابتدا کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

خاکدانِ ہستی میں لاتعداد ہستیاں عالم ظہور میں آئیں اور چلی گئیں۔ انبیا، اوصیا اور ائمہ طاہرین کا تو ذکر کیا، ان کے علاوہ بھی ایسے افراد نقش پذیر وجود ہوئے

جن کا تذکرہ آئندہ نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔ مولوی سیّد محمد سلیمان عباس رضوی مرحوم کی شخصیت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ان کا پورا نام محمد سلیمان عباس تھا۔ سلسلۂ نسب حضرت امام رضاؑ سے ملتا ہے۔ ان کی ولادت ۱۲ جنوری ۱۹۲۴ء کو اپنے آبائی وطن قاضی کی ڈگونیہ ڈاکخانہ کوٹھی باری بزرگ ضلع اعظم گڈھ (یو۔پی) میں ہوئی۔ خود مولانا اپنے آپ کو آنجہانی اندرا گاندھی کا ہم سن بتاتے تھے۔ اُن کے والد کا اسم گرامی حکیم سیّد علی محمد رضوی تھا۔ بارہ سال کی عمر میں مولانا کے والد کا انتقال ہوگیا۔ والدہ بھی زیادہ عرصے تک حیات نہ رہیں۔ ابتدائی تعلیم دینی مکتب سے شروع ہوئی۔ مدرسہ ناصریہ جونپور سے فارغ ہوکر لکھنؤ تشریف لائے۔ اور وہاں سلطان المدارس سے صدرالافاضل کی ممتاز ڈگری حاصل کی۔ ابتدا ہی سے ذہین اور ہوشیار تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد راجہ محمود آباد کے بھانجے اور بھانجیوں کی تعلیم پر مقرر ہوئے۔ اور اس سلسلے میں کئی سال تک ریاست محمود آباد میں قیام رہا۔ اس کے بعد اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول اجمیری گیٹ دہلی میں مدرّس ہوگئے۔ یہاں اُن کا تقرر ۱۵ جولائی ۱۹۵۳ء کو ہوا۔ آج بھی اُن کے پڑھائے ہوئے طلبہ مولانا مرحوم کی شفقت و محبت کو یاد کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صلاح الدین سلمہٗ جو اس سیمنار کے ڈائرکٹر ہیں اور ذاکر حسین کالج شبینہ میں اردو کے استاد ہیں۔ مولانا کے خاص شاگردوں میں رہے ہیں اور میرے بھی شاگرد رشید ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ مولانا کا تدریسی مزاج قدیم طرز کا تھا اسی لیے وہ کلاس میں سختی اور شدّت کے حامی تھے جس کی وجہ سے طلبہ ان کو چنگیز خاں کہا کرتے تھے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ مولانا صرف فارسی ہی نہیں پڑھاتے تھے بلکہ تاریخ کی کلاسیں بھی لیتے تھے۔ ڈسپلن کا یہ عالم تھا کہ اگر کلاس میں شور ہو رہا ہے اور مولانا کے پہنچنے سے پہلے کسی نے جاکر کہہ دیا کہ چنگیز خاں

آرہے ہیں تو کرفیو کا سا سناٹا ہو جاتا تھا۔ کلاس میں وہ طلبہ سے ذرا سا بھی لاڈ پیار روا نہیں رکھتے تھے۔ کلاس کے باہر اُن کا رویّہ انتہائی مشفقانہ اور محبت آمیز ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صلاح الدین سلمٰہ ہی کا کہنا ہے کہ ساتویں کلاس میں جو فارسی ہم نے مولانا سے پڑھی آج تک اس سے زیادہ استعداد نہ بڑھ سکی۔ اور وہ موجودہ زمانے کے بی۔ اے کے معیار کی فارسی تھی۔

مولانا نے صدر الافاضل کے علاوہ پرائیویٹ طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے عربی اور فارسی میں ایم اے کی ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ اس دوران مختلف مقامات پر بہتر مستقبل کے لیے قسمت آزمائی بھی کرتے رہے۔

ایک واقعہ جو خود مولانا مرحوم نے مجھ سے بیان کیا کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے عربی ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرار کی جگہ نکلی۔ کرنل سید بشیر حسین زیدی صاحب اس وقت وائس چانسلر تھے اور مولانا سے ان کے قریبی مراسم بھی تھے۔ چنانچہ مولانا زیدی صاحب کی رہائش گاہ علی گڑھ پہنچے۔ زیدی صاحب نے خود تحریک فرمائی، درخواست لکھوائی حالانکہ وقت گزر چکا تھا لیکن امیدواروں کی فہرست میں مولانا کی درخواست شامل کرادی اور مولانا کو انٹرویو لیٹر بھی مل گیا۔ اب انٹرویو شروع ہوا۔ مولانا کو کامیابی کی پوری امید تھی۔ زیدی صاحب اس انٹرویو میں شروع۔ سے موجود رہے۔ لیکن جب مولوی سلیمان عباس کا نمبر آیا تو زیدی صاحب اُٹھ کر چلے گئے اور دوسرے صاحب کا تقرر ہو گیا۔ جس کا مولانا کو سخت افسوس رہا۔ ایک اور واقعہ جو مولانا نے خود مجھ سے بیان کیا جس سے مولانا کی فطری ذہانت کا پتہ چلتا ہے کہ انٹرویو میں کسی صاحب نے مولانا سے کَتِلَہ کے معنی دریافت کیے۔ مولانا نے معنی بتائے اور یہ بھی کہا کہ غالباً اردو میں جو لفظ کتلہ بولا جاتا ہے وہ اسی کَتِلَہ سے بنا ہے۔

اینگلو عربک اسکول کی ملازمت کے دوران مولانا کا تقرر بنارس ہندو یونیورسٹی میں فارسی کے لیکچرر کی حیثیت سے ہو گیا۔ وہاں ترقی کر کے ریڈر ہو گئے۔

Marfat.com

ریڈر ہونے کے لیے اس زمانہ میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ امیدوار پی۔ ایچ۔ ڈی ہو یا اس نے کوئی ایسا علمی کام کیا ہو جو شائع ہوا ہو۔ قاعدہ ہے کہ جو لوگ فنِ تقریر کے شہسوار ہوتے ہیں وہ میدانِ قلم میں کوتل نظر آتے ہیں۔ مولانا بھی اس کلیہ سے مستثنٰی نہ تھے۔ انٹرویو کے دوران مولانا کے فرزند سید محمد سلطان عباس سلمہٗ نے مولانا مرحوم کی لکھی ہوئی کتاب کی تین گیلی جلدیں لاکر پیش کیں۔ اور مولانا ریڈر ہو گئے۔ بقول ڈاکٹر امیر حسن صاحب عابدی "مولانا تقریر میں پکّے اور تحریر میں کچے تھے"۔ چنانچہ فارسی ادب میں مولانا کی کوئی کتاب پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے منظر عام پر نہ آسکی۔

بنارس ہندو یونیورسٹی میں مولانا علمی اور ادبی خدمات انجام دیتے رہے ستمبر ۱۹۸۴ء میں مولانا اپنے بھتیجے اور بھتیجی کی شادی میں شرکت کے لیے اپنے وطنِ مالوف تشریف لائے۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۸۴ء کی شام برات آنے والی تھی۔ مولانا چونکہ طہارت کے دلدادہ تھے اس لیے صبح کے وقت اپنے بھتیجے زیارت حسین کے ہمراہ جن کی دماغی حالت متوازن نہ تھی، غسل کے لیے تالاب گڑھی تشریف لے گئے۔ تالاب میں داخل ہوئے۔ تیرنا بخوبی جانتے تھے۔ غسل کرکے باہر نکل آتے۔ اچانک شبہ ہوا کہ شاید سر کے کچھ بال خشک رہ گئے لہٰذا دوبارہ تالاب میں داخل ہوئے مگر خود نہیں نکلے، نکالے گئے۔ اُن کا بلڈ پریشر بھی اکثر بڑھ جاتا تھا اور ۱۱۰/۲۳۰ تک پہنچ جاتا تھا۔ غالباً اسی عالم میں دل کا دورہ پڑا اور مولانا نے تالاب ہی میں جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اِنّا لِلّٰہِ وانا الیہِ راجعون ۔ اس سے قبل سفرِ ایران کے وقت بھی مولانا پر دل کا دورہ پڑا تھا جس کی وجہ سے یادداشت اس درجہ محو ہو گئی تھی کہ لڑکی کی شادی بھی یاد نہ تھی۔ ذرا سی دیر میں شادی کا گھر ماتمکدہ بن گیا۔

یہ کیا درد میں ڈوبا ہوا نظارا تھا　　جہاں برات سجی تھی وہیں جنازا تھا

سلطان عباس سلمہٗ شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے

Marfat.com

دوسرے صاجزادے ریحان عباس سلمہ بنارس سے بلوائے گئے۔

دوسرے روز ۲۰ ستمبر ۸۴ء کی صبح مولانا کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ مولانا کے رفیق کار پروفیسر ڈاکٹر مولوی بدرالحسن صاحب صدر شعبہ عربی بنارس ہندو یونیورسٹی نے نماز جنازہ پڑھائی اور سوئم کی مجلس میں ذاکری بھی فرمائی۔

"غریق رحمتِ کلیبہ" سے تاریخِ وفات نکالی گئی

۱۹۸۴ء

علمی استعداد

مولانا عربی فارسی اور اردو زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ فاضل علوم مشرقی و مغربی تھے۔ دوران تعلیم مولانا کو سلطان المدارس لکھنؤ میں جن قابل اساتذہ سے استفادے کا موقع ملا ان میں مولوی سید محمد باقر صاحب مجتہد مرحوم پرنسپل، مولانا ابن حسن صاحب مرحوم نونہروی، مولانا سید محمد صاحب سابق پرنسپل سلطان المدارس لکھنؤ اور مولانا عبدالحسین صاحب منطقی قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا کے ہم سبق مولوی غلام حسین صاحب جلالپوری تھے جو آج کل چک الہ آباد میں امام جمعہ و جماعت ہیں۔

صدر الافاضل کے علاوہ مولانا نے فارسی اور عربی میں ایم۔ اے کے امتحانات بھی پاس کیے تھے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے کوشش کرتے رہے چونکہ فنِ تقریر کے ماہر تھے اس لیے زیادہ وقت نہ دے پائے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ لیکن انھوں نے ڈاکٹر شمیم جہاں لیکچرر بنارس ہندو یونیورسٹی کو اپنی نگرانی میں

Marfat.com

شیخ علی حزیں کی ادبی خدمات پر تحقیقی مقالہ تیار کرایا۔

مولانا کی علمی استعداد سے متعلق ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ مولانا مرحوم اقبال عباسی صاحب استاد اینگلو عربک اسکول کی موجودگی میں فرقت کاکوروی مرحوم کے دولت کدے واقع پہاڑی بھوجلہ دہلی پر تشریف لاتے فرقت مرحوم نے اپنی تحریر دکھائی اور کہا کہ مولانا! جب تک آپ اس کو پڑھ کر اظہار اطمینان نہ کرلیں گے میں اس مضمون کو طباعت کے لیے نہیں بھیجوں گا۔

مولانا کی علمی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ کرنل سیّد بشیر حسین زیدی صاحب جب سوڈان تشریف لے جارہے تھے تو وہ مولانا سلیمان عباس مرحوم کو عربی کے مترجم کی حیثیت سے اپنے ساتھ لیجانا چاہتے تھے۔

مولانا کا حُلیہ

رنگ کھلتا ہوا گندمی، قد میانہ درجہ کا، لمبان چوڑان میں تناسب، جسم فربہ تو نہیں مگر گداز تھا۔ البتہ زمانے کے نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ آخری عمر میں کسی قدر توند نکل آئی تھی اور اسی مناسبت سے جسم بھی کسی قدر بھاری ہوگیا تھا۔ ورنہ عالم شباب میں وہ اکہرے جسم اور متوسط قد و قامت کے انسان تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی جن میں ذہانت کی چمک جلوہ گر تھی۔ ناک متوسط پتلی اور کھڑی دانت موتیوں کی طرح جڑے ہوئے مگر پان کھانے کے اثرات سے محفوظ نہ تھے۔ سر پر بال، چہرے پر داڑھی جو زیادہ گھنی تو نہیں تھی۔ اگر لمبائی چوڑائی کے حساب سے متوسط داڑھی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ سیاہ خضاب بھی استعمال کرتے تھے۔ مگر انتقال سے تین سال قبل خضاب ترک کردیا تھا۔ پان بے حد کھاتے تھے۔ چاندی کی ڈبیہ جو پانوں کے لیے مخصوص تھی ہمیشہ ساتھ رہتی جس میں پان چھالیہ کے علاوہ زردہ بھی ہوتا تھا اور کبھی کبھی چھوٹی الائچی بھی۔ خود تو پان

کھاتے ہی تھے دوسروں کو بھی مزے لے لے کر کھلاتے تھے۔ لیکن اس قدر محتاط کہ کبھی اُن کے کپڑوں پر پان کا دھبہ نہیں دیکھا گیا۔ مجموعی طور پر ان کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایک عالم اور ذہین انسان سے سابقہ ہے۔

لباس:

مولانا مرحوم عام طور پر گرمیوں میں سفید شیروانی اور سفید ٹوپی پہنتے تھے اور کبھی کبھی بادامی رنگ کی شیروانی بھی زیب تن ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ویسی ہی ٹوپی۔ ململ کا سفید کُرتا، سفید لٹھے کا ڈھیلا پاجامہ، باریک کنی کا مڑا ہوا پہنتے تھے۔ سردی کے موسم میں جسم پر سیاہ یا نیلی سرج کی گرم شیروانی ہوتی تھی اور سر پر اونچی باڑھ کی کھال کی ٹوپی۔ جس کا رنگ کبھی سیاہ، کبھی سلیٹی اور کبھی کشمشی ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ تو میں نے مولانا کو سفید ولایتی خرگوش کی کھال کی ٹوپی بھی پہنے دیکھا تھا۔ ایام عزا میں ذاکری کے دوران شیروانی پر سیاہ عبا بھی پہنتے تھے۔ عیدین کی نماز پڑھاتے وقت سیاہ عبا کے ساتھ سر پر سیاہ عمامہ بھی ہوتا تھا۔ عینک کا استعمال بھی کرتے تھے۔ جو عام طور پر سنہرے باریک فریم کی ہوتی تھی اور اُن کے چہرے پر خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ دائیں ہاتھ میں عقیق اور فیروزہ وغیرہ کی انگوٹھیاں بھی ہوتی تھیں۔ موزے کے ساتھ براؤن رنگ کا جوتا بھی پہنتے تھے۔

شخصیت:

مولانا کی ذات ہمہ صفت موصوف تھی۔ اُن کے نام سے پہلے لفظ مولوی جڑا ہوا ہے جو کسی اجنبی کے ذہن میں موصوف کے متعلق ایک مخصوص تاثر قائم کرنے

Marfat.com

یں ضرور معاون ثابت ہو گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کی شخصیت رنگا رنگ تھی۔ وہ بڑے مولوی ہی نہیں تھے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ نہایت ظریف طبع اور مرنجاں مرنج انسان تھے۔ خود ہنستے اور دوسروں کو ہنساتے۔ جس محفل میں وہ موجود ہوتے کبھی پھیکی نہ ہوتی تھی۔ بذلہ سنج اور ذہین انسان تھے اور پہلی نظر میں مخاطب کی شخصیت کو پہچان لیتے تھے۔ اس کے علاوہ نہایت خلیق، منکسر المزاج اور وضعدار انسان تھے۔ ایک مرتبہ مجھے ۱۹۵۷ء میں جب مولانا محلہ شیخان باڑہ ہندوراؤ دہلی قیام پذیر تھے ان کے یہاں قیام کا اتفاق ہوا۔ بے حد متواضع اور مہربان ثابت ہوئے۔

اعزا سے حسنِ سلوک کا یہ عالم تھا کہ مولانا کو ایک مرتبہ حج کا موقع میسّر آیا تو اپنے بجائے اپنے بڑے بھائی سیّد مزمّل حسین کو بھیجدیا۔ زیارت حسین اُن کے بھتیجے اپنے والد کے ہمراہ پاکستان چلے گئے تھے وہاں اُن کے والد کا انتقال ہو گیا تو مولانا نے بھتیجے کو ہندوستان بلالیا۔ حالانکہ قانونی دشواریاں تھیں اور وہی زیارت حسین آخر وقت تک ساتھ رہے۔

ہمیشہ دوسروں کی پریشانی اور مصیبت میں کام آتے تھے۔ اُن کو اپنے اعزا کی طرح ہی دوسروں کا بھی خیال رہتا تھا۔ اُن کے صاحبزادے کے قول کے مطابق اُن کو جتنی اپنی اولاد کی تعلیم کی فکر تھی اتنی ہی دوسروں کی بھی تھی۔ وہ بلاتفریق مذہب و ملت، دامے درمے، قدمے، سخنے مدد کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کو کبھی مالی فراغت حاصل نہ ہو سکی۔

ڈاکٹر صلاح الدین سلمہٗ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ اینگلو عربک اسکول کی ملازمت کے دوران جب مولانا کلاس میں درس دے رہے تھے تو دو غیر ملکی عورتیں آئیں جن کی گود میں بچے تھے۔ وہ فارسی میں گفتگو کر رہی تھیں مولانا بھی اُن سے فارسی ہی میں گفتگو کرنے لگے۔ طلبہ حیرت زدہ تھے۔ اور اچانک مولانا کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف بڑھا جس کو تمام طلبہ نے نہیں دیکھا بلکہ قریب کے

Marfat.com

طالب علم نے محسوس کیا کہ دوم رتبہ مولانا نے، اس سلسلے فرماتے ہیں دس دس روپیہ کے نوٹ نکالے اور ان دونوں عورتوں کو نہایت خاموشی سے دے دیے۔

مولانا ایک جاٹو نوجوان کی مدد کرتے تھے آج بھی مولانا کے وطن میں "مولانا سلیمان عباس بالیکا ودیالیہ" کے نام سے لڑکیوں کا ایک اسکول قائم ہے جس کو جاٹو ہی چلا رہے ہیں۔

مولانا عام اتحاد انسان کے حامی تھے۔ بنارس کے قیام کے زمانے میں مولانا تھیوسوفیکل سوسائٹی کے نائب صدر تھے۔ اور کمپیرٹیو ریلیجن Comperative Religien پر اُن کی تقریریں بھی ہوتی تھیں۔

کبھی شیعہ سُنّی اختلاف کی باتیں اُن کی زبان سے سننے میں نہیں آئیں۔ جس زمانے میں مولانا مظفر پور بہار میں عشرہ پڑھنے جاتے تھے اُن کی مجلسوں میں تعلیم یافتہ سنی مسلک کے حضرات تشریف لاتے تھے اور استفادہ کرتے تھے۔ اپنے ساتھیوں سے تعلقات کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ مولانا سب سے زیادہ اُسی سے قریب ہیں۔ وہ اتحاد کے شیدائی تھے اور برابر کوشاں رہتے تھے کہ اختلافات پیدا نہ ہونے پائیں۔ اس سلسلے میں مولانا دہلی کے قیام کے دوران انجمن حسینی سے بھی وابستہ رہے اور برابر قومی اختلافات کو رفع کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ چونکہ انجمن بازی کے چکّر میں کہیں نہ کہیں اختلافات رہ ہی جاتے ہیں لہٰذا اس قسم کے اختلافات سے مولانا کا دامن بھی محفوظ نہ رہ سکا۔

مرغوب غذا۔

مولانا کو چاول بہت پسند تھے۔ مولانا کے میزبان آغا مرزا صاحب کا بیان ہے کہ جب تک مولانا مجلس سے فارغ نہ ہو جاتے تھے میں دسترخوان پر چاول

Marfat.com

نہ آنے دیتا تھا۔ اس لیے کہ چاول آواز کے لیے مضر ہوتا ہے۔ مجلس پڑھنے کے بعد خوب چاول نوش فرماتے۔ مجلس سے قبل روٹی کے باریک باریک ٹکڑے شوربے میں بھگو کر شوق سے کھاتے اور کہتے جاتے کہ میں چاول کھا رہا ہوں۔

ذاکری۔

مولانا مرحوم فن ذاکری میں اپنا جواب آپ تھے۔ اُن کا شمار صفِ اوّل کے ذاکرین میں ہوتا تھا۔ وہ مجلس میں ابتدائی خطبہ عربی میں پڑھتے تھے جو بہت مشہور اور مقبول تھا۔ اُن کی آواز میں درد بھی تھا اور لحن بھی۔ اُس سے ان کے خطبے ہی میں کافی رقت ہو جاتی تھی۔ جو شخص اُن کی مجلس پہلی مرتبہ سنتا وہ خطبہ کی رقّت سے اندازہ لگاتا تھا کہ مجلس ختم ہوگئی۔ مولانا فطری طور پر خطیب تھے۔ زبان پر دسترس حاصل تھی۔ گھنٹوں بے تکان بولتے چلے جاتے تھے۔ میں نے پہلی مرتبہ مولانا کو ۱۹۵۳ء میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دہلی میں سُنا۔ جس میں وہ قومی اور ملّی مسائل پر دھواں دھار تقریر کر رہے تھے۔ وہاں اُن کی طلاقت لسانی کا اندازہ ہوا۔ وہ جس بات کو حق سمجھتے اس کی تائید کرتے تھے اور اس سلسلے میں وہ اپنے مدِمقابل کے کسی عہدہ اور منصب وغیرہ کا بھی خیال نہیں کرتے تھے۔ عشرۂ محرم کے سلسلے میں ایک مرتبہ پاکستان اور ایک مرتبہ ایران بھی تشریف لے گئے۔ دہلی میں مقامی طور پر مجالس کے سلسلے میں نذرانہ قبول نہیں کرتے تھے حالانکہ ان کی مالی حالت قابل اطمینان نہ تھی۔ دہلی سے بنارس جانے کے بعد بھی وہ پابندی کے ساتھ درگاہ شاہ مرداں کی ۲۰ صفر کی سالانہ مجلس میں ذاکری کے لیے تشریف لاتے رہے۔

بقول آغا مرزا صاحب سابق سکریٹری انجمن حیدری دہلی، مولانا نے تین یادگار مجلسیں پڑھیں۔

Marfat.com

پہلی مجلس:

خواجہ غلام السیدین مرحوم کے بھائی کے ایصال ثواب کے سلسلے میں پڑھی۔ جس میں سامعین کی حیثیت سے نواب زادہ مرتضیٰ علی خاں مرحوم، کرنل بشیر حسین زیدی صاحب، خورشید حیدر صاحب، آغا مرزا صاحب اور خواجہ غلام السیدین مرحوم صرف پانچ افراد شیعہ مسلک سے متعلق تھے۔ باقی لوگوں میں اکثریت اہل ہنود کی تھی جن میں بلشتر ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ مجلس کا موضوع تھا "حکمت" ایک گھنٹہ مولانا نے مجلس پڑھی۔ جب مصائب کی منزل آئی تو عورتوں کے گریہ کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوگئیں۔ دیگر سامعین نظریں جھکائے محوِ گریہ تھے۔ جب مجلس تمام ہوگئی تو سیدین مرحوم نے مولانا کو گلے لگالیا اور کہا مولانا آپ ایسی مجلس پڑھتے ہیں تو جواب دیا کہ دہلی میں عام طور پر سامعین کے مزاج کے مطابق پڑھتا ہوں۔ سیدین مرحوم اس مجلس سے اتنا متاثر ہوئے کہ اپنے بھائی کے چہلم کی مجلس پڑھوانے مولانا کو رام پور لے گئے۔

دوسری مجلس:

درگاہ شاہ مرداں علی گنج دہلی میں پڑھی جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم جو اس وقت ہندوستان کے نائب صدر تھے موجود تھے۔ خواجہ غلام السیدین بھی تشریف رکھتے تھے۔ مجلس میں سیدین صاحب مرحوم نے بھی ۴۰ منٹ تک نہایت بصیرت افروز تقریر کی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے تقریر سے معذرت کی۔ اس کے بعد مولانا کی باری آئی۔ مولانا نے اس مجلس کی ابتدا اس جملے سے کی:۔

"ذکرِ حسینؑ ذاکر حسین کے سامنے"

اس مجلس میں مولانا مرحوم نے کوئی جھول والی بات نہ کہی۔ ذاکر صاحب مرحوم شروع سے آخر تک اس مجلس میں موجود رہے۔ پوری مجلس سُنی اور روتے رہے۔

Marfat.com

تیسری مجلس :
بگھرہ ضلع مظفرنگر (یوپی) میں پڑھی۔ اس وقت بگھرے میں شیعہ سُنّی اختلاف تھا۔ ایک طرف مولانا تھے اور دوسری طرف مولانا محمد اسماعیل صاحب تشریف لائے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر لگا دیئے گئے تھے جب مولانا مرحوم کو اس صورت حال کا علم ہوا تو فرمایا کہ ہم مولانا اسماعیل صاحب سے مل لیتے ہیں۔ لوگوں نے منظور نہ کیا۔ سمجھوتہ یہ ہوا کہ مجلس ایک جگہ ہو۔ پہلے مولوی محمد اسماعیل صاحب تقریر کریں اس کے بعد مولانا سلیمان عباس صاحب اور اس کے بعد مولانا محمد اسماعیل صاحب۔ شیعہ فرقے کے لوگوں نے یہ بات تسلیم نہ کی۔ آخر مولانا نے مولوی محمد اسماعیل صاحب کو خط لکھ کر بھجوا دیا کہ میں آپ کی مجلس سے پہلے پڑھوں گا۔ سب لوگ ایک جگہ جمع ہو گئے۔ مولانا سلیمان عباس کا عنوان تھا " قرآن اور ہے خدا کی کتاب اور ہے" ۳ ½ گھنٹہ مجلس پڑھی اس دوران وقفہ بھی ہوا۔ فضائل کے بعد مولانا نے ۴۰ منٹ مصائب پڑھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیعہ اور سُنّی سب محوِ گریہ تھے اور اس کے بعد مولانا محمد اسماعیل صاحب نے تقریر ہی نہ کی اور شیعہ سنّی میل ہو گیا۔

شاید کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ مولانا سوز خوانی کے فن سے بھی بخوبی واقف تھے۔ اور جب کبھی ایامِ عزا میں اپنے وطن میں ہوتے تھے تو اپنے یہاں مجلس میں سوز، سلام اور نوحہ خود ہی پڑھتے تھے۔ صاحبزادوں کو سوز خوانی بھی سکھاتے تھے۔ آخر محرم میں گھر پر موجود تھے۔

جذبۂ طہارت

جہاں تک طہارت کا سوال ہے اس میں مولانا ضرورت سے زیادہ ہی

محتاط تھے۔ گھر میں ان کے بچے بھی اُن کے بستر پر نہ بیٹھ سکتے تھے۔ ایک لطیفہ جو مولانا روشن علی صاحب مجتہد پرنسپل فیضیہ عربک کالج میرٹھ نے مجھ سے بیان کیا کہ عشرۂ مجالس کے سلسلے میں ۔ ا ر صفر تا ۲ ر صفر مظفرپور بہار تشریف لے جاتے تھے۔ ایک دفعہ مولانا مرحوم نے مولانا روشن علی صاحب سے کہا بھئی! ہمارے بچے چھوٹے ہیں وہ ہم سے پیسے مانگتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں اس وقت پیسے نہیں ہیں تو وہ کہتے بھائی میاں! ہم آپ کے بستر پر چڑھتے ہیں۔ بس مولانا کچھ نہ کچھ ان کو دے کر پیچھا چھڑا لیتے تھے۔ کئی کئی بڑے بڑے لوٹوں سے اُن کی طہارت ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ نورالحسن صاحب ریڈر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جو اس وقت فتحپوری مسلم اسکول دہلی میں کلرک تھے۔ محمد مجتبیٰ زیدی صاحب پرنسپل اینگلو عربک اسکول دہلی سے ملنے آئے۔ اس وقت مولانا بڑا سا لوٹا لیے بیت الخلا کی طرف رواں دواں تھے کہ زیدی صاحب نے آواز دی۔ نورالحسن صاحب سے تعارف کرایا اور ازراہِ مزاح لوٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا کہ مولانا یہ کیا ہے؟

دوسرا واقعہ: اینگلو عربک اسکول میں مولانا ایک صاحب سے اکثر طہارت کے لیے لوٹا لینے آتے تھے۔ غلام عباس مرحوم مدرس اینگلو عربک اسکول بھی کھڑے تھے۔ اُن کے منھ سے ازراہِ مزاح طنزیہ جملہ نکلا کہ مولانا! اِن سے لوٹا لے کر پاک کر لیجیے گا۔ اُن صاحب کو یہ بات گراں گزری اور جواب میں کہا کہ میں نے بھی مولانا سے لوٹا لے کر قلعی ہونے کے لیے دے دیا ہے اور آیندہ کبھی مولانا کو لوٹا نہ دیا۔

(دہلی سے بنارس منتقل ہونے کے بعد جب تک مولانا کی آمد و رفت دہلی رہی ان کا قیام آغا مرزا صاحب کے یہاں کوچہ چیلان دہلی رہتا تھا۔ آغا صاحب کے گھر میں مولانا سے پردہ نہ تھا۔ گھر جیسے تعلقات تھے۔ تین تین پانی سے بھرے ہوئے لوٹے طہارت کے لیے بیت الخلا لے جاتے تھے اور بعض اوقات وہ بھی

Marfat.com

ناکافی ہوتے تھے اس لیے آغا صاحب نے مکان میں پانی کی ٹنکی بنوادی تھی اور اس کا تعلق براہِ راست بیت الخلاء سے کر دیا تھا تاکہ مولانا جی بھر کے طہارت کر سکیں۔ ظاہر ہے جب طہارت کا اتنا خیال تھا تو ارکانِ اسلامی کے اداکرنے میں کتنے محتاط رہے ہونگے)۔ مولانا حد درجہ پابند صوم وصلوٰۃ تھے حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کا خیال رکھتے تھے۔ عام طور پر مولانا ۱۲ یا ۱ بجے رات کو آرام فرماتے اور صبح نماز کے وقت اٹھ جاتے تھے۔ استخارہ کے بہت پابند تھے۔

مولانا کی شاعری

شاید کم حضرات کو یہ علم ہو گا کہ مولانا شاعر بھی تھے۔ میں نے خود اُن کو طرحی قصیدہ خوانی کی محفلوں میں ترنم سے قصیدہ پڑھتے دیکھا ہے۔ کیونکہ دیگر شعراء کے علاوہ میں بحیثیت قصیدہ گو شریک محفل ہوتا تھا۔ اُن کی آواز میں سوز بھی تھا اور ساز بھی۔ درگاہ شاہِ مرداں کی ۱۳ رجب کی محفل میں تو مولانا بحیثیت قصیدہ گو خاص طور پر شرکت فرماتے تھے۔ اُن کا قصیدہ معیاری ہوتا تھا اور قصیدہ کے تمام آداب کا پابند ہوتا تھا۔ مثلاً تشبیب، گریز مدح اور خاتمہ وغیرہ۔ اُس زمانے میں معیاری قصیدے کہنے والے لوگ کم رہ گئے تھے اور آج تو اور بھی کم نظر آتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا فنِ شاعری سے پوری طرح واقف تھے۔ بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ خود دوسروں کے کلام کی کھل کر داد دیتے تھے۔ جب کہ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ شاعر اور عالم شاذو نادر ہی دوسروں کو داد دیتے ہیں۔

Marfat.com

اولاد۔

مولانا مرحوم کی دو عدد شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی وارث حسین صاحب تحصیلدار کی صاحبزادی سے ہوئی۔ جن سے ایک لڑکی شہناز فاطمہ ہے۔ وہ ایم۔ ایس۔ سی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی ہے۔ جس کی شادی صفدر حسین صاحب انجینیر سے ہوئی ہے جو پالی ٹیکنک کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں لیکچرار ہیں۔

پہلی رفیقۂ حیات کے انتقال کے بعد دوسری شادی بھی انھیں وارث حسین صاحب تحصیلدار کی دوسری صاحبزادی سے ہوئی۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مولانا اپنے مزاج کے اعتبار سے کس قدر حلیم اور بردبار تھے۔ دوسری زوجہ سے ۵ لڑکے اور ۲ لڑکیاں ہیں۔ سب سے بڑے فرزند احسان عباس سلمہٗ ہیں جو آج کل بنگلور میں ایریا مینجر (Area Manager) ہیں۔ دوسرے صاحبزادے سلطان عباس سلمہ چنڈی گڈھ پنجاب یونیورسٹی میں فارسی کے لیکچرار ہیں۔ تیسرے صاحبزادے عرفان عباس سلمہ دہلی میں سائنس سے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں۔ ریحان عباس اور فرقان عباس بی۔ اے میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں دو صاحبزادیاں ناہید اور سعیدہ ہیں۔ ناہید سلمہا کی شادی ہوگئی ہے۔ سعیدہ علی گڈھ میں زیر تعلیم ہے۔ آج کل مولانا کے متعلقین بسلسلۂ تعلیم علی گڈھ ہی میں مقیم ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اس ہنگامہ آفریں اور پرشور دور میں، جس میں اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت کا عمل جاری ہے اور مجموعی طور پر باہمی اخوت و یک جہتی کا شیرازہ منتشر ہوتا ہوا نظر آرہا ہے۔ مولانا کی شخصیت ہمارے لیے مشعل راہ ہوسکتی ہے۔ مولانا سید محمد سلیمان عباس رضوی مرحوم اب اس دنیا میں نہیں ہیں

Marfat.com

جو آپ اُن سے شرفِ ملاقات حاصل کرسکیں۔ لیکن ہمارے پاس صرف تحریر ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے سہارے ہم نے مولانا مرحوم کو آپ سے متعارف کرانے کا شرف حاصل کیا ہے مختصر وقت میں ایسی جامع الصفات شخصیت کا احاطہ کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا تاہم کوشش کی ہے کہ جن حضرات نے مولانا مرحوم کو اُن کی زندگی میں نہ دیکھا ہو ان کے سامنے مولانا کی تصویر اُبھر کر آئے۔ ورنہ:

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

Marfat.com

شریف احمد

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی، موجودہ صدی کے نصف اوّل کے سب سے بڑے فن کار ہیں، جنھوں نے دِلّی کی مٹّی سے جنم لیا؛ اور اپنی سادہ خوبصورت اور توانا نثر کے ذریعے دِلّی کے تمدن اور تہذیب کی رعنائی اور برنائی کو ادب کے مال خانے میں محفوظ کر دیا۔

انھیں مزاح نگار سمجھا گیا۔ اُن کے ادب کو طنز و مزاح کی کسوٹی پر پرکھا گیا۔ اور یہ غلط بھی نہیں ہے — لیکن، غلط یہ ہے کہ انھیں "نرا" مزاح نگار اور طنز نویس سمجھ لیا گیا۔ "مضامینِ فرحت" کی سات جلدیں، اپنے دامن میں محض اعلا درجے کی ظرافت، خوش ذوقی و خوش مذاقی ہی لیے ہوئے نہیں ہیں، بلکہ اسلوب کی دلکشی، تاثیر اور تازگی کے ماوَرا اُن میں ایک دنیا آباد ہے — اِس دنیا کا دوسرا نام ہے: جہاں آباد، دِلّی — اور اس دلّی کے زمین و آسمان، فضا اور معاشرتی ماحول کا بھی ایک نام ہے: گنگا جمنی تہذیب، مغل ایرانی اور ہندی تمدّن کا آمیزہ — ! فرحت اللہ بیگ کے ادب کی پرکھ ابھی تک اِس طرح نہیں کی گئی — لیکن یہ پرکھ اس وقت ہمیں بھی نہیں کرنی ہے — ہمیں تو، تھوڑی سی دیر کے لیے یہ دیکھنا ہے کہ

Marfat.com

ایسے پُر تجمّل ادب کا خالق خود کیسا ہے۔؟ اور یہ دیکھنے کے لیے بھی ہمیں اُس کی ذات، زندگی اور زمانے کا اِس طرح احاطہ نہیں کرنا ہے، جس طرح ایک ادبی مورّخ، نقّاد یا سوانح نگار کرتا ہے۔ ہمیں مُو قلم سے مکمّل شبیہ بھی تیار کرنی نہیں ہے — ہاں، اس شبیہ کا ایک خاکہ بنانا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ شاید یہاں ہم میں سے کسی سے بھی نہیں ہوئی — اور اگر کسی صاحب کی ہوئی ہے، تو میں اُن سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں — ملاقات اور صحیح تر، ملاقاتیں ہوئے بغیر خاکہ لکھنا، کیا معنی — ؟ کہ یہ خاکہ نگاری کی شریعت میں کفر ہے — لیکن یہ سوچ کر اور دیکھ کر ہمّت بندھتی ہے کہ اچھی اور فنّی طور پر بہت اچھّی سوانح عمریاں، صاحبانِ سوانح کی زندگی میں، اُن کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کے بعد بھی لکھی گئی ہیں، اور اُن کے دنیا سے گزر جانے کے بعد بھی — پھر، خاکہ، سوانح عمری ہی کی ایک شاخ تو ہے۔ یہ بھی، اِس طرح لکھا جاتا رہا ہے لکھا جا رہا ہے۔ تو صاحبو سارا کھیل اس سوجھ بوجھ کا ہے، جو "شاخِ نازک" پر "پائیدار" "آشیانہ" بنانے میں صرف ہوتی ہے۔ یہ کھیل، ہر لکھنے والا نہیں کھیل سکتا — ان سطروں کے لکھنے والے کو اس کھیل کی مہارت کا ہرگز دعویٰ نہیں۔

ایک معنی میں، میری ملاقات میرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی سے ہوئی بھی ہے — اور آپ میں سے بھی بہت سوں کی ہوئی ہوگی — یعنی "مضامین فرحت" کے صفحات پر۔ اوّل تو ہر بڑا، سچّا اور کھرا فن کار اپنی تحریروں میں موجود ہوتا ہی ہے؛ دوسرے فرحت اللہ بیگ نے اپنے بہت سے مضامین میں، خود اپنی زندگی اور زمانے کو بغیر کسی اوٹ یا آڑ کے پیش بھی کر دیا ہے۔ پھر، اُن کے عزیز اور دوست غلام یزدانی نے "یادگارِ فرحت"

Marfat.com

مرتب کر کے فرحت کے نام اور کام کو واضح تر اور روشن تر کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں، گزشتہ پچاس سال میں معتبر اور نظر ور نقادوں نے اردو کے طنزیہ اور مزاحیہ ادب پر لکھتے ہوئے، فرحت کی شخصیت اور فن پر نئے زاویوں سے روشنی بھی ڈالی ہے۔

تو، "یادگارِ فرحت" کھولیے: فرحت کی دو عکسی تصویریں آپ کے سامنے آئی ہیں۔ ایک ضابطے کی، آفیشل۔ جب، زندگی کے آخری ایام میں وہ سرکارِ نظام میں انسپکٹر جنرل آف کورٹس تھے —— سر پر مخصوص دستارِ فضیلت و امتیاز، چہرے پر متانت ریشائیت، سیاہ شیروانی پر، سیاہ تر کلوک۔ ایک بے ضابطہ، غیر رسمی۔ مغربی لباس میں ملبوس، سفید بال، کشادہ پیشانی، روشن آنکھیں، پُر تمکین اور خوبصورت چہرہ۔ اوپر داہنے گوشے میں ایک آٹھ، نو سالہ بچّے کی تصویر کا عکس بھی ہے، اور یہ بچپنے کے فرحت ہیں۔

اسی کتاب میں، فرحت کی وہ لفظی تصویریں بھی ہیں، جو اُن کے اعزّہ اور احباب نے پیش کی ہیں۔ مثلاً:

"فرحت کا رنگ نہایت سرخ و سپید تھا۔ جلد صاف تھی اور ہونٹ پتلے پتلے۔ دانت چھوٹے اور پیوستہ۔ چہرہ نہ لمبا، نہ زیادہ گول۔ آنکھیں البتہ چھوٹی چھوٹی (دِلّی کی زبان میں چُنّیاں۔) ایک آنکھ دبا کر دیکھتے تھے۔ فرحت بچپن میں دُبلے اور جوانی میں چھریرے تھے۔ ہاں، آگے چل کر پیٹ کچھ نکل آیا تھا۔"

"فرحت مُغل تھے۔ صورت کے بھی، اور سیرت کے بھی۔ سُرخ وسفید رنگ۔ سرخی ایسی جیسے بُخارا کا شفتالو۔ کشیدہ قامت، چوڑا سینہ، پتلی کمر، ہاتھ پاؤں تناسب۔ آنکھیں گویا نیبو کی پھانکیں، لیکن انتہا کی نورانی —— ذہانت پڑی برستی تھی۔ مسکراتا چہرہ۔ گفتگو کا انداز بانکا۔ جھوم جھوم کر

چلتے تھے۔"

والد، میرزا حشمت اللہ بیگ غیر معمولی شکیل اور خوبصورت تھے۔ چچا علی میرزا بیگ تو گویا مغلوں کی جسمانی اور نسلی شناخت کو پوری طرح قایم کیے ہوے تھے ــــ یعنی کرنجی آنکھیں، بھورے بال اور کلّوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی ــــ اُز بیکوں اور برلاسوں کی نشانی۔ فرحت اپنے حسب، نسب سے خاصے کا نشس تھے۔ اس حد تک کہ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں اپنا مفصّل شجرۂ نسب بھی لکھ دیا ہے ــــ اس خاندان پر مُدّتوں دولت اور امارت سایہ فگن رہی، لیکن فرحت تک آتے آتے چند مکان، دُکانیں اور کچھ گاؤں رہ گئے تھے ــــ اور وہ بھی بڑی حد تک، اُن کے والد میرزا حشمت علی بیگ کی میرزا منشی کی نذر ہو گئے تھے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ ستمبر ۱۸۸۳ء میں ڈپٹی سلطان خاں کے مکان میں پیدا ہوئے۔ یہ مکان چوڑی والوں کی اُس حویلی میں تھا، جسے کچھ مدت پہلے تک راجا ستیل دامن کی حویلی کہا جاتا تھا ــــ دستور کے مطابق، فرحت کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد شاہ جی کے چھتّے والے اپر پرائمری اسکول میں داخل ہوے۔ اور وظیفہ حاصل کر کے کشمیری دروازے کے اس مدرسے میں داخل ہوئے، جس میں غدر سے پہلے ریزیڈنسی تھی اور پھر دلّی کالج ــــ لیکن کالج کی تعلیم کے لیے انھوں نے پہلے ہندو کالج اور پھر سینٹ اسٹفنز کا انتخاب کیا۔ فرحت کی زندگی میں اسٹفنز کی تعلیم بڑی معنی خیز ثابت ہوئی۔

اسکول اور کالج دونوں سطحوں پر، انھوں نے اپنی ذہانت اور ذکاوت کی داد حاصل کی؛ اور متعدّد تحریری اور تقریری مقابلوں کے انعامات حاصل کیے۔ ساتھ ہی مختلف کھیلوں اور ڈراموں میں حصّہ لے کر انھوں نے اپنی قابلیت اور طبّاعی کا مظاہرہ کیا۔ بی۔ اے میں چوں کہ اور مضامین کے

Marfat.com

ساتھ عربی بھی تھی؛ اس لیے کالج کے علاوہ، اپنے وقت کے مشہور عالم اور ناول نگار مولوی نذیر احمد سے عربی بھی پڑھی ــــ شاگردی اور طالب علمی کے یہ ایام آگے چل کر، اُن کے ایک شاہ کار "نذیر احمد کی کہانی : کچھ اُن کی کچھ میری زبانی" میں رونما ہوئے ــــ اگر معاشی حالات سازگار ہوتے تو فرحت ایم۔ اے بھی امتیاز سے پاس کرتے۔

تلاشِ معاش نے انھیں حیدر آباد جانے پر مجبور کر دیا۔ اور یہ واقعہ ۱۹۰۷ء کے اواخر کا ہے ــــ حیدر آباد، بالآخر ان کی معاشی اور متاہل زندگی کا مستقر ثابت ہوا۔ جہاں ایک ہائی اسکول کی مدد گار ہیڈ ماسٹری سے لے کر ہائی کورٹ کی انسپکٹنگ افسری تک کے مراحل انھوں نے بڑی محنت، مستقل مزاجی، دیانت اور فرض شناسی کے ساتھ طے کیے ــــ یہیں اُن کی شادی ہوئی۔ عقدِ ثانی ہوا۔ اولاد ہوئی۔ ادبی زندگی کا آغاز، ارتقا اور انجام ہوا۔ اور یہیں، پایانِ کار اُن کے سفرِ حیات کی آخری منزل بھی طے ہوئی ــــ اور یہ سانحہ ۲۷ اپریل، ۱۹۴۷ء کا ہے جساب لگا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنی جنم بھومی، دلّی میں فرحت نے تئیس، چوبیس سال گزارے، اور اس سے کہیں زیادہ، یعنی تقریباً چالیس سال، ارضِ دکن کے شہر حیدر آباد میں گزار دیے ــــ کیا دلّی کا جادو جھوٹا پڑ گیا تھا۔؟ اس لیے کہ وہ چالیس سال میں، چالیس بار تو کیا، بیس بار بھی نہیں آئے ــــ نہیں دلّی ہمیشہ فرحت میں زندہ رہی ــــ کبھی اُن کے لاشعور اور تخیئل میں، کبھی اُن کی تخلیقات میں، کبھی اُن کی شخصیت میں اور کبھی اُن کی معاشرت میں انھوں نے اشعار میں جگہ جگہ دہلوی زبان پر فخر ہی نہیں کیا ہے بلکہ بے تکلف دوستوں اور عزیزوں سے کہا کرتے تھے:

"میاں! میں خالص دہلی کی زبان لکھتا ہوں" ــــ! ان کی تحریریں اس دعوے کی سچائی کا ثبوت ہیں۔

Marfat.com

فرحت اللہ بیگ نے بڑی بھرپور زندگی گزاری ـــ پچھلی سطوروں میں اُن کی خارجی زندگی کے چند اہم موڑ، اہم واقعات ہی کو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن ان کی داخلی زندگی اس سے کہیں زیادہ اہم، عمیق، رنگارنگ اور معنی خیز ہے۔ اُن کی شخصیت جلوۂ صد رنگ کا مظہر نظر آتی ہے۔ وہ نابغہ ہونے کی حد تک طبّاع اور ذہین ہیں۔ ان کا مشاہدہ تیز، تخیّل شاداب، احساس شدید اور شعور گہرا ہے۔ بہ حیثیت طالبِ علم، ان کے ہونہار اور وعدہ کناں ہونے کا ذکر ہوا؛ لیکن ذہانت کے ایک رُخ شوخی اور پُر لطف شوخی کی مثالیں تو اُن کی زندگی میں بکھری پڑی ہیں ـــ شاہ جی کے چھتے کے اسکول میں استادوں کے نِک نیم کسی اور نے نہیں، انھوں نے ہی وضع کیے تھے۔ استادوں کا حلیہ، چہرہ مُہرہ اور برتاؤ بیان کرنے کے بعد کسی کو "سپڑے" کسی کو "دنبے" کے خطاب سے نوازنا انھیں کا کام تھا۔ کھیل اور طرح طرح کے کھیل سے دل چسپی، چاہے وہ گنجفہ، چوسر اور شطرنج ہو، چاہے کرکٹ، ٹینس اور فٹ بال، ان کی بے قرار اور متحرک شخصیت کا ایک اور پہلو ہے ـــ سینما بینی سے وہ ڈرامے کی طرف آئے۔ کالج کے دِنوں میں اچھے اداکار ثابت ہوئے۔ جہاں گئے، اس شوق نے پیچھا نہ چھوڑا ـــ کبھی انگریز اداکار ہیمنگ، کا شاگرد بنایا، کبھی آغا حشر سے گہرا ربط پیدا کیا ـــ شعروادب سے تو گویا ان کا خمیر تیّار ہوا تھا، لیکن مصوّری اور موسیقی سے بھی اچھا خاصا شغف تھا۔ دلّی کے مصوّر استاد فضل اور استاد عارف سے اُن کا تلمذ، اس پر دلالت کرتا ہے۔ وہ ہریانوی ہیں، دُو ہے، کسان جاٹ کی مانند گا سکتے تھے۔ مشاعروں میں، اپنا کلام مخصوص دلکش لحن میں پڑھ کر داد حاصل کر سکتے تھے۔

گپ بازی، جسے آج Table Talk کا نام دیا گیا ہے، اُن کا محبوب مشغلہ تھی۔ اچھا مطالعہ ہو، ذہن اور آنکھیں کھلی ہوں، حافظہ ہر جگہ

Marfat.com

ساتھ دے، اور سب سے بڑھ کر ذوقِ سلیم اور دل دردمند حصّے میں آیا ہو، تو گپ ایک قدر بن جاتی ہے۔ اور قسّامِ ازل نے، انھیں اِن خصوصیات سے بھی بہرہ مند کیا تھا۔ مجلسیں ان کی مشتاق رہتیں۔ یارانِ سرِ پل اُن کی آمد کے منتظر رہتے۔

سوال پیدا ہو سکتا ہے: اس قدر نجیب الطرفین شخص، میر درؔد، مومنؔ، اور غالبؔ سے قرابتِ قریبہ رکھنے والا، وجاہت اور ذکاوت کا مالک کسی Complex میں مبتلا کیوں کر نہیں ہوا۔ ؟ احساسِ برتری، یا اُس کی دوسری صورت احساسِ کمتری، فرحت کی زندگی اور فن میں نظر نہیں آتا۔ پھر فرحت کی مزاح نگاری کا محرّک کیا ہے — ؟ کیا اپنے عزیز، میرزا رفیق بیگ کا اصرار کہ "میرے ماہنامے" نمائش" کے لیے کچھ لکھیے —! کیا اپنے محترم معاصر ادیب، عظمت اللہ خاں کی پیہم فرمائش کہ "کچھ لکھو تم لکھ سکتے ہو۔ بہت اچھا لکھ سکتے ہو؟" اور پھر بابائے اُردو عبدالحق اور مولانا سلیم پانی پتی کا مستقل پیچھا کرنا — اہلِ نظر نے انھیں فرحت کی تحریروں کا محرّک قرار دیا ہے۔ راقم الحروف کو اس سے یک سر تو انکار نہیں، لیکن اس کے نزدیک بڑا محرک دِلّی ہے، جسے فرحت چھوڑ آئے تھے، جس میں ان کی جڑیں تھیں، جس کی یادیں اُن کے تخیّل پر بجلی بن کے برستی تھیں۔ فرحت نے بہت لکھا۔ بہت اچھا۔ بہت بُرا۔ لیکن اس پر دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ ان کے بہت اچھے کے پیچھے صرف دلّی کام کر رہی ہے — "نذیر احمد کی کہانی: کچھ اُن کی، کچھ میری زبانی"، "دِلّی کا ایک یادگار مشاعرہ" اور "پھول والوں کی سیر" میں دِلّی اور صرف دِلّی سانس لیتی ہے۔ دِلّی جو محلّات، عمارات، رہ گزاروں اور باغوں سے کہیں زیادہ ایک تہذیب کا نام تھا۔

میرزا فرحت اللہ بیگ شاعر بھی ہیں اور صاحبِ دیوان شاعر۔

عروض، بیان و بدیع سے پوری طرح آشنا۔ غزلیں بھی کہیں، نظمیں بھی، رباعیاں بھی۔ سبھی کچھ۔ یہاں تک کہ ہجو اور ریختی بھی۔ اور یہ سب انھوں نے بڑی سنجیدگی سے کیا۔ اور اس سے بھی زیادہ سنجیدگی بلکہ انہماک سے انھوں نے یقینؔ، احسانؔ اور نظیر اکبر آبادی کے کلام کی تصحیح اور تدوین کی ـــ لیکن ان کا پیمانِ وفا صرف ایک چیز سے بندھا تھا۔ وہ صرف ایک چیز کے لیے پیدا ہوئے تھے: مزاح، ظرافت اور طنز کے لیے ـــ جس کا اظہار نثر میں ہو۔ (اکبرالٰہ آبادی کی طرح نظم میں نہیں۔) اور یہ ایک چیز، ان کے قلم کے لمس سے، اردو میں کچھ کی کچھ ہو گئی۔

غیر متوازن شخصیت اچھا شاعر، اچھا مصوّر اور اچھا مُغنّی پیدا کر سکتی ہے۔ اچھا مزاح نگار نہیں۔ اچھا اور اعلا درجے کا مزاح کسی قدر آسودگی چاہتا ہے ـــ مادی اور ذہنی، اور یہ فرحت کے پاس تھی۔ کم از کم اس وقت ضرور تھی، جب انھوں نے باقاعدہ لکھنے کے لیے قلم اٹھایا۔

انھوں نے ہر رنگ میں بہار کا اثبات کیا۔ زندگی کو نت نئے زاویوں سے دیکھا۔ وہ رنگِ میرؔ بھی اپنانے کی کوشش کرتے ہیں؛ اور شاعری کے حوالے سے نظیر اکبر آبادی کی بھری پُری اور وسیع دنیا تک بھی پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فن کار کی اصل زندگی اور فن میں مطابقت اور ہم آہنگی کم ہی ملتی ہے ـــ یہ مطابقت اور ہم آہنگی فرحت کے یہاں ہے ـــ آپ اُن کے مضامین پہلے پڑھیے، اور اُن کی شخصیت کا محض ایک ہیولیٰ ذہن میں قایم کر لیجیے، اور پھر اُن سے ملیے ـــ آپ کے ذہن میں بنا ہوا ہیولیٰ گوشت اور پوست کے فرحت سے بالکل ملتا ہو گا۔ اور یہ بڑی بات ہے۔

Marfat.com

محمد فیروز دہلوی

میر باقر علی داستان گو

صاحبو! کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

میر باقر علی داستان گو کو میں نے دیکھا نہ سُنا البتہ اُن لوگوں کو دیکھنے اور سننے کا ضرور اتفاق ہوا جو میر صاحب کے والہ وشیدا تھے اور ان کی محفلوں میں شریک ہو چکے تھے اُنھیں بزرگوں کی گفتگو اور بیانات سے یہ خاکہ مرتب کیا ہے۔

دو سال قبل میر صاحب کے داماد سید صغیر حسن نقوی کراچی سے دہلی پہنچے ان کے نیاز حاصل کیے۔ میر باقر علی کا ذکر آیا، فرمایا ـــــ " اُن کے آبا و اجداد ایران کے مشہور شہر مازندران سے تشریف لائے تھے اور دہلی کے ترکمان دروازے میں رہائش اختیار کی۔ میر صاحب کے نانا میر امیر علی "قصّہ گو" تھے اور بہادر شاہ ظفر کی خلوت و جلوت میں کہانی قصّے سناتے تھے اور میر پیڑہ کے نام سے مشہور تھے ان کے صاحب زادے میر کاظم علی تھے جنھوں نے قصہ کو داستان بنایا اور اس فن میں وہ کمال حاصل کیا کہ شمال سے جنوب تک بس اُنھیں کی دھوم تھی۔ اُنھیں کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ بادشاہ کو روزانہ داستان سنایا کرتے تھے ایک موقع ایسا آیا کہ عاشق و معشوق کے درمیان صرف ایک پردہ

Marfat.com

حائل تھا۔ پردہ اٹھ جائے تو وصال ہو جائے۔ مگر میر کاظم علی نے احساسات خیالات اور کیفیات کے بیان میں بارہ سال گزار دیے اور پردہ نہ اٹھا آخرکار بادشاہ کا اشتیاق بے قابو ہوگیا اور اس نے تنگ آکر کہا۔ " آج پردہ اٹھ جانا چاہیے تب پردہ اٹھا۔ ورنہ نہ جانے کب تک پردہ نہ اٹھتا انھیں کاظم علی نے میر باقر علی کو داستان گوئی کا فن سکھایا۔۔"

میر باقر علی ۱۸۵۰ میں ڈوموں کی گلی ترکمان دروازے میں پیدا ہوئے ان کے والد میر حسین علی بھی قلعہ میں ملازم تھے۔ ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا۔ میر صاحب کے خاندان نے فصیل سے باہر علی گنج شاہ مرداں (موجودہ جور باغ) میں پناہ لی۔ میر صاحب کے نانا اور والد غدر کی بساط کے ساتھ لپٹ گئے۔ امن وامان ہوا تو میر باقر علی اپنے ماموں میر کاظم علی اور خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ فراش خانہ میں آکر بس گئے۔ میر کاظم علی کی کوئی اولاد نہ تھی بھانجے کو بیٹا بنایا اور اپنا فن سکھایا۔ میر کاظم علی کی ہزار داستانی کی شہرت حیدر آباد پہنچی سر آسماں جاہ کا دور تھا۔ میر کاظم علی کو یاد کیا وہ حیدر آباد پہنچے اور پھر آخیر عمر تک وہیں رہے۔ لیکن حیدر آباد جانے سے پہلے میر باقر علی کو داستان گوئی میں طاق کر چکے تھے۔ چنانچہ ماموں دکن میں اور بھانجہ شمال کی ریاستوں میں داستان سناتے اور انعامات واکرامات پاتے۔ پٹیالہ، رام پور، بھوپال کے رجواڑوں اور نوابوں میں بلائے جاتے تھے۔ میر باقر علی نے ریاست پٹیالہ میں باقاعدہ داستان گو کی حیثیت سے ملازمت کی یہ ملازمت بھی اُن داستانِ حیات کا ایسا قصہ ہے جس کے بغیر میر باقر علی کی داستان مکمل نہ ہوگی۔ میر صاحب انتہائی وضعدار اور خود دار تھے۔ ریاست پٹیالہ کے دربار کا قاعدہ تھا جو دربار میں حاضر ہوتا وہ صافہ باندھ کر آتا۔ چنانچہ میر صاحب کو بھی یہی حکم ملا۔ میر صاحب نے دربار میں صافہ باندھ کر جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جس شخص کو میرا حلیہ اور لباس پسند نہیں وہ میرا فن کیا پسند کرے گا۔" یہ کہہ کر دہلی آنا چاہتے تھے کہ مہاراجہ

Marfat.com

کا پیغام ملا۔ میر صاحب آپ اس شرط سے آزاد ہیں آپ کو اختیار ہے جو لباس چاہیں پہنیں۔ چنانچہ میر صاحب کلا بتوں کی گول ٹوپی پہنے دربار میں پہنچے۔ جب تک ریاست میں رہے کسی نے اُنھیں نہیں ٹوکا کہ میر صاحب صافہ کیوں نہیں باندھا۔

یوں میر صاحب بڑے سادہ لوح اور سادہ مزاج آدمی تھے طبیعت میں بلا کی انکساری تھی۔ جس کے پاس بیٹھتے صبح سے شام کر دیتے تھے۔ جوانی میں رنگ گورا تھا لیکن آخر عمر میں کل گجا (ملگجا) ہوگیا تھا۔ درمیانہ قد، چھریرا بدن، چھوٹی سی چگّی داڑھی، پوستینوں کی آنکھیں۔ گرمی میں چوڑی آستینوں کا ململ کا کرتا، انگرکھا اور پتلی موری کا پاجامہ، سردی میں چھینٹ کی آدھ سیری نیمہ آستین پہنتے تھے۔ کانوں سے رومال لپٹا ہوا۔ پاؤں میں دیسی جوتی، باتیں کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔

میر باقر علی نے زندگی کی دھوپ چھاؤں دیکھی تھی۔ اچھے اور بُرے دن دیکھے تھے وقت کی رفتار پہچانتے تھے۔ ریاستوں میں قدر و منزلت کم ہوئی تو دہلی کے رئیسوں اور امیروں کے دیوان خانوں کی زینت بنے۔ سیٹھ چھنا مل، حکیم اجمل خاں، نواب فیض احمد خاں اور نواب ننھے خاں کے دیوان خانوں میں داستان سناتے تھے جب یہاں بھی سناٹے کا راج ہوا تو گھر بیٹھ گئے۔ پیٹ پالنے اور تن ڈھانپنے کے لیے چھوٹی چھوٹی داستانیں لکھیں خود ہی چھپوائیں اور خود ہی دلّی کے گلی کوچوں میں گھوم پھر کر بیچیں۔ یہ کتابیں میر صاحب اور اُن کے گھر والوں کا پیٹ نہ بھر سکتی تھیں۔ اس لیے کتری ہوئی چھالیا بیچنے لگے۔ یہ چھالیا بھی خود ہی رات کو کترتے اور دن نکلے داہنی بغل میں ایک بڑی سی پوٹلی دبائے اور بائیں ہاتھ میں ایک بستہ لیے گھر سے نکلتے۔ دلّی والوں میں اب بھی چند بزرگ ایسے ہوں گے جنھوں نے میر صاحب کو دلّی کی گلیوں میں پاجی بڑوس، بادشاہ کا مولا بخش ہاتھی، خلیل خاں اور فاختہ کی آوازیں لگاتے سنا ہوگا۔

قدرداں آواز سنتے ہی گھر سے نکلتے کتابیں خریدنے کے بہانے میر صاحب سے بات کرتے اور اپنی ضرورت کے مطابق کتری ہوئی چھالیا خرید کر خاموشی سے چلے جاتے یہ تھا انیسویں صدی کا فنکار میر باقر علی داستان گو جسے دیکھنے اور سننے کے لیے راجہ اور مہاراجہ بے قرار رہتے تھے اسی بلبل ہزار داستان کو اب بیسویں صدی میں پہچاننے والا کوئی نہ تھا ـــ بائیسکوپ کی ایجاد نے داستان گوئی کو زنگ لگا دیا تھا۔ میر باقر علی زمانہ شناس تھے جانتے تھے کہ پردے پر اب ہزار چہرے نظر آئیں گے اب اس ایک چہرے کو کوئی کب تک دیکھے گا۔ آبرو کے ساتھ بسر کرنے کی آخر کوئی تو شکل ہونی چاہیے ـــ

والد مرحوم اور اشرف صبوحی صاحب میں دوستانہ مراسم تھے۔ چنانچہ ایک روز بعد نماز عصر دونوں گلی سیداں پہاڑی بھوجلہ پہنچے۔ میر باقر علی فراش خانہ سے یہاں آن بسے تھے۔ یہ گھر نسبتاً چھوٹا تھا (اس گھر میں گوندنی کا ایک پیڑ ہے اور گوندنی والے گھر کے نام سے آج بھی مشہور ہے) دروازہ پر دستک دی۔ میر صاحب باہر آئے اور چندھیا کر دیکھنے لگے۔ صبوحی صاحب نے تعارف کرانا چاہا بولے ـــ "میاں ہم لوگ نئی روشنی کے نہیں کہ "ظاہر میں اُجالا اور دل میں اندھیرا" جو آنکھوں میں بس گیا، بس گیا۔ پھر پردہ کرایا اور گھر میں لے گئے۔ رسمی گفتگو کے بعد آنے کی وجہ پوچھی۔ والد مرحوم کا بیان ہے کہ اشرف صبوحی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "میر صاحب کئی دن سے سوچ رہا تھا مگر اتنی ہمت نہ ہوئی تھی کہ یہاں تک آؤں ..... میر صاحب نے اضطرابی کیفیت میں پوچھا میاں خیرت تو ہے اشرف صاحب نے چند منٹ توقف کیا اور پھر کہا۔ میر صاحب، "خیریت ہی نہیں ہے"۔ پوچھا "ماجرا کیا ہے۔ عرض کیا "میر صاحب! آپ جیسا صاحبِ کمال، مفکر کائنات داستان گوئی کا بے تاج بادشاہ اس طرح گلیوں میں مارا مارا پھرے کتابیں اور چھالیا بیچے یہ تو آپ کی شان کے خلاف ہے۔ میر صاحب سُن کر مسکرائے اور پھر اطمینان سے جواب دیا۔ میاں شان کا مفہوم دنیا نے غلط سمجھ رکھا ہے۔

Marfat.com

"شان ہاتھی کا نشاں" پھر دلی کو اب کیا سمجھتے ہو۔ کایا پلٹ گئی۔ بجلی کی روشنی میں پرانے ڈیوٹ کو کون پوچھتا ہے۔ میاں ایک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔۔۔ خدا حمالی کرائے دلالی نہ کرائے۔ اور میاں اب دلی کہاں دلی کے دن والے کہاں خوشی تو دلی والوں کی خوش اقبالی کے ساتھ رخصت ہوئی۔ آج جو خوش ہوتا ہے دراصل خوشی کو منہ چڑاتا ہے۔ میں تو بھئی داستان گوئی سے چھالیا بیچنے میں زیادہ خوش ہوں۔ داستان کیا قبرستانوں میں جاکر سناؤں۔ زندوں میں تو کہیں چرچا رہا نہیں۔ کیوں کر رہے جو ہے زبان سے نا آشنا۔ اگلے وقتوں کی معاشرت پر منہ آنے والا۔ انسان کو انسان ہی نہیں سمجھتا۔ زندگی کا فلسفہ ہی بدل گیا ہے بچے کھچے لوگ رہ گئے تھے جن کے ہاں جاکر کبھی کبھی بزرگوں کی فاتحہ پڑھ آتا تھا۔ ان کی صحبتیں بھی درہم برہم ہوگئیں۔ اس لیے سوچا کہ زندگی کے جتنے دن باقی ہیں آبرو کے ساتھ گزارو۔ سوچتے سوچتے یہ سمجھ میں آیا کہ چھالیا بیچو۔ اب چھالیا لے کر جاتا ہوں اور دلی والوں کو پان کھانا بھی سکھاتا ہوں۔ دلی والے پان کھانا ہی بھول گئے اپنی معاشرت بدل کر اپنے بڑوں کی ہنسی اڑاتے اڑاتے، میں دیکھ رہا تھا کہ پان کھانے والوں میں بے شعوری بڑھتی جارہی ہے اگر یہ بے شعوری اسی طرح بڑھتی گئی تو ہمارے تمدن کی یہ چیز بھی گئی۔ اب دلی والوں کو پھر پان کھانا سکھانا شروع کیا۔ آج کل پہلے ، نسبت پان زیادہ کھائے جاتے ہیں جسے دیکھو ہنواڑی کی دکان پر کھڑا ہے یا ڈبیہ جیب میں لیے بکر بکر چباتا ہے۔ مگر ان سے پوچھو کہ کیا کھایا پان یا پیپل کا پتا۔ چھالیا یا پنساری کی دکان کا کوڑا تو دانت نکوس دیتا ہے ایسو ہی نے تو ہمیں بدنام کیا۔ ہماری معاشرت میں کیڑے ڈلوائے۔ اس لیے میں نے داستان کہنا چھوڑی۔ میاں تمہارے بڑوں نے جانوروں کی طرح پیٹ بھرنے کے لیے پان نہیں کھائے۔ ایسے پان کھانے سے تو بہتر ہے آدمی گھاس پتے کھالے۔ اگلے لوگ پان کھاتے تھے گلے دانتوں اور معدے کی دوا سمجھ کر اس لیے پان اور اس کے جملہ لوازم سے واقف ہوتے تھے۔ چھالیا

کیسی ہونی چاہیے پان کس موسم میں کس حالت میں کون سا کھانا چاہیے۔ کتھا کیوں کر پکائیں۔ چونا کس طرح بجھائیں۔ اب یہی سب باتیں سکھاتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے دلی والوں میں پان کھانے کا کچھ کچھ سلیقہ آگیا ہے اور تو اور اب تو پنجابی تک کہنے لگے ہیں کہ "آہو میر صاحب بن پان دا سواد آیا۔" میر صاحب اتنا کہہ کر رُکے سانس لیا اسی وقت آہٹ ہوئی پلٹ کر دیکھا ایک بچہ خاصدان لیے کھڑا ہے۔ میر صاحب نے خاصدان لیا اور بڑی نزاکت سے اُس کا ڈھکنا کھولا۔ اندر ورق لگی گلوریاں تھیں۔ میر صاحب نے ایک ایک گلوری دی اور پھر اپنے لیے اٹھائی تھی کہ کچھ یاد آیا۔ کہنے لگے میاں اب آخری وقت ہے یہ بھی سنتے جاؤ، پھر تمھیں کوئی سنانے یا بنانے والا بھی نہیں ملے گا۔" پھر گلوری اٹھاتے ہوئے کہا

" میاں یہ گلوری دیکھ رہے ہو۔ یہ میری بچی نے بنائی ہے۔ میں نے چھالیا کترنا، پان لگانا اور گلوریاں بنانا مرزا جی سے سیکھا تھا۔ اب تم پوچھو گے کون مرزا جی۔ ؟ میاں یہ مرزا جی قلعے میں شاہی خاصدان کے لیے گلوریاں بناتے تھے اور ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ اگر ان کی بابت کچھ کہوں تو ایک دفتر درکار ہے۔ مرزا جی تین قسم کی گلوریاں بناتے تھے۔ ایک مچھلی کی صورت جس پر چاندی یا سونے کا ورق لپیٹ کر پر اور دم اس کے پان کی کترنوں سے بناتے تھے اور آنکھیں اس کی بادام سے اور ایک پان کا ماہی پشت نہایت باریک کتر کر اور گلوری کی مچھلی پر پھیلا دیتے تھے طشتری میں نہایت خوش نما معلوم ہوتے تھے اور وہ گلوری کھانے میں نہایت خوش ذائقہ ہوتی تھی۔ دوسری گلوری کسی محفل یا مجلس کے واسطے بنائی جاتی تھی۔ ایک بہت بڑی کشتی میں ہزار دو ہزار پان کی گلوری بنتی تھی۔ لیکن پانوں کا ماہی پشت اس خوبی سے لگاتے تھے کہ پان اڑ نہ سکے اور ان پر ورق لگائے جاتے تھے ساتھ ہی چند چھریاں بھی کشتی میں سلیقے سے لگا کر رکھ دیتے تھے۔ جس صاحب کا جی چاہتا چھری سے اپنے کھانے کے موافق حصہ کاٹ لیتا جتنا بھی حصہ کاٹا جاتا ہر حصہ میں چونا کتھا چھالیا

Marfat.com

الائچی پان سب برابر ہوتا تھا۔ تیسری گلوری معشوق پسند بنائی جاتی تھی۔ وہ ایک معمولی مثلث گلوری ہوتی تھی اور اس میں یہ خوبی ہوتی کہ جب عاشق و معشوق کھانے کا ارادہ کریں اور گلوری کے دونوں کونے پکڑ کر کھینچیں تو گلوریاں برابر کی الگ ہو جائیں۔"

میر باقر علی نے ہر طرح کی وسیع معلومات بڑی محنت سے حاصل کی تھی۔ ہر علم کا انھوں نے باقاعدہ مطالعہ کیا تھا۔ استادوں سے باقاعدہ سیکھا تھا۔ سیکھنے کا یہ شوق عمر بھر برقرار رہا۔ میرے ایک بزرگ حکیم اعجاز احمد دہلوی کا کہنا ہے کہ "جب دلّی میں طبیہ کالج کھلا تو ہم نے بھی وہاں داخلہ لیا۔ میر باقر علی کی عمر اس وقت ساٹھ پینسٹھ سال کی ہوگی وہ بھی باقاعدگی سے کالج آتے اور ہم لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر طب پڑھتے تھے یہی نہیں انھوں نے امتحان دیا اور فارغ التحصیل ہونے کی سند بھی حاصل کی۔ یہی نہیں انھوں نے اپنی اکلوتی بیٹی باقری بیگم کو بھی طبیہ بنایا وہ طبیہ کالج کی سند یافتہ تھیں۔

میر باقر علی گنجینۂ علم تھے ایک ذرا چھیڑ دیئے گھنٹوں بے تکان بولیں گے۔ ان کی اسی وصف پر خواجہ حسن نظامی نے ۱۹۱۸ء میں انھیں مقرر کائنات کا خطاب دیا تھا۔ میر صاحب جہاں داستان گوئی میں کامل الفن تھے وہیں زبان کے محافظ اور پاسبان تہذیب و اخلاق بھی تھے۔ بیسویں صدی شروع ہوتے ہوتے کوثر و تسنیم سے دُھلی اردو کچھ کچھ میلی ہونے لگی تھی۔ انگریزی کے الفاظ اس میں شامل ہونے لگے تھے۔ سرکاری دفتروں میں ملازم ہی نہیں دلّی کے بعض شرفا بھی انگریزوں کی نقل میں مزاج شریف کے بجائے "ہاؤ ڈو یو ڈو" کہنے لگے تھے۔ دلّی کی کھڑکیاں اور دروازے ہر ایرے غیرے کے لیے کھل گئے زبان تتر بتر نہ ہوگی تو پھر کیا ہوگی۔"

میر صاحب کی عادت تھی کہ راہ چلتے کسی کو غلط لفظ بولتے سنا سرِ راہ ٹوک دیا۔ تصحیح کی محل استعمال سمجھایا اور پھر آگے بڑھے۔ میاں! کیا کہا — "اُف" —

Marfat.com

جانتے ہو یہ کیا ہے۔ کہا کلمہ تاسف ہے۔ بولے صحیح مگر میرے عزیز اس کے ایک اور معنی بھی ہیں وہ بھی گرہ میں باندھ لو۔ اُف عربی میں ناخن کے میل کو کہتے ہیں۔ کسی نے گالی دی یا سخت لہجہ میں بات کی تو میر صاحب کہتے خدا نے تم کو زبان اچھے لفظ بولنے کے واسطے عنایت کی، جانتے نہیں ؎

قدرت کو ناپسند ہے سختی بیان میں
پیدا ہوئی نہ اس لیے ہڈی زبان میں

ایک مرتبہ شریف منزل میں حکیم اجمل خاں کے دیوان خانے میں حکیم صاحب کے احباب جمع تھے میرے نانا محمد احمد صاحب بھی وہاں موجود تھے مختلف لفظوں اور محاوروں پر بحث ہو رہی تھی۔ نانا صاحب کا بیان ہے کہ میر باقر علی اپنے مخصوص انداز میں ہر لفظ کے معنی اور استعمال بتا رہے تھے اچانک حکیم صاحب نے کہا "میر صاحب یہ ہُن برسنا کیا محاورہ ہے۔ روزمرہ نہ جانے کتنی بار ہم کہتے ہوں گے لیکن یہ کبھی نہیں سوچا کہ ہُن ہے کیا" میر صاحب نے نہایت شائستگی سے جواب دیا۔ مسیح الملک آپ کے صدقے جاؤں میں تو آپ کی خاکِ پا بھی نہیں عرض کرتا ہوں۔ ہن ایک سونے کا سکہ ہے جو قطب شاہی بادشاہوں کے زمانے میں چلتا تھا اور سونے کے سکوں میں سب سے چھوٹا سکہ ہوتا تھا۔ حضرت عالمگیر نے جب دکن کا قصد کیا تو دلّی کے اہلیوں نے جانے سے انکار کیا مگر چونکہ یہ افواہ مشہور ہوگئی تھی کہ دکن میں ہن برستا ہے اس لالچ سے سب بادشاہ کے ساتھ ہو لیے۔۔۔ پھر کسی نے پوچھا میر صاحب یہ خطِ طغرا کیا بلا ہے۔ میر صاحب مسکرائے اور ایک ادائے خاص سے بولے طغرا ایک جانور نما پرندہ کا نام ہے جس کی ہم شکل طغرا لکھا جاتا ہے اور یہ پیروں کی مثال ہوتا ہے۔ لفظ طغرا کی ط کو زیر سے پڑھیں تو یہ ملے ہوئے کے معنی دیتا ہے۔ یہ خط ایک پیچیدہ خط ہے جس کو بادشاہ اکثر اپنے فرمانوں میں استعمال کرتے تھے"

میر صاحب کھرے سید تھے۔ کھری کھری سناتے تھے۔ گھر ہو یا باہر دسترخوان پر

Marfat.com

کسی نے خلافِ آداب حرکت کی اور میر صاحب نے سرِ محفل ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دسترخوان پر ہزار نعمتیں ہوتیں لیکن میر صاحب کی عادت تھی کہ وہ پہلا اور آخری لقمہ نمک کا لیتے۔ کوئی پوچھتا تو کہتے اصل تو نان و نمک ہی ہے ــــ میر صاحب کہیں مدعو ہیں دسترخوان سجا ہوا ہے ایک طائرانہ نظر ڈالی کہیں کسی چیز کی کمی نظر آئی تو صاحب خانہ کو ٹوک دیا میاں دنیا بھر کی نعمتیں ہیں مگر "سقل دان" نہیں۔ میزبان نئے خیال کا ہوا اور اُس نے پوچھ لیا کہ "سقل دان کیا۔؟" تو بھری محفل میں سمجھانا شروع کیا "میاں یہ مثل مرتبان کے ہوتا ہے اور اوپر اُس کے ڈھکنا۔ یہ دسترخوان پر رکھا جاتا ہے کہ جو ایسی شئے جیسے ہڈی وغیرہ اس کے اندر ڈالدی جائے۔ میاں کیا تم ہڈیاں بھی کھا جاتے ہو۔ یاد رکھو ہڈی کو مُنہ نہ لگاؤ اس سے پتھری کا مرض پیدا ہوگا۔ اور اس تنبیہ و تاکید کے بعد میر صاحب کوئی چھوٹی غوری یا طشتری طلب کرتے اور بائیں جانب دسترخوان سے ذرا ہٹا کر اپنے قریب رکھ لیتے۔ نوالے میں کوئی ہڈی کا ٹکڑا آیا۔ انھوں نے انتہائی نفاست سے اُسے نکالا اور لوگوں کی نظر بچا کر اس میں ڈالدیا۔

شخصیت اور کردار کی اس جھلک کے بعد میر صاحب کا فن بھی دیکھیے میرے جن بزرگوں نے میر صاحب کو داستان سناتے دیکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میر صاحب کی داستان جہاں ہوتی وہاں اُجلی اُجلی چاندنیوں کے فرش بچھ جاتے۔ میر صاحب کے لیے ایک چھوٹا سا تخت بچھا دیا اس پر قالین اور گاؤتکیہ۔ میر صاحب تخت پر براجمان ہوتے۔ کٹورے یا گلاس میں پانی منگواتے جیب سے چاندی کی ڈبیا اور چاندی کی چھوٹی سی پیالی نکالتے۔ ڈبیا میں افیون کی گولی ہوتی اُسے نکال کر روئی میں لپیٹتے۔ پیالی میں تھوڑا سا پانی ڈال کر روئی میں لپٹی ہوئی افیون اس میں گھولتے رہتے جب ساری افیون پانی میں تحلیل ہوجاتی تو روئی نکال کر اگالدان میں پھینک دیتے اور پیالی سے چسکی لیتے اور اس کے بعد چائے پیتے۔ عام طور پر چائے کے بارے یہ ضرور کہتے۔ "میاں یہ فرنگی بھی نئی نئی ایجاد کرتے ہیں۔ شراب حرام ہوئی

Marfat.com

تو ایسی شے تیار کی کہ بڑے بڑے مولوی اور متقی بھری محفل میں پیتے ہیں اور کوئی ٹوکتا تک نہیں بلکہ اصرار کرکے پلاتا ہے واہ بھئی واہ !! مزے کا مزہ اور نشے کا نشہ۔ میاں ہمارے خیال میں تو چائے کی خوبی بس یہی ہے۔ لب سوز۔ لب ریز اور لب بند (بہت زیادہ میٹھی) — چائے کے دو گھونٹ لیے اور پھر داستان شروع کی — انتقال سے پہلے ہفتہ میں ایک بار اپنے گھر پر داستان سنانی شروع کی تھی پہلے ایک گھنٹہ! اور سنانے کا معاوضہ ایک آنہ فی کس۔ جب اس میں گزارہ نہ ہوا تو وقت بڑھا دیا رات بعد نماز عشا نو بجے سے گیارہ بجے تک۔ دس بارہ سننے والے میر صاحب کے گھر پر جمع ہوتے — گھر میں داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا کمرہ ہے اس کمرے کے دروازے کے بالکل بیچ میں ایک چوکی پر میر صاحب خود بیٹھتے سرہانے ڈوری ٹنگی لال ٹین ہوتی صحن میں بائیں طرف ایک طاق میں چھوٹا سا دیا جلتا۔ داستان سننے والے مودبانہ انداز میں گھر میں داخل ہوتے خاموشی سے پیتل کی پیلی دونی نکالتے اور طاق میں دیے کے پاس رکھ کر خاموشی سے بیٹھ جاتے — (انقلابات ہیں زمانے کے ایک وقت تھا کہ میر صاحب کو ریاستوں اور رجواڑوں سے انعام واکرام میں سنہری اشرفیاں ملا کرتی تھیں اور اب یہ عظیم فنکار دو آنے میں دو گھنٹے داستان سنایا کرتا تھا۔) میر صاحب نے مجمع پر نظر ڈالی آنے والوں کو پہچانا۔ ان کے قریبی دوست میاں مجّو نے سب کو چائے کی ایک ایک پیالی پیش کی، میر صاحب نے معمول کے مطابق چنیا بیگم کی چسکی لی اور پھر چائے کے ایک گھونٹ کے ساتھ داستان شروع کی:

"کم ترین یہ داستانِ فرحت عنوان یہاں سے گزارش کرتا ہے کہ ایک روز کا ذکر ہے کہ میان بارگاہِ سلیمانی اور بارجہاں بانی منعقد ہوا تو سو سوا سو طائفہ ارباب نشاط حاضر۔ تھاپ طبلوں پر پڑ رہی ہے۔ آواز ہوشا ہوش و بادہ نوش کے ساتھ سارنگی کا لہرا اور

بابئں کی گمک آسمان کو جاری ہے طرح طرح کے باجے۔ الغور نے بربط بین، بانسری، بنگ، دائرہ، پر ند، جلترنگ، چنگ، دف، ڈھولک، رباب، سرتانی، نفیری، سرسنگھار، طاؤس، ستار، طرب جوش، قانون، کمانچہ، مردنگ، منجیرہ نے۔ نسترن بج رہے ہیں ساقیان گل فام جام وصراحی لیے ہوش اڑا رہے ہیں...

میر صاحب ایک ایک چیز کی تصویر کھینچ رہے ہیں اور خود تصویر بن رہے ہیں ساز و سامان، لباس، ہتھیار کی تفصیل شروع ہوتی تو میر صاحب سیکڑوں نام گنا جاتے۔ زیوروں کا ذکر آیا تو بتاتے کہ شاہی بیگمات کے زیور کیا ہوتے تھے۔ درمیانہ طبقہ کی خواتین کون کون سے زیور پہنتی تھیں نچلے طبقہ کی عورتوں کو کون سے زیور بھاتے تھے۔ دلّی کے مشہور سادے کار اکثر و بیشتر میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اُن سے زیورات کی بناوٹ پر گفتگو کرتے استاد حامد کے کوچے میں عبدالستار، فیض محمد اور عبداللہ سادے کاروں کے خاندان آباد تھا۔ یہ لوگ شاہی زیورات بناتے تھے۔ اسی خاندان کے کسی سادے کار نے میر صاحب سے کہا تھا "آپ کی زبان چلتی ہے کسی کا دل جلتا ہے۔ یہ دلّی کی امیر زادیاں اپنے شوہروں کو پریشان کرتی ہیں کہ فلاں زیور بنواؤ۔ بس توجید پر ہاتھوں میں جہانگیریاں پہنوں گی اور گلے میں ذگذگی۔ میر صاحب! سونا بہت سخت جان ہوتا ہے پہلے دوسروں کو گلاتا ہے پھر خود گلتا ہے۔ خدا کے واسطے ان زیوروں کا ذکر نہ کیجیے ورنہ دلّی کے یہ "ملمع چڑھے" رئیس کنگال ہو جائیں گے۔

دلّی کے اس باکمال عظیم فنکار نے ۱۹۲۸ء میں زندگی کی آخری سانس لی۔ ستر سال پہلے جو پناہ گاہ بنی تھی وہی جگہ اب آخری آرام گاہ ٹھہری۔ میر باقر علی درگاہ شاہ مرداں میں دفن ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں اس بلبلِ بوستاں کی تربت کی کیا گت بنی کوئی نہیں جانتا ؎

Marfat.com

تربتِ کہنہ کے مٹ جانے میں بھی معنی ہیں
خاکِ مرحوم ملی جا کے گلِ عالم میں

میر باقر علی داستان گو جیسے جامع کمالات شخص روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ عہدِ شاہی میں پیدا ہونے اور زر و جواہر میں کھیلنے والا' روایت پرست انگریزوں کے عہدِ حکومت میں پیسہ پیسہ کو محتاج رہا۔ زندگی میں ناقدری ہمارے خمیر میں ہے اور مرنے کے بعد چاہت اور عقیدت ہماری عادت ہے۔

خدا آباد رکھے' "اردو اکادمی دلّی" کو جس نے دلّی کی اِن لکھوری اینٹوں کو جنھیں آثارِ قدیمہ والے بھی بھول چکے تھے دلّی کے کونوں کھدروں سے تلاش کر کے یہاں یکجا کیا ورنہ اب تو یہ عالم ہے۔ ہائے دلّی وائے دلّی۔ بھاڑ میں جائے دلّی...!!

سید حسن مہدی

دگر دانائے راز ابد کہ ناید

(محمد مجتبیٰ زیدی)

محمد مجتبیٰ زیدی کا آبائی وطن قصبہ جھالو ضلع بجنور تھا۔ آپ کے والد بزرگوار سید زندہ علی ایک عالمِ دین تھے۔ بسلسلہ درس و تدریس مولوی زندہ علی قصبہ جلالی ضلع علی گڈھ میں مقیم ہو گئے اور یہیں ۱۹۰۷ء میں زیدی صاحب کی ولادت ہوئی۔ قدیم دستور کے مطابق والد مرحوم نے اپنے ہونہار فرزند کی ابتدائی مذہبی تعلیم پر خاص توجہ کی۔ پھر آپ کو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے اسکول میں داخل کیا جہاں سے زیدی صاحب نے ہائی اسکول پاس کیا اور مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے ریاضی میں ایم۔ ایس۔ سی کی سند حاصل کی۔ اس دوران میں مختلف کھیلوں میں بھی وہ دلچسپی لیتے رہے۔ لمبی دوڑ اور تیراکی کا آپ کو خاص شوق تھا۔

علی گڈھ یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر اور لیکچرر بھی رہے۔ تقریباً ڈیڑھ سال تک اڑیسہ میں ملازمت کرتے رہے۔ مگر جلد ہی بلوچستان کی قلات ریاست کے صدر مقام مستنگ میں احمدیہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔ ان کی قابلیت اور کارکردگی کا یہ صلہ ملا کہ زیدی صاحب انسپکٹر محکمہ تعلیمات اور کچھ عرصہ کے بعد ریاست کے نائب وزیر تعلیمات کے عہدہ تک پہنچ گئے۔

۱۹۴۲ء میں قلات کی ملازمت ترک کر کے علی گڈھ واپس آ گئے جو ایک

طرح سے زیدی صاحب کا اب وطن ثانی ہوگیا تھا۔ ایک بار پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں لیکچرر ہوگئے۔ لیکن اس ملازمت کو چھوڑ کر اپنا ذاتی کاروبار شروع کردیا۔

جب جولائی ۱۹۴۹ء میں دوبارہ اینگلو عربک اسکول شروع ہوا تو زیدی صاحب اسکول کے پرنسپل مقرر ہوئے۔

اگست وستمبر ۱۹۴۷ء کے فسادات نے دہلی شہر کو کس حد تک متاثر کیا اس کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو اُس وقت دہلی میں رہتے تھے اور جنھوں نے اپنی آنکھوں سے خونچکاں مناظر دیکھے۔ دہلی سے میرا تعلق ۱۹۴۶ء سے شروع ہوتا ہے جب میں اینگلو عربک کالج میں ایک لیکچرر کی حیثیت سے آیا۔ دوران فسادات میں دہلی میں موجود تھا۔ مرحوم مرزا محمود بیگ جو اُس وقت علم النفسیات میں اسی کالج میں لیکچرر تھے مجھے اور اپنے چند رفقائے کار مثلاً ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور ڈاکٹر خورشید احمد فاروق اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کو لے کر پرانہ قلعہ میں پناہ لی۔ دہلی میں جو تباہی برپا ہوئی تھی اور کشت وخون کا بازار گرم تھا اسکو فرد کرنے کی غرض سے دہلی میں مدراس رجیمنٹ کو طلب کیا گیا اور اِس نے اپنا کیمپ اینگلو عربک کالج اور اینگلو عربک اسکول کے کمپاونڈ میں قائم کرلیا۔ یہہ دونوں ادارے ہنگامہ کی وجہ سے بند تو ہو ہی گئے تھے لیکن ایسے حالات میں ان دو اداروں کی تباہی ناگزیر تھی۔

دہلی کے ان فسادات کا فوری ردّ عمل پیدا ہوا کہ دہلی کے بہت سے خاندان اور افراد ترک وطن کرنے پر مجبور ہوگئے۔ اگر کہیں مرزا محمود بیگ بھی دہلی چھوڑ دیتے تو یقین مانیئے نہ دہلی کالج اینگلو عربک کالج کہ جگہ لیتا اور نہ اینگلو عربک اسکول ہی دوبارہ شروع ہوتا۔ بیگ صاحب نے دہلی نہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا بلکہ دہلی کی قدیم اور تاریخی علمی اداروں کو حیات نو عطا

Marfat.com

کرنے کا بھی نہایت اہم فریضہ اپنے ذمہ لیا۔ اس سلسلہ میں ان کی کوششوں کو بار آور کرنے میں پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد ڈاکٹر ذاکر حسین اور دہلی یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر سر مارس گوائر نے مدد دی۔ اینگلو عربک کالج کے بجائے اس ادارہ کو قدیمی اور مشہور دلی کالج کے نام سے جنوری ۱۹۴۸ء میں شروع کیا گیا اور جولائی ۱۹۴۹ء سے اینگلو عربک اسکول بھی باقاعدگی سے کام کرنے لگا۔

۱۵ر جولائی ۱۹۴۹ء کو سید محمد مجتبیٰ زیدی اینگلو عربک اسکول کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ موصوف جب دہلی آئے تو وہ دور دہلی آنے کا نہیں دہلی سے جانے کا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے اثرات شاہجہاں آباد کے در و دیوار سے عیاں تھے ترک وطن کا سلسلہ جاری تھا۔ ایسے حوصلہ شکن اور صبر آزما دور میں زیدی صاحب نے اسکول کی ذمہ داری سنبھالی۔

مرحوم بیگ صاحب دلی کالج کے پرنسپل بھی تھے اور اینگلو عربک اسکول کے منیجر بھی۔ بیگ صاحب کی مردم شناسی اور فراست قابل داد ہے کہ انھوں نے زیدی صاحب ایسی شخصیت کو اس عہدہ کے لیے منتخب کیا یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ اینگلو عربک کالج اور اینگلو عربک اِسکول کے تباہی اور بند ہو جانے کے اسباب ایک ہی تھے اور جب یہ دونوں ادارے دوبارہ جاری کیے گئے تو ان کی مشکلات اور مسائل بھی یکساں تھے۔ یہ بھی حُسنِ اتفاق ہے کہ ان دونوں اداروں کو ایسے نازک مرحلہ پر خوش قسمتی سے بیگ صاحب اور زیدی صاحب جیسی جری اور بیدار شخصیتوں کی قیادت اور سرپرستی حاصل ہوئی۔ جس طرح بیگ صاحب نے اپنی زندگی دہلی کالج کی ترویج و ترقی کے لیے وقف کر دی، یہی عالم زیدی صاحب کا تھا کہ مرحوم نے اپنی عمر کے بیس سال اِسکول کو مضبوط کرنے اور اس کو فروغ دینے میں صرف کر دیے اپنے حسنِ انتظام اور بلند کردار سے اسکول میں ایک نئی لہر پیدا کر دی اور اسکول کو اس بلندی تک پہنچا دیا جو اسے اُن کے

Marfat.com

بعد پھر میسّر نہ ہوئی۔

زیدی صاحب غیر معمولی انتظامی صلاحیت رکھتے تھے انھوں نے اپنی ذات کو اسکول کی بقا، ترویج و ترقی کے لیے وقف کرکے ایک مثال قائم کی جس سے ان کے رفقائے کار متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ان کی اس عظیم جدوجہد میں شریک ہوگئے۔ روز اول سے اسکول کو شدید مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سرکاری امداد اسکول کے سالانہ اخراجات کی صرف نوّے فی صدی تک ہی کفالت کرسکتی تھی۔ دس فی صدی کے اخراجات کی رقم کی فراہمی ایک انتہائی دشوار سوال تھا۔ جن اساتذہ کو کئی کئی مہینوں تک تنخواہیں نہ ملتی ہوں ان کو قابو سے باہر نہ ہونے دینا اور اُن کے درمیان نظم و ضبط برقرار رکھنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ لیکن زیدی صاحب اس دشوار مرحلہ سے بھی کامیابی کے ساتھ گذرتے رہے اور اساتذہ فرائض کی انجام دہی میں کسی طرح کی کمی واقع نہ ہونے دی۔ اخراجات کی کمی کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے اور آمدنی میں اضافہ کے ذرائع تلاش کرتے رہے۔ چنانچہ انھوں نے طلبا سے بلڈنگ فنڈ کے لیے ایک رقم وصول کرنی شروع کردی۔ تنخواہیں جو رقم کی کمی کا باعث وقت پر نہ دی جا سکیں ان کی ادائیگی میں کبھی کبھار اس فنڈ میں جمع کی ہوئی رقم کا سہارا لے لیتے۔ کچھ نادان لوگوں نے پرنسپل کی اس ہمدردانہ کارروائی کو ان کی بدنیتی پر محمول کرتے ہوئے خفیہ طور پر حکام اعلا سے شکایت کردی۔ زیدی مرحوم حسابات کو باقاعدگی سے رکھنے میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ اس شکایت کی تفتیش کے لیے C.B.I محکمہ کا آفیسر آیا۔ پہلے اسکول کے منیجر بیگ صاحب کے پاس گیا۔ بیگ صاحب نے شکایت سنی اور حسبِ عادت مسکرائے اور آفیسر سے کہا کہ ہم میں اور آپ میں ایک فرق ہے۔ آپ لوگ ہر شخص کو بے ایمان سمجھتے ہیں تاوقتیکہ وہ اپنی ایمانداری نہ ثابت کردے اور ہم ہر شخص کو دیانت دار سمجھتے ہیں تاوقتیکہ وہ اپنے

Marfat.com

عمل سے اپنی بے ایمانی نہ ظاہر کردے۔ اسی اثنار میں زیدی صاحب بھی آگئے اور آفیسران کے ہمراہ اسکول آگئے۔ اتفاق سے دفتر کے ہیڈ کلرک اس روز غیر حاضر تھے اور الماریوں کی چابیاں اُن کے پاس تھیں۔ کاغذات پیش نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اگر چاہتے تو زیدی صاحب کے لیے یہ عذر پیش کردینا آسان تھا مگر انھوں نے تالے تڑوائے اور کاغذات پیش کیے۔ کوئی باقاعدگی حساب میں نہ مل سکی اور افسر مطمئن واپس گئے۔ یہ واقعہ مجھے بیگ صاحب سے معلوم ہوا تھا۔ اس کی تفصیل اس لیے ضروری تھی کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ بیگ صاحب کو زیدی صاحب پر کس قدر اعتماد تھا اور خود زیدی مرحوم میں کتنی خوداعتمادی اور اپنے کاغذات میں حسب ضابطہ اندراج پر کتنا عبور تھا۔ بروقت تنخواہ نہ ملنے سے پریشان ہو کر اساتذہ نے یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ طلبار سے وصول شدہ فیس کی رقم جو ہر ماہ کے ابتدائی ہفتہ میں ان کے ہاتھ آتی تھی اپنے پاس رکھ لیتے جس کا جواز یہ تھا کہ آخر ہماری گزر کیسے ہوگی۔ زیدی صاحب نے اس کارروائی کو غیر ضابطہ قرار دیتے ہوئے ان اساتذہ کو امادہ کیا کہ وہ فیس کی رقم اسکول میں جمع کر دیں اس کے بعد جن حضرات کو کم سے کم جتنی رقم درکار ہوگی اسکول سے مل جائے گی اور اس کی رسید دفتر میں محفوظ رہے گی۔

ان تمام مشکلات میں مبتلا رہنے کے باوجود زیدی صاحب ایک منتظم سے مجموعی طور پر نہایت کامیاب پرنسپل ثابت ہوئے۔ بیس سال ـــ تک انھوں نے اپنے فرائض منصبی خود اعتمادی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیے۔ لیکن انتظامی امور کی پیچیدگیوں سے جن لوگوں کو واسطہ پڑتا ہے بخوبی واقف ہیں کہ کسی شخص کے لیے ہر شخص کو خوش اور مطمئن رکھنا کس قدر مشکل ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر منتظم کے تمام فیصلے سب کے لیے قابلِ قبول بھی نہیں ہوتے۔ مرحوم میں مردم شناسی کی صفت بھی تھی اس لیے ہر شخص کی صلاحیت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش

Marfat.com

کرتے تھے۔

مرحوم ریاضی کے استاد تھے اور اپنے مضمون پر انھیں پورا عبور تھا اپنے مضمون پر شائع ہونے والی کتابوں کا بغور مطالعہ کرتے اور ہر نئے نظریہ سے باخبر رہتے۔ پرنسپل کے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ وہ مدرس کے فرائض انجام دیتے رہے اپنے طلبا کو بہت محنت سے پڑھاتے تھے۔ کلاس سے باہر نکلتے تو ان کی کالی شیروانی چاک کی گرد سے جا بجا سفید نظر آتی تھی اور خود بھی تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ضرورت محسوس کرتے تو زائد کلاسیں بھی لیتے۔ ایک اعلا درجہ کے مدرس ہونے کی وجہ سے زیدی صاحب اپنے طلبا میں بے حد مقبول تھے۔

طلبا کے ساتھ ان کا معاملہ ایسا تھا جیسا کسی بزرگ کا اپنی عیال کے ساتھ ہوتا ہے ان کی ضرورتوں کا شدید احساس رکھتے تھے۔ ان کی جائز اور مناسب شکایات کو یا تو دور کرتے یا کم سے کم کرنے کی کوشش کرتے۔ سائنس کے طلبا کو ہمیشہ خصوصیت سے محنت کی طرف راغب کرنے میں کوشاں رہے۔

ادبی، صحافتی اور کھیل کود کے شعبے بھی مرحوم کی توجہ کا مرکز رہے۔ بالخصوص فٹ بال میں اِسکول کے لڑکوں نے نمایاں شہرت حاصل کی۔ اکثر طلبا دہلی کے مختلف فٹ بال کلبوں میں کھیلتے رہے۔ کالج اور یونیورسٹی کی ٹیم میں یہاں سے نکلے ہوئے اکثر طلبا کو داخل کر لیا جاتا تھا۔ دہلی یونیورسٹی فٹ بال ٹیم کی کپتانی کے فرائض بھی اس اسکول کے سابق طلبا نے انجام دیے۔

ڈائرکٹریٹ آف ایجوکیشن دہلی میں زیدی صاحب دہلی کے ممتاز ترین پرنسپلوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ محکمہ کے عہدہ داروں سے ان کے ذاتی مراسم بھی تھے پرنسپلوں کی انجمن میں ان کا وزن محسوس کیا جاتا تھا اور ان کے مشوروں پر سنجیدگی سے غور کیا جاتا تھا۔ مرحوم کی گرانقدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ۱۹۶۶ء میں دہلی اسٹیٹ کی طرف سے اسٹیٹ ایوارڈ دیا گیا اس سے قبل کشمیر میں

Marfat.com

منعقد ایک تعلیمی سیمنار میں زیدی صاحب دہلی کے نمائندوں میں شامل کیے گئے۔ کئی سال تک دہلی اسکاؤٹ کمشنر کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

بحیثیت انسان ان میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ میں ذاتی طور پر اپنی زندگی میں اپنے والد مرحوم کے بعد جن دو شخصیتوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہوں اور جنھوں نے میرے دل و دماغ پر اپنے کردار کے دیرپا نقوش چھوڑے ہیں وہ تھے مرزا محمود بیگ جو دلی کالج کے پرنسپل تھے اور جن سے میرا براہِ راست تعلق ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک رہا اور دوسرے سید محمد مجتبیٰ زیدی مرحوم جو کالج کی ملحقہ عمارت میں اینگلو عربک ہائر سکنڈری اسکول کے ۱۹۴۹ء سے لے کر ۱۹۶۹ء تک پرنسپل رہے۔ زیدی مرحوم جب پرنسپل کی حیثیت سے یہاں آئے تو انھوں نے کالج کی عمارت کے بالائی حصّہ میں جو متعدد کمرے ہیں ان میں سے ایک میں قیام کیا۔ ان کے قریب ہی ایک اور کمرہ میں منظور حسین مولوی صاحب بھی تنہا رہتے تھے۔ مولوی صاحب مرحوم فطرتاً کم آمیز تھے اور ابھی زیدی صاحب سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن مولوی صاحب نے فرمایا "بھئی تمہاری ملاقات اسکول کے نئے پرنسپل سے ہوئی۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ ان کی اس بات سے میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں اسکول کے پرنسپل سے ملاقات کروں۔ چنانچہ میں ایک دن سہ پہر کے وقت اسکول کے پرنسپل کے دفتر میں گیا۔ ان کی کرسی خالی تھی۔ میں باہر نکل کر مسجد کے سامنے والی روش پر چند قدم آگے بڑھا تھا کہ سامنے سے ایک صاحب میری طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ مولوی صاحب کی بتائی ہوئی وضع قطع معلوم تھی۔ میانِ راہ ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ آپ اسکول کے پرنسپل ہیں؟ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ انھوں نے اپنا بھی اسم گرامی بتایا۔ میرے دریافت کرنے پر فرمایا کہ میں علی گڈھ سے آیا ہوں۔ یہ سنکر معاً مجھے خیال آیا کہ میرے چھوٹے بھائی بی۔ ایڈ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں میں نے ان کا ذکر کر دیا۔

Marfat.com

یہ سنتے ہی زیدی صاحب نے فرمایا کہ آپ ان کی طرف سے بے فکر ہو جائے۔ ان کی تعلیم مکمل ہوتے ہی ان کو ملازمت مل جائے گی۔ حالانکہ میں نے ان سے اس پہلی ملاقات میں ایسی کوئی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ میری اور زیدی صاحب مرحوم کی ملاقات کا سلسلہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ میرے بھائی کے امتحان کا نتیجہ ابھی شائع بھی نہیں ہوا تھا کہ میرے گھر کے پتہ پر فتحپوری ہائر سیکنڈری اسکول کے منیجر کی طرف سے میرے بھائی کی تقرری کا خط آگیا۔ یہ تھا زیدی مرحوم کا جذبۂ معاونت اور حُسنِ اخلاق جو ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں اور روشن پہلو تھا۔ ان کی دوست نوازی کی متعدد مثالیں میرے سامنے ہیں جن کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

زیدی صاحب میں دوستی کا شدید جذبہ تھا۔ وہ جس کو اپنا دوست سمجھتے تھے اس کی ہر ممکن مدد کرنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے اور اس دوستی کی خاطر وہ کبھی کبھی اپنے سُود و زیاں کا بھی خیال نہیں کرتے تھے۔ کم از کم دو ایسے واقعات میرے علم میں ہیں جن سے زیدی مرحوم کے کردار کی یہ خصوصیت ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنے ساتھیوں پر آنچ نہ آنے دی اور ان کی ملازمت کو انتہائی سنگین حالات میں محفوظ رکھا۔ زیدی صاحب کا یہ معمول تھا کہ وہ اسکول کے فرائض سے فارغ ہوکر اور رات کا کھانا کھا کر روزانہ مولوی صاحب مرحوم کے مکان واقع محلہ فراشخانہ (دہلی) جاتے تھے اور نشست کا یہ سلسلہ تقریباً آخر دم تک قائم رہا۔ اِس نشست میں شریک ہونے والوں میں میرے علاوہ دہلی کے ایک نامور خاندان کے چشم و چراغ نواب سید امیر مرزا مرحوم۔ خورشید حیدر صاحب، باقر مہدی صاحب اور اقتدار حسین صاحب بھی اکثر و بیشتر ہوتے تھے۔ اس نشست میں اسکول اور کالج کے مسائل پر گفتگو کے علاوہ اِدھر اُدھر کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ میں اور زیدی صاحب تو اکثر رات میں بہت دیر سے گھر لوٹا کرتے تھے۔ مولوی صاحب سے بھی رفتہ رفتہ زیدی صاحب کے تعلقات بہت

Marfat.com

گھرے ہوگئے تھے۔ مولوی صاحب جب دلی کالج کے پرنسپل ہوگئے تو اسکول اور کالج کے اکثر اختلافی مسائل کے سلسلہ میں ان دونوں حضرات کے درمیان شدید اختلاف رائے ہوتا رہتا تھا لیکن زیدی صاحب نے ان اختلافات کو اپنے ذاتی تعلقات پر اثرانداز نہ ہونے دیا اور مولوی صاحب کے گھر پر نشست کا سلسلہ جاری رہا۔

زیدی صاحب میں غیر معمولی انکسار تھا۔ وہ اپنے ہم عمروں اور خوردوں کے ساتھ یکساں طور سے پیش آتے تھے۔ ان کی گفتگو کا لہجہ بہت نرم ہوتا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ زیدی صاحب کبھی کسی پر اس طرح برہم ہوئے ہوں کہ انھوں نے اپنا ذہنی توازن کھو دیا ہو۔ ان کو غصہ آتا تھا لیکن غصہ میں ان کی آواز بلند نہ ہوتی تھی۔ ان کی انسان دوستی شرافتِ نفس اور حسن اخلاق سے میں ہمیشہ متاثر رہا۔ میری نظر میں بہت سے واقعات ہیں جو اُن کے ان اوصافِ حمیدہ کے شاہد ہیں۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ میرے ایک عزیز جن پر زیدی صاحب کے متعدد احسانات تھے کسی بات پر زیدی صاحب سے بے حد ناراض ہوگئے اور ان کی شان میں ایک سخت ترین جملہ کہہ گئے۔ زیدی صاحب خاموش رہے۔ اس واقعہ کے اگلے روز ہی زیدی صاحب کو انھیں صاحب کی لڑکی کا داخلہ کرانے کے لیے حسب وعدہ جانا تھا۔ وہ صاحب یہ سمجھے کہ اب زیدی صاحب ان کی لڑکی کا داخلہ کرانے نہ جائیں گے۔ لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب دوسرے روز زیدی صاحب گھر سے لڑکی اور ان کی والدہ کو اپنے ساتھ لے کر اسکول اپنے صرفہ سے لے گئے اور داخلہ کرادیا۔ یہ تھا زیدی صاحب کا جذبۂ ہمدردی جو کسی خارجی اشتعال سے متاثر نہ ہوتا تھا۔

زیدی صاحب نہایت درد مند دل رکھتے تھے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ وہ کسی خوشخبری سے کم متاثر ہوتے تھے لیکن اگر وہ کسی کی پریشانی سنتے تو بے چین ہوجاتے

Marfat.com

اور ہر ممکن کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ شفیق میموریل اسکول کا انتظام ۱۹۵۰ء سے بیگ صاحب کے سپرد کر دیا گیا تھا لیکن دراصل زیدی صاحب ہی اسکول کی نگرانی کرتے تھے۔ انھیں دنوں کی بات ہے کہ اس اسکول میں اساتذہ کے تقرر کے سلسلہ میں انٹرویو ہو رہے تھے۔ انتخابی کمیٹی میں بیگ صاحب کے ساتھ زیدی صاحب بھی تھے۔ دو امیدوار جو انتخابی کمیٹی کے سامنے آئے اُن کے لباس بوسیدہ اور میلے کچیلے تھے اور صورت سے بھی پریشان حال لگتے تھے۔ بیگ صاحب نے ان دونوں کی وضع قطع کو دیکھ کر زیدی صاحب سے فرمایا، ”زیدی صاحب ٹیچر کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ صاف ستھرے کپڑوں میں ہو تا کہ طلبا پر اچھا اثر پڑے“ زیدی صاحب نے جواب دیا کہ آپ نے اِن دونوں سے گفتگو کی ہے اور آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کس قدر پریشان حال ہیں۔ جو اپنے اہل و عیال کا پیٹ بھر نہیں سکتے اپنے لباس کی طرف کیسے توجہ کر سکتے ہیں۔ بیگ صاحب نے جواب دیا' نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا آپ ان دونوں کو ضرور جگہ دیں۔

زیدی صاحب کے دوستوں کا حلقہ محدود تھا لیکن اس میں ہر طبقہ اور مذہب کے لوگ شامل تھے۔ شری صاحب پرنسپل سناتن دھرم اسکول اور آنجہانی بیج ناتھ بخشی جو دلی کالج میں ڈائرکٹر آف فزیکل ایجوکیشن تھے ان کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ شفیق احمد علوی صاحب جو دِلّی کالج کے دفتر کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر اوکھلے میں مقیم ہیں زیدی مرحوم کے ۱۹۴۲ء کے دوست ہیں اور تاحیات زیدی مرحوم شفیق صاحب سے اُسی شفقت اور بے تکلفی سے ملتے تھے جو مرحوم کا شعار تھا۔

زیدی صاحب شیعہ عقائد رکھتے تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے سختی سے پابند تھے۔ مجالس سید الشہدا امام حسین علیہ السلام میں بڑی عقیدت سے شریک ہوتے تھے۔ دنیاوی مصالح کے تقاضوں کے دباؤ میں آکر مرحوم نے کبھی بھی

اپنے عقائد کی پردہ پوشی نہ کی اور نہ ہی تعصب کو اپنے قریب آنے دیا اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول اور شفیق میموریل اسکول میں اساتذہ کے تقرر شاہد ہیں کہ اکثر زیدی مرحوم نے اپنے ہم عقیدہ امیدواروں کے مقابلے میں دوسروں کو منتخب کیا۔ وہ اساتذہ جو اپنی کوتاہیوں پر پرنسپل زیدی کی باز پرس کو تعصب پر محمول کر کے خود کو بے خطا تصوّر کرتے تھے۔ آج وہی لوگ زیدی مرحوم کے حُسنِ انتظام اور شرافت نفس کی مدح کرتے ہیں۔

زیدی مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری بیس سال اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول کی خدمت میں وقف کر دیے تھے۔ اپنی غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں اور بلا کی خود اعتمادی کی بدولت ایک انتہائی دشوار بس گوناں مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے زیدی مرحوم اِسکول کی ترویج اور ترقی میں مسلسل مصروف رہے اور اس اسکول کو ان بلندیوں سے روشناس کرایا جو پھر اس اسکول کو نصیب نہ ہوئیں۔

زیدی مرحوم ۱۵ر نومبر ۱۹۶۷ء ۵۸ سال کی عمر میں اپنے عہدہ سے ریٹائر ہوئے لیکن قاعدہ کے بموجب تعلیمی سال کے اختتام یعنی ۳۰ر اپریل ۱۹۶۸ء تک فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔

زیدی صاحب ایسے پرنسپل کی اسکول سے علیحدگی کا تصوّر کیا کم پریشان کُن تھا لیکن اُن کے جانشین کا مسئلہ اُس سے بھی زیادہ بیگ صاحب کو پریشانی میں مبتلا کیے تھا۔ چنانچہ بیگ صاحب نے زیدی صاحب کی ملازمت میں دو سال کی مزید توسیع کے لیے بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن بغیر زیدی صاحب اسکول کو چلانا ایک امرِ محال نظر آ رہا تھا اور اُن کے جانشین کی تلاش جاری تھی لہٰذا زیدی صاحب یکم مئی ۱۹۶۸ء سے ستمبر ۱۹۶۹ء تک اعزازی حیثیت سے پرنسپل کے فرائض انجام دیتے رہے۔

Marfat.com

مرحوم کی صحت عرصہ سے خراب تھی۔ کچھ سال پہلے پتّے کی تھیلی میں پتھر آگئے تھے جس کا آپریشن کرایا۔ اس کے بعد بظاہر صحت مند نظر آتے تھے لیکن اندرونی طور پر ان کے جگر کا فعل درست نہ تھا۔ جون ۱۹۷۰ء میں یرقان میں مبتلا ہوگئے۔ ڈاکٹروں کی صلاح کے باوجود اسکول کے معاملات میں دل چسپی لینے سے باز نہ آئے۔ بالآخر طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو علیگڑھ چلے گئے اور مسلم یونیورسٹی کے میڈیکل کالج کے اسپتال میں داخل ہوگئے۔ جگر کی خرابی نے شدت اختیار کی اور مرحوم مرض استسقا میں مبتلا ہوگئے۔ ۸ر اگست ۱۹۷۰ء کو میڈیکل کالج ہی میں انتقال فرمایا اور منٹو ہی میں دفن کیے گئے۔ مرحوم نے اپنے بعد اپنی اولادِ صلبی میں تین صاحبزادگان اور دو صاحبزادیاں چھوڑیں۔ اہلیہ بھی بفضلہٖ حیات ہیں۔

اسکول کے اساتذہ اور دیگر احباب ان کی عیادت کی غرض سے برابر علی گڈھ جاتے تھے۔ استفسارِ حال پر عموماً زیدی صاحب بس یہ کہہ کر کہ اچھا ہوں بات کاٹ دیتے اور اسکول کے بارہ میں اور دوستوں سے ان کے اہل و عیال کے بارہ میں گفتگو شروع کر دیتے۔ یہ تھے زیدی مرحوم جو آخر دم تک نہ اسکول کو اور نہ اپنے دوستوں کو فراموش کر سکے۔

اس دنیا میں ایسے بہت کم لوگ ہوتے ہیں جن کی ذات میں اتنے صفات اور اوصاف یکجا ہو جائیں۔ زیدی مرحوم کی خامیاں اور کمزوریاں کم و بیش وہی تھیں جو ہما شما میں اکثر و بیشتر پائی جاتی ہیں۔

آج جب کہ بربریت کا دور دورہ ہے اور اعلا اخلاقی قدریں جو تہذیب کا سرمایہ تھیں۔ خود بینی و خود غرضی، مطلب پرستی و مصلحت کوشی کے سانچے میں ڈھلتی جارہی ہیں، زیدی مرحوم کی شرافتِ نفس، خلوص، انسان دوستی، رواداری، وضع داری، عجز و انکساری اور اِن سب پر بالا اُن کا جذبۂ معاونت و دستگیری بلاشبہ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

Marfat.com

آخر میں اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول کے معزز مدرس اور نامور شاعر شمیم کرہانی مرحوم کے چند اشعار پیش کرتا ہوں جو انھوں نے زیدی صاحب مرحوم کے سانحۂ ارتحال پر بطور خراج عقیدت پیش کیے تھے۔

جسم زیدی چشم ظاہر بیں سے گورُو پوش ہے
اُسوۂ زیدی مگر ہر دل سے ہم آغوش ہے
تا قیامت روشن و تاباں رہیں گے سر بسر
پرتو زیدی سے اپنے مدرسے کے بام و در
نقشِ کردار محبت کا مٹا سکتا ہے کون
خدمتِ محسن کی عظمت کو بھلا سکتا ہے کون

Marfat.com

اسرار احمد

ایک خاموش، بے لوث خادم ــــ محمد شفیع بیتیل والے

حضرات، آپ نے فارسی کا وہ مشہور شعر

خاکسارانِ جہان را، بہ حقارت منگر
توچہ دانی کہ دراین گرد، سوارے باشد

تو یقیناً سنا اور بارہا پڑھا ہوگا، لیکن شاید اس شعر کی جیتی جاگتی تفسیر پیش کرنے والا کوئی مردے خاکسار نظروں سے نہ گذرا ہو، جس کو دیکھ کر خلفائے راشدین کے دور کے اسلامی کردار کی یاد تازہ ہو جاتی ہے. اس دورِ پُرآشوب میں جب کہ قحط الرجال پڑ گیا ہے ہم نے اِسی دہلی کے ایک کوچے میں مردِ مومن کی تعریف پر پوری طرح اُترنے والی ایک ایسی شخصیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اُس سے ملے ہیں، اس کی قربت سے فیضیاب ہوئے ہیں جس کا سراپا اور جس کا کردار دیکھ کر یہ شعر بے ساختہ ہماری زبان پر مچلنے لگتا ــــ جو بظاہر ایک عام اور خاموش سا شخص نظر آتا، ایک ایسا عام سا شخص جس کے بارے میں کچھ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن جو درحقیقت بے نیازی، انکساری، خاموشی اور خاکساری کا لبادہ اوڑھے سماجی، ملی اور قومی کاموں میں دامے، درمے، قدمے، سخنے منہمک تھا، جس کے یہاں نہ ستائش کی تمنّا تھی اور نہ

خود تشہیری کی خواہش ـــــ جو راہِ خدا میں فرضِ عبدیت سمجھ کر اپنا قدم اٹھاتا اور دنیاوی انعام واکرام سے بے نیاز ہو جاتا ـــــ اس مردِ خاکسار اور بے نیاز کو جس کا نام محمد شفیع پیتل والا تھا آپ میں سے بیشتر حضرات نے یقیناً دیکھا ہوگا۔

یہ لگ بھگ بیس پچیس سال پہلے کی بات ہے جب میں روزگار کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومتا ہوا دلّی پہنچا ـــــ دلّی آج کی طرح اس وقت بھی ایک بڑا شہر تھا، سڑکوں پر اس وقت بھی لوگوں کا اژدہام رواں دواں تھا ریلوے اسٹیشن اُس وقت بھی مسافروں کی آمد و رفت سے پُر رہتا ـــــ میں ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی اٹیچی اور جیب میں چند تعارفی رقعے لیے اُس ہجوم سے بچتا بچاتا باہر آیا اور انسانوں کے سیلاب میں گم ہوگیا۔ ایک دو دن کے بعد جب دلّی سے ذراسی جان پہچان پیدا ہوگئی تو تعارفی رقعے نکالے اور امیدیں باندھ کر ملاقاتیں شروع کیں ـــــ لیکن جلد ہی احساس ہوگیا کہ

امیدوں کے تاریک افق پہ کون ستارے ٹانکے گا
سوکھی جا معصوم تمنا کس کو اتنی فرصت ہے

بعض حضرات کو ہمدردی کے دو لفظ بولنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ اب میرے پاس صرف ایک تعارفی رقعہ موجود تھا شفیع صاحب پیتل والوں کے نام۔ تجربات کی روشنی میں اب اس شہر ناپُرساں میں کسی کے پاس جانے کی ہمت تو نہیں تھی لیکن پھر بھی دل نہیں مانا اور ایک شام صدر بازار، بارہ ٹوٹی کا پتہ معلوم کرکے ان کی دُکان پر پہنچ ہی گیا ـــــ گدی پر ایک سیدھے سادھے اور معصوم سی شکل صورت والے ایک صاحب تشریف فرما تھے۔ معلوم ہوا یہی شفیع صاحب پیتل والے ہیں ـــــ دیکھ کر اوس ہی تو پڑگئی، دُبلا پتلا جسم، درمیانہ قد، گندمی رنگ، نازک سا ناک نقشہ، چھوٹی سی ڈاڑھی، جسم پر ہلکے رنگ کی شیروانی، سر پر ٹوپی، بالکل ایک عام مسلمان جیسا حلیہ، لیکن چہرے پر

Marfat.com

متانت و سنجیدگی، آنکھوں میں غور و فکر کی جھلکیاں۔ علیک سلیک کے بعد ہم نے تعارفی رقعہ دیا اور حرفِ مدّعا بیان کیا ــــ شفیع صاحب نے سکون سے ہماری بات سُنی، خاموشی سے رقعہ پڑھا، چند لمحوں کے لیے کہیں کھو گئے اور پھر اچانک دھیمے سُروں میں بزرگانہ شفقت کا سوتہ اُبل پڑا ــــ لہجے کی حلاوت اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے ایسا محسوس ہوا گویا ہمارا درد، ہماری پریشانی ان کی ذات میں سما گئی ہے۔ الجھنوں میں مبتلا اور پریشان حال انسان کے لیے ہمدردی کے چند بول ڈھارس بندھانے کا کام کرتے ہیں اور گھور اندھیرے میں روشنی جھلملانے لگتی ہے، اُن کی ہمدردانہ گفتگو اور مشفقانہ رویے سے ہماری ہمت بندھی، اجنبی شہر اور اجنبی ماحول میں شدید اپنائیت کا احساس ہوا اور دورِ اندھیرے میں روشنی جھلملانے لگی۔ کامیابی اور ناکامی خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن دورِ ابتلا میں کسی مردِ مخلص کا ملنا بھی کچھ کم نہیں شفیع صاحب سے ملاقات کر کے جب میں رخصت ہوا تو ان کی شفقت اور ہمدردی سے ذہن پر چھائی ہوئی مایوسی بڑی حد تک کم ہو چکی تھی اور دل کو یقین سا ہو گیا کہ آنے والی کل کا سورج کامیابی اور کامرانی کا پیغام لے کر آئے گا۔

شفیع صاحب مرحوم بلند حوصلہ انسان تھے۔ عملِ پیہم ان کے کردار کی خوبی تھی۔ مسائل کے آگے سپر ڈالنا انھوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ دوسروں کو ثابت قدم رہنے اور ایمانداری سے راہِ راست پر چلنے کا مشورہ دیتے، یہی اُن کی تجارتی اور سماجی زندگی کی کامیابی کا راز تھا۔ اُنھوں نے زندگی بھر اپنے خاندان کے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دوسروں کی دامے، درمے اور سخنے مدد کی لیکن صلہ کبھی نہیں چاہا۔

شفیع صاحب ۱۹۰۲ء میں دلّی کی مشہور پنجابی برادری کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد شیخ حاجی انعام اللہ صاحب مرحوم بھی برادری کے دوسرے افراد کی طرح تاجر تھے، تجارت اس برادری کا

پیشہ ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جب دلّی کی دوسری برادریاں اپنا مخصوص کردار برقرار نہ رکھ سکیں اور نئے سماجی ڈھانچے میں گم ہوگئیں، پنجابی برادری آج بھی اپنی انفرادیت قائم رکھے ہوئے ہے اور اس کا تشخص آج بھی اُسی طرح برقرار ہے۔ خدا نے اس برادری کو روپے پیسے سے بھی نہیں بلکہ شفیع صاحب جیسے ان گنت بے لوث مخلص اور دیانت دار افراد سے بھی نوازا ہے، جنھوں نے اپنے اپنے دور میں خدمتِ خلق اور رفاہِ عام کے کاموں میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور دلّی کی سماجی زندگی پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

جناب شفیع نے اپنے والد کے تجارتی کاموں کے ساتھ برادری کے اجتماعی کاموں اور خدمتِ خلق میں حصّہ لینا شروع کیا۔ سرسید کی اصلاحی تحریکوں سے متاثر ہوکر پنجابی برادری میں اصلاحِ رسوم کی غرض سے پنجابی یوتھ لیگ (Punjabi Youth League) کے نام سے نوجوانوں کی ایک انجمن تشکیل دی، یہ یوتھ لیگ اصلاحِ رسوم کے پروگرام کی خلاف ورزی کرنے والوں کے گھروں پر پکٹنگ کیا کرتی تھی۔ ہر بڑے کام کی ابتدا چھوٹے پیمانے پر ہوتی ہے اور اس کے نتائج دیر میں نکلتے ہیں۔ شفیع صاحب اور اُن کے ساتھیوں کی پنجابی یوتھ لیگ بہت عرصہ تک تو قائم نہ رہ سکی، لیکن اصلاحِ رسوم کا وہ پودا آج تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

۱۹۴۷ء میں جب کہ انسان، انسان کے خون کا پیاسا بن گیا تھا، انسانیت اور بھائی چارہ کے الفاظ طاقِ نسیاں ہوگئے تھے، شفیع صاحب دلّی کے اُن چند ہندو مسلم دیوانوں میں سے تھے جنھوں نے قتل و غارت گری کو روکنے اور باہمی میل ملاپ کو پھیلانے کے لیے اپنی زندگیاں بھی خطرے میں ڈال دی تھیں۔ اُن خونیں دنوں میں جب مہاتما گاندھی نے بحالیٔ امن کے لیے محلہ کشن گنج کا دورہ کیا تو اہلِ محلہ سے شفیع صاحب اور اُن کے رفقاء کے کاموں کے بارے میں سن کر اُن کی ہمت بندھائی اور بربریت کے مقابلے میں ڈٹے رہنے کی تلقین کی۔

جب یہ قتل و غارت گری تھمی اور انسان اپنے ہوش میں آیا تو ان گنت مسائل پیدا ہونے شروع ہو گئے، مہاجرین نے سر چھپانے کے لیے خالی جگہوں کو آباد کرنا شروع کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے قبضے ہونے شروع ہو گئے مساجد اور قبرستان مفاد پرست لوگوں نے ہتھیانے شروع کر دیے۔ اس نازک دور میں جناب شفیع مرحوم نے وقت کی نزاکتوں کو محسوس کرتے ہوئے نہایت تدبر سے کام لیا اور اپنے اثر و رسوخ سے ناجائز قبضے ہٹوائے۔ یہ شفیع صاحب ہی کی مخلصانہ اور بے لوث کوششو کا نتیجہ ہے کہ آج قبرستان شہدی پورہ موجود ہے، ورنہ شاید یہ قبرستان بھی کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا ــــ اسی طرح اُنھوں نے اپنی حکمتِ عملی سے ان گنت جائیدادوں کو کسٹوڈین میں جانے سے بچایا۔

شفیع صاحب کی خاموش اور بے لوث ملّی اور قومی خدمات کی وجہ سے مولانا آزاد، مولانا احمد سعید، حضرت مفتی کفایت اللہؒ مفتی عتیق الرحمٰن، گوپی ناتھ امن اور مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم جیسے بزرگ ان کو عزیز رکھتے۔ سماجی اور ملّی کاموں میں اُن کے بے داغ کردار کو دیکھ کر متعدد تنظیموں نے اُن کو عہدوں کی پیش کش کی، لیکن اس مردِ بے لوث نے کبھی کوئی عہدہ قبول نہیں کیا بلکہ ایک خاموش اور انتھک ورکر کی طرح سماجی اور رفاہی کاموں میں تندہی اور نیک نیتی سے لگا رہا۔

وہ بے پناہ انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اُنھوں نے تجارتی امور میں ان صلاحیتوں کو استعمال کیا اور اپنے چھوٹے سے کاروبار کو دیکھتے ہی دیکھتے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ قومی اور ملی اجتماعات کے وقت اُن کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر انتظامات ان کے سپرد کر دیے جاتے ــــ شاہ سعود جب ہندوستان تشریف لائے اور جماعت اہلِ حدیث نے لال قلعہ کے سبزہ زار پر اُن کے اعزاز میں عصرانہ اور استقبالیہ کا پروگرام

Marfat.com

ترتیب دیا تو اس کے اہتمام و انصرام کی تمام ذمہ داری جناب شفیع مرحوم کے ہی سپرد کی گئی تھی، اُن کے حسنِ انتظام نے اُس عصرانے کو چار چاند لگا دیے تھے۔

شفیع مرحوم بنیادی طور پر تاجر تھے اور تجارت ان کا پیشہ اور ذریعۂ معاش تھا۔ آج تجارت میں ہر جھوٹ، ہر فریب روا ہے، لیکن ہم نے شفیع صاحب کو تجارتی معاملات میں بھی حکم نبوی پر سختی سے عمل کرتے ہوئے دیکھا ہے ــــ کاریگر مال تیار کرکے لاتے اور اس سے پہلے کہ اُن کا پسینہ خشک ہو، اُن کی اُجرتوں کی ادائے گی کردی جاتی۔ یہی نہیں بلکہ کاریگروں کو اپنے چھوٹوں کی طرح عزیز رکھتے اور ان کے دُکھ سُکھ میں برابر شریک ہوتے ــــ خدا نے جس فیاضی سے اُنھیں پیسہ دیا تھا وہ اس پر کنڈلی مار کر نہیں بیٹھے بلکہ خدا کے بندوں کا حق ان تک پہنچاتے رہے ــــ اُن کی مخیّری کا یہ عالم تھا کہ خاموشی اور راز داری سے ضرورت مندوں کی مدد کرتے اور اپنی ذات کو بھی علم نہ ہونے دیتے۔

وہ کاروبار میں امانت، دیانت، اصول پسندی اور قناعت پر کلیتاً عامل تھے۔ یہ خدا پر اُن کے لازوال یقین اور بے عیب زندگی گذارنے کی خواہش اور کوششوں کا پرتو تھا کہ وہ آٹے میں نمک کے برابر منافع لیتے اور اتباعِ رسول کا یہ عالم تھا کہ مال کا نقص گاہک کے علم میں لاکر سودا طے کرتے اور مال بیچتے۔

۷ راگست ۱۹۷۱ء کو نیک، دیانت داری اور پرہیزگاری کی زندگی گذارنے والا ملت اور سماج کا یہ خاموش خادم دارِ فانی سے کوچ کر گیا اور دلّی صحیح معنوں میں اپنے ایک بے لوث اور انتھک سپوت سے محروم ہو گئی۔

Marfat.com

آج جب کہ سماجی، ملی اور رفاہی کاموں کے نام پر شہرت پسند، ابن الوقت اور پست قد لوگ اپنا قد اونچا کر رہے ہیں ناموری اور شہرت حاصل کرنے کے لیے زاغ وزغن کی بولیاں بول رہے ہیں، دلی کے سماجی اسٹیج پر اچھل کود کر رہے ہیں۔ نگاہوں میں شفیع صاحب جیسے مخلص، بے لوث، خوش کردار، بے نیاز اور نیک لوگوں کی تصویر گھوم جاتی ہے اور رہ رہ کر یہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسے لوگ پھر کبھی پیدا نہیں ہونگے۔

Marfat.com

فیاض رفعت

حافظ محمد یوسف دہلوی

خاکہ آرائی۔ خاکہ نمائی یا خاکہ نویسی کوئی ہنسی ٹھٹھول نہیں۔ اس میدان کارزار میں بڑے بڑوں کے پتّے پانی ہوتے ہیں۔

اب مجھ جیسے ہیچ مدان سے لوگوں کا اصرار ہے کہ دلّی والوں کا جو قرض تمہاری گردن پر ہے۔ اس کی کم از کم ایک قسط تو ادا کردو ـــــ اس شہر میں جو بھی آیا یہیں کا اور یہاں والوں کا ہو لیا۔ دل کی بستی کی طرح یہ بستی بھی ہزار بار اجڑی اور ہزار بار آباد ہوئی۔ یہاں الف لیلوی کردار شہرزاد بھی ہیں اور شہریار بھی یہ عمرو عیار کا شہر بھی ہے اور پیران طریقت کی چوکھٹ بھی۔ بائیس خواجاؤں کے اس ڈیرے میں حضرت بختیار کاکی بھی ہیں اور امیر خسرو بھی! غرض کہ دلّی شہر کے ہزار رنگ ہیں۔ اور اس ہزار شیوہ شہر کی بوقلمونی اور نیرنگی کا ذکر کیسے ہو کہاں تک ہو۔

یہاں کی بولی ٹھولی یہاں کے محاورات۔ یہاں کی مہترانیوں کی ملاہیاں یہاں کی بیگمات اور یہاں کی بیگماتی زبان۔ یہاں کے شاہان کرام کا جلال وجمال۔ یہاں کے صوفی وصافی قلندروں کا رقصِ بسمل اور اس کا وجدانی کیف وسرور! یہاں کے کبوتر باز۔ بٹیر باز اور داستان طراز۔ یہاں کے

Marfat.com

مطبخ و مطعم۔ یہاں کی شاہی عمارتیں۔ غرض کہ محمد شاہ رنگیلے سے لعل کنور اور استاد رسا نگ دلّی کی فصیلوں میں ایسے طلماتی آئینہ خانے جلوہ گر ہیں کہ لفظوں کی سوغات حیرت کدوں میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہے۔

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

دلّی والوں کے ساتھ میرا تہذیبی رشتہ تیس برسوں سے استوار ہے۔ یہاں کی گلیوں میں یہاں کے کوچوں میں۔ یہاں کی حویلیوں میں ڈیوڑھیوں اور بیٹھکوں میں میرے ماہ و سال آج بھی زندہ اور تابندہ ہیں۔

عالم میں انتخاب اس شہر کی مٹی کی خوشبو میرے پور پور میں رچی بسی ہوئی ہے۔ میرا بال بال دلّی اور دلّی والوں کا مقروض ہے۔ ادب صحافت غربت، امارت، شرافت، لطافت، کثافت، نزاکت، نفاست میرے شخصی وجود کے سابقے اور لاحقے ہیں۔

آمدم برسر مطلب خاکے کی لمبائی چوڑائی گیرائی اور گہرائی کے لیے کوئی دلیل عذر خواہی پیش کیے بغیر وہ داستانوی خاکہ پیش کرتا ہوں۔ جس کے شہزادہ گلفام، حافظ محمد یوسف دہلوی ہیں۔

دلّی یونیورسٹی یعنی دانش کدہ علم و فن میں استراحت کے ۴ و سال گزارنے کے بعد جب یہ خاکسار سڑکوں کی خاک نشینی میں مصروف تھا اور آنکھوں کے سامنے دن میں تارے روشن تھے اور پیٹ سے صدا آئی تھی۔

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے

مجھے ادریس دہلوی کی طرف سے مژدۂ جانفزا ملا۔ وہ اپنے ہندی رسالے سشما کے لیے میری خدمات کے طالب تھے۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔

میں نے اس پیش کش کو فوراً قبول کر لیا

دفتر شمع میں میرا پہلا دن تھا میرے لیے میز کرسی اور ٹیلی فون کا اہتمام

کر دیا گیا تھا۔ پہلے ہی دن حافظ صاحب نے مجھے بلایا۔ اور فرمانے لگے۔

" بھائی کچھ پیسوں کی ضرورت ہو تو لے لو۔ آواز میں شفقت تھی اور ایک عجب سی لگاوٹ۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" پیسے تو میرے پاس ہیں۔" دراصل میں اُسی دن اپنے کرم فرما قبلہ ڈاکٹر سروپ سنگھ کی سفارش پر حکیم عبدالحمید سے خاصی بڑی رقم لے کر آیا تھا۔ اور اس مصرعے کو بار بار اپنے ذہن میں دوہرا رہا تھا۔

" بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست "

حافظ صاحب نے میرے مسلسل انکار کے باوجود میری گرم جیب کو مزید گرم کرتے ہوئے کہا۔

یہ میری طرف سے ہیں۔ رکھ لو کام آئیں گے۔

ہندی رسالے سشما کی ادارت کا کام شروع ہو گیا میں اوقات کی پابندی کے بغیر دفتر آنے جانے لگا۔ مگر اس سے قطع نظر کبھی کبھی میرا جی چاہتا تو میں شام کو غروب آفتاب کے بعد دفتر میں بیٹھا رہتا اور کچھ اپنا اور کچھ شمع، سشما کا کام کرتا رہتا۔ حافظ صاحب دفتر میں دیر گئے تک رہتے تھے۔ شام کو ان کی محفل بڑے اہتمام سے سجتی تھی۔ ان کے دوستوں رفیقوں اور درباریوں کا آنا شروع ہو جاتا تھا۔ سلامت علی مہدی انڈین فائن آرٹ پریس کے مالک لالہ جی جن کے یہاں شمع چھپتا تھا ——— حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر رہتے۔ مسرور تونسوی اور کبیر کوثر بھی آجاتے تھے۔ چائے کوکا کولا اور آئس کریم کا دور چلتا۔ لطیفوں اور قہقہوں کی بارش ہوتی رہتی۔ گو کہ میں اس محفل زعفران زار کا رکن نہیں تھا۔ مگر مشروبات میرے حصے میں بھی آتے۔ شام کی ان بے تکلف محفلوں میں کبھی کبھی متوقع یا غیر متوقع رہبر حافظ صاحب کے فلمی دوست خوبصورت طرحدار خواتین کے ساتھ رد ہوتے تو میرا بھی دل شاد اور آنکھیں روشن ہو جاتیں۔

Marfat.com

حافظ صاحب بے حد سنجیدہ اور متین طرزِ عمل میں یقین رکھتے تھے۔ زیرِ لب مسکراہٹ کے علاوہ ایسا کم ہی ہوا کہ حافظ صاحب کو کبھی میں نے زور سے ہنستے ہوئے دیکھا ہو۔ ان کے کتابی چہرے پر سب سے نمایاں ان کی بولتی ہوئی سرگوشیاں کرتی ہوئی ذہین آنکھیں تھیں۔ نہ جانے کیوں ان کی آنکھیں دیکھ کر مجھے شہر فسوں کے جادوگر یاد آتے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ان کی شخصیت کا طلسم ہی تھا کہ اداکار و صداکار اور ریاکار سبھی ان کا دم بھرتے تھے۔ حافظ صاحب پرانی دلّی کی تہذیب کے امین و سرخیل ہوتے ہوئے بھی جدید روشنی کی کرنوں کو اپنی روح میں اُتارنے کے فن سے آشنا تھے۔ یہ ان کا آراستہ و پیراستہ ذوقِ جمال ہی تھا کہ شمع کو پھاٹک حبش خاں کے تنگنائے سے نکال کر آصف علی روڈ کے کشادہ ماحول میں لے آئے۔ نزاکت اور نفاست جزو بدن بھی تھی اور جزو روح بھی شمع کو آفسیٹ پر شائع کر کے انھوں نے اردو صحافت کا ایسا حسین سہرہ گوندھا جن کی تازگی اور خوشبو رہتی دنیا تک قائم رہے گی ان دِنوں اشیا کے سب سے مہنگے آرٹسٹ اندرجیت شمع کے ادارے کے ساتھ وابستہ تھے۔

جن کے آرٹ ورک نے پورے برصغیر میں دھوم مچا رکھی تھی۔ شمع کے لکھنے والوں میں سعادت حسن منٹو۔ کرشن۔ عصمت جیسے نامور قلم کاروں کے علاوہ بالکل نئے لکھنے والے بھی شامل تھے۔ جن میں ایک نام اس احقر کا بھی ہے۔ آج سے تقریباً چھبیس برس قبل ادارہ شمع کے رسائل میں میری کہانیاں شائع ہونا شروع ہوگئیں تھیں۔

حافظ صاحب کو دلّی کے میلوں ٹھیلوں سے عشق تھا۔ عرس ہو۔ مشاعرہ ہو۔ قوالیاں ہوں۔ رقص و سرود کی محفل ہو۔ وہ ہر جگہ پیش پیش نظر آتے۔ محفل سماع کی محفلوں میں ان پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ بزرگانِ دین کے آستانوں پر وہ ہمیشہ حاضری دیتے رہتے۔ مذہبی امور کی پابندی کے

ساتھ ساتھ وہ اپنے کام کو بھی عقیدہ سمجھ کر انجام دیتے تھے۔ حافظ صاحب، صاحبِ ثروت ہوتے ہوئے بھی نخوت سے کوسوں دور تھے۔ وہ اپنے ہر ملازم کو خاندان کا ایک فرد مانتے تھے۔ اور حتی الامکان اس کے سکھ دکھ میں شریک رہتے تھے۔

وضعداری کا یہ عالم تھا کہ دفتر شمع میں اکثر نریش کمار شاد اور سلام مچھلی شہری نشے میں دھت آتے اور حافظ صاحب سے پیسوں کا مطالبہ کرتے۔ نہ صرف پیسوں کا مطالبہ کرتے بلکہ بدمذاقی پر بھی اتر آتے۔ مگر حافظ صاحب کے ماتھے پر کبھی شکن نہ آتی۔ وہ بڑی محبت اور خندہ پیشانی سے پیش آتے اور خاموشی سے روپیے دیکر رخصت کر دیتے۔ ادیبوں، شاعروں کی نہ صرف عزت کرتے تھے بلکہ ان کی ہر ممکن مالی امداد بھی کرتے رہتے تھے۔

حافظ صاحب نے زندگی کے چوراہے سرد و گرم دیکھے زندگی کی دھوپ نے انھیں اس قدر تپایا کہ ان کی شخصیت کا سونا کندن بن گیا۔ یہ پل دو پل کی بات نہیں نصف صدی کا قصہ ہے۔ جس شمع کو آج سے تقریباً پچاس سال قبل حافظ صاحب نے روشن کیا تھا۔ اس کی روشنی ظلمتوں کا سینہ چاک کرتی ہوئی ایک ایسا ستارۂ نور بن چکی ہے جس کا فیضان ساری دنیا میں عام ہے۔

آندھی میں، بارش میں طوفان میں وہ ٹھیک نو بجے صبح دفتر آجاتے تھے۔ اور آخر میں سب کے چلے جانے کے بعد خود دفتر چھوڑتے تھے۔

اکثر شمع بازار میں آجانے سے حافظ صاحب کو جامع مسجد کی اس دُکان میں دیکھا جاتا تھا جہاں سے شمع اور ادارے کے دیگر رسائل کی نکاسی کا کام ہوتا تھا۔ حافظ صاحب بلا تکلف دُکان کے تختے پر خوش گپیاں کرتے رہتے تھے اور چائے کا دور چلتا رہتا تھا ان کے طور طریقوں سے یہ بالکل نہیں ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایشیا کے عظیم ترین اردو ادارے کے مالک ہیں۔ ہمیشہ کرتا پاجامہ پہنتے تھے۔ جاڑوں میں بالوں دار ٹسری ٹوپی پہن لیتے تھے

اور پرانے فیشن کا کوٹ یا شیروانی۔ انھیں میں نے سوٹ بوٹ میں کبھی نہیں دیکھا۔ کاروباری سوجھ بوجھ اور ذہانت میں ان کا جواب نہیں تھا۔ رقابت کے جذبے سے یکسر عاری رہ کر معاصر رسالوں کے مدیروں اور مالکوں کو صالح مشورے دیتے رہتے تھے اور ان کی دشمنی کے باوجود ہر طرح ان کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ تقریب چاہے دشمن کی ہو وہ اس میں ضرور شامل ہوتے تھے۔ وہ ایسے دلّی والے تھے جن کے دم قدم سے دلی کی تہذیبی سماجی اور معاشرتی قدریں زندہ تھیں۔ گو کہ وہ ہمارے درمیان نہیں رہے۔ مگر دلّی اور دلّی والوں کی شمع ہمیشہ روشن رہے گی۔

Marfat.com

حکیم شریف

"حکیم شریف مرحوم کی یاد میں یہ مضمون اصلاً، ہمارے، آپ کے بلکہ ہم سب کے، یا کم از کم ہم میں سے بیشتر لوگوں کے دوست عقیل ناروی مرحوم کو لکھنا اور پڑھنا تھا، لیکن شومیٔ تقدیر کہ عقیل صاحب، بجائے مضمون لکھنے کے، خود حکیم صاحب کی رفاقت کے لیے راہیٔ جنت الفردوس ہو گئے۔

اور یہ ذمہ داری اس خاکسار کو سونپی گئی۔ کسی دانشور نے کیا خوب کہا ہے کہ خاکے کا اصل لطف اسی وقت ہے جب کہ وہ اس ہستی کے سامنے پڑھا جائے جس پر لکھا گیا ہے، تاکہ وہ ہستی خود نہ صرف محظوظ ہو سکے بلکہ جواب آں غزل کے طور پر خاکہ نگار کی خبر بھی لے سکے۔ ممدوح سامنے ہو تو خاکہ نگار کو ان تمام پہلوؤں تک رسائی کی مکمل آزادی حاصل رہتی ہے، جن کا حاصل خاکہ ہوا کرتا ہے اور خاکہ محض عقیدت نامہ نہ رہ کر زندہ خاکہ بن کر ابھرتا ہے، بعد از مرگ لکھا جانے والا خاکہ اپنے مصنف پر غیر محسوس طریقے سے چند اخلاقی قیود عائد کرتا ہے، جن کی پابندی اس کے لیے لازم ہو جاتی ہے۔ میرے ناچیز خیال میں اس مشکل سے اس محفل کے سبھی نثر کار کو گذرنا پڑا ہوگا۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ــــ

اس خاکے میں جو خامیاں ہیں وہ راقم الحروف کے عجزِ قلم کا نتیجہ ہیں اور اگر کچھ لطف ہے تو سمجھیے کہ وہ ممدوح مرحوم کی دلنواز شخصیت کا رہینِ منت ہے۔

بہر کیف خاکہ حاضر ہے۔

Marfat.com

مظفر حسین سید

حکیم شریف صاحب

آج سے ایک ڈیڑھ دہائی قبل سرزمین شاہجہاں آباد پر قدم رکھا تو میر کا مشہور شعر ذہن میں گونج رہا تھا، سر پر نہ دستار تھی نہ پگڑی، سو خدا کا شکر ادا کیا اور فصیل میں داخل ہوگیا۔

گرچہ بہت کچھ اجڑ چکا تھا اور سب کچھ بدل چکا تھا، اب دہلی کے کوچے اوراق مصوّر نہ رہے تھے، حضرت دہلی کی یادگار صرف چند دروازے تھے اور کہیں کہیں شکستہ فصیل کے آثار، تاہم ؎

بزم کو برہم ہوتے مدت نہ گذری تھی بہت

والا مضمون تھا۔

ان دنوں جن کج کلاہوں کا ذکر ہر زبان پر تھا، پرانی دہلی کی تہذیبی، تمدّنی، ثقافتی و معاشرتی زندگی جن ہستیوں سے عبارت تھی، انہی میں ایک شخصیت حکیم محمد شریف خاں کی تھی۔

حکیم شریف صاحب محبوب خاص و عام تھے، ایک خلقت ان کی گرویدہ تھی، میرے جیسے نو وارد اور کم مایہ کے لیے ان کی حیثیت قطب مینار سے کم نہ تھی، جسے ہم فاصلے سے ہی دیکھ سکتے تھے، قریب جانے پر ہماری خیالی پگڑی گر جاتے

Marfat.com

کا یقینی خدشہ تھا۔ لہٰذا قربت خارج از امکان ٹھہری۔ جو کچھ دیکھا دور سے دیکھا اور دوسروں سے سنا۔

پستہ کی حدود میں آجانے والا میانہ قد، دبلے پن کی حد تک اکہرا جسم، چہرہ ریش سے عاری مگر عارضوں پر باریک مونچھوں کا مسکن، آنکھوں پر دبیز شیشوں والی عینک، کان میں سماعتی آلہ، سر پر کھدر کی ٹوپی آڑی رکھی ہوئی سفید کھدر کا براق کرتہ پاجامہ اور شیروانی، پیروں میں موزے اور کبھی سلیم شاہی کبھی گرگابی جوتے، منہ پان سے مرصّع۔ چہرے پر ایک پائیدار تبسم کے باوجود ہلکا سا خاندان دبدبہ، ایسا کہ جس سے لوگ مرعوب نہ ہوں، صرف متاثر ہوں، یہ تھے دلّی والوں کے حکیم شریف صاحب۔

ہر چند کہ شخصیت کچھ ایسی بھاری بھرکم اور رعب داب والی نہ تھی مگر اس کے گرد ایک ہالہ تھا جسے ہم کبھی عظمت اور کبھی اقبال کا نام دیتے ہیں یہی چیز انھیں عام لوگوں سے ممتاز کرتی تھی وہ معمولی نظر آتے ہوئے بھی غیر معمولی تھے، ان کی شخصیت میں سہل ممتنع کے اچھے شعر کی سی سادگی تھی، مگر یہ سادگی وہ تھی جو معنی آفرینی کو کم نہیں کرتی بلکہ اس میں اضافہ کرتی ہے۔

نجابت، شرافت اور مشرقی تہذیب کا پیکر، وضع داری، حسن اخلاق، سخاوت و فیاضی کا متحرک، فعال نمونہ، خیال خاطر احباب میں گم، نازک آبگینوں کی حفاظت کی فکر میں ہمہ وقت مبتلا رغازی مگر گفتار کے کم، کردار کے زیادہ۔ بقول شاعر ؎

ع "عجم کا حسن طبیعت، عرب کا سوز دروں"

یہ تھے حکیم اجمل خاں کی وراثت کے امین حکیم شریف صاحب!!

عام دہلی والوں کے لیے حکیم شریف صاحب، اپنے مداحوں کے لیے حکیم صاحب اور خاندان میں نہیں آس پڑوس تک کے تمام خورد وں کے لیے آکا ابا۔ انھیں لوگ حکیم صاحب کہتے، جو حکیم صاحب نہ کہنا چاہتا وہ آکا ابا کہتا، اور جو آکا ابا نہ کہہ سکتا وہ حکیم صاحب کہتا، غرض محض شریف صاحب

Marfat.com

وہ کسی کے پیے نہ تھے۔

بقول شخصے ان دنوں زندگی خوش باشی نہ تھی تو کچھ بھی نہ تھی، خاندانی لوگوں کی روایات کے عین مطابق حکیم صاحب خوش باش بھی تھے، خوش پوش بھی اور خوش خوراک بھی، خوش خوراکی سے مراد پُرخوری، یا بسیارخوری نہیں بلکہ خوش مذاقئ دسترخوان ــــ وہ کھانا کھانے اور دوسروں کو کھلانے کے ہی دلدادہ نہیں تھے بلکہ خود اپنے ہاتھ سے پکانے اور پکا کر بے تکلف دوستوں کو کھلا کر خوش ہونے والوں میں سے تھے۔ بقول شمیم احمد صدیقی صاحب ممبر پارلیمان، حکیم صاحب کھا کر کم اور کھلا کر زیادہ خوش ہوتے تھے، غالباً خود شمیم صاحب کو بھی یہ وصف حکیم صاحب مرحوم سے ہی ورثہ میں ملا ہے۔

حکیم صاحب پان کھاتے نہیں تھے، بلکہ انھیں پان کی لت تھی، پان میں لکھنؤ والا کالا تمباکو استعمال کرتے، سگریٹ بھی پیتے تھے لیکن ان کی کمزوری اگر تھی تو پان۔ بھائی نذیر پان والے ان کے مزاج شناس تھے۔ سفر بھی درپیش ہوتا تو پانچ سات دن کے لیے نذیر کے پان ساتھ لے جاتے۔

برف کے ایسے شائق کہ بارہ مہینے برف پیتے، بلّی ماران کے سلطان برف والے جاڑوں میں صرف ان کے لیے برف منگا کر رکھتے تھے قلفی کے بڑے دلدادہ ہی نہیں، قلفی سازی میں ماہر بھی تھے۔

رندوں میں رند، پارساؤں میں پارسا، خوردوں میں خورد، بزرگوں میں بزرگ، بردباری و حلیمی کا مرقع تھے حکیم صاحب، صاف دل تھے، ان کے دل میں کھوٹ اور کپٹ کا گزر نہ تھا، انکساری کا یہ عالم تھا کہ مخاطب کو احساس ہی نہ ہوتا کہ کس سے ہم کلام ہے، اور بے خوفی ایسی کہ بڑے بڑے کو خاطر میں نہ لاتے، اکثر چھوٹوں کی حمایت میں بڑے بڑوں سے بھڑ جاتے۔ یعنی حالی کے لفظوں میں۔

خاکساروں سے خاکساری تو ضرور تھی مگر سر بلندوں سے انکسار ہرگز ہرگز

Marfat.com

نہ تھا — اور ان کی یہی ادا دلّی والوں کو بھاتی تھی۔

خاندانی آدمی تھے، خوش حال، خوش باش اور اشراف کی روایات کے عین مطابق زندگی کی تمام تر رنگا رنگیوں کو پورے اہتمام کے ساتھ قبول کرنے والے، زندگی کے رسیا اور زندگی کو اس کی پوری لطافتوں کے ساتھ جینے والے، ان کی محفلوں میں شریک ہونے کی سعادت تو نصیب نہیں ہو سکی مگر خیال ہے کہ "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" پر مزور یقین رکھتے ہونگے۔ یوں بھی انہیں شہنشاہ بابر سے خاص نسبت تھی۔

شعر و ادب کا کڑھا ہوا ذوق تھا، ہزاروں اشعار ورد زبان رہتے، شعر نوازی صرف مطالعہ تک محدود نہ تھی بلکہ سلسلہ شاعر نوازی تک دراز تھا — جوش صاحب اور اس عہد کے کئی بڑے شعراء متعدد بار ان کے یہاں ہوتے، شریف منزل کے کشادہ ہال میں شعری محفلیں اکثر گرم ہوتیں اور دہلی کی سردی کے باوجود رات گئے تک سر دھنے ہوتیں، گرمی ہوتی تو وسیع صحن میں چھڑکاؤ ہوتا اور محفل جمتی، اور گرمیٔ کلام موسم کی گرمی کو مات دیتی نظر آتی۔

حکیم صاحب کا ذکر جب بھی آیا، جانے کیوں اصغر گونڈوی مرحوم کا یہ شعر ذہن میں گونج گیا ؎

اندازہیں جذب اس میں شمع شبستاں کے
اک حسن کی دنیا ہے خاکستر پروانہ

اور اس پروانے کی شمع کے شبستاں کا نام تھا، شریف منزل، وہی شریف منزل جس کے در و دیوار قومی تحریک آزادی کے عینی شاہد تھے، جہاں اپنے عہد کی دو جلیل القدر ہستیوں مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ جہاں اس دور کی سبھی عظیم شخصیتوں نے قیام بھی کیا تھا، شب بسری بھی اور خفیہ نشستوں میں اہم فیصلے بھی، ایسے فیصلے جو بعد میں پوری قوم اور ملک پر اثر انداز ہوئے، مسیح الملک حکیم اجمل خاں کا

Marfat.com

مسکن بھی شریف منزل ہی تھی اور بعد میں یہی شریف منزل اس جلیل القدر خاندان کے مختلف اطبّا کا مرکز رہی۔ اس دور کی شریف منزل آج کی شریف منزل نہ تھی، نہ وہاں کوئی بازار تھا، نہ دفتر نہ دُکان نہ ہوٹل، بڑے پھاٹک کے بعد ڈیوڑھی پارک کے دو رویہ اطبّا کی بیٹھکیں تھیں جہاں ہر خاص و عام کے لیے دریائے شفا جاری و ساری تھا۔

اسی شریف منزل میں حکیم محمد شریف خاں نے آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالتے ہی چشمِ حیرت سے ملک کی تاریخ کے اس نازک، اہم اور انقلابی عہد کی برگزیدہ ہستیوں کو دیکھا اور ان کی محفلوں میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کی۔

یہاں یہ دل چسپ وضاحت بھی بے موقع نہ ہوگی کہ شریف منزل ہمارے ممدوح سے موسوم نہیں جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جا سکتا ہے بلکہ مرحوم کے خاندان میں چھٹی پشت میں ایک بزرگ حکیم محمد شریف تھے ان ہی کا نام نامی اس محلسرا کی وجہ تسمیہ بنا، اور انھی کی رعایت سے یہ خاندان، خاندان شریفی کہلایا۔ انھی حکیم شریف کلاں کے پردادا اس خاندان کے پہلے طبیب تھے اور ہمارے ممدوح یعنی حکیم شریف خود اس خاندان کے آخری طبیب ثابت ہوئے، یوں اس خاندان کے لیے نو۹ پشتوں تک پیشۂ طبابت وجہ افتخار رہا۔

خاندان شریفی کا سلسلہ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔ جو شجرہ اس خاندان میں آج بھی موجود ہے اس کے مطابق ان کے جدِ امجد حنفی سلسلہ کے ایک جیّد عالم دین و بزرگ خواجہ عبداللہ حراری تھے، جن کا مزار تہران میں آج بھی موجود ہے، خاندان کے متعدد بزرگوں کے مزارات سمرقند و بخارا میں ہیں۔ خواجہ عبداللہ حراری شہنشاہ بابر کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ ایک روایت کے مطابق بابر ان کا عقیدت مند تھا اور برکت کے لیے انھیں اپنے ساتھ لایا تھا، شیوخ کے اس خاندان کے افراد عرصہ تک خواجہ زادے ہی کہلاتے رہے۔ بعد میں کسی مغل شہنشاہ نے خاندان کے

Marfat.com

سربراہ کو خان کے خطاب سے سرفراز کیا اور اس طرح خان کا لفظ ان کے نام کا جُز بن گیا۔

آخر آخر زمانے میں شریف منزل میں چار مشہور اطبّار کی نشست تھی، حکیم محمود احمد خاں، حکیم عبدالرحیم خاں، حکیم محمد عاقل خاں اور حکیم محمد شریف خاں — چاروں اطبار کے علاحدہ علاحدہ مطب تھے — کم وبیش ۱۹۶۵ء تک یہی سلسلہ رہا۔ بعد میں حکیم شریف صاحب تنہا رہ گئے تھے اور اور اپنے والد حکیم محمد ظفر خاں کے قائم کردہ دواخانۂ ہند کی نگرانی کرتے تھے اس دواخانے کا جو حشر ہوا، اس کا ذکر آگے آئے گا۔ آج کل باقیات کے طور پر یہاں حکیم محمود خاں مرحوم کا مطب ان کی یادگار رہ گیا ہے، اس طویل پس منظر کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اس کے بغیر حکیم شریف صاحب کی شخصیت کو سمجھنا آسان نہ ہوتا۔

حکیم صاحب تہذیب قدیم کے ساختہ وپرداختہ اور روایات اشراف کے امین تھے۔ اپنے احباب، شناساؤں اور معتقدین کے لیے وہ ہمیشہ معتبر اور مفید ہی ثابت ہوئے۔ بقول شمیم صاحب، یہ تو ممکن تھا کہ کسی وقت ان کی ذات سے کسی کو فائدہ نہ پہنچ سکے، مگر یہ ہرچند ممکن نہ تھا کہ ان کی وجہ سے کسی کو کوئی ضرر پہنچے یا کسی کے مفاد پر حرف آئے۔

سفارش کا ان کے یہاں کوئی حدوحساب نہ تھا، کسی طالب کے لیے انکار نہ تھا۔ اور نہ ہی سفارش کرتے وقت وہ کسی قسم کی تحقیق وجستجو میں یقین رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی مشہور ہے کہ بلدیہ کی رکنیت کے زمانے میں ان کے ایک ہمسائے نے ایک مخدوش دیوار منہدم کرانے کے لیے درخواست گذاری علاقے کے ممبر کی حیثیت سے ان سے سفارش بھی کرائی، متعلقہ عملہ جب دیوار کے انہدام کی کارروائی کے لیے موقع پہ پہنچا تو عقدہ کھلا کہ وہ دیوار دراصل خود حکیم صاحب کے ہی ایک مکان کی تھی۔

Marfat.com

سیاست اور دیانت میں کیا علاقہ؟ مگر ان کی ایمانداری پر سب کا عقیدہ تھا، اور ان کے خلوص کا سب کو یقین تھا۔ ایمانداری کی اس سے بڑی مثال کیا ہوگی کہ سیاست میں داخل ہوئے اور جنگ انتخاب میں اترے تو ہر مرتبہ غریب سے غریب تر ہوتے گئے۔ یہ انتخاب آرائی کے وقت کوئی نہ کوئی جائیداد فروخت کی، اور آخری انتخاب میں اپنے آبائی دواخانۂ ہند سے بھی محروم ہوگئے۔ ہمارے ملک کی، کثیف اور بدعنوانیوں سے عبارت سیاست میں کسی سیاست داں کی یہ بھی عجیب و غریب مثال ہے وہ اس میدان میں طالع آزمائی کے بعد دولت میں اضافہ کرنے کی بجائے، اپنی آبائی املاک سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا ہو،

مادّی دولت نہ سہی لیکن نیک نامی و مقبولیت کے سکّوں کے جو انبار حکیم صاحب نے لگائے ان میں برکت ہی برکت ہے، ابھی تک خرچ نہیں ہوئے ــــ وہ جب گھر سے نکلتے تو اتنے سلام موصول ہوتے کہ شاید جواب دیتے دیتے ہاتھ بھی تھک جاتا ہوگا، بقول ان کے ایک مرحوم شناسا، جوابِ سلام کا انداز بھی ایسا محبت بھرا اور دلکش تھا کہ سلام کرنے والے کا جی چاہتا کہ پھر سے سلام کرے۔

ان کے سراپا اور ان کی شخصیت کا بیان سہل نہیں،

ع جو کچھ کہا کہ تیرا حسن ہوگیا محدود ؎

والا معاملہ ہے۔

حکیم صاحب کے معمولات بھی کم دل چسپ نہ تھے، سیاست کی وادیٔ خارزار میں قدم رکھنے سے پہلے باقاعدہ مطب کرتے، علی الصبح بیدار ہو جاتے، پابندیٔ وقت سے بیٹھتے، دوپہر کو آرام کرتے اور سہ پہر کو پھر مطب میں آجاتے نماز پنجگانہ کا خاص اہتمام تھا، روزہ ناغہ ہونے کا سوال نہ تھا، یہاں تک کہ پہلا الیکشن لڑا تو رمضان کے دن تھے اور حکیم صاحب روزہ رکھتے تھے۔

Marfat.com

اکبرالہ آبادی نے ملّت مسلمہ کو مرغوب و محبوب جن چار سنتوں کا ذکر کیا ہے، ان سب پر موصوف عمل پیرا تھے، پھر بھلا قیلولہ کیسے رہ جاتا۔ لیکن ان کا قیلولہ، معمولی قیلولہ نہ تھا، اس کا الگ ہی انداز تھا۔ وہ دوپہر کے وقت انتہائی پابندی سے ڈھائی تین گھنٹے سوتے اور وہ بھی اس اہتمام سے کمرہ بند کرکے، اندھیرا کرکے، اور اندھیرا بھی ایسا کہ بستر سے اتریں تو چپل آسانی سے نہ ملیں۔ موسم گرمی کا ہوتا تو پلنگ کے نیچے گیلی ریت بچھائی جاتی، چارپائی ستلی کی بُنی ہوئی اور وہ بھی پانی سے تر، اس پر فقط ایک چادر اور بعد استراحت منھ پر تولیہ۔ ہوا کے لیے پہلے فرشی اور بعد میں برقی پنکھے کا استعمال ہوتا، اس طرح جو فضا بنتی اس میں ضرور جدید ایرکنڈیشن کا سا لطف آتا ہوگا۔

حکیم صاحب بارہ مہینے، کسی موسم کی تخصیص کے بغیر کھدّر کے کپڑے پہنتے، اونی کپڑے استعمال نہیں کرتے تھے، سفر کے شوقین تھے، ہمیشہ درجہ اوّل میں سفر کرتے، ایک ملازم ساتھ رہتا، وہی ان کا خزانچی بھی ہوتا کیونکہ وہ سفر میں ہوں یا حضر میں خود اپنے پاس پیسے رکھنے کے عادی نہ تھے اور نہ ہی ملازم سے حساب لینا جانتے تھے۔

شمیم صدیقی صاحب راوی ہیں کہ ان کے پاس بڑی سے بڑی رقم چند گھنٹوں میں ختم ہوجاتی تھی، داد و دہش کا یہ عالم تھا کہ کسی کے لیے انکار نہ تھا، خود مالی اعتبار سے اکثر پریشان رہتے، مگر سخاوت و فیاضی کی روش کبھی نہ بدلی۔

یہاں ایک قصہ یاد آتا ہے، آپ حضرات میں سے بہتوں نے شاید سنا یا پڑھا بھی ہوگا۔

ایک عرب کا سامنا اپنے ایک دیرینہ دشمن سے ہوگیا۔ عرب کی تلوار نہایت بیش قیمت تھی، دشمن نے اس سے اسی شمشیر کی فرمائش کردی، عرب

Marfat.com

نے اپنی تلوار بلا تامّل اس کے حوالے کردی۔ بعد میں کسی دوست نے یہ احوال سن کر کہا کہ تم نے بڑی حماقت کی تم نہتے تھے، وہ اپنی تلوار سے حملہ کر دیتا تو کیا ہوتا۔ عرب نے کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو، یہ سامنے کی بات تو میں بھی جانتا تھا — مگر ذرا غور تو کرو جب اس نے سوال کر ہی دیا تو میں انکار کیوں کر کرتا۔

کچھ یہی معاملہ حکیم صاحب کا تھا۔ ان کی وضع داری کا عالم یہ تھا کہ خواہ بالکل قلّاش ہوں، کسی ہم نشین، ملاقاتی کو اس کا احساس نہ ہونے پاتا۔ البتہ ہر وقت کے ساتھیوں کی بات اور تھی۔

حکیم صاحب خاصہ اونچا سنتے تھے، ان کی کم سماعتی سے لوگ اکثر فائدہ اٹھاتے، لیکن ایک بار انھوں نے بھی اس سے کام لے لیا۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ کسی شامیانے قناعت والے کے کچھ واجبات ان کے ذمّے تھے۔ جب وہ مطالبہ کے لیے مطب میں آیا تو اتفاق سے ان کے پاس پیسے نہ تھے۔ وہ بے چارہ اپنی بات کہتا رہا اور حکیم صاحب آئیں بائیں شائیں جواب دیتے رہے اس نے کہا کہ بل لایا ہوں، — یہ بولے کہ ٹھیک ہے شام کو سات بجے آنا۔ اس نے پھر کہا کہ جناب مجھے پیسے چاہئیں — انھوں نے جواب دیا کہ، اچھا پھر ٹھیک ہے کل صبح میں خود ہی پہنچ جاؤں گا، رشتہ داروں کو اطلاع کر دینا۔ غرض وہ بے چارہ تنگ آکر ناشاد و نامراد لوٹ گیا۔

تب حاضر باشوں نے بتایا کہ وہ دراصل اپنے پیسے لینے آیا تھا، ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولے کہ میں تو اس کی صورت دیکھ کر سمجھ گیا تھا، مگر جیب خالی جو تھی — سو آج یہ بہرہ پن کام آگیا۔

میدان سیاست میں آنے کے بعد معمولات میں زبردست فرق آگیا تھا، اکثر رات گئے تک مصروف رہتے اور دیر سے بیدار ہوتے، ان کا مخصوص قیلولہ بھی موقوف ہوگیا تھا، مگر ایک بات پر سختی سے کاربند تھے اور آخر تک

رہے، صبح کو وہ خواہ کبھی بیدار ہوں، لیکن پہلے فجر کی نماز ادا کرتے پھر معمولات زندگی شروع کرتے، ایسا کبھی نہ ہوا کہ انھوں نے فجر کی نماز، خواہ قضا ہی سہی، پڑھے بغیر اپنا دن شروع کیا ہو۔

حکیم صاحب اپنے علاقے کی محبوب ترین شخصیت تھے، عوام کے ساتھ ان کا رابطہ ہمیشہ رہا، عام لوگوں کی دسترس سے دور نہ ہوں، محض اس مقصد سے بلّی ماران کے بسم اللہ ہوٹل میں شام کو پابندی سے بیٹھتے تھے ویسے بھی شریف منزل کے دروازے ہر وقت ہر خاص و عام کے لیے کھلے رہتے تھے ۔ البتہ رات کے آٹھ بجے کے بعد کسی کی باریابی نہ تھی یہ ان کی نجی محفل اور بزم آرائی کا وقت تھا ۔

وہ مجلسی آدمی تھے مگر سیاست کے مطلب کے ہرگز نہ تھے، پیدائشی قوم پرست تھے، مجاہدینِ آزادی کے معروف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ مگر اپنی قوم پرستی کی قیمت وصول کرنے کا خیال انھیں کبھی نہ آیا۔

انھیں سیاست کی ضرورت نہ تھی، مگر سیاست کو ان کی ضرورت لاحق ہو ہی گئی۔ انھیں اس میدان میں لانے والے بیرسٹر نورالدین احمد تھے۔ جو ان کے چچا کے قریبی دوست تھے۔ صورت حال یہ تھی کہ بلی ماران کے حلقے سے حکمراں جماعت کانگریس مسلسل شکست کھا رہی تھی، کمیونسٹ لیڈر سرلا شرما اس علاقے کی لیڈر تھیں، وہی الیکشن جیتتی تھیں۔ کانگریس کو ان کے مقابلے کے لیے ایک ایسی ہر دلعزیز شخصیت کی ضرورت تھی جو پارٹی کے بل پر نہ سہی، اپنے دم خم سے انتخابی دنگل میں فتح حاصل کر سکے۔ نورالدین صاحب کی نظر انتخاب حکیم شریف صاحب پر پڑی۔ عوامی مقبولیت بھی تھی اور خاندانی پس منظر بھی ۔ حکمتِ عملی کامیاب رہی اور کانگریس جیت گئی۔

ایک دل چسپ بات یہ تھی کہ خود شریف منزل ان کے حلقۂ انتخاب میں شامل نہ تھی، اسی لیے ان کی حریف ان کے خلاف یہ پروپیگنڈہ کرتی تھیں

کہ خود ان کی بیوی اور بہنیں وغیرہ بھی انھیں ووٹ نہیں دیں گی، لیکن وہ یہ بتانا بھول جاتی تھیں کہ خود حکیم صاحب بھی اپنے آپ کو ووٹ دینے والے نہ تھے، وجہ صاف تھی وہ خود دوسرے علاقے میں رائے دہندہ تھے۔

دلی کے باسی جانتے ہیں کہ بلی ماران کا حلقہ ایسا خطرناک اور سیاسی اعتبار سے نازک حلقہ ہے کہ وہاں کوئی امیدوار کبھی ۲ دو مرتبہ مسلسل کامیاب نہیں ہوا۔ لیکن حکیم صاحب اسی حلقے سے مسلسل تین مرتبہ جیتتے رہے اور اس شان سے کہ ہر مرتبہ ان کو ملے ووٹوں میں اضافہ ہوا۔ اور آخری مرتبہ دو تہائی سے زیادہ ووٹ ملے، حریف کی ضمانت ضبط ہو گئی۔ قابل ذکر ہے کہ تین مرتبہ میں سے دو مرتبہ ایسا دور تھا کہ فضا کانگریس مخالف تھی اور بلدیہ میں کانگریس کو اقتدار حاصل نہ ہو سکا تھا۔

دوسری دل چسپ بات یہ کہ حکیم صاحب کے بعد جو ۲ دو انتخاب ہوئے۔ ان میں دونوں مرتبہ کانگریس کو شکست ہوئی اور دونوں بار ایک نیا امیدوار کامیاب ہوا۔ یعنی روایت برقرار رہی کہ روایت شکن میدان سے ہٹ چکا تھا۔

ان کی ممبری کے زمانے میں کانگریس کو اقتدار تو ایک ہی مرتبہ ملا۔ لیکن وہ اسٹینڈنگ کمیٹی کے ممبر مستقلاً رہے، شہری بس کا محکمہ جو اس وقت DTU کہلاتا تھا اس کے نگراں تو رام لعل جی تھے مگر عملاً حکیم صاحب کا ہی حکم چلتا تھا، وہ اس کے ڈپٹی چیرمین بھی رہے۔

(ہمارے موجودہ مرکزی وزیر جناب خورشید عالم خاں، جو حسن اتفاق سے یہاں تشریف فرما بھی ہیں، وہ اس وقت DTU کے جنرل منیجر کے عہدے پر فائز تھے)

جوش قوم پرستی کا عالم یہ تھا کہ پاکستان گئے تو وہاں اعزہ واقارب واُن کے احباب سے خوب بحثیں ہوئیں۔ ایسی ہی ایک سیاسی بحث میں

Marfat.com

ایک قریبی عزیز سے لڑ پڑے، وطن واپس آئے تو اعلان کیا کہ اب ہرگز پاکستان نہیں جاؤں گا، اور نہیں گئے۔

طب یوں تو گھر کی لونڈی تھی، پھر بھی شریف صاحب نے اجمل خاں طبیہ کالج سے باقاعدہ سند حاصل کی، یہ کالج خود ان کے ہی بزرگوں کا قائم کیا ہوا ہے۔ ضابطہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ خاندان کے رواج کے مطابق اپنے تایا حکیم محمد احمد خاں سے تحصیلِ فن کرتے رہے اور عملی تربیت حاصل کی۔ خاندان شریفی کا دستور تھا کہ نوجوانوں کو طب کے درس کے لیے ان کے چچا یا تایا کی خدمت میں رکھا جاتا تھا۔ یوں محمد شریف خاں، حکیم شریف بنے۔ افسوس کہ خود ان کے صاجزادگان میں سے کسی نے ان کی خواہش وارمان کے باوجود اس علم میں دلچسپی نہیں لی اور یوں شریف منزل میں چراغ طب نے حکیم صاحب کے ساتھ ہی آخری سانس لی، اور مسیح الملک کا فن اُن کے گھرانے سے رخصت ہوا۔

حکیم محمد ظفر خاں صاحب فراش ہوئے تو انھوں نے اپنے فرزند ارجمند حکیم شریف صاحب کو دواخانہ ہند کا نگراں مقرر کیا۔ اس کے ساتھ ہی شریف صاحب نے مطب میں بیٹھنا بھی شروع کیا۔ یوں ان کے طبّی عمل کا آغاز ہوا۔

حکیم صاحب کو مرض کی تشخیص میں خاص مہارت تھی، وہ نباض بلا کے تھے، مریض کی نبض پر ہاتھ رکھ کر سب کچھ بتا دیتے اور وہ ان کے معمول کی طرح اقرار میں سر ہلانے جاتے وہ کبھی کسی مریض سے حال نہ پوچھتے، کوئی بتانا بھی چاہتا تو اسے روک دیتے، قارورہ کا نظری معائنہ بھی شاذو نادر ہی کرتے، بیشتر نبض پر ہی انحصار کرتے تھے۔ غریب امیر کی کوئی تخصیص نہ تھی، سب کے لیے یکساں نسخے تجویز کرتے، کہ طب کے ذریعہ دولت کمانے کی ہوس نہ تھی۔ اللہ نے دست شفا بھی بخشا تھا، لوگوں کو فائدہ ہوتا اور دور دور سے مریض آتے، کتنے ہی مایوس مریض دردر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد ان تک پہنچتے

Marfat.com

اور ان کا دامن مراد پھولوں سے بھر جاتا۔ مخصوص مریضوں کو دیکھنے کے لیے اکثر حیدر آباد، بمبئی و بھوپال وغیرہ کا سفر کرتے تھے۔

حکیم صاحب کے رفیق خاص خلیل احمد صاحب راوی ہیں کہ ۱۹۶۰ء میں حکیم صاحب بمبئی گئے اور ماہم میں اپنے ایک مداح سیٹھ شرف علی کے یہاں ٹھہرے۔ سیٹھ کے کسی دوست نے اپنی شریک حیات کی نبض دکھائی۔ حکیم صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھتے ہی کہا کہ ان کے اولاد نہیں ہو سکتی، کیوں کہ رحم کی جراحی ہو چکی ہے۔ سیٹھ شرف علی نے اس بات کو ماننے میں تامل کیا، تب مریضہ کے شوہر نے تصدیق کی کہ چھ ماہ قبل ان کا اس قسم کا آپریشن ہو چکا تھا۔

سیٹھ شرف علی اس بات سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے فرط مسرت سے حکیم صاحب کو گود میں اٹھا لیا اور تین ہزار روپے فوراً خلیل صاحب کو دیے کہ یہیں دواخانہ کھولو۔ اس نے دکانیں بھی دلوادیں، اس کی دلی خواہش تھی کہ حکیم صاحب بمبئی میں رہیں، ابتدائی تیاریاں بھی ہوئیں، کچھ دوائیں بھی تیار ہوگئیں۔ مگر حکیم صاحب دلّی کی گلیاں چھوڑ کر کہاں جانے والے تھے۔ نتیجہ یہ کہ وہ دوائیں بعد میں دہلی میں غریب مریضوں میں مفت تقسیم کی گئیں۔ حکمت کو دولت کی بازیافت کا ذریعہ بنانے اور آج کے بیشتر نیم حکیموں کی طرح لوگوں کی مجبوری کا استحصال کرنے کا گھناؤنا خیال انھیں کبھی نہ آیا۔

بقول راوی حکیم صاحب مریض کی طرف متوجہ ہوتے تو لگتا کہ بس آج یہی ایک مریض دیکھنا ہے، کوئی عجلت نہیں، کوئی ناگواری یا جھلاہٹ نہیں، جو عموماً معروف معالجین کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔

وہ مریض کو حد سے بڑھا ہوا پرہیز نہ کراتے، عموماً سب کچھ کھانے کی اجازت دے دیتے، کوئی ڈھنگ کا مریض ہوتا تو کہتے کہ میاں اشراف کو تھوڑی بہت بیماری مثلاً معدے کی گرانی، طبیعت کی کسلمندی وغیرہ تو رہتی ہی ہے، ذہن الجھا الجھا رہتا ہے، نیند اکثر اڑ جاتی ہے یہ کوئی خاص بات نہیں

Marfat.com

جاؤ، عیش کرو۔

آخری سفر سے چند برسوں قبل خیال آیا کہ میرے بعد تو تاریکی ہی ہے لہذا اپنے مقرب خاص خلیل صاحب کو تربیت دینا شروع کی، کچھ خود سکھایا، کچھ حکیم محمود خاں سے اصرار کر کے سکھوایا۔ ان کی خدمت میں وہ پہلے ہی بہت کچھ سیکھ چکے تھے، نتیجہ یہ کہ آج بھی خلیل صاحب حکیم محمود خاں کا مطب لیے بیٹھے ہیں اور مدھم ہی سہی مگر شریف منزل میں طب یونانی کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔

گرچہ سیاست نے حکمت کو بڑی حد تک محدود کر دیا تھا، مطب میں بیٹھنے کی پابندی نہ رہی تھی دواخانہ بھی ختم ہو چکا تھا، لیکن نہ تو مریضوں کا اعتماد اپنے مسیحا پر سے اٹھا تھا اور نہ مسیحا کے یہاں کسی وقت کوئی تامل یا تساہلی تھی۔ لوگ راستے میں روک کر نسخہ لکھوا لیتے، اور دوا جہاں سے جی چاہتا خریدتے۔ اکثر مریض دو دو گھنٹہ تک انتظار کرتے اور حکیم صاحب کو نبض دکھا کر ہی واپس جاتے۔

آخر ایک دن ہزاروں کے روگ مٹانے اور دکھ بانٹنے والے اس زندہ دل انسان کو بھی مرض الموت نے گھیر لیا۔ ولنگڈن اسپتال میں داخل کرایا گیا، ڈاکٹروں نے معدے کا سرطان تجویز کیا جو ظاہر ہے کہ لاعلاج تھا۔ نت نئے ڈاکٹر آتے اور نبض دیکھتے، حکیم صاحب نے تنگ آکر اپنے رفیق خاص خلیل صاحب کو طلب کیا اور کہا کہ تم میری نبض دیکھو۔ ان معصوموں کو تو یہ بھی معلوم نہیں میری صرف ایک ہی نبض چلتی ہے، دوسری گم رہتی ہے، مگر یہ مستقل نبض دیکھنے کا ناٹک کرتے ہیں۔ خلیل صاحب نے نبض دیکھی، پھر انھوں نے خود ہی اپنا حال بتایا اور کہا کہ سرطان ورطان کچھ نہیں، جگر کی خرابی ہے، معدے میں انتشار ہے، خود ہی علاج بھی تجویز کیا اور کہا کہ اب گھر لے چلو۔

مگر تیمار دار اور اعزہ کہاں مانتے، انھیں ہمدرد نرسنگ ہوم میں منتقل کر دیا گیا

Marfat.com

جہاں ڈاکٹر عزیز نے علاج شروع کیا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ آخر یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا۔

جنازہ اٹھا تو خلقت کا انبوہ کثیر تھا۔ جنازے کی چارپائی میں بلیاں باندھی گئیں اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے مزار اقدس کے قریب قبرستان مہندیان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

کسی من چلے نے آہستہ سے کہا ع حاذق کا جنازہ تھا بڑی دھوم سے نکلا

اخبار "الجمیعۃ" نے ان کی موت پر لکھا کہ ــ "حکیم صاحب کی موت سے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں اہم واقعات کو جنم دینے والی شریف منزل سے ملکی و قومی سیاست کا شعور رخصت ہو گیا!"

حکیم صاحب اپنی ذات سے انجمن تھے، بقول شخصے ان کی صحبت میں جی لگتا تھا۔ نیا حوصلہ، نیا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ وہ دوست بنانے کے معاملے میں بڑے محتاط تھے مگر جب ایک بار کسی کو دوست کا درجہ دے دیا تو گلے گلے پانی نبھاتے تھے، کسی کو دوست کہنے کی دیر تھی، اس کے بعد اس کے جملہ مفادات جیسے ان کی ذمہ داری بن جاتے تھے۔ اور دوستوں کا یہ حال کہ جس نے ایک مرتبہ برت لیا، غلام بن گیا۔

اگلے وقتوں کے لوگ تھے نا !!

دھرمیندر ناتھ

پیکر خلوص جناب گوپی ناتھ امن

کچھ لوگ آئیل پینٹنگ کی طرح ہوتے ہیں جو دور سے دلفریب نظر آتے ہیں مگر نزدیک جایئے تو ان کے دھبے اُبھر آتے ہیں۔ کچھ لوگ مینیچر پینٹنگ کی طرح ہوتے ہیں جن کی خوبصورتی اور باریکیاں قریب سے ہی دکھائی دیتی ہیں ذرا فاصلہ ہوتے ہی ان کا جادو ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں جو تاج محل کے دروازے کی تحریر کی طرح قریب اور دور سے یکساں دکھائی دیں اور اُن کی دلکشی برقرار رہے۔ یہ لوگ اپنے آپ میں سچے ہوتے ہیں، شخصیت میں کہیں کوئی دہراپن نہیں ہوتا اپنے عقیدوں پر چلتے ہیں یعنی جو مانتے ہیں وہ لکھتے بولتے ہیں اور اُنھیں قدروں کو اپنی زندگی میں سمو لیتے ہیں۔ اِن کا مذہب انسانیت اور اُن کا اثاثہ وہ ہمہ گیر قدریں ہیں جو انسانی تہذیب کی بنیاد ہیں۔ جو خیالات اور رشتوں کو یک جہتی کے دھاگے میں پروتی ہیں۔ ایسے لوگ علاقائی تعصب یا تمدنی تنگ نظری سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اِس لیے وہ اگر ایک خطّے میں پیدا ہوں اور دوسرے علاقے میں جا بسیں تو انھیں دو تہذیبوں یا تمدنوں کا حسین امتزاج ہو جاتا ہے۔ ایسی ہستی میں بجا طور پر تہذیبوں کا قِران السعدین ہوتا ہے۔ ایسی ہی

Marfat.com

ذات بابرکات جناب گوپی ناتھ امنؔ کی تھی جو لکھنوی اور دہلوی تہذیب وتمدن کا دلآویز مرقع تھے۔ امن صاحب جو وفاداری بشرط استواری کو عین ایمان مانتے تھے نام کے آگے لکھنوی لکھتے رہے۔ لکھنؤ سے ناتا نہ ٹوٹا لکھنویت اُن کی شخصیت کا جزو لاینفک رہی مگر ۲۳ میں دلّی آئے تو یہیں کے ہو رہے دلّی والے ہو گئے۔ فراخ دِلی دہلوی تہذیب کی بنیاد ہے اور لوگ دلّی کو اپناتے ہیں لیکن امن صاحب اُن خوش نصیبوں میں ہیں جنھیں دلّی نے اپنایا۔ انھوں نے شعر و ادب، صحافت وسیاست میں دِلّی کی وہ خدمت کی کہ دِلّی والوں کے دل میں جگہ بنالی دِلّی والوں نے انھیں اپنا نمائندہ منتخب کیا۔ اِس لیے امن صاحب کو اگر جناب گوپی ناتھ امن لکھنوی دہلوی لکھا جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا۔

اپنے متعلق مذاق کرنے کے لیے کلیجہ بھی چاہیے اور سلیقہ بھی ایک صحافی نے امن صاحب سے انٹرویو میں ایک سوال پوچھا تھا "آپ کی زندگی گوناگوں مصروفیات کی حامل ہے۔ لیکن آپ کو سب سے زیادہ عجیب کب محسوس ہوتا ہے؟" امن صاحب نے برجستہ جواب دیا "جب کسی کُشتی جیتنے والے کو دنگل میں انعام دے کر ہاتھ ملاتا ہوں۔" اِس جملے کا لطف وہی حضرات لے سکتے ہیں جنھوں نے امن صاحب کو دیکھا ہے۔ دبلے پتلے میانہ قد کے امن صاحب کو دیکھ کر دماغ میں یہ مصرع گونجنے لگتا تھا:

ع　　　اور اِس نحیف سے سو کام دو جہاں کے لیے

حضرت امن لکھنوی سے پہلی مرتبہ ملنے والے کا تاثر کم وبیش وہی ہوتا تھا جو شوکت تھانوی نے 'شیش محل' میں مولانا حسرت موہانی کے متعلق لکھا ہے۔ "یا اللہ حسرت موہانی ایسے ہوتے ہیں" ایک نامور شاعر ممتاز صحافی اور برگزیدہ سیاسی رہنما سے ملنے کا اشتیاق لیے جو لوگ آتے تھے ان کے ذہن میں ایک تصویر ہوتی تھی ایک وجیہہ شکیل شخص کی جس کا جسم بھاری بھرکم لباس

Marfat.com

قیمتی رعب دار چہرہ ہوگا جس پر غیر معمولی سنجیدگی کی موٹی تہہ ہوگی مگر جب تصوّر حقیقت سے دو چار ہوتا اور سامنے معمولی کھادی کی اچکن ٹوپی اور چوڑے پائنچے کے پاجامے میں ملبوس ایک دبلا پتلا آدمی ہوتا تو ملاقات کرنے والے کے چہرے پر مایوسی اور حیرت جھلک اٹھتی مگر چند لمحوں کی بات چیت کے بعد امن صاحب کا خلوصِ علم، اپنا پن دل و دماغ کو چھو جاتے اور وہ شخص امن صاحب کا گرویدہ ہو جاتا۔ چہرے پر یہ احساس نمایاں ہوتا کہ امن صاحب ایسے ہی ہوتے ہیں۔

چہرے مہرے کے لحاظ سے امن صاحب کچھ خاص نہ تھے دبا ہوا گندمی رنگ، لمبوترا چہرہ کشادہ پیشانی، رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں بغیر دانت کا منھ خشخشی مونچھیں معمولی فریم کی عینک جو کھسک کر ناک کے سرے تک آجاتی چہرے پر تین چیزیں نمایاں تھیں پر خلوص ذہین آنکھیں جن میں ہمدردی جلوہ گر تھی دوسری خصوصیت تھی زندہ دلی کی نرم دھوپ جس سے تمام چہرہ روشن رہتا تھا۔ متبسم لب جن پر کوئی لطیفہ، شعر، واقعہ یا خوبصورت جملہ ہوتا تھا (جس دن یا جس آدمی سے امن صاحب بہت سنجیدہ ہوکر بات کرتے بس یہی سوچنا پڑتا و یا خدا خیر) تیسری چیز جس نے شنکر جیسے کارٹونسٹ کو امن صاحب کی تصویر بناتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کیا وہ ان کی ناک تھی۔ سیاست میں رہتے ہوئے بھی امن صاحب موم کی ناک والے نہیں تھے وہ اونچی ناک والے تھے۔ ادارت ہو یا وزارت کئی بار استعفیٰ دیے مگر جھک کر سمجھوتے نہیں کیے۔ مطلب پرستی کو کبھی جزوِ ایماں نہیں مانا بلکہ مصلحت کو ایمان کی موت سمجھا۔

اِس مرد مجاہد کی تمام زندگی روشنی کا سفر تھی کہیں بھی تاریک گوشہ نہیں تھا حیات ایک کھلی کتاب تھی۔ سیاست کی کاجل کی کوٹھری سے گذرے مگر کہیں کوئی لکیر یا دھبا نہیں لگا۔ اتنا فعال آدمی جو اتنی تنظیموں انجمنوں سے وابستہ ہو مگر سماجی زندگی سے کنارہ کش تو زندگی داس کبیر کی چادر کی طرح جیبوں کی

تیوں نرمل بنی رہے بے داغ وبے ریا ہو یہ ہے جینے کا فن جب ماضی کا کوئی لمحہ روح پر بوجھ نہ بنے۔

لکھنؤ کے محلہ غوث نگر میں ایک متوسط سریواستو کائستھ خاندان میں ۱۶ ار ستمبر ۱۸۹۸ء یعنی پہلے نوراتر کی متبرک صبح کو امن صاحب کی ولادت ہوئی۔ والد محترم جناب مہادیو پرشاد اُردو اور ہندی میں شاعری کرتے تھے گھر کے ادبی ماحول، محلے کی شاعرانہ فضا نے ننھے گوپی ناتھ کی صلاحیتوں کو اُجاگر کیا۔ امین آباد اسکول میں لسان الہند مولانا عزیز لکھنوی جیسے معلم نے اس ہونہار طالب علم کو شعر وسخن کی باریکیوں سے روشناس کرایا۔ امن صاحب کو شعر و ادب کی اس بلندی تک پہنچانے میں پروفیسر بیج ناتھ فگار لکھنوی کا بڑا ہاتھ ہے۔

۱۹۱۶ء میں امن صاحب میٹرک کے امتحان میں اسکول میں اوّل آئے۔ مگر خانگی مسائل کے سبب تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا۔ دورانِ ملازمت ادیب فاضل منشی فاضل اور بی۔ اے کے امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ حصول معاش کے لیے لکھنؤ سول کورٹ میں ملازمت کی مگر یہاں کا ماحول راس نہ آیا اور صرف تین مہینے بعد ہی لکھنؤ میونسپل بورڈ کے محکمہ حفظان صحت میں کلرک بن گئے۔ سن سولہ میں لکھنؤ میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں گاندھی جی کے پہلے پہل درشن کیے اور اُن کے معتقد ہو گئے۔ اسی لیے انھوں نے اپنا تخلّص بھی امنؔ رکھا اور قومی تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ تحریک ترک موالات میں بہت سرگرم رہے۔ قلق تھا تو صرف ایک بات کا کہ وہ گرفتار نہیں کیے گئے کیونکہ جس دن اِن کے جتھے کو گرفتار ہونے کے لیے جلوس نکالنا تھا اُس سے پہلے ہی گاندھی جی نے تحریک ملتوی کردی تھی۔

۲۸ء میں الہ آباد ہائی کورٹ سے جونیر لار کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد امن صاحب نے ملازمت پر وکالت کو ترجیح دی۔ چونکہ اودھ

Marfat.com

میں مختاروں کو قانونی پریکٹس کرنے کی اجازت نہ تھی اس لیے انھوں نے ۲۴ء میں میرٹھ اور ۲۵ء میں غازی آباد میں سکونت اختیار کی اور جلد ہی قانونی پیشے کی صفِ اول میں آگئے۔ اس زمانے کے قریبی ساتھیوں میں چودھری چرن سنگھ جی تھے جو بعد میں وزیرِ اعظم بنے۔

۳۰ء کے نمک ستیاگرہ اور ۳۱ء کی سول نافرمانی تحریک میں جلسوں میں تقریریں کیں اور قید فرنگ میں رہے جہاں عظیم ہستیوں کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔

رہائی کے بعد امن صاحب وکالت سے صحافت میں آگئے۔ لالہ دیش بندھو گپتا جی انھیں اردو کے مشہور قومی روز نامے 'تیج' میں لے آئے جہاں انھوں نے ۱۵ سال تک ادارت کی ذمہ داری نبھائی۔

سن بیالیس کی بھارت چھوڑو تحریک میں امن صاحب کو سرکار نے خطرناک شخص قرار دیا اور فیروز پور جیل میں نظر بند رکھا۔

۴۶ - ۴۷ء کے فسادات نے دِلّی کی فضا کو مسموم کر دیا تھا۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا تھا۔ مذہب کے نام پر شیطنت کا رقصِ عریاں ہو رہا تھا۔ مگر امن صاحب لوگوں کو پیامِ امن و انسانیت دے رہے تھے۔ آج بھی کئی حضرات موجود ہیں جنھوں نے اس تنِ لاغر کو مجاہدانہ شان سے میدان میں سر بکف جاتے دیکھا۔ فساد زدہ علاقوں میں امن صاحب نے رواداری کی بات کی مظلوموں کی طرفداری کی ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ بلوائیوں کے ہجوم کے سامنے تن تنہا دیوار آہن بن کر کھڑے ہو گئے۔ گلے پر خنجر رکھا گیا گالیوں سے نوازا دھمکیاں دی گئیں مگر امن صاحب کے لب پر یہی نغمہ تھا ؎

نیکی ہے اک فسوں مجھے اب تک یقیں نہیں
ایماں ہے سرنگوں مجھے اب تک یقیں نہیں

یقینِ محکم اور عملِ پیہم کی شمشیریں لے کر جہادِ زندگانی میں وہ ظلمت پسند

Marfat.com

قوتوں کے خلاف صف آرا رہے۔ تقسیم وطن کے بعد تو کچھ اخبارات نے کھل کر فرقہ پرستی کے شعلوں کو ہوا دی۔ پریس کی اس بے راہ روی کو روکنے کے لیے امن صاحب کو صوبہ دہلی کا پریس افسر بنا دیا گیا۔ صاحبزادہ خورشید احمد خاں (دِلّی کے چیف کمشنر) فرماتے تھے " امن صاحب جیسے میرے پاس پانچ افسر ہوتے تو دلّی میں فسادات نہ ہوتے"۔ امن صاحب نے سماج دشمن عناصر کی بیخ کنی کی۔ بقول جناب شفیق الرحمٰن قدوائی 'بزن' بول دیا۔ اخبارات کو راہِ راست پر لانا آسان کام نہیں تھا مگر امن صاحب بھی امن صاحب تھے۔

چودھری برہم پرکاش جی کے اصرار پر ۵۲ء میں دلّی اسمبلی کے انتخاب میں امن صاحب کانگریس کے ٹکٹ پر چناؤ کے میدان میں اُترے۔ علاقے کے لوگوں نے ووٹ بھی دیے اور نوٹ بھی یعنی امن صاحب کی اپنی جیب سے کُل ڈھائی سو روپے خرچ ہوئے۔ دلّی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر بنے اور اسٹیٹ ٹرانسپورٹ اتھارٹی کے چیئرمین کی ذمہ داری سونپی گئی۔ سیاسی مصروفیات کے باوجود آپ نے اس زمانے میں کئی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ ۵۳ء میں دلّی ریاستی حکومت کے وزیر بنا دیے گئے۔

یکم ستمبر ۵۵ء کو روزنامہ سنسار کا اجرا ہوا۔ امن صاحب وزارت سے پھر ادارت میں آگئے مگر سنسار اخبار کی عمر بہت مختصر ثابت ہوئی وجہ تھی ریشہ دوانیاں ؎

صحرانوردیوں میں بھی موجود ہیں رقیب ۔۔۔ تلوؤں سے چھیڑ چھاڑ ہے ہر نوکِ خار کو

سنسار سبوتاژ کی نذر ہو گیا کیا ہوا نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ ۵۶ سے ۵۹ء تک امن صاحب دِلّی لائبریری بورڈ کے چیئرمین رہے۔ ۵۸ء میں دلّی کے لیفٹننٹ گورنر کے مشیر اور تعلقات عامہ کمیٹی کے چیئرمین نامزد ہوئے آپ کے دوسرے ساتھی ڈاکٹر یدھ ویر سنگھ تھے۔ ۶۶ء تک انھیں دونوں حضرات نے ریاستی سطح پر دِلّی والوں کی نمائندگی کی تھی۔ انٹرم میٹرو پالیٹن کونسل کے

عارضی صدر کی حیثیت سے امن صاحب نے ممبران کو حلف دلایا۔

۷۰ء میں پیروں کی معذوری کی وجہ سے سماجی زندگی سے عملاً کنارہ کش ہوگئے اس وقت بھی ۷۵ کمیٹیوں سے صدر یا رکن کی حیثیت سے وابستہ تھے۔ امن صاحب کرسی پر بیٹھے تو بڑے نظر نہیں آئے عہدوں سے الگ ہوئے یعنی کرسی سے ہٹے تو چھوٹے نہیں دکھائی دیے۔ ہر حال میں مستی قایم رہی۔ گھر پر شطرنج کی بازیاں جمنے لگیں زیادہ تر ہندی کے مشہور ادیب جینندر کمار جی کے ساتھ مقابلہ ہوتا۔ کوئی جیل کا ساتھی آجاتا تو پرانی باتیں چھڑ جاتیں کوئی شاعر یا ادیب آجاتا تو باتوں کا سلسلہ چلتا ہی رہتا۔ قہقہے گونجتے رہتے کچھ حضرات فیضان سخن کے لیے بھی آتے تھے۔

امن صاحب کی خدمات کا اعتراف سرکاری سطح پر بھی کیا گیا ۷۴ء میں دلّی انتظامیہ کی ساہتیہ کلا پریشد نے اعزاز دیا۔ ۷۶ء میں اتر پردیش اردو اکادمی نے ادبی خدمات کے صلے میں انعام سے نوازا۔ ۷۷ء میں صدر جمہوریہ نے پدم بھوشن کا اعزاز عطا فرمایا۔ مگر امن صاحب نے زبان و قلم سے قوم کی جو خدمت کی تھی وہ بقول گوسوامی تلسی داس رسونتھا سکھائے تھی۔

خرابیٔ صحت کے باوجود امن صاحب کے لب پر کوئی شکوہ نہیں آیا نہ کبھی زمانے کی شکایت کی نہ تقدیر کا رونا رویا۔ اتنا فعال سماجی کارکن معذور ہوکر گھر میں محدود ہو جائے اور یاس کا سایہ بھی اپنے پاس نہ پھٹکنے دے یہ آسان بات نہیں ہے قائم العقل کی پہچان ہے۔ اکثر برنارڈ شاہ کے جملے کا حوالے دیتے تھے۔ نیچے کی منزل ٹھیک نہیں ہے تو کیا ہوا خدا کے فضل سے اوپر کی منزل تو ٹھیک ہے۔ اشارہ دل و دماغ کی طرف تھا۔ انھوں نے زمانے کو کبھی کوسا نہیں بلکہ زندگی کے ہر لمحے کا مزہ لیا جینے کا ذائقہ لیا۔ گزرے کل کی یادیں سنجوئے رہے لیکن روشن مستقبل کے شیدائی تھے۔ زریں روایات کے امین تھے ماضی پرست نہ تھے حال میں تر و تازہ رہنے کا فن وہ جانتے تھے۔ ہر حال میں

Marfat.com

شکر خدا کرتے رہے۔ زندگی میں کیا کیا نہیں ہوا مگر وہ ہمیشہ کہتے تھے تو کیا ہوا۔ امن صاحب ۷ جولائی ۸۲ ء کو صبح ½ ۱۰ بجے جہان فانی سے رخصت ہوئے مگر آخری دنوں تک دھرم روشن اور قلم جاری رہا۔

x x x

امن صاحب ایک فرد نہ ہوکر ایک جلوسِ زندگی تھے۔ وہ مجاہد آزادی تھے۔ وقت کے تقاضے اُنھیں میدان سیاست میں لے آئے۔ امن صاحب عالم باعمل تھے تنظیم میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ قومی تحریک کا گہرا مطالعہ بھی کرتے رہے یہاں تک کہ لوگ اُنھیں قومی تحریک کا انسائیکلو پیڈیا، کہتے تھے۔ تشدّد کے ذریعے انقلاب پسند نہ تھا مگر انقلابیوں کے جذبۂ سرفروشی کی عزت کرتے تھے۔ جیل میں رہے تو قاعدے قانون کی پوری پابندی کی۔ تحریکوں میں اتنی لگن سے کام کیا کہ کھانے پینے کی بھی سُدھ بُدھ نہ رہی نتیجہ یہ ہوا کہ تپ دق نے موت کی دہلیز تک پہنچا دیا مگر اپنی قوت ارادی سے اِس مہلک مرض سے نجات حاصل کی۔ میدان عمل میں ثابت قدم رہے۔ ایک واقعہ پیش خدمت ہے ۱۱ اگست ۴۲ ء کے دن چاندنی چوک میں جلوس کی اگلی صف میں امن صاحب تھے لاٹھی چارج ہوا ایک انگریز سارجنٹ نے اِن پر ڈنڈے برسانے شروع کیے مگر امن صاحب کے پائے استقلال کو ذرا بھی جنبش نہ ہوئی اگر دِتّی پولیس کا ایک داروغہ بیچ میں آکر اس سارجنٹ کو دوسری طرف نہ بھیج دیتا تو معلوم نہیں اُس دن کیا حادثہ ہو جاتا کیونکہ امن صاحب تو اپنی جگہ سے ہٹنے والے نہیں تھے۔ اس سے پہلے ۳۰ ء کے نمک ستیاگرہ میں سینے سے گرم کڑھائی لگا ہی چکے تھے تاکہ پولیس والے بنا ہوا نمک نہ چھین لے جائیں۔

سیاست میں جو تبدیلیاں آئیں ان میں بہت سی امن صاحب کو پسند نہ تھیں ان کے ذہن میں جو معیار تھا اُس پر کم ہی لوگ پورے اترتے تھے۔ اِسی لیے جب امن صاحب قربانی، نظم و ضبط اور مطالعہ کی بات کرتے تو سیاسی لوگ اُن کی

Marfat.com

باتیں تو بہت عزت سے سنتے مگر اُن پر عمل پیرا کم ہی ہوتے تھے امن صاحب کسی بھی عہدے پر رہے مگر اپنے رفقا کو کبھی نہیں بھولے ۔ کئی ساتھی مخالف پارٹیوں کے سربراہ یا بڑے عہدے دار بنے مگر امن صاحب سے ان کی دوستی قائم رہی کیونکہ امن صاحب نے دوستی یا رشتوں کو رنگین شیشوں سے نہیں دیکھا۔

امن صاحب ایک سچے گاندھی وادی تھے۔ کھادی پہننا اور چرخا کاتنا تو گاندھی واد کا اوپری چھلکا ہے مگر صدق وصفا عدم تشدد اور ذاتی زندگی کو ایک پیام بنا دینا صحیح معنوں میں گاندھی واد ہے۔ امن صاحب ظلم دیکھ کر کبھی خاموش نہیں رہے۔ غریبوں کی خدمت ان کا مذہب تھا اور یہ قول وفعل کی ہم رنگی اور ہم آہنگی ملمع نہیں بلکہ جزوِ ہستی تھی گاندھی جی نے فرمایا تھا، انسانی زندگی کو خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا' یہ مقولہ امن صاحب کے لیے مہامنتر کی حیثیت رکھتا تھا۔ برج کشن چاندی والے گاندھی جی کے مضامین کا اردو ترجمہ کرانا چاہتے تھے نظر انتخاب امن صاحب پر پڑی۔ امن صاحب ۴۶ء میں گاندھی جی کے بہت نزدیک آئے اِس ضمن میں ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ امن صاحب نے گاندھی جی سے پوچھا میں نبھانا لکھوں یا نباہنا کس ترجمے کو آپ بہتر سمجھتے ہیں۔ مہاتما جی نے کہا" دونوں میں کیا فرق ہے ؟" امن جی نے بتایا ہندی لفظ نِروَاہ سے نباہ بنا ہے لکھنؤ والے نباہنا بولتے ہیں اور دلّی میں نبھانا بولا جاتا ہے، گاندھی جی نے مسکرا کر کہا' ہم اس وقت دِلّی میں ہیں اس لیے نبھانا لکھیے " اِسی طرح باپو جی سے امن صاحب نے کہا' آپ کے مضامین کا ترجمہ کرنے والے کو تو اِس ملک کی تمام زبانیں آنی چاہئیں تو گاندھی جی نے اِن کے چہرے پر نظریں جما کر کہا' آدمی کہاں ملتے ہیں' گاندھی جی کے قریب آئے تو ان کے معیار پر کھرے اُترے۔ مہاتما جی نے اُنھیں آشرم میں مستقل طور پر رہنے کی دعوت دی مگر خانگی پریشانیوں کے سبب جانا نہ ہو پایا۔ گاندھی جی

Marfat.com

کی شہادت امن صاحب کے دل کی گہرائیوں کو چھو گئی اُن کی نظم و نثر میں عقیدت اور کرب کی جھلک نظر آتی ہے۔

اردو صحافت میں بھی امن صاحب کا خاص مقام ہے۔ روزنامہ تیج میں امن صاحب لیڈنگ نوٹس لکھتے، خبروں کا ترجمہ کرتے، مختصر نظمیں اور مختلف موضوعات پر مضامین لکھتے۔ لیکن روزنامہ تیج اخبار کے قارئین ایک کالم خاص دلچسپی سے ملاحظہ فرماتے تھے وہ تھا "نقش و نگار" جس کی داد کبھی کبھی عجیب ڈھنگ سے بھی ملتی۔ مگر جن حضرات کو یہ معلوم تھا کہ اس پردۂ زنگاری میں کون ہے وہ ملنے پر امن صاحب کو مبارکباد دیتے تھے۔ مزاح نگاری سنجیدہ انشا پردازی سے زیادہ مشکل ہے بات بھی کہی جائے اور وہ پسندِ خاطرِ احباب بھی ہو بلکہ لطف تو جب ہے جس پر نشتر چلے وہ بھی پکار اٹھے کیا خوب۔ امن صاحب کی زبان عام فہم اور ٹکسالی ہوتی تھی وہ علمیت سے دوسروں کو مرعوب کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ترجمے میں اُنھیں مہارت حاصل تھی لفظ پر لفظ چسپاں ہو جاتا تھا۔ ترجمے میں صوری اور معنوی دونوں خوبیاں ہوتی تھیں۔

سنسار اخبار میں نرم گرم کا کالم لکھتے تھے جس کا مذاق شائستہ اور زبان میں ادب کی چاشنی ہوتی تھی طنز کی ترشی بھی ہوتی تھی مگر اس کا مقصد تضحیک یا تنقید محض نہیں بلکہ اصلاح ہونا تھا۔ اصلاح کے نام پر وہ برائیوں کے ایسے بکھان یا منظر کشی کے خلاف تھے جس میں قارئین چٹخارہ لینے لگیں۔ انھوں نے کسی کی ٹوپی نہیں اچھالی۔ وہ عقیدت شکنی کے مقابلے میں عقیدت مندی کو بہتر سمجھتے تھے۔ امن صاحب نے اپنے اداریوں میں تنگ نظری، دقیانوسی روّیے، فرقہ پرستی کے خلاف آواز اُٹھائی مگر ان کا رویہ منفی نہ ہو کر مثبت تھا۔

وزارت اور چیرمینی کے زمانے میں بھی امن صاحب اخبارات کے لیے لکھتے رہے دنیائے صحافت سے تعلق بنا رہا ایک مرتبہ جواہر لال نہرو سے ملاقات

Marfat.com

کرکے آئے تو اخبار والوں نے اِس کی خاصی چٹپٹی خبر بنادی۔ پنڈت جی نے خفگی کے عالم میں فون کیا کہ آپ نے اخبار والوں کو سب کچھ کیوں بتادیا۔۔۔ امن صاحب نے کہا ، جناب میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا لیکن میرے ویوز تو سبھی کو معلوم ہیں اِس لیے انھیں ہی چھاپ دیا۔ لیکن آپ نے غور فرمایا اس میں کہیں کوئی جملہ یا اشارہ ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ آپ نے کیا فرمایا۔ پنڈت جی نے ہلکی ہنسی کے دوران کہا ، ہاں یہ تو میں نے خیال ہی نہیں کیا مگر ذرا آپ اِس قوم سے بچ کر رہیے گا۔" امن صاحب نے جواب دیا، جناب میں خود اِسی قوم سے ہوں۔

اُردو شاعری میں قوم پرستی اور حب الوطنی کی پرانی روایت ہے لیکن گنے چنے شاعر ہی دار و رسن کی منزلوں سے گذرے ہیں۔ جناب گوپی ناتھ امن کی شاعری میں احساس مشاہدہ اور تجربے شامل ہیں اِسی لیے ان کے کلام میں کیفیت ہے۔ عصری آگہی اور سماجی شعور کو فنکارانہ انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ کبھی واہ واہ کے لیے نہیں لکھا۔ عقیدوں کے خلاف ایک بھی شعر نہ کہا انھوں نے جن موضوعات پر طبع آزمائی فرمائی ان میں خاصا تنوع ہے۔ اُن کے کلام میں ذاتی میلانات اور تحریک آزادی کے تقاضے فن کو انقلابی روح سے چسپاں کرنے کے آرزومند نظر آتے ہیں۔ لکھنؤیت کلام میں جلوہ گر ہے شاعری میں بھی ضابطہ پسند تھے مگر عروض کی سختیوں کے باوجود پرانے استعارات وتشبیہات کو نئے انداز و معنی میں استعمال کیا۔ اُن کا محبوب وطن ہے۔ سیاسی غزلیں کہیں مگر غزل گوئی کا لب ولہجہ قائم رکھا۔ نظمیں لکھیں جن میں بلا کی روانی اور معنی آفرینی ہے۔

امن صاحب نے مذہبی شاعری بھی کی ہندو اور سکھ دھرم کی مشہور کتابوں کے منظوم ترجمے کیے جو منظر عام پر نہ آسکے۔ وہ ثنا خوان پیمبر وآل پیمبر رہے حمد نعت، قصیدے، سلام اور مرثیے بہت کچھ لکھا جو لکھا دل سے لکھا۔

Marfat.com

میدانِ مزاح میں بھی انھوں نے شہسواری کی پیروڈی جیسی شوخ صنف کو منھ لگایا استادوں کی زمینوں میں خوب خوب شعر نکالے ملاحظہ فرمائیں ؎

جوانوں کا بڑھاپا دیدنی ہے اولڈ دلّی میں
نئی دلّی میں بوڑھوں پر جوانی دیکھتے جاؤ

امن صاحب نے کشتِ سخن کی آبیاری کی اُن کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے۔ اُنھوں نے اردو کو جناب شام لال روشن دہلوی اور کشن لال خنداں دہلوی جیسے سخنور دیے جنھوں نے مشاعروں میں سامعین کے لبوں پر تبسّم کے گلاب کِھلائے ہیں۔ حصول آزادی سے پہلے قومی مشاعروں کا انتظام کیا جس میں عوام کو پیامِ حریت دیا۔ ملک آزاد ہوا تو فرقہ پرستی کے ماحول میں شمع امید فروزاں کی 'محبت کے نغمے سناؤں گا پھر بھی' جیسی نظموں میں اپنے عزم کو آشکار کیا۔ آزاد ہندوستان میں تعمیر کے لیے ذہن تیار کرنے کے لیے شعرا اور ادبا کی حوصلہ افزائی کی ان کا یقین تھا اچھا شاعر اچھا انسان بھی ہونا چاہیئے۔ اور اسے سامعین کے شعور کو صحت مند بنانا چاہیئے۔ اس لیے انھوں نے مشاعروں کی اصلاح بھی کی اور اُس سے کچھ احباب ناراض بھی ہوئے مگر امن صاحب کی عقیدت کے جوش کا یہ حال تھا ؎

حق گویم و دنیا سبز باغم دہد آزار
آخر چہ شد اں شیوہ برادر کشیدن

۶۲۲ میں غازی آباد میں امن صاحب نے ہندی میں کویتا لکھنا شروع کیا۔ جیل میں کوی سمیلنوں میں کویتا پاٹھ کیا۔ امن صاحب کے دائرہ احباب میں ہندی جگت کی مشہور ہستیاں میتھلی شرن گپت کشیم چندر سمن، بالکرشن شرما نوین رام دھاری سنگھ دنکر وغیرہ تھے جن کا ساتھ راشٹریہ کوی سمیلنوں میں بھی ہوتا اور گھر پر بھی گوشٹھیاں ہوتی تھیں۔

امن صاحب نے صرف دو کہانیاں لکھیں ہیں جن میں سے ایک ہی شائع

Marfat.com

ہوئی عنوان تھا 'بڑے میاں' پاکستان کے ایک رسالے نے اِس کہانی کو دوبارہ شائع کرتے ہوئے یہ نوٹ دیا "خدا کا شکر ہے ابھی اس برصغیر پر ایسے بزرگ ادیب موجود ہیں۔ امن صاحب سات زبانیں جانتے تھے تقریباً ایک درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ بہت سے مسودات شائع ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ امن صاحب کی ریڈیائی تقاریر اخبارات کے مزاحیہ کالموں سے ادبی اور سیاسی خاکے اور مضامین اگر جمع کر کے کتابی شکل دی جائے تو یقیناً ایک اہم کام ہوگا۔

براڈکاسٹر کی حیثیت سے امن صاحب بہت مقبول تھے جناب رفعت سروش رقم طراز ہیں" امن صاحب فصاحتِ زبان سے واقف ہیں اور وہی زبان لکھتے ہیں جو بولتے ہیں اور آسان زبان میں اپنی بات کو واضح کرتے ہیں اس لیے اِن کی تقریریں براڈ کاسٹنگ کے اعلا معیار پر پوری اترتی ہیں اور میں ان کو اُردو کے چند بہترین مقررین میں شمار کرتا ہوں۔ اِن کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت وسیع ہے اِس لیے میں نے امن صاحب کو ہر موضوع پر زحمت دی اور اُنھوں نے اپنی تقریر کے موضوع کا پورا حق ادا کیا۔ یہ برجستگی ہر ایک کے حصے میں نہیں آتی جامعیت اور اختصار کے ساتھ محدود وقت میں نفس مضمون کو پیش کرنا ایک فن ہے۔ ریڈیائی مباحثوں کے لیے بیدار اور انضباط پسند ذہن کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ گفتگو کی روانی کے ساتھ غیر ضروری اور قابل اعتراض باتیں نہ کہی جائیں۔ امن صاحب کو اِس فن پر پورا عبور حاصل ہے"

شاعروں کی انتظامی قابلیت پر عام طور پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔ لیکن امن صاحب وزیر ہوئے تو سماج کے ہر طبقے نے اِس کا خیر مقدم کیا۔ اخبارات نے تعریف میں اداریئے لکھے۔ عبدالماجد دریا بادی نے پیغام بھیجا "خدا کا شکر ہے اُردو کا ایک شاعر وزیر بنا" جوش ملیح آبادی نے منظوم مبارکباد دی ے

Marfat.com

طاقوں سے گرے جنگ و جدل کے اصنام
جب امن کے ہاتھوں میں وزارت آئی

امن صاحب اپنی انتظامی قابلیت کا لوہا پریس آفسر کی حیثیت سے منوا چکے تھے افسران بالا اُن کی عزت کرتے تھے ان کی کوئی بات کبھی ٹالی نہیں گئی۔ محکمے میں بدعنوانی کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ خود بہت محنت کرتے تھے اس لیے ماتحت اسٹاف بھی مصروف رہتا۔ امن صاحب افسر سے زیادہ کنبہ کے بزرگ کی حیثیت سے مانے جاتے تھے کیونکہ وہ تمام دفتر والوں کو ایک خاندان مانتے تھے چھوٹے بڑے کی تفریق نہیں بلکہ دکھ سکھ میں برابر کے شریک تھے۔

ڈپٹی اسپیکر بنے اسٹیٹ ٹرانسپورٹ اتھارٹی کے چیرمین رہے مگر اپنی کار نہیں تھی بس میں آتے جاتے تھے کوٹھی میں جانے کو تیار نہیں تھے مگر جواہر لال جی کا حکم آیا اور بادل ناخواستہ سرکاری کوٹھی میں گئے لیکن محلے والوں سے رابطہ قائم رہا۔ وزارت کے زمانے میں بھی وہی سادگی اپناپن وہی ملنساری، دفتر کیا تھا کھلا دربار تھا جہاں ہر ایک کی بات سنی جاتی تھی اور مدد کی جاتی مگر قاعدے کے خلاف کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ غریبوں اور دیہات والوں کے لیے ان کے دل میں خاص جگہ تھی۔ جاڑا گرمی برسات گاؤں گاؤں گھومے، دلی پنچایت راج قانون۔ زمینی اصلاحات کا قانون وغیرہ ان کے ہی مرہون منت ہیں۔

امن صاحب ایک قابل پارلیمنٹرین تھے۔ اسمبلی میں تیار ہو کر جاتے: بحث میں مدلل تقریر کرتے ممبران میں جب بھی گرما گرمی ہوتی یا ایوان کی فضا کچھ بوجھل ہو جاتی تو اپنے ایک بامو قع شعر یا جملے سے ماحول کو پھر تروتازہ کر دیتے۔ کمیٹیوں میں اُن کے ساتھ کام کرنا اپنے آپ میں بہت دلچسپ ہوتا تھا۔ وہ اپنے مخالفین کی بات کو بھی سنتے جو ماننے کی بات ہوتی اسے مان لیتے۔ ایک بل کے سلسلے میں ڈاکٹر امبیدکر کی کوٹھی پر گئے ڈاکٹر صاحب نے تعجب سے پوچھا

Marfat.com

آپ کانگریسی وزیر ہوکر بھی میرے پاس آئے ہیں امن صاحب کا جواب تھا میں تو ایک طالب علم کی حیثیت سے حاضر ہوا ہوں، امید کہ پر اس کا گہرا اثر پڑا امن صاحب نے تعلقات عامہ کی کمیٹیوں میں ایسے لوگوں کو لیا جو صاحب کردار تھے۔ اچھا آدمی خواہ کسی بھی پارٹی کا ہو وہ اپنے ساتھ جوڑ لیتے تھے۔

امن صاحب قلم کے دھنی تھے وہ وکیل رہ چکے تھے اس لیے قانونی پہلو بھی دماغ میں رہتا تھا ادیب اور شاعر ہونے کی وجہ سے ان کی فائل کی نوٹنگ میں ادبی چاشنی ہوتی تھی جس کو دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا شیکسپیر، ملٹن، گولڈ اسمتھ، وغیرہ کے اقتباسات فائل میں تحریر فرماتے تھے۔ کاغذات پورے پڑھتے تھے جس دن فائل آتی اسکو اسی دن یا اگلے ہی دن نپٹا دیتے ہاں اگر معاملات کی سیدھی جانکاری کی ضرورت ہوتی تو افسر کو بلوا لیتے یا علاقے والوں سے مل کر معاملات کی سیدھی جانکاری حاصل کرتے تھے۔ سنتے سب کی تھے مگر فیصلے خود لیتے تھے۔

ایک بڑا عہدہ ایک غلط قسم کے سیاستداں کے تحت امن صاحب کو دیا جارہا تھا امن صاحب نے اس زور سے ایک ہی جملہ میں خفگی کا اظہار کیا کہ پیش کش کرنے والے صاحب سٹپٹا گئے۔ دلی کے وزیر اعلا چودھری برہم پرکاش نے ایک تقریر میں کہا تھا:

"میں نے امن صاحب کو اپنی کابینہ میں اس لیے شامل کیا تھا کہ یہ غلط بات دیکھ کر چپ نہیں رہیں گے اور مجھے بھی غلط کام نہیں کرنے دیں گے۔"

امن صاحب کسی بھی عہدے پر رہے لیکن وضعداری قائم رہی پنڈت خوشدل ایڈیٹر ماہنامہ دیش سیوک دہرہ دون نے ایک واقعہ بیان کیا ہے 'رات کو نو بجے کسی نے میرے دفتر کے دروازے پر دستک دی میں نے دروازہ کھولا امن صاحب کو دیکھ کر مجھے خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی میں نے کہا 'آپ وزیر ہیں ریلوے اسٹیشن سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو فون کر دیتے تو وہ فوراً کار لے کر جاتا اور آپ کو سرکٹ ہاؤس میں ٹھہرانے کا انتظام کرتا۔

امن صاحب نے سنجیدگی سے جواب دیا، خوشدل صاحب یہ وزارت کتنے دلوں کی ہماری آپ کی دوستی تو زندگی بھر قائم رہے گی۔ جو دلی سکون اور راحت مجھے آپ کے یہاں رہ کر ملے گی وہ سرکٹ ہاؤس کی نمائشی زندگی شان وشوکت اور تکلفات کی اس دنیا میں کہاں۔"

جناب امن جب سیاسی زندگی سے الگ ہوئے تو گھر میں صرف ساڑھے انیس روپے تھے کرائے کے مکان میں عمر گزار دی۔ کار کا تو ذکر ہی کیا گھر میں سائیکل بھی نہ تھی۔ مگر سکون قلب تھا۔ اپنی زندگی اپنے ڈھنگ سے جینے میں بھی اک مزہ ہے۔

دل میں اگر روحانیت جلوہ گر ہو تو تمام زندگی Pilgrim's Progress ہو جاتی ہے امن صاحب نے عقیدت کو رہبر بنایا اور اخلاقی قدروں کو جزو حیات۔ ان کی عقیدت میں تجارت نہیں تھی۔ پاکستان میں حسین ڈے کا جلسہ تھا جناب امن نے تقریر کی ابتدا مولانا ظفر علی خاں کے ایک شعر سے کی ؎

جناب کرشن کا یوں احترام کرتا ہوں	محمدؐ عربی کو جھکائیں سر ہندو

سامعین سے پوچھا کہیے کیسا شعر ہے؟ آواز آئی بہت اچھا ہے۔ امن صاحب نے کہا کچھ اچھا تو ہے مگر بہت اچھا نہیں ہے۔ مذہبی رواداری کی بنیاد تجارت نہیں ہے۔ عقیدت میں شرطیں نہیں لگائی جاتیں۔ محبت کو فائدے نقصان کے میزان میں نہیں رکھا جاتا۔ اس کے بعد امن صاحب نے ایک رباعی پیش کی،

حسین ابن علی کو سلام کرتا ہوں	کہ اس سے کسب فیوض دوام کرتا ہوں
نہیں ہے مصلحت آمیز بندگی میری	پئے طہارتِ دل اہتمام کرتا ہوں

یہ ہے امن صاحب کا اندازِ فکر۔

گرونانک جی سے عقیدت تھی گرو گرنتھ صاحب سکھ منی صاحب اجب جاجی صاحب کا

Marfat.com

پاٹھ کرتے تھے۔ سنسکرت میں گیتا پاٹھ کرتے تھے۔ بائبل سے متاثر تھے یسوع مسیح کی قربانی دل پر نقش تھی۔ کلام پاک انھوں نے مولانا نورالدین بہاری سے باقاعدہ پڑھا۔ اسلامیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مدلل اور بامقصد تقریر فرماتے تھے۔ حضرت علی مرتضیٰ اور امام عالی مقام حسین علیہ السلام سے دلی لگاؤ تھا۔ انھوں نے اپنی عقیدت کا اظہار نظم و نثر میں کیا ہے ؎

غمِ حسین میں جو آنکھ تر نہیں ہوتی
اسے نصیب حقیقی نظر نہیں ہوتی

حسینی شان کے سجدے ہیں سجدے میری نظروں میں
جبیں فرسائیوں کا نام سجدہ ہو نہیں سکتا

مذاہب کا تقابلی مطالعہ امن صاحب کو خاص طور سے پسند تھا میراں تلسی سبور وغیرہ کا بہت سا کلام ازبر تھا۔ وہ ذاکرِ حسین تھے ہندوستان کے کونے کونے میں مجلسیں پڑھی۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں نے صلح خواہی کے لیے حافظ کے راستے سے الگ ہٹ کر اپنی راہ بنائی ہے میں 'بابراہمن اللہ اللہ با مسلماں رام رام کرتا ہوں۔ رام اُن کے اندر بسا ہوا تھا اور آخری لمحات میں بھی وہ نام جپ رہے تھے۔ اسی خدا پرستی کی وجہ سے وہ سیاست کے نشیب و فراز میں اپنا توازن برقرار رکھ سکے۔

امن صاحب کی شخصیت کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُن کے دائرہ احباب میں ملک کے وزیرِاعظم سے لے کر گاؤں کے بغیر پڑھے لکھے کسان تک آتے تھے۔ راشٹرپتی بھون سے گاؤں کی چوپال تک اُن کا میدان عمل تھا۔ لوگوں سے مل کر انھیں خوشی ہوتی تھی مگر فائیو اسٹار ہوٹل کے کلچر والوں سے 'میں تو مل لیتا ہوں لیکن دل میرا ملتا نہیں' والی بات تھی یعنی انھیں برداشت کرتے تھے۔ غلط تلفظ یا ناموزوں شعر سے انھیں

Marfat.com

بہت کوفت ہوتی تھی۔ وہ غیر رسمی نشستوں میں زیادہ لطف لیتے تھے شرطیہ تھی اہل محفل پڑھے لکھے ہوں خاص طور پر فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی، نواب جعفر علی خاں، اثر لکھنوی۔ جسٹس ویاس دیو مصرا سید حسین علی جعفری وغیرہ حضرات اگر موجود ہوتے تو یہ محفل گھنٹوں چلتی۔

سماجی زندگی میں فعال لوگوں میں نہیں کہنے کی ہمت ہونی چاہیئے ورنہ لوگ ان پر ظلم کرتے ہیں ایک اچھا مقرر شاعر اگر کہیں صاحب اقتدار ہو تو وہ چاہے یا نہ چاہے جلسے جلوسوں، مشاعروں وغیرہ میں اُسے مدعو کیا جاتا ہے اور یہ لوگ منع نہیں کر پاتے۔ یہ مروت کبھی کبھی ذہنی کوفت بن جاتی ہے اور صحت پر بھی اثر انداز ہوتی ہے امن صاحب کا حال بھی یہی تھا جان پہچان والے آتے اور جلسے کے لیے ہاں کرالے جاتے۔ گھر والے جز بز ہوتے۔

امن صاحب پر ایک ظلم یہ بھی ہوتا تھا جب انھیں کسی کی تقریر لکھنی پڑتی تھی کبھی کبھی تو نوبت یہاں تک آجاتی تھی، حضور یہ تو آپ نے اپنے معیار کی لکھ دی میرے معیار کی لکھ دیجیے، امن صاحب کا بہت سا وقت لوگوں کے شعری یا نثری مجموعوں کے دیباچے لکھنے میں صرف ہوا۔ ہم لوگ دبی زبان کہتے بھی تھے اب یہ ایک اور مسودہ آگیا" وہ کہتے "منع کیسے کروں" ان کی بے چارگی دیکھ کر ترس بھی آتا تھا۔ اگر مجموعے میں کچھ جان ہوتی تو خیر۔ ورنہ اِس طرح کا پیش لفظ لکھا جاتا جس میں کتاب گم ہو کر رہ جاتی یعنی دیباچہ ٹاپ ہیوی ہوتا۔ وہ کتاب کے ایک ایک شعر یا جملے کو پڑھتے تھے مگر کلام ہی بے نمک ہو یا نثر پھسپھسی تو دیباچے لکھنے میں کیا خاک مزہ آئے۔ لیکن امن صاحب ہیں کہ لکھ رہے ہیں۔ اُن کے لکھے پیش لفظ میں کچھ جملے ایسے ہوتے جن سے کتاب کی اصلیت بھی ظاہر ہو جاتی اور عقلمندوں کے لیے اشارہ بھی ہوتا مگر مصنف کی دل شکنی بھی نہیں ہوتی۔ مثلاً سخنور نے دوسروں کے کلام سے استفادہ کیا ہے تو لکھتے اِن صاحب کا مطالعہ بہت وسیع ہے اگر کلام میں غلطیاں ہیں تو شعر

لکھ دیتے ہے

نظم کس از عیب وہنر پاک نیست　　　آب رواں بے خس وخاشاک نیست

اگر کوئی 'بے اُستاد' ہوتا تو لکھتے اِنھوں نے اپنی راہ خود بنائی ہے۔

بچپن سے ہی امن صاحب کو کتب بینی کا شوق تھا اتنا پڑھتے تھے کہ والدہ آکر ہاتھ سے کتاب چھین لیتیں۔ نتیجہ یہ ہوا دماغی ارتقا تو خوب ہوا مگر جسمانی طور پر وہ کھیلوں کی دنیا سے دور ہی رہے۔ اسکول میں ایک دفعہ کرکٹ کھیلنے گئے تھے مگر پہلی ہی گیند نے وکٹوں کو گرا دیا اور یہ کھیل کی دنیا سے آؤٹ ہوگئے۔ جب پاؤں سے معذور ہوگئے تو ریڈیو سے فٹ بال ہاکی اور کرکٹ کے میچوں کی کمنٹری سن لیتے تھے یا ٹی وی پر میچ دیکھ لیتے تھے کتاب ان کی بہترین رفیق تھی۔ لسانیات، مذاہب کا تقابلی مطالعہ، سماجی ارتقا یا کسی کا معیاری مجموعۂ کلام پڑھنے سے اُن کی ذہنی تسکین ہوتی۔ ناول اور کہانیاں بہت کم پڑھتے اور جاسوسی یا رومانی ناولوں کو تو انھوں نے کبھی ہاتھ لگایا ہی نہیں۔ مطالعے کا شوق تادم آخر قائم رہا ۸، ۷ گھنٹے روزانہ تو کتابوں کے ساتھ گذرتے ہی تھے جتنا پڑھنے کا شوق تھا کتابیں ڈھنگ سے رکھنے کا اتنا ہی سلیقہ نہ تھا اس لیے اکثر بے ترتیبی سے پریشان رہتے۔

امن صاحب کی زندگی کی کامیابی میں ان کی شریک حیات شریمتی رگھناتھ کماری جی کا بڑا حصہ ہے۔ جنھوں نے شوہر کی خدمت کو فرض اولین سمجھا اور امن صاحب کو حتی الوسع گرہستھی کے جھنجھٹوں سے آزاد رکھا ۴۲ ۶ میں تحریک آزادی میں جیل گئیں حصول آزادی کے بعد سماجی تنظیموں میں بہت کام کیا۔

امن صاحب گھر کے معاملات میں عین غین ہی تھے یعنی حساب کتاب رکھنے سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مگر روزانہ زندگی کے کاموں میں بھی ان کا حال کچھ کچھ چچا چھکن جیسا ہوتا تھا۔ ایک دن اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ پانی گرم اور دول کے جاگنے سے پہلے کر دیں کیونکہ سب جاگ گئے تو انھیں اس قسم کے کام نہ کرنے دیں گے

اور وہ گھر کے کاموں میں اپنا تعاون دینا چاہتے تھے۔ صبح ہم لوگوں کی آنکھ کھلی تو دیکھا باورچی خانے کی روشنی جل رہی ہے۔ دیا سلائی کی بہت سی ادھ جلی تلیاں پڑی ہیں مگر چولہا سرد ہے۔ نل کے نیچے پانی کی ٹنکی رکھی ہے مگر اس کے نیچے کی ٹونٹی بند نہیں کی گئی لہذا پانی کی آمد و رفت جاری ہے۔ شریمتی امن اگر امن صاحب کو پھل تراشنے کی کوشش کرتے دیکھتیں تو فرماتیں ، دیکھیے چاقو تیز ہے ذرا ہاتھ بچائیے گا، کبھی کبھی تو مسکرا کر کہتیں ، یہ ہم لوگوں کی دنیا ہے آپ کی دنیا کتاب اور قلم کی ہے یہ میدان آپ کا نہیں۔

امن صاحب کاغذات کبھی سنبھال کر نہیں رکھتے تھے جب مشاعرے جلسے یا کسی مٹنگ میں جانے کو تیار ہوتے تو زور شور سے تلاش شروع ہوتی قدرت نے بیگم امن کو یہ خوبی عطا فرمائی تھی کہ وہ کتابوں اور کاغذوں کے انبار سے مطلوبہ غزل یا درخواست ۔مضمون یا فائل تلاش کرکے امن صاحب کے سامنے پیش کر دیتی تھیں۔

امن صاحب کی اگر کوئی کمزوری تھی تو شطرنج۔ موقع مل جاتا تو پھر بازی جم جاتی۔ ایک کیمپ میں گئے لوگوں کو آرام کرنے کا وقفہ دیا گیا مگر یہ وقت کہاں ضائع کرتے جیندر جی کے ساتھ کھیل شروع ہو گیا اور منتظمین پریشان کیونکہ اِن دونوں حضرات کو تقریر کرنی تھی۔ شطرنج کھیلتے وقت کوئی آجاتا تو بات ہاں ،ہوں، میں ہوتی۔ کھانے کے لیے باربار تقاضے آتے مگر یہ ایسے مبتلائے شطرنج تھے کہ بھوک برداشت کرنے کو تیار تھے مگر بازی سے ہاتھ اٹھانے کو تیار نہ تھے۔ اس وقت لوگ اصرار کرنے سے ڈرتے تھے کیونکہ جھلّا کر کہیں برت ہی نہ دھارن کر لیں۔ بس اس معاملے میں ہم نے دیویندر ستیارتھی جی کو ثابت قدم دیکھا جو تالاب کے کنارے والے بگلے کی طرح گھنٹوں انتظار کرتے کہ کب شطرنج کی بازی سمٹی جائے اور

Marfat.com

وہ اپنی کہانی شروع کریں۔ امن صاحب کی پاؤں کی معذوری انھیں راس آئی یعنی ایک سننے والا مل گیا وہ چائے پیتے اور داستان جاری رہتی یہ وہ الفِ لیلا تھی جس میں ایک داستان ہزار بار سنائی جاتی تھی۔

کائستھ ہوتے ہوئے بھی امن صاحب کباب اور شراب سے دور رہے۔ وہ زاہد و پارسا تھے مگر اس پر کبھی ناز نہیں کیا۔ وہ زاہد تھے مگر زاہد خشک نہیں۔ شراب کو ہاتھ نہیں لگایا اس کے خلاف بھی بہت کچھ لکھا مگر شرابیوں سے نفرت نہیں تھی۔ وہ تر و تازہ ماحول کے دلدادہ تھے۔ انحطاط انھیں ناپسند تھا۔ خود باغ و بہار شخصیت تھے کہا کرتے تھے منھ لٹکا کر بیٹھنے سے بڑھاپے کا بوجھ بڑھ جاتا ہے۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنسنا بڑے دل گردے کی بات ہے اس وقت بھی جب زندگی اور موت میں کشمکش تھی ڈاکٹر نے کہا، ذرا زبان دکھائیے، امن صاحب نے مسکرا کر کہا، جناب زباں درازی اچھی نہیں ہوتی۔

امن صاحب ۱۹۳۲ء میں دلّی آئے نصف صدی میں انھوں نے وقت کی کتنی ہی تبدیلیاں دیکھیں۔ دلّی کا نقشہ بدلا، نئی تہذیبوں اور تمدنوں کا انفصال ہوا قدریں بدلیں۔ نئی دلّی کا رنگ روپ انھیں لبھا نہ سکا مگر امن صاحب عطر کے داغ سی پرانی دلّی کے عاشق رہے اُسی خوشبو سے ان کا دل و دماغ معطر رہا۔ وہ اِس کلچر کی مہک کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔ اُن کی تمنا تھی کہ دلّی کی نک سک چاہے کتنی بھی درست کیوں نہ کی جائے مگر، دہلویت، ختم نہ ہو۔ دلی کے کلچر کا تحفظ ہو یہ صدیوں کی وراثت سیاست وقت کے پاؤں تلے نہ روندی جائے کاش ان کی یہ تمنا پوری ہو۔

پروانہ رُدولوی

مولانا عبدالباقی ایم اے

قدمیں اچھی خاصی بُلندی وبالائی۔ رنگ گندمی۔ آنکھیں اور بھویں سیاہ۔ سینہ چوڑا اور کمر پتلی۔ ہاتھ بازو مضبوط اور لمبے۔ گفتگو اور انداز بیان میں ایک خاص قسم کی نمکینی —— یہ تھے مولانا عبدالباقی ایم اے۔ آپ دلی والے تو نہ تھے مگر ملک کے بٹوارے کے بعد اجڑنے والی دِلّی کو پھر سے بسانے والوں میں ضرور تھے۔ آزادی سے پہلے عمر کا بیشتر حصّہ لاہور میں گذرا —— وہ شہباز لاہور کے ایڈیٹر تھے۔ مولانا عثمان فارقلیط کے بعد زم زم کے چیف ایڈیٹر بنے۔ انھوں نے ایک شاندار باتصویر اخبار آزاد بھی نکالا وہ زمیندار اور لاہور کے چند دوسرے اخبارات سے بھی وابستہ رہے خضر حیات خان کی یونینسٹ وزارت میں وہ ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز بھی رہے۔

مگر آزادی کے بعد وہ دلّی میں آبسے اور ۲۳ر فروری ۱۹۶۸ء کو نہایت کس مپرسی کے عالم میں اسی شہر کی خاک میں مل گئے۔

وہ ایک عظیم صحافی ضرور تھے مگر Committed صحافی نہ تھے۔ اُن کی وابستگی صرف قلم سے تھی اور اُن کا قلم آگ بھی اگلتا تھا اور پانی

بھی۔ ایک اخبار کے دفتر میں بیٹھ کر وہ آگ لگاتے تھے تو دوسرے اخبار کے دفتر میں بیٹھ کر اس آگ کو بجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ نہ جانے یہ اُن کی شخصیت کا تضاد تھا یا کچھ اور۔ انھیں سردار پٹیل سے قریب ہونے کا شرف بھی حاصل تھا اور مولانا ابوالکلام آزاد کا قرب بھی نصیب تھا۔

حکایات گھڑنے۔ اقوالِ زرّیں ڈھالنے اور مصنوعی حوالہ جات تراشنے میں انھیں ملکہ حاصل تھا وہ اپنی ان تخلیقات کو اپنے ادارتی کالموں میں زور پیدا کرنے کے لیے آزادانہ استعمال کرتے تھے۔

جواہر لال نہرو سے لے کر لال بہادر شاستری تک اور اچاریہ نریندر دیو سے لے کر ڈاکٹر لوہیں تک ملک کے صفِ اوّل کے تمام سیاستدانوں سے اُن کی جان پہچان تھی مگر اس جان پہچان سے وہ زیادہ فائدہ نہ حاصل کر سکے ہو سکتا ہے کہ اُن کی لاہور کی زندگی اعلا و ارفع اصولوں کی ترجمان رہی ہو مگر دلّی آنے کے بعد دال روٹی کی فکر اُن کو زیادہ رہنے لگی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ اُن کی وفاداریاں بھی بدلتی رہتی تھیں۔

مولانا عبدالباقی نے آزاد ہندوستان میں مولانا عبدالوحید صدیقی کے ساتھ مل کر روزنامہ نئی دنیا کی بنیاد رکھی۔ مولانا صدیقی نئی دنیا کے مینجنگ ایڈیٹر تھے اور باقی صاحب چیف ایڈیٹر۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ اخبار بٹوارے کی تباہ کاریوں سے متاثر ہونے والے مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گیا۔ نئی دنیا نے مسلمانوں کے اندازِ فکر کو بدلنے انھیں ہندوستان میں رہ کر حالات کا مقابلہ کرنے اور عزم و ہمت سے کام لینے کا عادی بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ باقی صاحب نے نئی دنیا میں جاندار اداریے لکھے شذرات سپرد قلم کیے اور مسلمانوں

Marfat.com

کے احساسِ کمتری کو دور کرنے والے مضامین چھاپے مگر جلد ہی انھوں نے نئی دنیا سے علیحدگی اختیار کرلی اور خود اپنا اخبار پیام وطن جاری کیا ان کا یہ اخبار کمزور طبقا کے بالخصوص مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی نہ کرسکا حکومت کی صفائی پیش کرنا۔ اس پر مسلمانوں کا اعتماد بحال کرنا اس اخبار کا خاص مقصد تھا۔

ان دنوں شیخ محمد عبداللہ جیل میں تھے اور مجتبیٰ غلام محمد کشمیر کے وزیر اعظم تھے مس سردولا سارا بھائی دہلی میں بیٹھ کر شیخ صاحب اوران کے دیگر رفقاء ـــــ مولانا مسعودی اور میرزا افضل بیگ وغیرہ کی نظربندی کے خلاف زبردست مہم چلا رہی تھیں۔ نئی دنیا شیخ عبداللہ کی نظربندی کے خلاف مس مردولا سارا بھائی کی اس مہم میں بھرپور حصّہ لے رہا تھا۔ کشمیر میں نئی دنیا کے داخلہ ہی کی لغت تھی اور پیام وطن بخش غلام محمد اور حکومت ہند کے نظریات کی تبلیغ کا ذریعہ بنا ہوا تھا۔ پیام وطن اور نئی دنیا میں اتنا ٹکراؤ تھا کہ کچھ نہ پوچھیے۔ بے باکی. مسلم پروری اور شیخ محمد عبداللہ حمایت کی وجہ سے روز بروز نئی دنیا کی مقبولیت میں اضافہ ہورہا تھا مگر پیامِ وطن، ٹیلی پرنٹر کی جزوی اچھی کتابت وطباعت، اوریجنل ریڈنگ میٹر اور ضخامت کے باوجود نہ چل سکا۔ مولانا عبدالباقی کار اور کوٹھی کے مالک تھے۔ اور اُن کی دوسری بیوی شاہدہ نکہت اپنی کوٹھی میں ہر شام دربار لگاتی تھیں جن میں اپنی شرکت کو دہلی کے شاعر ادیب اور افسانہ نگار باعث فخر سمجھتے تھے مگر

؎ حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شُد

مولانا عبدالباقی کو پیام وطن کے لیے جو امداد ملتی تھی وہ اُن کے اخراجات کے مقابلے میں نا کافی تھی۔ پیام وطن میں تنخواہ کے لیے ہڑتال ہوئی۔ شاہدہ نکہت نے ہڑتالی ملازمین کی ڈنڈوں سے تواضع کی ـــــ

بالآخر پیام وطن بند ہوگیا۔ مگر مولانا باقی نے ہمت نہیں ہاری۔ کار اور کوٹھی ایک ایک کر کے اُنھیں داغِ مفارقت دے گئے اور وہ ایک بار پھر مصائب سے دوچار ہوگئے۔

اُنہی دنوں صاحبزادہ محمد محسن فاروقی نے جن کا مذہبی رسالہ آستانہ مسلمانوں میں کافی پڑھا جاتا تھا ایک سیاسی ہفت روزہ پیام مشرق جاری کیا۔ مولانا عبدالباقی بہت کم تنخواہ پر اِس ہفت روزہ اخبار سے وابستہ ہوگئے اور اپنے قلم کے جوہر دکھانے گئے دیکھتے ہی دیکھتے مشرق کو انھوں نے اُردو کا سب سے زیادہ چھپنے والا ہفت روزہ بنا دیا۔ مگر تنخواہ میں اضافہ کے سوال پر اپنی اِس اخبار سے بھی علیحدگی اختیار کرنی پڑی وہ کئی بار پیام مشرق میں آئے اور گئے تین بار پیام وطن اور دو بار ہفتہ وار کاروان وطن جاری کیا۔

مولانا عبدالباقی جس اعتماد کے ساتھ اردو میں لکھتے تھے اُس وثوق سے انگریزی میں بھی لکھا کرتے تھے وہ صرف صحافی ہی نہ تھے بلکہ صفِ اوّل کے براڈکاسٹر بھی تھے آل انڈیا ریڈیو کی نیوز سروسز ڈویژن نے جب اردو خبروں کے سب حالات حاضرہ پر ۵ منٹ کے تبصرے کا پروگرام شروع کیا تو مولانا باقی ہی یہ تبصرے لکھا کرتے تھے۔ بعد میں ظفر پیامی اور دوسرے تبصرہ نگاروں نے بھی یہ خدمت انجام دی۔ ظفر پیامی نے ایک مدت تک مولانا عبدالباقی کے اخبار پیام وطن میں کام کیا اس اخبار کی پیشانی پر مدیروں میں ن کا نام بھی شائع ہوا کرتا تھا دوسرا نام غلام علی کا تھا جو الٰہ آباد کے رہنے والے تھے۔ ظفر پیامی اب میدان صحافت کے شہسواروں میں شمار ہوتے ہیں مگر غلام علی سوویت یونین کے دفترِ اطلاعات سے ابستہ ہونے کے بعد قریب قریب گمنام ہو چکے ہیں۔

Marfat.com

مولانا عبدالباقی نے جن دنوں پیام وطن نکالنا شروع کیا اُن دنوں میں لکھنؤ میں تھا اور یوپی اسمبلی وکونسل میں روزنامہ آزاد بنارس کے لیے رپورٹنگ کیا کرتا تھا۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ پنڈت گووند بلب پنتھ اور بابو سمپورنا نند کی چیف منسٹری کے زمانے میں حکومت یوپی نے جن صحافیوں کو Accreditation دیا تھا ان میں صرف چار صحافی مسلمان تھے۔ ایک امین سلونوی مرحوم جو انڈپینڈنٹ نیوز سروس چلاتے تھے۔ دوسرے ایس ایم جنو جو انڈین ایکسپریس کے نامہ نگار تھے تیسرے رضا انصاری جو قومی آواز کے اِسٹاف رپورٹر تھے اور چوتھا میں۔

مولانا عبدالباقی نے خود میری پیشکش پر مجھے اپنا نامہ نگار بنا لیا تھا اور میں لکھنؤ سے اُنھیں اہم خبریں اور تبصرے بھیجا کرتا تھا مگر انھوں نے اِس خدمت کے صلے میں مجھے پھوٹی کوڑی بھی نہ دی، چند ماہ بعد دہلی آگیا اور نئی دنیا سے وابستہ ہوگیا مگر مولانا عبدالباقی کے ساتھ کام کرنے کا موقع مجھے بہت بعد میں ملا اور وہ بھی چند مہینوں کے لیے۔ پہلے نئی دنیا بند ہونے کے بعد واقعات نو میں اور بعد میں سید انیس الرحمٰن مرحوم کے ہفتہ وار اخبار پرچم ہند اور روزنامہ ملک و ملت میں۔ واقعاتِ نو مولانا عبدالوحید صدیقی نے نکالا تھا جس میں اُن کے بڑے صاحبزادے مولانا احمد مصطفیٰ صدیقی راہی نے لیتھو میں رنگا رنگ طباعت کے کامیاب تجربات کیے تھے۔ مولانا عبدالباقی کی زندگی کے آخری ایام بڑی پریشانی میں گزرے۔ ان کے دیرینہ رفیقوں تک نے ان سے منھ موڑ لیا تھا یہ لکھتے ہوئے دل دکھتا ہے مگر لکھے بغیر بھی نہیں رہا جاتا کہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں ان کے پاس اتنے پیسے بھی نہ ہوتے تھے کہ وہ دو وقت کی روٹی کھا سکیں۔

Marfat.com

اپنی دوسری بیوی شاہدہ نکہت اور دو بچیوں کے ساتھ وہ جامع مسجد کے ہوٹلوں میں نظر آتے تھے شناسا انھیں ہوٹل میں دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ خود ہوٹل والے بھی اُن سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔ کچھ دن انھوں نے چراغ دلّی کی درگاہ کے دالان میں بھی گذارے۔ انتقال سے چند مہینہ قبل انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نزدیک بستی نورونگر میں ایک مکان کرایہ پر حاصل کر لیا تھا۔ اس مکان میں پانی اور بجلی کے کنکشن بھی نہ تھے۔ وہ صبح کھدّر کا ایک تھیلا ٹانگ کر گھر سے نکلتے اور قلم کی کاشت شروع کر دیتے کسی اخبار کے لیے ادارتی کالم لکھتے تو کسی کے لیے افسانہ۔ اس طرح شام تک جو کچھ کماتے اسی میں اپنی اور اپنی بیوی اور دونوں بچیوں کی گذر بسر کا سامان حاصل کرتے۔ اپنے اِس زوال کا اُن کے دل و دماغ پر گہرا اثر تھا

۲۳ فروری ۱۹۶۸ء کو اچانک جامع مسجد ہی کے ایک ہوٹل میں قلب کا دورہ پڑا۔ کسی نے اُنھیں ہمدرد نرسنگ ہوم میں داخل کرادیا رات کو وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ لاش نورونگر لائی گئی۔ اِس عظیم صحافی کی تدفین میں صرف گنے چنے افراد تھے ـــــ مولانا عبدالوحید صدیقی، عبداللطیف اعظمی نازانصاری۔ راقم الحروف۔ سلام مچھلی شہری سید انیس الرحمٰن اور غالباً ظفر پیامی بھی۔

ان کے انتقال کے بعد کسی نے بھی اُن کو یاد نہ کیا صرف میں نے ایک مضمون ”قطب صحافت مولانا عبدالباقی ایم اے“ لکھ کر

Marfat.com

ملک وملت میں شائع کیا تھا۔ مگر تلاش بسیار کے باوجود ملک و ملت کا وہ فائل نہیں ملا جس میں یہ مضمون تھا۔ اِس مضمون پر میں نے مولانا باقی کی پوری زندگی کا احاطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر مولانا باقی کی طبیعت میں ٹھہراؤ ہوتا تو وہ بھی مہاشے کرشن اور اور مولانا عبدالوحید صدیقی کی طرح اپنی دیرپا یادگاریں چھوڑ کر جاتے مگر مزاج میں توازن نہ ہونے اور صحافت کو محض پیشہ سمجھ کر اختیار کرنے کی وجہ سے ایک عظیم صحافی ہوتے ہوئے بھی وہ کوئی ٹھوس یادگار چھوڑ کر نہ گئے۔

اللہ بس باقی ہوس

Marfat.com

صوفی عزیزالرّحمٰن

میں کہتا ہوں افسر جمشید تم صوفی عزیزالرحمٰن کو نہیں پہچانتے!
افسر جمشید کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں، پہچانتا ہوں اور بیان کرتا ہوں۔

(پہلا تاثر ——— دیہاتی چہرہ)

"نالائق، بدتمیز، چلا جا میرے سامنے سے خبیث"

یہ الفاظ کہنے والے تھے، صوفی، حافظ، حاجی، قاری محمد عزیزالرحمٰن پانی پتی اور سننے والا شخص تھا ان کا بیٹا ضیاءالرحمٰن یعنی رحمٰن نیرّ!!

یہ ۱۹۶۵ء کے ایک سرد دن کی بات ہے جب رحمٰن نیر مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں بمبئی سے لے کر آئے تھے۔ میں انہی کے پاس دہلی کے محلہ کشن گنج، شیش محل کے مکان نمبر ۶۸۶ کے ایک تنگ کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ صوفی جی کی گرج دار آواز سن کر میں باہر نکل آیا۔ رحمٰن نیرّ اپنے باپ کی ڈانٹ سن کر شاید اتنا نہ ڈرے ہوں جتنا میں ڈر گیا تھا۔ صوفی جی کا سانولا چہرہ غصّہ کی وجہ سے تانبے کی طرح چمک رہا تھا رحمٰن نیرّ تو سعادت مند بیٹے کی طرح گردن جھکائے اوپر چلے گئے اور صوفی جی نے اسی غصّہ کی حالت میں مجھے اندر بلا لیا تب مجھے معلوم ہوا۔ رحمٰن نیرّ کو یہ ڈانٹ اس لیے پڑی تھی کہ وہ

شراب پینے لگے تھے اور کسی نے صوفی جی سے ان کی شکایت کر دی تھی۔ مجھ پر ڈانٹ اس لیے پڑی کہ میں رحمٰن نیرؔ کے دوستوں میں تھا! اس کے بعد صوفی جی کی حیات کے آخری سال ۱۹۷۱ء تک میری ان سے انگنت ملاقاتیں رہیں لیکن فسٹ امپریشن از دی لاسٹ امپریشن کے زیرِ اثر میں ان سے ہمیشہ ڈرتا رہا۔ اور آج بھی جب میں اُنھیں تصوّر کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں تو میرے لاشعور سے نامعلوم خوف ابھر آتا ہے۔ ایک ایسا عجیب خوف جو میں نے کسی اور شخص سے مل کر کبھی محسوس نہیں کیا — !

لانبا قد، مضبوط جسم، سانولا رنگ، کھڑی ناک، سرخ آنکھیں، گھٹنوں سے نیچے رہنے والا کرتا اور ٹخنوں سے اوپر رہنے والا شرعی پاجامہ، کرتے پر صدری، واسکٹ اور جاڑوں میں روئی کی بنڈی، کبھی کبھی اچکن اور سر پر عمامہ —— شہر میں اگر اس حلیے کا آدمی نظر آئے تو ہم کہیں گے کوئی دیہاتی ہے۔ صوفی عزیز الرحمٰن اسی حلیے کے ساتھ ۷۰ برس شہر میں رہے —— دلّی شہر میں!!

صوفی جی کا آبائی وطن پانی پت ہے اور تاریخی نام مرغوب خاں جس میں سنِ پیدائش پوشیدہ ہے!

صوفی عزیز الرحمٰن یوسف زئی پٹھان کے خون کا سلسلہ بنو کو ہاٹ قبیلے سے جا کر ملتا ہے۔ اس قبیلے کے لوگ اکثر فوج میں بھرتی ہو جایا کرتے تھے۔ صوفی جی کے والد شادی خاں فوج میں بھرتی ہو کر پانی پت چلے آئے تھے اس زمانے میں پانی پت بہت بڑی فوجی چھاؤنی تھی۔ صوفی جی پانی پت میں ہی پیدا ہوئے۔ لیکن پیدائش کے سات دن بعد یتیم ہو گئے۔ صوفی جی کے ماموں قاری فضل الرحمٰن نے اپنے بھانجے کی پرورش کی اور تعلیم و تربیت بھی کی۔ گویا اپنا تمام علم اپنے بھانجے کو منتقل کر دیا۔

Marfat.com

دہلوی چہرہ

ماموں فضل الرحمٰن کے انتقال کے بعد صوفی عزیز الرحمٰن نے تلاش معاش کے لیے دہلی کا رخ کیا۔ ایک مستند بیان کے مطابق یہ اِس صدی کا تیسرا سال تھا پھاٹک حبش بارہ دری نواب وزیر کی مسجد کے امام کی حیثیت سے صوفی جی نے دلی والوں سے اپنا تعارف کرایا اور اسی مسجد میں انھوں نے ایک دینی مدرسہ بھی شروع کردیا۔ اسی مدرسے میں صوفی جی نے بے شمار بچوں کو قرأت سکھائی دینی تعلیم سے آراستہ کیا اور قرآن حفظ کرایا۔ صوفی جی سے تعلیم پانے والے بے شمار بچوں میں دو مشہور شخصیتیں بھی شامل ہیں۔ نور نقی اور محمد یوسف دہلوی۔ شمع میگزین کے پہلے شمارے پر مالک ومدیر کی حیثیت سے یہی دو نام لکھے ہوئے ہیں! (کوئی دینی مدرسہ ہو یا سماجی اسکول اِس میں پڑھنے والے بچوں میں سے بے شمار لوگ قابلِ ذکر شخصیت بنتے ہیں)

قوم پنجابیان دہلی کے بزرگوں نے صوفی عزیز الرحمٰن پانی پتی کی صلاحیتوں کو شناخت کرلیا تھا۔ آزاد مارکیٹ محلہ کشن گنج کی املی والی مسجد میں امام کی جگہ خالی ہونے پر صوفی جی کو یہاں بلالیا گیا۔ بلانے والے تھے اس مسجد کے متولی حاجی انعام اللہ صاحب پیتل والے!

جب صوفی جی نے گلی شیش محل کے مکان نمبر ۶۸۶ میں بیوی بچوں کو لاکر آباد کیا تو محلے والوں کو معلوم ہوا کہ وہ ۹ بچوں کے باپ ہیں۔ چار لڑکے ریاض الرحمٰن، لطیف الرحمن، ضیاالرحمٰن، اور مرغوب الرحمٰن پانچ لڑکیاں صفیہ، ذکیہ، شمیمہ، نسیمہ اور سرتاج بیگم!

صوفی جی نصف صدی سے زائد املی والی مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ محلّے والوں کا بیان ہے کہ صوفی جی نماز پڑھتے وقت اکثر رودیا کرتے تھے۔ الوداع جمعہ میں وہ ایک خاص خطبہ پڑھا کرتے تھے۔ اس

Marfat.com

خطبے میں کچھ خاص دعائیں بھی شامل تھیں۔ ان کے پڑھنے کا انداز اتنا مقبول ہوا کہ محلے کے بچے اکثر ان کی نقل اتارا کرتے تھے۔

انھوں نے ہزاروں نکاح پڑھائے ہیں۔ اور ایک بھی مثال ایسی نہیں ہے کہ ان کا پڑھایا ہوا نکاح "طلاق" کے انجام کو پہنچا ہو! دین کے پیچیدہ مسائل وہ اس طرح سمجھاتے تھے کہ پوچھنے والے کی پوری تسلی ہو جاتی تھی۔ حالانکہ صوفی عزیزالرحمٰن نے کسی مکتب میں تعلیم نہیں پائی تھی کسی دارالعلوم سے سند حاصل نہیں کی تھی۔ ان کے دارالعلوم کا نام تو قاری فضل الرحمٰن تھا صوفی عزیزالرحمٰن کے بے شمار شاگرد قاری اور حافظ برصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں قرأت کے فن میں انھیں کمال حاصل تھا۔ قرأت کا جو فن وہ اپنے ساتھ پانی پت سے لائے تھے اب دہلوی طرزِ قرأت کے نام سے موسوم ہونے لگا تھا! دہلی نے صوفی عزیزالرحمٰن کو اور صوفی جی نے دہلی کو پورے طور پر اپنا لیا تھا ـــ اب وہ دہلی والے تھے!

شعری چہرہ

بقول سید حفیظ الدین! صوفی صاحب کو شعر و شاعری سے بھی ذوق و شوق رہا ہے جملہ اصنافِ سخن میں کافی دستگاہ حاصل ہے۔ نعتیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی خمسے بھی کہے اور قصائد بھی۔ ٹھمریاں بھی کہیں اور دادرے بھی۔ آپ کا ایک دیوان "دیوانِ عزیز" کے نام سے شائع ہو چکا ہے وہ اس قدر مقبول ہوا کہ پہلا ایڈیشن بالکل ختم ہو گیا"

اگر اردو کے کسی نقاد سے پوچھا جائے کہ آپ نے صوفی عزیزالرحمٰن کو ادب میں کوئی مقام کیوں نہیں دیا تو وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگے گا اور اگر اس نقاد سے یہ پوچھا جائے کہ جناب ادب میں کسی کو مقام دینے کے سلسلے میں آپ کا اپنا معیار کیا ہے؟ تب بھی وہ حیرت سے مجھے دیکھے گا اردو

Marfat.com

کے نقاد کو اس کی وہی حیرت میں مبتلا چھوڑ کر صوفی جی کی بات کرتا ہوں۔ صوفی جی کی شاعری ان کے احباب تک محدود رہی۔ اور دیوانِ عزیز کا پہلا ایڈیشن ان کے شاگردوں تک محدود رہا۔

سفری چہرہ

انسان اپنی زندگی میں سفر بھی کرتا ہے۔ صوفی جی نے بھی کئی سفر کیے۔ کلیر شریف، اجمیر شریف، پاک پٹن اور حج بیت اللہ کے لیے سفر۔ وہ اپنے عہد کے مشہور علمار سے بھی ملے جن میں مولانا حسین احمد مدنی اور اشرف علی تھانوی قابلِ ذکر ہیں!

(بے شمار لوگ اپنی زندگی میں بزرگوں سے ملتے ہیں اور درگاہوں سے مستفید ہوتے ہیں)۔

عاملی چہرہ

صوفی عزیز الرحمٰن کا مجموعہ کلام "دیوان عزیز" نایاب ہے البتہ ان کی دوسری تصنیف "آئینہ عملیات" Arailable ہے ۳۸۰ صفحات پر مشتمل اِس کتاب میں ۴۴۴ عملیات درج ہیں۔ عمل کرنے کے ضروری قواعد، ایام کے سعد و نحس فالنامہ اور علم قیافہ پر مختصر مضمون بھی موجود ہیں۔ کتاب کے شروع میں صوفی جی کے ایک قریبی دوست سید حفیظ الدین کا "احوال واقعی" کے عنوان سے ایک مضمون بھی شامل ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ صوفی جی شہرت پسند نہیں تھے۔ یہ کتاب بھی اپنے دوست کے اصرار پر لکھی۔ اس کتاب میں ایک بھی عمل ایسا نہیں ہے جو صوفی جی کا اپنا تخلیق کردہ ہو۔ نقش سلیمانی۔ کنز الحسین اور مجرباتِ دیربی جیسی کتابوں میں یہ تمام عملیات اور نقش لفظ بہ لفظ موجود ہیں صوفی جی نے آئینہ عملیات کو اس دعوے کے ساتھ پیش کیا ہے کہ تمام عملیات ان کے آزمودہ ہیں۔

Marfat.com

صوفی جی کی آمدنی کا کوئی بھی آج تک پتہ نہ لگا سکا۔ مسجد کے پہلے متولّی انھیں صرف دس روپے دوسرے متولّی حاجی حمید اللہ پٹیل والے انھیں ۲۵ روپے اور آخری دس سالوں میں املی والی مسجد کے موجودہ متولّی محمد یحییٰ پٹیل والے انھیں صرف ۶۰ روپے ماہانہ دیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے اتنی کم تنخواہ میں ۹ بچوں کی پرورش، تعلیم و تربیت اور بیاہ شادی کے اخراجات ممکن ہی نہیں۔ بچّوں کو پڑھانے کی بھی وہ کوئی فیس نہیں لیتے تھے۔ رحمٰن نیر کا بیان ہے کہ میں نے ابّا میاں کی جیب کبھی خالی نہیں دیکھی۔ وہ جب بھی نوٹ نکالتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی بینک سے آیا ہے۔" ان کے قریب رہنے والوں کا گمان ہے کہ صوفی جی کو "دستِ غیب" حاصل تھا۔ آئینہ عملیات اور آمدنی کے تناظر میں میں نے ان کے "دست غیب" کا ذکر کیا ہے میں سمجھتا ہوں ان کے عملیات ہی ان کا "دستِ غیب" ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں ہزاروں مریضوں کا روحانی علاج کیا ہے!

اچانک میرے اندر سے آواز آتی ہے "ٹھہر جاؤ" لکھتے لکھتے میرا قلم رک جاتا ہے۔

باطنی چہرہ

"افسر جمشید! میں نے تم سے کہا تھا کہ تم صوفی عزیز الرحمٰن کو نہیں پہچانتے تم نے ان کے جتنے چہرے بیان کیے وہ سب ظاہری چہرے ہیں۔ شخصیت نگاری کا تخلیقی عمل اس وقت تک ادھورا ہے جب تک ظاہر کے ساتھ باطن کو بھی منکشف نہ کیا جائے!

" اے افسر جمشید میں تمہیں صوفی جی کے باطنی چہرے سے متعارف کراتا ہوں تم نے ابتدا میں ان کے غصّے کا ذکر کیا ہے۔ سنو! بزرگوں کے

غصّے کا ذکر کرتے وقت غصّے کی جگہ "جلال" کا لفظ استعمال کرنا چاہیے۔ "جلال" اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے اور حضرت فاروقِ اعظم کی سنت بھی! وہ باپ جو اپنے بیٹوں کو "خبیث" کہہ کر پکارتا ہے۔ وہی رات کی تنہائی میں اللہ کے حضور میں سجدے کی حالت میں راہ مستقیم پر چلنے کی دعا رکرتا ہے۔ اور دعار کی اس درخواست کو اپنے آنسوؤں سے لکھتا ہے۔ اللہ کے حضور میں پیش کی گئی ایسی درخواست جو دل کے آنسوؤں سے لکھی گئی ہو ضرور مقبولیت کا درجہ حاصل کرتی ہے اور اس کا ثبوت اب تم دیکھ رہے ہو۔ رحمٰن نیّر نے توبہ کی اور قادریہ سلسلے میں حضرت خوشحال خاں کے ہاتھ پر بیعت بھی کرلی۔ خانۂ کعبہ اور عرفات کے میدان میں "اللھم لبیک" بھی کہہ آیا ہے! اور تم روزانہ یہ بھی دیکھتے ہو کہ رحمٰن نیر بے پناہ مصروفیت میں بھی نماز کے وقت مشین کی طرح سب کام چھوڑ کر نماز کا فرض دفتر ہی میں ادا کرتا ہے صوفی جی موجود نہیں ہیں۔ لیکن موجود ہیں!

افسر جمشید! تم نے صوفی جی کے خدوخال اور حلیہ بیان کرتے وقت انھیں دیہاتی کہہ کر پکارا ہے۔ رسول اللہ، خلفائے راشدین، صحابۂ اکرام اور اولیائے عظام کے لباس کو اپنا کر صوفی جی خاموشی کی زبان سے یہ اعلان کرتے رہے کہ دیکھو ہمارے بزرگوں کا حلیہ ایسا ہوا کرتا تھا۔ ان کا لباس زبانِ حال سے پکار پکار کر کہتا تھا کہ مغربی لوگوں کا لباس پہن کر فخر کرنے والوں میں اس حلیے میں اپنے لاکھوں بزرگان دین کی کبھی نہ مٹنے والی علامت ہوں!

اے افسر جمشید! تم نے لکھا ہے صوفی عزیز الرحمٰن کی طرح کروڑوں امام ہیں، دینی مدارس کو چلانے والے لاکھوں مدرس ہیں یہ کوئی خاص بات نہیں۔ میں تمھیں بتاتا ہوں یہی خاص بات ہے۔ کسی بھی باقاعدہ تنظیم سے وابستہ

Marfat.com

ہوئے بغیر، سرکاری امداد کے محتاج نہ ہوتے ہوئے بھی یہ مدارس قریہ قریہ، بستی بستی اور محلے محلے ہزاروں مخالفت کی آندھیوں کے درمیان صدیوں سے رسول اللہ کے دین کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔

فانوس حق کے جس کی حفاظت خدا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

اے افسر جمشید! قرآنی علم کی روشنی تقسیم کرنے والوں کو حقارت کی نظر سے مت دیکھو کیا خبر ان میں کوئی ولیِ کامل پوشیدہ ہو۔ کوئی عبدالقادر جیلانی ہو کوئی معین الدین ہو کوئی نظام الدین چھپا ہوا ہو!!

شمس الحق عثمانی

ظَفر ادیب

میرے ہمجولی نے دکان کی اکلوتی سیڑھی پر قدم رکھا تو کرسی کے بائیں ہتھے پر بازو ٹکائے اس شخص کی چھوٹی چھوٹی گھری سانولی انگلیوں میں دبا قلم رک گیا۔ خمیدہ گردن سیدھی ہوئی اور قدرے کشادہ دہانے کی ہلکی سی لرزش، چند ثانیوں کے لیے مسکراہٹ میں تبدیل ہوکر، گھرے سانولے اور گول چہرے پر بکھرتی چلی گئی۔

"آؤ ـــــ چھٹی ہوگئی ـــــ اسکول سے ؟"

"ہاں" میرے ہمجولی نے جواب دیا۔

وہ اور میں اس کرسی پر ٹک گئے جو مختصر سی میز کے پہلو اور ایک ایسے ریک کی درمیانی جگہ میں پڑی تھی جس میں چینی مٹی کے رنگ برنگے چوکور ٹائل کتابوں کی طرح لگے ہوئے تھے۔ کرسی لوہے کی تھی؛ اس پر شاید کبھی کوئی رنگ رہا ہو مگر اب وہ لوہے کے اس مخصوص رنگ میں رنگی ہوئی تھی جو ہر غیر مستعمل لوہے پر تسلط جما لیتا ہے۔

دکان میں اِدھر اُدھر : ایک ہی سائز کے چوکور ٹائل ـــــ کچھ قطاروں میں کھڑے ہوئے ـــــ کچھ اوپر تلے ڈھیریوں میں ـــــ اور کچھ چیڑ کی پیٹیوں کی درزوں سے جھانکتے ہوئے : سب کے سب گرد آلود؛ بس اُن چند

Marfat.com

ٹائلوں کے چہرے صاف تھے جو اپنی قطار میں آگے کھڑے تھے۔
سڑک کی دوسری طرف، دیوار کے پیچھے، وہ مال گودام اور اُس سے آگے وہ میدان ہے جو منٹو کی سلطانہ کو اپنے کمرے سے نظر آتا تھا۔ سلطانہ اس میدان میں بچھی ریل کی بے شمار پٹریوں اور انجن کے دھکّے سے پٹریوں پر چلتے کسی اکیلے ڈبے کو " دیکھتی تو اُسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جارہی ہے"۔
زنگ اور گرد سے گزرتی نگاہیں اُس شخص کی جانب گئیں تو وہ دکان کے باہر، مال گودام کے اوپر، آسمان کو دیکھ رہا تھا —— یہ بڑے کان —— کنپٹی پر چھوٹے مگر گُدّی اور سر کے پچھلے حصّے پر مقابلتاً بڑے بالوں کی جھکا جھک تہہ —— اور چمک سے محروم سفید قمیص کے گریبان سے جھانکتی نرخرے کی ساکت ہڈّی۔
میرے ساتھی نے پہلو بدلا تو اس کے نیچے دبے کرسی کے حصّے نے ایک کراہ بلند کی، جس کی ریس میں میری جانب کا کوئی جوڑ چرچرایا۔
" کب آنے کو کہا —— ریاض' نے ؟"
گویا کرسی کی کراہوں کے جواب میں اُس شخص نے پوچھا —— اور جملے کے آخری دو لفظ ادا کرتے ہوئے نہایت آہستگی سے گردن گھما کر ہماری طرف دیکھا —— چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی سیاہ پتلیوں نے ڈھیلے کی سفیدی کو نمایاں کر دیا تھا۔ سیاہی اور سفیدی کے اس تصادم نے پُتلی کے اندرونی حاشیے پر غبار غبار بھورے پن کو نظر کی گرفت میں آنے کے قابل بنا دیا تھا۔
" آئیں گے کسی وقت"۔ میرا ساتھی بولا۔
" کہنا، شام کو وہیں مل لے —— گلی قاسم جان میں"۔
" اچھا، کہہ دوں گا"۔
اُس شخص کا نچلا ہونٹ یوں کھنچا کہ اُس کی لکیر اوپری ہونٹ میں دھنس گئی۔

Marfat.com

اچھی خاصی چوڑی ٹھوڑی کی کھال اور گلے کے دونوں پٹھے اوپر کو کھنچے، قدرے کشادہ پیشانی پر یک بارگی چھے سات شکنیں ابھریں اور ڈوب گئیں۔

"اچھا ——— میں چلتا ہوں۔ کہہ دوں گا بھائی ریاض سے۔"

"ٹھیک ہے ——— شام کو آجائیے۔"

ہم دونوں شردھانند مارگ کی اس مختصر دُکان سے نکل کر بائیں ہاتھ کی اُس گلی میں چل پڑے جو کوچہ پنڈت اور گلی شاہ تارا پہنچاتی ہے۔

"کون صاحب ہیں یہ؟" میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"بھائی ریاض کے ماسٹر جی ——— ظفر صاحب؛ ظفر ادیب صاحب۔ شاعری بھی کرتے ہیں۔"

"اس وقت تو کچھ نثر میں لکھ رہے تھے!؟"

"ہاں تنقید بھی لکھتے ہیں۔"

ایک شام وہی دوست اور میں لال کنویں سے گلی قاسم جان میں مڑے تو اُس نے چوک اندارا کنواں پر ٹھٹکتے ہوئے کہا:

"ذرا اجملی شفا خانے تک چلتے ہیں۔"

چوک پار کرتے ہی بائیں جانب کا موڑ کاٹا اور پندرہ بیس قدم بعد اُس سنگی دروازے کے سامنے رکے جس کے پہلوؤں میں چوکیاں بنی ہوئی تھیں۔ چوکھٹ پھلانگی تو نیم تاریک ڈیوڑھی کے اکھڑے ہوئے پلاسٹر سے ٹھوکر لگی۔ جسم کو سنبھالنے کے لیے ہاتھوں نے دیوار کا سہارا لیا تو دیوار کی نمی سے ناراض سفیدی انگلیوں سے چمٹ گئی۔ ڈیوڑھی سے انگنائی میں پہنچے تو جانب مغرب واقع برآمدے میں ایک چھوٹے سے بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اردگرد کی مکانیت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی، انگنائی اور برآمدے کا فرش جگہ جگہ سے پھولا اور تڑخا ہوا۔ برآمدے کے لگ بھگ وسط میں ایک بیضوی میز کے قریب

Marfat.com

پڑی دو بینچوں پر بیٹھے دس بارہ لڑکے لڑکیاں، کتابوں اور کاپیوں کی ورق گردانی کر رہے تھے۔

"آیئے ــــــ"

شاگردوں کے درمیان گھرے ہوئے ظفر صاحب نے مدھم اور سپاٹ لہجے میں کہا اور ایک شاگرد کو اشارہ کیا کہ ہمارے بیٹھنے کے لیے بینچ کا سرا خالی کر دے۔

"بیٹھیے ــــــ"

ایک بچے کی کاپی سے نظر اٹھا کر ظفر صاحب نے ہم دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ــ ہم بیٹھ گئے تو وہ واپس اسی کاپی میں چلے گئے۔ انگلیوں میں دبا ہوا قلم اس چار سطری کاپی پر بائیں سے دائیں چل رہا تھا جو ان کے گھٹنے پر ٹکی ہوئی تھی اور عینک کے پیچھے سکڑی ہوئی آنکھیں بالکل ساکت تھیں۔

اُن سے اچٹ کر نگاہ ادھر ادھر گئی تو اندازہ ہوا کہ یہ نہایت کشادہ مکان کبھی نہایت شاندار بھی رہا ہوگا۔ کمروں کے بند دروازے، کواڑوں کے اوپری حصّے میں جڑے شیشے اور پھولا ہوا ماربل کا فرش؛ کبھی یقیناً رنگین رہے ہوں گے مگر اب ساٹھ واٹ کی روشنی میں مکان کے کچھ حصّے زرد زرد ہیں اور زیادہ تر سیاہ۔

"نہیں مانے گا، تو، !"

بیضوی میز کے تختے کھڑکھڑائے تو ظفر صاحب کی مدھم آواز ابھری۔ ایک لڑکا میز سے اپنا بستہ اٹھا رہا تھا۔

"جا رہا ہے ــــــ کل جلدی آنا !"

ایک ایک کر کے سب بچّے چلے گئے تو ظفر صاحب نے عینک اتار کر جیب میں رکھی، میز پر پڑا رومال اٹھا کر پیشانی اور اُسی جیسے صاف چوتھائی سر کا پسینہ خشک کیا اور جھنجھناسی بجتی کرسی میں بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ پاؤں میز کے

نیچے پھیل گئے اور آنکھیں اُن دو تین کتابوں اخباروں میں جا دھنسیں جن کے پیٹ میں بہت سے لکھے بے لکھے کاغذ بھرے ہوئے تھے۔

"ٹیڑھی لکیر پڑھا ہے ـــ آپ نے؟"

انھوں نے لکھے بے لکھے کاغذوں پر نظر جمائے جمائے اچانک پوچھا۔ اپنے ذہن میں جاری کسی خیال کے بارے میں اچانک کوئی بات پوچھ بیٹھنا ظفر صاحب کی عادت تھی۔ مخاطب کو متعلقہ موضوع اور سوال کی نوعیت سمجھنے میں چند لمحے ضرور لگتے؛ جس کا نتیجہ یہ بھی ہوتا کہ مخاطب اپنے آپ کو مجتمع کر ہی رہا ہوتا کہ ظفر صاحب دوسری بات شروع کر دیتے اور وہ اپنے جواب کی ادائیگی سے محروم ہی رہ جاتا۔ کسی بات کا جواب ادا نہ کر پانے کی زحمت صرف دوسروں ہی کا مقدر نہ تھی بلکہ ظفر صاحب خود بھی اس کا شکار ہوتے تھے۔ نتیجتاً دوسرا شخص یا تو اپنے سوال کو مجہول و بے مصرف سمجھتا یا پھر اس بدگمانی میں مبتلا ہو جاتا کہ اُس کا سوال سمجھا ہی نہیں گیا۔ یہ بدگمانی اس وقت دور ہوتی جب ظفر صاحب ہفتوں اور کبھی کبھی تو مہینوں بعد اس کے بھولے بسرے سوال پر کچھ یوں اظہارِ خیال کرتے:

"بھئی وہ تم جو کہہ رہے تھے ـــ غالب کے بارے میں؛
ایسا ہے کہ وہ ٹھیک ہی ہے۔"

ایسے میں یہ سوچنا مخاطب کا کام تھا کہ ظفر صاحب نے غالب کے بارے میں اس کی کس بات کو ٹھیک ہی ہے کہہ کر تائید سی کی ہے۔ اگر دوسرے نے بات کی وضاحت نہ چاہی تو ظفر صاحب مطمئن ہو جاتے کہ اُس نے ان کے کچھ کہے بغیر ہی وہ سب کچھ سمجھ لیا جو انھوں نے پچھلے دنوں سوچا تھا۔

"فی بطنِ شاعر" جیسی یہ کیفیت ظفر ادیب کی گفتگو ہی کا نہیں بلکہ پوری زندگی کا اسلوب تھی اور اس کی وجہ تھی: دوسرے پر اعتبار۔

ظفر ادیب کو یہ اعتبار بھی تھا کہ دوسرے ان کی لکھی کتابیں پوری توجہ سے

Marfat.com

پڑھتے اور آنکتے ہیں۔ یہ اعتبار شاید اس لیے بھی تھا کہ وہ اپنے زیادہ تر خیالات کو ضبطِ تحریر میں لانے سے پہلے چند معتبر لوگوں ـــــــ مثلاً: ڈاکٹر یوسف حسین خاں، مولانا عرشی، قاضی عبدالودود اور آخر آخر کالی داس گپتا رضا ـــــــ سے ان کی تائید یا تردید ضرور چاہتے تھے۔ ادب کے ساتھ ہی ساتھ سماجی معاملات میں بھی ظفر صاحب نے اعتبار کی یہ روش کبھی ترک نہیں کی حالانکہ ہر دو معاملات میں ان کے اعتبار کو صدمے پہنچے۔

زیر تحریر موضوع کے تئیں نقاد سے زیادہ محقق کا انداز اختیار کرنے والے ظفر ادیب کو یہ بات آخیر تک محقق نہ ہو سکی کہ ان کے زمانے کا قاری ادب کا مطالعہ کچھ ضروریات کے تحت کرنے لگا ہے اور اُن کی ضرورت کسی کو نہ تھی؛ علاوہ گھر والوں کے۔

گھر کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ظفر ادیب نے دہلی میں صرف جز وقتی معلّمی اور ادب ہی کو مستقل ذریعۂ معاش بنایا۔ اس بارے میں انھیں کوئی نہ کوئی معاون ملتا ہی رہا۔ شردھانند مارگ کی دکان در اصل ان کے ایک مربّی کی املاک تھی؛ جہاں دن میں بیٹھ کر وہ پڑھتے لکھتے، درمیان میں اٹھ کر ٹیوشن پڑھانے جاتے اور شام ہوتے اجملی شفاخانہ پہنچتے، جہاں ادیب، ادیب فاضل، ادیب کامل اور اسکول کی چھوٹی بڑی جماعتوں کے طلبہ پڑھنے آتے تھے۔

شردھانند مارگ کی دکان اور اجملی شفاخانے کی عمارت ظفر صاحب کے کرم فرماؤں کے پاس نہ رہی تو کوچہ پنڈت میں واقع علی منزل کی بیٹھک اُن کا واحد ٹھکانہ بن گئی۔ انجمن ترقی اردو شاخ دہلی کے دفتر سے باقاعدہ وابستگی نے تنخواہ نامی چیز تو برائے نام ہی فراہم کی مگر اُن کو دل خواہ ٹھکانہ ضرور مہیا کیا۔ انجمن کی جنرل سکریٹری صاحبہ کے طفیل میں، اس عمارت سے حاصل مرکزیت کو ظفر صاحب نے اپنی افتادِ طبع اور ضروریات کے مطابق استعمال کیا۔ اتوار کے علاوہ، ہر روز صبح آٹھ بجے سے شام کے ساڑھے سات آٹھ بجے تک یہی عمارت

ان کا مرکز و محور تھی۔ انجمن کے برائے نام کاموں سے دس بجے تک نمٹنے کے بعد وہ اپنے پڑھنے لکھنے میں لگ جاتے، لکھتے لکھتے اٹھ کر پڑھانے چلے جاتے، واپس آکر پھر اپنا قلم سنبھال لیتے، تیسرے پہر اسکولی بچے آتے اور شام ڈھلے اِکّا دُکّا ملاقاتی —— اسی عمارت اور معمول میں ظفر صاحب نے اپنی زیادہ تر کتابیں لکھیں اور شائع کیں؛ کبھی وزارتِ تعلیم و ثقافت کے تعاون سے اور کبھی اپنے بل بوتے پر۔

گرمیوں میں معمولی پاپلین یا کھدّر کا سفید قمیض پاجامہ، آتی جاتی سردی میں قمیض پر سوئٹر اور شدید سردی میں ڈھیلا ڈھالا اوورکوٹ؛ پیروں میں بارہ مہینوں بند جوتا۔ چھوٹے چھوٹے مستحکم قدم اٹھاتے ظفر صاحب: راستہ چلتے تو سڑک کے اِس قدر کنارے یا فٹ پاتھ کے اتنے اندر کہ یوں لگتا کہ اب کسی دکان کی دہلیز چڑھ جائیں گے۔ سڑک پار جانے کے لیے پہلے رک کر کھڑے ہوتے اور بڑے دھیان سے دائیں بائیں دیکھنے کے بعد اس لمحے نہایت تیزی سے اس پار جا پہنچتے کہ جب سواریاں گزروں دور ہوتیں۔

احتیاط و خوف سے مرکّب رفتار و گفتار کے ساتھ گرد و غبار، نیم تاریکی اور زنگ خوردہ ماحول میں گزران کرتے ظفر صاحب کو دیکھ کر محسوس ہوتا کہ انھوں نے ایسے ہی ماحول میں آنکھ کھولی ہوگی —— مگر جاننے والوں نے بتایا کہ ظفر ادیب کے باپ دادا خاصے دولت مند تاجر تھے بسنہ ۱۹۴۷ء سے پہلے ملتان میں ظفر صاحب نے عمارتی سامان کی تجارت بھی کی اور پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے ٹھیکے دار بھی رہے۔

وہ اپنے خاندان کے پہلے اور آخری شاعر و ادیب تھے؛ شاید اسی لیے ظفر ادیب تھے۔

سانحۂ تقسیم نے ظفر ادیب سے مٹی اور اینٹوں کے مکانات ضرور چھینے؛ کاغذ اور دھات کے مہر لگے ٹکڑے ضرور غصب کیے لیکن یہ سانحہ ان کی اس

Marfat.com

سیر چشمی و سربلندی کو فنا نہ کرسکا جو انھیں ہوش سنبھالتے ہی حاصل ہوگئی تھی۔ بہ قول سرور تونسوی، ان کی دولت اور فراخ دلی سے ہر وہ ادیب فیض یاب ہوتا جو کراچی و لاہور آتے جاتے ملتان میں اُن کے یہاں قیام کرتا تھا علاوہ ازیں ملتان اور لاہور میں متعدد لوگ ایسے تھے جو ظفر ادیب سے مالی اعانت حاصل کرتے تھے۔ اُن کی یہ اعانت —— بہ صورت دیگر —— ہندوستان میں بھی جاری رہی۔ یہاں ان کے پاس سکّے نہیں تھے تو قلم تھا۔ جس سے انھوں نے کئی لوگوں کو پی۔ ایچ۔ ڈی اور صاحب دیوان بنا دیا اور کئی موضوعات پر لکھی کتابوں کے توسّط سے آنے والی نسلوں کو وہ خام مواد فراہم کیا جو فکرو خیال کی نئی عمارتوں کی تعمیر میں کام آسکتا ہے۔

مجھے ایک نہایت ثقہ ذریعے سے معلوم ہے کہ ظفر صاحب دہلی آنے کے چند سال بعد سے ہر روز حضرت سرمد شہید کے مزار پر حاضری دیتے تھے۔ ایک حاضری کے دوران انھیں سرمد شہید نے بشارت دی کہ وہ دِلّی کے ایک صاحبِ نسبت صوفی سے باقاعدہ بیعت ہوں۔ اپنی سربلندی پر راسخ اور پین یا بال پین کو اس اعتماد کی بنا پر کلپ سے اٹکائے بغیر قمیص کی جیب میں یوں ہی ڈال لینے والے ظفر صاحب، کہ جب کہیں جھکنا ہی نہیں تو قلم کیسے گر سکتا ہے، شہید کے حکم کی تعمیل میں مقررہ چوکھٹ پر دست بستہ و خمیدہ سر حاضر ہوئے۔

حیرانیوں کو جذب کرنے —— ہر ناگواری کو گردن کے خفیف جھٹکے سے گرا دینے اور ہر فیصلے کو لبوں کی بے آواز حرکت کے ذریعے کسی ان دیکھے پر چھوڑ دینے کی قوّتیں ظفر صاحب کو اپنے آغاز و اختتام کے شہروں سے حاصل ہوئی تھیں؛ جہاں اُن کا آغاز ہوا تھا وہ بہ ظاہر لاکھ اور اندرون سوا لاکھ صوفیوں کی بستی کہی جاتی ہے اور جہاں وہ ختم ہوئے وہاں بائیس خواجہ محوِ استراحت ہیں۔

تعزیتی جلسے میں ایک صاحب نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا

Marfat.com

کہ انھوں نے ۲۴ر جون ۱۹۸۴ء کو شمشان گھاٹ پر ظفر ادیب کا چہرہ دیکھا تو ان کے کم کم کھلنے والے لب نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے الگ تھے بلکہ ان کا دہانہ یوں کھُلا ہوا تھا گویا ظفر ادیب آج وہ سب کچھ کہہ گزرنا چاہتے ہوں جسے اب تک برداشت ہی کرتے آئے تھے —— لیکن — میرا خیال ہے کہ ظفر صاحب کو شاید ہی کچھ کہنا پڑا ہو کیونکہ وہ تو کم از کم گزشتہ ۴۴ سال سے، اپنے تحمّل کے ذریعے ایک ایک بات اُسی ایک پر چھوڑتے رہے تھے —— اُن کا وہ کھُلا ہوا دہانہ : حیرانیوں کے اس ڈیرے میں اُن کی پہلی اور آخری حیرت ضرور تھا —— کہ وہ یہاں بے بس تھے۔

—— ۲ ——

نام :- بھیم سین

قلمی نام :- ظفر ادیب

والد کا نام :- ایشور داس

والدہ کا نام :- سُکھ رانی

پیدائش :- ۱۲ر جنوری ۱۹۱۳ء
بابو محلّہ، ملتان چھاونی

شادی :- سنہ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ

اہلیہ کا نام :- ساوتری دیوی

انتقال :- ۲۳ر جون ۱۹۸۴ء لگ بھگ سات بجے شام۔
لوک نائک جے پرکاش نرائن اسپتال میں
مرض الموت : پھیپھڑوں کی ٹی۔ بی۔

Marfat.com

کتابیں:

۱۔ جوئے بار ۱۹۴۷ء سے قبل (شاعری)
۲۔ گفت و شنید ۱۹۶۷ء (تنقیدی مضامین)
۳۔ ہم عصروں پر غالب کا اثر ۱۹۷۱ء (تنقید)
۴۔ خواب نئے ۱۹۷۳ء (طویل نظم)
۵۔ دو حالی ۱۹۷۴ء (تنقید)
۶۔ اردو زبان کا قومی کردار ۱۹۷۶ء (تنقید)
۷۔ یگ جو بیت گیا ۱۹۷۶ء (ناول)
۸۔ یوں سوچا تھا ۱۹۷۹ء (〃)
۹۔ غالب کے معنوی اساتذہ ۱۹۸۰ء (تنقید)
۱۰۔ انسان سے آدمی اور... تک ۱۹۸۱ء (طویل نظم)
۱۱۔ جاں نثار اختر اور اس کی شاعری ۱۹۸۴ء (تنقید)
۱۲۔ کالی داس گپتا رضا (تنقید)

مسوّدے:

۱۔ غالبیات اور رضا
۲۔ احسان دانش
۳۔ غالب کی فارسی شاعری کا موازنہ اس کے معاصر ہندستانی فارسی گویوں کی شاعری کے ساتھ۔

ترتیب:

۱۔ شعری ادب ۱۹۵۱ء

Marfat.com

(بہ تعاون: فکر تونسوی اور نریش کمار شاد)

ایوارڈ:

بھاشا وبھاگ ہریانہ، یوپی اردو اکادمی ۱۹۷۱ء
یوپی اردو اکادمی ۱۹۷۶ء آندھرا اردو اکادمی ۱۹۷۶ء
یوپی اردو اکادمی، پنجاب بھاشا وبھاگ ۱۹۸۰ء
ساہتیہ کلا پریشد، دہلی ۸۲-۱۹۸۱ء

Marfat.com

سید امان الرحمٰن

حکیم مولوی عبدالغفار دہلوی

دلّی بلاشبہ عالم میں انتخاب ہے اور دلّی والے اپنی انفرادیت رکھتے ہیں ہندوستان ہی میں نہیں دنیا کے کسی بھی کونے میں ہوں، اپنے اطوار، انداز، لباس، نشست و برخاست اور بول چال سے شناخت میں آجاتے ہیں۔ دلّی کی تہذیب و ثقافت، علم و ادب اور شرافت و بردباری کا شہرہ ہمیشہ رہا ہے۔ دلّی ہندوستان کا دل ہے اور دل والوں کا مرکز رہی۔ جب دلّی ۱۹۴۷ء میں لٹی پٹی تو دہلویت پر بھی ضرب پڑی۔ پاکستان بننے کے بعد دلی والوں کی پاکستان کو ہجرت اور پاکستان سے مہاجرین کے دلّی آنے، رہنے اور بسنے سے دلّی کی انفرادیت میں دراڑ پڑ گئی لیکن پھر بھی دلّی کے کچھ حصے ایسے باقی رہے کہ دہلویت' کا مجسم اظہار بن گئے۔ ہزاروں یگانۂ روزگار دلی سے ہجرت کر گئے، پھر بھی جو باقی رہے انھوں نے دلّی کی آبرو کو بنائے رکھا۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک اہم شخصیت حکیم مولوی عبدالغفار دہلوی کی بھی ہے۔ دلّی لٹنے پٹنے کے بعد بھی علم و حکمت کا مرکز رہی اور تہذیب و تمدن کا سرچشمہ بھی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ دلّی کی خاک میں رُلتا کنکر بھی اپنی صلابت، سختی اور چمک دمک میں ہیرا ہوتا ہے اور جو سچ مچ ہیرا ہو

Marfat.com

اس کی تابندگی اور عظمت کتنی پائیدار نہ ہوگی۔ مولوی عبدالغفار بلاشبہ دہلوی تہذیب کا ایک ترشا ہوا ہیرا تھے۔ آپ کے اجداد میں بڑی بڑی محترم و محتشم ہستیاں گزری ہیں۔ آپ کے خاندان میں مورث اعلا کے طور پر حضرت خواجہ شیخ نورالدین ملک یار پرانؒ کا نام نامی لیا جاتا ہے جن کی وفات ۷۰۸ھ میں ہوئی تھی۔ سلسلۂ خاندان کے دوسرے اکابرین میں جن نامی گرامی شخصیتوں نے اس دنیائے فانی کو روشن کیا، ان میں حضرت قاضی محمد ہارونؒ (وفات ۸۵۲ھ) حضرت مولانا محمد نوراللہ (وفات ۱۰۴۵ھ) حضرت مولانا قاضی نبی اللہ (وفات ۱۱۱۹ھ) حضرت مولانا ہدایت اللہ (وفات ۱۱۶۶ھ) مولانا لطف اللہ (وفات ۱۲۲۴ھ) حضرت مولانا شاہ کریم اللہ (وفات ۱۲۹۰ھ) اور حضرت مولانا مفتی محمد یعقوبؒ (وفات ۱۳۲۵ھ) اسمائے گرامی آتے ہیں۔ یہ سب شخصیتیں اپنے وقت میں علم و حکمت کا مرکز تھیں۔ بڑے بڑے صاحب علم و فضل ان ہستیوں سے کسب فیض کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ حکیم مولوی عبدالغفار دہلوی اسی خاندان کے فرد تھے اور آپ کا قیام باغ نبی اللہ میں رہا۔ یہ عمارت آج بھی مسجد اور قیام گاہ کی صورت میں چوک حوض قاضی میں موجود ہے۔ مولانا امداد صابری اس عمارت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"چوک حوض قاضی پر ایک قدیمی مسجد ہے جو ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۹-۱۸ ۱۷ء میں تعمیر ہوئی جس کو مفتی کریم اللہ صاحب نے از سرِ نو بنوایا اور توسیع بھی کی۔ مسجد کے جنوب مشرقی کونے میں ایک مکان تھا جس کے دروازے پر باغ نبی اللہ ۱۱۳۱ھ لکھا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی زمانے میں باغ ہوگا۔ ہو سکتا ہے اس باغ کی جگہ یہ مکان بنا ہوا ہو اور باغ کا کتبہ اس مکان کے دروازے پر لگا دیا گیا ہو۔" (دلی کی یادگار ہستیاں ص ۳۰۵)

Marfat.com

میرے ذاتی خیال میں اس جگہ مدرسہ قائم کیا گیا ہوگا اور اسے علم کے باغ سے تشبیہ کے پیش نظر سلسلہ خاندان کے ایک بزرگ مولوی نبی اللہ سے نسبت دی گئی ہوگی۔

مولوی کریم اللہ صاحب ایک سچے عالم کی طرح قناعت پسند تھے اور درس و تدریس میں مصروف رہ کر قوم کی خدمت میں لگے رہتے تھے۔ سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں دلی والوں کا تذکرے میں آپ کے متعلق لکھا ہے:

"جامع فنون ہیں۔ خصوصیات دینیات میں دستگاہ کامل ہے۔ توکل اور قناعت میں اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ باوجو عیالداری اور تاہل کے اہل دنیا کی طرف کم رجوع کرتے ہیں۔ بیشتر اوقات گرامی کو تدریس طلبہ شائق میں مصروف اور عنان ہمت افادۂ طالبین کی طرف معطوف رکھتے ہیں۔"

مولوی کریم اللہ صاحب، شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کے خاص شاگرد تھے۔ شاہ صاحب نے مولوی کریم اللہ صاحب کو جوانی میں ہی سند افتا دے دی تھی۔

ایسے قانع اور جامع عالم کے پوتے مولوی عبدالغفار دہلوی تھے جن کا نسبی سلسلہ شیخ نورالدین ملک یار پراں سے ملتا ہے۔ شیخ نورالدین ایران سے سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں دہلی آئے تھے اور منہاروڈ پر بابا ابوبکر طوسی المعروف بہ مٹکے شاہ کے سامنے کی جگہ پر مقیم ہو گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ باباطوسی نے جب انھیں یہ بتایا کہ سرکاری زمین پر قیام کے لیے بادشاہ کی اجازت ضروری ہے تو آپ اسی وقت اپنی روحانی قوت سے سلطان کے پاس ٹھٹے میں جا پہنچے اور وہاں سلطان سے اپنے دہلی میں قیام کے بارے میں بتایا سلطان بلبن کو درویش و فقرا سے بہت عقیدت تھی۔ اس نے اسی وقت وہ جگہ اور لنگر کے خرچ کے لیے چار گاؤں شیخ نورالدین کو

Marfat.com

عطا کردیے۔ آپ اس فرمان شاہی کے ساتھ دہلی واپس آگئے۔ بابا ابو بکر طوسی سے ملے اور انھیں شاہی فرمان دکھایا۔ بابا طوسی بہت حیرت زدہ ہوئے لیکن سمجھ گئے کہ شیخ نورالدین پہنچے ہوئے بزرگ ہیں اسی لیے روحانی پیّروں پر ہی وہ ٹھٹھہ پہنچ کر بادشاہ سے ملے اور اجازت لے کر روحانی پیروں پر ہی واپس بھی آگئے۔ بس اس روز سے شیخ نورالدین ملک یار پراں کے نام سے مشہور ہوگئے۔ آپ نے ساری زندگی اسی جگہ قیام کیا اور وفات کے بعد اسی زمین میں دفن ہوئے۔ اسی نسبی سلسلے کے ایک بزرگ مولوی محمد یعقوب تھے جو جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ممتاز خطیب اور واعظ بھی تھے۔ شہادت کے بیان پر آپ کو اس قدر قدرت حاصل تھی کہ کوئی بھی دوسرا واعظ ان کے انداز کو کبھی نہ اپنا سکا۔ ماہِ محرم میں آپ کے اس وعظ کو سننے کے لیے لوگ دور دور سے کھنچے چلے آتے تھے۔ سحر البیانی کی یہ خصوصیت حکیم مولوی عبدالغفار دہلوی کو ورثے میں ملی تھی۔ آپ بھی جب شہادت کا بیان فرماتے تھے تو جذب و تاثر کا ایک سماں قائم ہوجاتا تھا۔ حضرت مولانا نے اپنے انداز خطابت سے وعظ کو ایک فن کا درجہ عطا کیا تھا اور اس فن پر آپ کو مکمل قدرت حاصل تھی۔

مولانا محمد یعقوب حنفی مذہب کے جید علما میں تھے۔ قناعت پسند، متوکل درس و تدریس کے شائق اور فتاویٰ نویسی میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی آپ کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا تھا۔ سلمان شاہ جہانپوری نے اپنی کتاب "امام الہند: تعبیر و افکار" میں مولانا محمد یعقوب کے حضور میں، میں نے اپنے والد بزرگوار کے بعد سب سے پہلے زانوئے ادب تہ کیا اور ان سے عربی ادب اور منطق کا درس لیا۔ مولوی محمد یعقوب سے ہم لوگ قطبی اور شرح ملا پڑھتے تھے۔ شرح ملا کسی وجہ سے ختم نہ ہوئی البتہ قطبی ختم ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ مختصر المعانی کا ایک حصہ پڑھا

Marfat.com

تھا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب ایک اچھے اور مستند شخص تھے اور سوچتا ہوں تو واقعی ان کی درسیات خوب مستحضر تھیں۔

مولوی عبدالغفار نے علوم دینی کی تعلیم اپنے والد مولانا محمد یعقوب سے ہی حاصل کی تھی اور طب و حکمت حکیم عبدالمجید خاں صاحب سے سیکھی تھی۔ قدرت نے ہاتھ میں شفا دی تھی جس کی وجہ سے آپ کے مطب میں جو مسجد حوض قاضی کے بالا خانے پر تھا، ہمیشہ بھیڑ رہتی تھی۔ تعویذ بھی دیتے تھے جس کے لیے لوگ بتاتے ہیں کہ وہ بھی بہت اثر رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے آپ کے پاس ہندو مسلمانوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ آپ عوام کی فلاح و بہبود کے کام بھی کرتے تھے اور دینی معاملات میں بھی بہت دلچسپی لیتے تھے۔ اپنے جد شیخ نورالدین ملک یار پراں کا عرس ہر سال بڑے تزک و احتشام کے ساتھ کرتے تھے۔ رسول مقبول اور اہل بیعت سے بے پناہ عقیدت و محبت تھی۔ دہلی کے علما میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ حکام تک بھی پہنچ اور قدر و منزلت تھی مگر کبھی بھی کوئی ذاتی فائدہ کسی ایسے ذریعے سے نہیں اٹھایا۔ اپنے والد محترم کی طرح مولوی عبدالغفار صاحب کو بھی درس و تدریس کا بڑا شوق تھا۔ اپنے مرتے دم تک وہ باغ نبی اللہ میں مدرسے کو وسعت دیتے رہے۔ ایک ایسا مدرسہ قائم کرنا آپ کا خواب تھا جہاں طلبہ یکسوئی سے رہ اور پڑھ سکیں اور دنیاوی ضرورتوں کے لیے انھیں کسی کا دست نگر نہ ہونا پڑے۔ لیکن آپ کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا کیونکہ ۱۹۴۷ء کے بعد تہذیب دلّی اتنی بکھر گئی تھی کہ اس کے سمٹنے اور بننے کے لیے برسہا برس درکار تھے۔ دراصل اس زمانے کے حالات میں ایک تہذیب کا زوال ہو رہا تھا بلکہ یوں کہیے کہ زوال ایک سنگ میل بن گیا تھا کیونکہ جب انتشار تہذیب کی منزل آجاتی ہے۔ جس کے ساتھ ہی تہذیب کی تاریخ ختم ہو جاتی ہے ۱۹۴۷ء میں دہلوی تہذیب کو ایک خون چکاں دور سے گزرنا پڑا تھا اور

Marfat.com

اس وجہ سے دہلوی معاشرے پر کچھ اثرات پڑے کہ مذہبی علم و تعلیم کی طرف دہلی کے بچے کھچے مسلمانوں کا وہ رجحان نہ رہا جو پہلے تھا، اسی وجہ سے باغ نبی اللہ کا مدرسہ بھی اپنی ان خدمات کو نہ نبھا سکا۔ جن کے لیے وہ قائم کیا گیا تھا۔ دھیرے دھیرے مدرسہ بالکل بند ہوگیا بس مسجد باقی رہی۔ لیکن یہاں بھی ماضی کی رونقیں بس مثال ہی ہیں۔ مختار مسعود نے کیا خوب لکھا ہے: "جب مسجدیں بے رونق اور مدرسے بے چراغ ہو جائیں۔ جہاد کی جگہ جمود اور حق کی جگہ حکایت کو مل جائے۔ ملک کے بجائے مفاد اور ملت کے بجائے مصلحت عزیز ہو، اور جب مسلمانوں کو موت سے خوف آئے اور زندگی سے محبت ہو جائے تو صدیاں یوں ہی گم ہو جاتی ہیں۔" یقیناً یہی ہوا، ہماری تہذیب کی بھی صدیاں گم ہوگئیں۔

مولوی عبدالغفار صاحب کو اس تہذیبی زوال کا بہت احساس تھا۔ انھوں نے ہمیشہ کوشش کی کہ دہلی کے مسلمان اپنی تہذیبی روایات کے پیرا ہن بن جائیں۔ حضرت مولانا کھلے دل، کھلے ذہن اور کھل کر بات کہنے کے قائل تھے۔ آپ کا قد لمبا اور جسم گداز تھا۔ چہرہ سرخ و سفید اور آواز بلند تھی۔ سرخ و سفید چہرے پر اس قدر رعب رہتا تھا کہ پہلی ملاقات میں اپنی بات کہنے کے لیے ہمت باندھنی پڑتی تھی۔ عموماً نرم لہجے میں گفتگو کرتے تھے لیکن مرضی کے خلاف معمولی سی بات بھی گوارہ نہ تھی اس لیے لہجے میں فوراً تیزی آجاتی تھی۔ دلّی کی عوامی شخصیت تھے اور کوئی دلّی والا ایسا نہ تھا جو آپ کے نام سے واقف نہ ہو۔ حالات حاضرہ پر بھی گہری نظر رہی تھی لیکن کبھی سیاست میں ملوث نہیں ہوئے۔ ملنے والوں میں ہر قسم کے لوگ تھے اور حضرت مولانا ضرورت مندوں کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔ مسجد باغ نبی اللہ کے متولی اور شاہی امام تھے لیکن اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے حکمت پر انحصار کرتے تھے۔ ہمدرد دواخانہ کے حکیم عبدالحمید صاحب

Marfat.com

اکثر حاضر خدمت ہوا کرتے تھے۔ آپ کے آخری دن تک حکیم صاحب کے آپ سے نیاز مندانہ مراسم رہے اور میں سمجھتا ہوں کہ حکیم عبدالحمید صاحب کو آج بھی مولوی صاحب کی اولاد سے تعلق خاطر ہے۔

مولوی عبدالغفار دلّی کی تہذیب کا نمونہ تھے آپ کا لباس بھی ہمیشہ وضع دار دلّی والوں کا رہا۔ لمبا کرتا عموماً سفید رنگ کا، پتلے پائنچوں کی سیدھی شلوار، کندھے پر ایک بڑا سا رومال جسے سر پر بھی لپیٹ لیا جاتا تھا۔ ہاتھ میں تسبیح اور عصا رہتا تھا کیونکہ پان کھاتے تھے اس لیے پانوں کی ڈبیہ اور چھالیا کا بٹوا ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے۔ کہیں باہر جاتے وقت چغہ بھی زیب تن کرتے تھے پیروں میں آگے سے مڑی ہوئی سلیم شاہی جوتی ہوتی تھی۔ بیٹھنے کا انداز بھی بڑا روایتی تھا طبابت کے لیے جب کمرے میں آتے تو دو زانو ہو کر بیٹھتے تھے اور نشست کا یہ انداز اٹھنے تک برقرار رہتا تھا۔ ہر مریض کا حال بڑی توجہ سے سنتے تھے اور آپ کی اس توجہ سے مریض کو بہت طمانیت حاصل ہوتی تھی۔ دراصل حکیم اور ڈاکٹر کی ہمدردانہ توجہ ہی مرض میں افاقہ کر دیتی ہے

مولوی عبدالغفار کو علم و ادب سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ علم و آگہی کو پھیلانے کے لیے آپ نے اپنے بزرگوں کی نہ صرف یہ کہ پیروی کی بلکہ ان کا نام روشن کیا۔ آپ نے ایک رسالہ المفتی' جاری کیا تھا جو مضامین کے اعتبار سے بڑا وقیع ہوتا تھا۔

مجھے ذاتی طور پر مولوی صاحب کی خدمت میں حاضری دینے کا شرف ان کی آخری عمر میں حاصل ہوا لیکن تب بھی ان کا رکھ رکھاؤ اور رواداری ان کے مزاج کا اظہار تھی۔ واقعی دلّی والے دل سے چاہتے ہیں اور دل ہی سے چاہے جانا چاہتے ہیں۔ آپ کے پاس اکثر و بیشتر آنے والے معززین میں پیر ضامن نظامی، مولانا مختار احمد، حکیم عبدالحمید، حکیم سید مختار احمد اشرفی، مولانا قدیر اعظم عباسی، منشی ذکی حسن، ہرکشن لال سبھروال ایڈووکیٹ،

Marfat.com

پریم چند پریم، حکیم سید حسن اور علامہ اخلاق دہلوی صاحبان شامل ہیں۔

مولانا امداد صابری نے اپنی کتاب 'دلی کی یادگار ہستیاں' میں مولانا کی ہمت، قناعت، توکل اور استحکام کردار کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

۴۷ ۱۹ء کے پر آشوب دور میں مسجد و مدرسہ اور مولانا کے گھر پر حملے ہوتے۔ کوئی چیز نہ بچی جس کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ مولانا عبدالغفار صاحب کے بڑے صاحبزادے مولانا ابوالفضل کو سخت مجروح کیا۔ ذاتی کتب خانے کی کتابیں، نادر نسخے، مدرسے کی قدیم لائبریری اور درسی کتابیں جو تعداد میں آٹھ ہزار تھیں، لٹیں اور جلیں، گھر کا سامان، مسجد اور مدرسے کا سامان، دیگر اعزا اور متعلقین کا سامان جو لاکھوں کا تھا، بے دردی کے ساتھ لوٹا گیا۔ گھر کو آگ لگی، مسجد پر حملہ ہوا، محراب، مسجد وستون و مصلی کو نقصان پہنچا۔ بڑے صبر اور دلیری کے ساتھ مولانا نے یہ دن گزارے۔ مسجد سے ایک منٹ کے لیے علیحدہ نہیں ہوئے پنج وقتہ نمازیں ہوئیں، اذانوں کی صدائیں بھی گونجیں، مطب بھی جاری رکھا، اپنے خاندانی قبرستان کی بھی مستعدی کے ساتھ حفاظت کی اور شیخ نورالدین ملک یار پراں کا عرس ہر سال وقت مقررہ پر کیا۔"

دراصل کردار کی یہی استقامت، ہمت و جرأت ہی شخصیتوں کو عظمت عطا کرتی ہے۔ وہی ہستیاں قابلِ تعریف ہوتی ہیں جو دوسروں کو زندہ رہنے کا حق برابر سے دیتی ہیں۔ جیسے اور جینے دو' یہی زندگی کا اصول ہے اس لیے یہی جزو ایمان بھی ہونا چاہیے۔ سچ تو یہ ہے کہ سوکھی گزرگاہوں کے کنارے خضر کی تلاش عبث ہوتی ہے۔ اب نہ دریا میں پانی ہے نہ انسان میں دریا دلی۔ ایسے عالم میں جس نے چلنے کے لیے راستہ دیدیا وہی خضر ٹھہرا، جس نے زندہ رہنے دیا، وہی مسیحا بن گیا۔ مولوی عبدالغفار نے ۴۷ ۱۹ء کے پر آشوب دور میں ایک مسیحا اور خضر کا کردار ہی ادا کیا تھا۔ اپنی جگہ قائم

رہ کر انھوں نے دوسروں کو یہ سبق دیا تھا کہ پتھر اپنی ہی جگہ بھاری ہوتا ہے۔ افراد ہوں یا پوری قوم، اپنے مزاج کے مطابق ہی واقعات سے سبق لیا جاتا ہے مولوی عبدالغفار صاحب نے کبھی کم ہمتی کا سبق نہیں لیا۔ حالات کو اپنے اوپر حادی ہوتے نہیں دیا بلکہ حالات کو اپنے قابو میں رکھا۔ یقیناً وہ ایسی شخصیتوں میں تھے جن سے مل کر طبیعت کو کشادگی کی دولت حاصل ہوتی تھی۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ خطابت کا فن انھیں اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا۔ اپنے سننے والوں کو آپ ساتھ چلاتے تھے۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی طرح آپ کو بھی یہ خصوصیت حاصل تھی کہ اپنے سامعین کو جب چاہیں ہنسا دیں جب چاہیں رُلا دیں۔ شہادت کا بیان آپ اس دلسوزی سے کرتے تھے کہ کربلا کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا تھا۔ وقت کی شناخت اور شخصیت کی پرکھ واقعی بڑا مشکل کام ہے لیکن مولوی عبدالغفار صاحب دونوں کی شناخت کر سکتے تھے۔ ان کے مزاج میں نرمی بھی تھی اور گرمی بھی۔ اس لیے وقت کو اپنے سانچے میں ڈھالنا ان کو آتا تھا۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ زندگی ایک عطیہ ہے جس کا کم از کم حق ادا کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ دوسروں کو اس میں حصہ دار بنا لیا جائے۔ اور وہ واقعی اس پر عمل کرتے تھے۔ افسوس کہ ایسی یگانہ روزگار ہستی اب ہم میں نہیں ہے۔

مولانا ۲۱ ستمبر ۱۹۶۳ء کو حسب معمول گھر سے نکل کر اپنے مطب میں تشریف لے گئے تھے جہاں بہت سے مریض آپ کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ حسب عادت انھیں دیکھنے میں مشغول ہو گئے دن کے تقریباً گیارہ ساڑھے گیارہ بجے طبیعت اچانک ناساز ہو گئی۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے بتایا کہ فالج کا اثر دائیں طرف ہوا ہے۔ فالج کا اثر زبان پر بھی تھا مگر ہوش و حواس قائم تھے۔ اس بیماری کے زمانے میں بھی مسجد کی تعمیر و مرمت جاری رہی۔ زبان کام نہیں کر رہی تھی اس لیے حضرت مولانا اشاروں سے ہی مستری کو کام سمجھا دیتے تھے۔ یہ حالت سترہ روز تک رہی۔ آخر ۷ اکتوبر ۱۹۶۳ء کی صبح کے

Marfat.com

پونے آٹھ بجے بعمر تقریباً ستر پچھتر سال جان آفریں کے سپرد کر دی اور اپنے خاندانی قبرستان شیخ نورالدین ملک پراں میں دفن ہوئے جسے اب باغِ بیدل بھی کہا جاتا ہے۔

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مولانا موصوف کی بڑی خواہش تھی کہ باغ نبی اللہ ایک بڑا عربی مدرسہ بن جائے۔ اسی نقطۂ نظر سے مسجد کے اطراف میں وہ عمارت کی تعمیر کر رہے تھے، لیکن افسوس عمر نے وفا نہ کی یا یوں کہیے کہ بہت آخر میں انھوں نے اس بڑے کام کی طرف توجہ کی تھی ورنہ آج دلّی میں باغ نبی اللہ عربی زبان وادب کی تعلیم کا ایک بہت بڑا مدرسہ ہوتا۔ افسوس یہ بھی ہے کہ ان کی اولاد نے بھی ان کے کام کو آگے نہ بڑھایا۔ لیکن اس کے باوجود جب تک دلّی موجود ہے، دلّی کی تہذیب کا ایک بھی پرستار زندہ ہے، علم و آگہی کا ایک بھی طلب گار موجود ہے، مولوی عبدالغفار زندہ رہیں گے۔ مرنے کے بعد دلوں میں یاد چھوڑ جانا موت نہیں ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو عمل کے اچھے نمونے چھوڑ جاتے ہیں چونکہ ان سے بڑھ کر کوئی یادگار نہیں ہوتی حکیم مولوی عبدالغفار دہلوی بھی اپنے کردار و عمل کے روشن نمونے چھوڑ گئے ہیں جو ہمیشہ راہ دکھائیں گے۔

ے خوشا نصیب یہ منزل نصیب ہو جس کو
فنا حیات ہے لیکن کسی کسی کے لیے

Marfat.com

غلام احمد علمی

حاجی ظہور الدین

دلی والے، نورانی شکلوں والے تن اور من دونوں کے اُجلے، دلّی کے دل والے تو کبھی کے اللہ کو پیارے ہوئے وہ دلّی والے جن کے دم قدم سے اگلی وضع داریاں قائم تھیں، دلّی کی ستھری تہذیب اور معاشرت روشن تھی جن کی من موہنی باتیں پتھروں کو موم کیا کرتی تھیں ان دلّی والوں کو چراغ کہاں "سرچ لائٹ" سے بھی ڈھونڈو گے تو کہیں نہیں پاؤ گے۔ اب تو ان دلّی والوں کے خواب اور سائے ہی باقی رہ گئے۔ ان دلّی والوں کو دیکھنا ہے تو بس یادوں کے چراغ روشن کریں ممکن ہے ماضی کے دھندلکے میں کوئی نقش ابھر آئے۔ ذرا ٹھہریے! یہ کون ہے ابھی ابھی کوچہ میر عاشق چاوڑی بازار سے ایک رکشا جامعہ ہوٹل کے موڑ سے کباڑی بازار آئی اور جامع مسجد پولیس چوکی کے نیچے آکر رُکی۔ آپ نے انھیں پہچانا دیکھی دیکھی سی صورت لگتی ہے نا۔ غور سے دیکھیے دودھ سے دُھلی شیروانی، سفید کرتا اور پاجامہ بگلے جیسی سفید ٹوپی، بڑی بڑی آنکھیں، گھنیری پلکیں، بھرواں ڈاڑھی، کشادہ پیشانی بڑے کان، لمبی ناک، گندمی رنگ، درمیانہ قد اور کسرتی جسم۔۔۔ آپ نے اِنھیں پہچان ہی لیا یہ کون ہے؟ کیا کہا سرسید، سرسید کے

Marfat.com

دور ہیں یہ کباڑی بازار کہاں تھا یہ ہٹو بچو کرتے رکشا والے کہاں تھے یہ تو ہمارے اور آپ کے عہد کی دین ہے۔ پھر یہ وجاہت اور بھاری بھر کم شخصیت کس کی ہو سکتی ہے؟ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ذرا سامنے دیکھیے۔ پولیس چوکی سے پہلے ایک اور زینہ ہے۔ یہ زینہ ٹائروں والی بڑی دکان کے ساتھ ساتھ اوپر جا رہا ہے۔ یہ جہاں آپ کھڑے ہیں آپ ہی کے سر کے اوپر کٹہرے سے ایک سائن بورڈ بندھا ہوا ہے۔ جس پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے۔ "حاجی ہوٹل"

یہ صاحب جو رکشا سے اُتر کر بید کا سہارا لے کر بسم اللہ کہہ کر پہلی سیڑھی پر قدم رکھ رہے ہیں اسی ہوٹل کے مالک حاجی ظہورالدین ہیں۔ آپ بھی ان کے پیچھے پیچھے اوپر آجائیے اور پھر دیکھیے کہ کیا محفل جمتی ہے۔ وہ دیکھیے حاجی صاحب زینہ طے کر کے بازار کی طرف بنے برآمدے میں جا رہے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوٹل کے ملازم سلام کر کے کس قدر احترام کے ساتھ پیچھے ہٹتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ حاجی صاحب برآمدے میں پہنچیں ایک طائرانہ نظر برآمدے پر ڈال لیں۔ بالکل سامنے ہی بڑی میز کے سامنے سبز ریکسین چڑھی لوہے کی ایک پرانی بنچ پر کٹہرے سے لگے ماتھے پر ململی مغلئی ٹوپی جھکائے ٹانگ پر ٹانگ رکھے سفید ڈاڑھی والے جو بزرگ ہنکارے بھر رہے ہیں۔ یہ ہیں جگت استاد رسا دہلوی۔ میز کی دوسری طرف دیوار سے لگی جو تین کرسیاں پڑی ہوئی ہیں ان میں سے بیچ کی کرسی پر سے کالی داڑھی والے جواہر کٹ اور کرتے میں ملبوس جو صاحب پھدک کر کھڑے ہوئے ہیں یہ کوئی اور نہیں انھیں حاجی صاحب کے صاحبزادے امیر دہلوی ہیں اور یہ ان کے برابر والی کرسی سے چشمہ درست کرتے ہوئے جو صاحب اٹھے ہیں۔ حاجی صاحب کے دوسرے صاحب زادے حاجی میاں ہیں۔ یہ لیجیے حاجی صاحب کرسی پر بیٹھے بید میز پر رکھی مسافروں کا رجسٹر کھول کر دیکھا پھر اندراج پر اوپر سے

Marfat.com

نیچے تک ایک نظر ڈالی رجسٹر بند کیا اور میز پر کھسکا دیا۔ سامنے بیٹھے استاد نے کھنکارا اور حاجی صاحب نے پوچھا

" رسا سب خیریت ہے نا؟

" میاں کس کی خیریت، یہاں تو جو رونہ جاتا اللہ میاں سے ناتا"

"کیا صبح سے ادھار کھائے بیٹھے ہو۔"

" دیکھو حاجی! سب یار اللہ کو پیارے ہوئے۔ اب ہم دو تین صورتیں ہی ہیں۔ جو دم گزر جائے غنیمت ہے میں ان بچوں کو تمہاری شیطانی کے قصے سنا رہا تھا" اتنا کہہ کر استاد کٹہرے سے نیچے جھانکنے لگے۔

" کیا کہا؟" حاجی صاحب نے پیار سے بید اٹھائی اور استاد نے پیچھے ہٹنے کی ایکٹنگ کی

" میاں برا کیوں مانتے ہو؟ کون سی غلط بات کہدی، تم ہی نے تو بتایا تھا کہ نواب معین الدین کو علی گڈھ داخل کرانے گئے تھے اور سرسید بن بیٹھے......

" رسا ہوش میں آؤ۔ میں سرسید نہیں بنا تھا۔ رجسٹرار آفس کے باہر جو اس وقت لڑکے جمع تھے ان کے فہم کا قصور تھا۔ بے چارے سمجھ بیٹھے کہ سرسید کا چھوٹا بھائی آگیا لپک کر رجسٹرار کے پاس پہنچے۔ وہ بھلا آدمی بھی یہی سمجھا۔ نتیجہ میں بچے کا داخلہ ہو گیا۔"

" اور یہ کیوں نہیں بتاتے کہ وہاں خوب خاطر و مدارات بھی ہوئی

" بھائی وہ حافظ ظہور الدین کی نہیں سرسید کے چھوٹے بھائی کی ہو تھی۔ سب میرے مولا کا کرم ہے ایسی صورت بنائی کہ بڑے بڑوں کو دھوکا ہوا۔ تمہاری طرح نہیں کہ بوڑھے ہونے کو آئے ابھی تک بچوں گھر کے چوکیدار معلوم ہوتے ہو۔

" دیکھ بھئی حاجی، چند دن کی بات ہے۔ پھر جنت میں پوچھونگا کہ

آگے پیچھے پھرتی ہیں۔ ایک ایک کی شان میں سو سو شعر نہ پڑھے تو بات نہیں۔ پھر کہو گے بھائی اپنے پاس تو ایک بھی نہیں پھٹکتی۔ تیرے شعر سن کر لٹو ہو گئی ہیں۔"

آپ ان بزرگوں کی باتیں سن کر کیوں انگشت بدنداں ہیں۔ دونوں لنگوٹیے ہیں ان میں ایسی ہی ہوتی آئی ہے۔ وہ دلّی والا ہی کیا جو خوش طبع اور خوش گفتار نہ ہو ـــــ سُنیے چند منٹ کے لیے اِدھر آجائیے۔ اگر آپ اسی طرح ان دونوں کی باتیں سنتے رہے تو صبح سے شام ہو جائے گی اور آپ کو پتہ بھی نہ چلے گا۔ مجھ سے پوچھیے میں بتاتا ہوں کہ حاجی صاحب کے کتنے روپ ہیں۔ اسی بینچ پر میں نے بھی پینتیس[۲۵] چھتیس[۲۶] سال گزارے ہیں۔ حاجی صاحب میرے بزرگ ہیں لیکن مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ میں کسی زاہد خشک کے پاس بیٹھا ہوں۔ حاجی صاحب نے ہمیشہ وہ سلوک کیا کہ جو ایک دوست دوسرے دوست کے ساتھ کرتا ہے۔ حاجی صاحب کبھی فرصت میں ہوں اور احباب کا جمگھٹا نہ ہو تو پھر دیکھیے اپنی داستانِ حیات کے ورق کس طرح الٹتے ہیں۔ ایسا ہی کوئی بھلا سا وقت تھا جب حاجی صاحب نے بتایا تھا کہ اُن کے جدِ اعلا منشی ایزد بخش بہادر شاہ ظفر کے منشی تھے۔ اس زمانہ میں منشی کی حیثیت وزیر سے کم نہیں ہوتی تھی۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب انگریز جامع مسجد پر قابض ہوئے اور ۲۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو دلّی کے رؤسا اور عمائدین کی درخواست پر جامع مسجد بحال ہوئی تو اس کا پہلا متولی منشی تراب علی کو بنایا گیا۔ منشی تراب علی حاجی ظہور الدین کے دادا تھے۔ والد حافظ نور الدین رامپور میں عمارتوں کے ٹھیکیدار تھے۔ ریاست رامپور کے نواب حامد علی خاں نے جامع مسجد رامپور اور کوٹھی خاص باغ کی تعمیر کے لیے حافظ نور الدین سے مشورہ کیا تھا اور ان عمارتوں کا بہت سا حصہ حافظ صاحب کی صلاح پر تعمیر کرایا تھا۔

Marfat.com

حاجی صاحب، حافظ نورالدین کے اکلوتے بیٹے تھے، حافظ صاحب کی سات اولادیں ہوئیں۔ چھ بیٹاں اور ایک بیٹا ـــــ حاجی صاحب کہتے ہیں بہ صدی اور میں ساتھ ساتھ پیدا ہوئے۔ چودہ سال کی عمر میں قرآنِ کریم حفظ کیا۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ مطلع العلوم رامپور میں ہوئی۔ باقی تعلیم مدرسہ عالیہ فتحپوری دلی میں۔ حاجی صاحب اتنا کہہ کر بچپن کی یادوں میں گم ہوجاتے ہیں "میاں کیا لوگ تھے۔ اب تو ان جیسے لوگوں کے لیے آنکھیں ترستی ہیں۔ میری تعلیم و تربیت جن بزرگوں کے سائے میں ہوئی ان میں ہر ایک کا اپنا مرتبہ اور مقام تھا۔ سید میر نواب جان مولانا ولایت احمد۔ مفتی کفایت اللہ۔ خدا ان سب بزرگوں کو مقام اعلا عطا کرے وہ سکھا گئے جو اب شاید ہی کوئی سکھائے۔" میاں ہم نے ان بزرگوں کی جوتیاں اٹھائی ہیں آج کے بچوں کی طرح نہیں۔ استاد سامنے سے آرہا ہے۔ لپک کر اس طرف سے اُس طرف ہو گئے کہ سلام نہ کرنا پڑے۔" اتنا کہہ کر حاجی صاحب نئی نسل کا ماتم کرنے لگے۔

دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ ایک بار مولانا ولایت احمد جمعہ کی نماز کے لیے جامع مسجد تشریف لائے۔ ان کے پیچھے پیچھے ہمارے حاجی صاحب بھی اپنے پوتے کے ساتھ نماز کے لیے آرہے تھے جیسے ہی مسجد کے دروازہ پر مولانا نے اپنی جوتیاں اتاریں حاجی صاحب نے جھک کر ان کی جوتیاں اٹھالیں۔ مولانا ولایت احمد نے انھیں دیکھا اور گلے سے لگا لیا "میاں یہ کیا کر رہے ہو۔ اب تو تم پوتا پوتی والے ہو ۔ ۔ ۔ ۔"

حاجی صاحب نے مود بانہ انداز میں کہا۔ "آپ میرے استاد ہیں آپ کی جوتیاں اٹھانا میرے لیے فخر و عزت کی بات ہے۔

انھیں بزرگوں کی تربیت کا اثر تھا کہ حاجی صاحب کی نیک نامی پر حرف نہ آیا۔ وہ دین دار ملنسار، مخیّر، سنجیدہ اور بردبار تھے۔ حکیم اجمل خاں،

گاندھی جی، مولانا شوکت علی، محمد علی کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ ان بزرگوں کے ساتھ جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں ترکِ موالات کی تحریک میں گرفتار ہوئے اور چھ مہینہ جیل میں رہے۔ آزادی سے پہلے جب دلی میں فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھی تو امن وامان برقرار رکھنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی۔ اس کمیٹی میں معززینِ شہر خواجہ محمد شفیع، حکیم دلبر حسن خاں، لالہ امرناتھ، حکیم سراج الدین۔ پیارے لال موٹر والے، لالہ شنکر لال، عبدالواحد خاں، خواجہ حسن نظامی اور سید عزیز حسن بقائی شامل تھے۔ یہ کمیٹی حاجی صاحب ہی کی ذاتی کوششوں سے وجود میں آئی تھی۔ ان لوگوں نے ہندو مسلم اِتحاد اور بھائی چارہ کے لیے دلی کی گلی کوچوں میں جلسے کیے۔ میٹنگیں بلائیں اور ایک ایسا ماحول پیدا کیا کہ دلوں کی کدورت بڑی حد تک دور ہوگئی۔ ۱۹۴۷ء میں فسادات کے وقت جب کرفیو نافذ ہوا تو حاجی صاحب نے اس کرفیو میں کھانے پینے کا سامان اور دوسری ضرورت کی اشیاء علاقے کے تمام گھروں تک پہنچائیں۔ دلی اس وقت موت کی چھاؤنی بنی ہوئی تھی جو گھر سے نکلتا تو پھر اللہ ہی اُسے گھر پہنچاتا ورنہ دوسرے تیسرے دن اطلاع آتی کہ فسادیوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ اس عالم میں حافظ صاحب نے اپنی جان کی پرواہ نہ کی ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کی۔ ڈاکیہ ڈاک لے کر نہ آیا تو خود ہی پورے علاقے میں ڈاک تقسیم کی۔

پچھلے دنوں جب مجاہدینِ آزادی کی خدمت کے اعتراف میں قومی وظیفہ مقرر کیا جا رہا تھا تو حاجی صاحب نے یہ وظیفہ لینے سے انکار کردیا اور کہا کہ خدا کا دیا میرے پاس بہت کچھ ہے۔ آپ کسی ضرورت مند کو دیدیجیے۔ میں تو اتنا ہی چاہتا ہوں کہ میرا وطن شاد اور آباد رہے۔

حاجی صاحب نیک خصلت اور پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔

چنانچہ ۱۹۵۲ء میں اسی ہوٹل کے نیچے زینے کے ساتھ اپنا کھانے کا سعید ہوٹل چھوڑ کر اس بالاخانے پر آ گئے اور یہاں چائے بیچنی شروع کی تو حاجی صاحب کی چائے پینے اور اُن سے ملاقات کرنے کے لیے لوگ دور دور سے آنے لگے چائے کا ہوٹل شروع کیے ابھی کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ حاجی صاحب نے ریستوراں کو رہائشی ہوٹل میں بدل دیا۔ جامع مسجد کا قرب اور حاجی صاحب کے اخلاق نے لوگوں کو اپنا گرویدہ کر لیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ملک بھر سے ادیب، شاعر، تاجر اور فنکار یہاں آکر ٹھہرنے لگے۔ میں نے شکیل بدایونی۔ نشور واحدی۔ دعا ڈبائیوی۔ غلام عباس۔ کلکتہ کے مشہور تاجر یوسف فیروزی محمد عمر لیس والے۔ جمیل الرحمن چشمہ والے۔ حاجی ممتاز الدین، حاجی اللہ نور چوہدری ممتاز الدین اور سید محمد صدیق کے علاوہ رحیم الدین، امام الدین خاں ڈاکٹر، استاد چاند خاں، استاد حافظ علی خاں سرود نواز۔ استاد صادق علی بین کار، رسولن بائی نثار حسین خاں وغیرہ کو اکثر و بیشتر یہیں دیکھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۵۲ء میں وزیر اعظم پاکستان محمد علی بوگرہ ہندوستان آئے تو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر حاجی ظہور الدین نے ہی ان کا پُرتپاک استقبال کیا تھا حاجی صاحب کے اس رویّہ سے پنڈت جواہر لال نہرو بے حد متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنے سیکریٹری ایم۔ آر بیگ کو ہدایت کی کہ وہ ہر مسلم سربراہ کے استقبال کے لیے حاجی صاحب کو مدعو کریں۔ چنانچہ ۱۹۵۵ء میں جب شاہ سعود ہندوستان آئے تو حاجی صاحب نے ان کا ایئرپورٹ اور جامع مسجد پر دلّی کے معزز شہری کی حیثیت سے استقبال کیا۔ اس موقع پر حاجی صاحب نے جامع مسجد کی مختصر تاریخ پر مشتمل ایک کتابچہ اردو اور عربی میں شائع کیا تھا۔

حاجی صاحب خوش الحان حافظ تھے انھوں نے اپنے گھر سے قریب

Marfat.com

کوچہ میر عاشق کی مسجد کنویں والی میں ۶۰ سال مسلسل نماز تراویح میں قرآن شریف سنایا۔

حاجی صاحب نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے دو لڑکے ہوئے ناصرالدین اور امیرالدین۔ ناصرالدین آج کل کارپوریشن میں سپرینٹنڈنٹ ہیں اور امیر دہلوی اردو کے معروف شاعر ہیں۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی ہوئی ماشاءاللہ یہ اہلیہ بقید حیات ہیں ان سے دو لڑکیاں اور چار لڑکے نواب معین الدین، فیاض الدین عرف حاجی میاں۔ ریاض الدین ڈاکٹر رضی الدین۔ نواب معین الدین دہلی الیکٹرک سپلائی میں ملازم ہیں۔ فیاض الدین حاجی ہوٹل کے نگراں ہیں۔ ریاض الدین انجینیر تھے اس خوب رو نوجوان کی عمر نے وفا نہیں کی اور عین عالم شباب میں داغ مفارقت دے گیا اس الم ناک سانحہ پر حاجی صاحب نے جس صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا ــــ عزیز اقارب دوست احباب ان سے پوچھتے کہ یہ کیا ہوگیا۔ وہ انھیں دلاسہ دیتے اور کہتے مشیتِ ربی۔ خدا نے ایسا چاہا ہوگیا۔

حاجی صاحب اپنے زمانہ کے بہترین فٹ بال کھلاڑی تھے اور فٹ بال کی دنیا میں مولانا کے نام ــ سے پکارے جاتے تھے۔ استاد رسا، مولانا زبیر قریشی، کیپٹن ہرنام سنگھ، عقیل مرزا، مجید مرزا عرف مجن اور استاد بیخود دہلوی کے بھائی سید امین الدین، سید شاہ شریف حسین اور فیاض احمد ان کے ہم عمر کھلاڑی تھے۔ حاجی صاحب مغل اور ینگ مین ٹیم میں گول کیپر کی حیثیت سے کھیلے۔

حاجی صاحب کھانے کے شوقین تھے۔ عمدہ اور لذیذ کھانے پکواتے اور احباب کو ساتھ کھلاکر خوش ہوتے انھیں گولے اور سیخ کے کباب بہت پسند تھے دلی کا مشہور کبابی بندو جب کراچی چلا گیا تو حاجی صاحب کے

Marfat.com

لیے کراچی سے کباب آتے۔ حاجی صاحب کے عزیز اقارب جب بھی بذریعہ ہوائی جہاز دلّی آتے بندو کے کباب اپنے ہمراہ لاتے۔ دوپہر اور رات کے کھانے کے بعد میٹھی چیز ضرور کھاتے۔ گرمی میں آم اور خربوزے۔ اور موسم سرما میں دیسی گھی میں گڑ ملا کر کھاتے تھے۔ حاجی صاحب کو شکار کا بھی شوق تھا۔ ہم نے انھیں شکار کھیلتے نہیں دیکھا لیکن ان کے بہترین شکاری ہونے کے تذکرے ضرور سنے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اچھے کھانے کے شوق ہی نے انھیں سعید ہوٹل کے لیے اکسایا ہوگا ۱۹۴۷ء کے بعد حاجی صاحب نے لذیذ کھانوں کا ہوٹل اسی حاجی ہوٹل کے نیچے کھولا تھا۔ دلّی ریلوے اسٹیشن پر فرسٹ کلاس ریٹائرنگ روم میں کینٹین بھی تھی جس کی نگرانی ان کے بہنوئی بابو سعید الدین کرتے تھے اور خود حاجی صاحب کانپور ٹینڈری سے چمڑے کا کاروبار کرتے تھے اور کانپور ٹینڈری کے دلّی میں بینکر تھے۔

حاجی ظہور الدین انتہائی معاملہ فہم اور صاحب الرائے تھے۔ کوچہ میر عاشق کی ہندو مسلم آبادی نے انھیں میر محلہ بنایا۔ اور اپنے قضیے جھگڑے ان کے پاس لاتے حاجی صاحب آپ ہی فیصلہ کیجیے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد دلّی کی فضا عرصہ تک مکدر رہی۔ ہندو اکثریتی علاقے میں مسلمان نہ جاتے مسلم علاقے میں ہندو نہ آتے۔ یہ انھیں دنوں کی بات ہے کہ بابو رام ہارمونیم والے کی سالی کی شادی متھرا میں ہوئی چند دن میاں بیوی خوش رہے پھر لڑکے نے بیوی کو مارنا پیٹنا شروع کیا۔ لڑکی نے گھر شکایت بھیجی۔ بابو رام مشورے کے لیے حاجی صاحب کے پاس آئے۔ حاجی صاحب نے کہا لڑکی کو دلّی لے آؤ پھر دیکھیں گے۔ لڑکی دلّی آ گئی۔ حاجی صاحب نے اسے اپنے گھر بلا کر حالات دریافت کیے اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ لڑکی شوہر کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اگلے روز انھوں نے چاند بہاری وکیل سے کہا کہ لڑکے کے خلاف مقدمہ دائر

کر دیں۔ چنانچہ مقدمہ شروع ہوا۔ دو تین ماہ بعد لڑکی اور لڑکے دونوں کو بیانات کے لیے عدالت میں طلب کیا گیا۔ اسی دوران لڑکے والوں نے کہلا بھیجا۔ لڑکی عدالت میں آئی تو اس کی ناک چوٹی کاٹ لیں گے۔ لڑکی والے بہت پریشان ہوئے۔ حاجی صاحب نے کہا کہ آپ لوگ وقت مقررہ سے پہلے عدالت میں پہنچ جائیں اور لڑکی کو میرے گھر بھیج دیں۔ جس روز بیانات ہونا تھے۔ لڑکی والے عدالت پہنچ گئے۔ دس بجے عدالت شروع ہوئی۔ دس بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے کہ حاجی ظہورالدین عدالت میں اس طرح داخل ہوئے کہ شیروانی کا دامن لڑکی نے تھام رکھا تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی ___ مجسٹریٹ نے یہ منظر دیکھا تو حاجی صاحب سے پوچھا کہ آپ کا اس لڑکی سے کیا تعلق ہے۔ حاجی صاحب نے کہا میرے محلے کی بچّی ہے۔ میری اپنی اولاد کے برابر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ دونوں میاں بیوی کے بیانات تخلیہ میں لیں۔ آپ پر حقیقت واضح ہو جائے گی۔ مجسٹریٹ نے ایک نظر حاجی صاحب کو دیکھا اور پھر حکم دیا کہ بیانات کمرے میں علاحدہ علاحدہ قلم بند کیے جائیں گے۔ بیانات لینے کے بعد مجسٹریٹ نے اسی روز فیصلہ سنا دیا۔ لڑکی حاجی صاحب کے ساتھ اپنے گھر آ گئی۔ حاجی صاحب کے ایسے ان گنت واقعات ہیں۔ اب ایسے وضع دار بات کی خاطر جان دینے والے لوگ کہاں رہ گئے۔

ایک روز بعد نماز عصر ہوٹل میں حاجی صاحب کے چند احباب جمع تھے۔ مولانا محمد علی شوکت علی کا ذکر ہو رہا تھا۔ حاجی صاحب خاموشی سے گفتگو سنتے رہے۔ جب سب اپنی اپنی کہہ چکے۔ تو حاجی صاحب نے ٹھنڈا سانس لیا اور کہا میاں اب تو چند ہی لوگ رہ گئے ہیں جو انھیں جانتے ہیں ان بھائیوں نے قوم کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا مگر قوم نے ان کی قدر نہ کی چند دن میں ہی سب بھول گئے۔ میں نے ان تینوں بھائیوں

کو قریب سے دیکھا ہے۔ جتنے با شعور تھے اتنے ہی چُلبلے بھی تھے"۔ احباب میں سے کچھ کے کان کھڑے ہوئے کہ دو کا ذکر سبھی نے سنا تیسرے کہاں سے آٹپکے۔ تجسس بڑا تو ایک صاحب نے پوچھا کہ کیا مولانا محمد علی سے بھی چھوٹے کوئی بھائی تھے۔ نہیں میاں۔ مولانا محمد علی تو سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ سب سے بڑے احمد علی پھر شوکت علی ان کے بعد محمد علی۔ یہ تینوں بھائی متعدد بار غریب خانہ پر آچکے ہیں۔ ایک مرتبہ ہم لوگ گھر پر بیٹھے تھے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں کہ خیال آیا بھائی احمد علی شاعری کرتے ہیں مگر ان کا کوئی تخلص نہیں مولانا محمد علی کا جوہر تخلص ہے۔ شوکت علی کا گوہر بڑے بھائی کا تخلص کیا ہو۔ چنانچہ سبھی تخلص سوچنے لگے۔ تبھی شوکت علی بولے میں بتاتا ہوں۔ ان کا تخلص ہونا چاہیئے۔ شوہر۔۔۔ شوہر۔۔۔

حاجی ظہور الدین کو اکابرینِ سیاست، علمائے دین، شعرا اور ادبا کے ان گنت دل چسپ واقعات اور لطیفے یاد تھے جب کبھی اچھے موڈ میں ہوتے تو سناتے ورنہ عام طور پر سنجیدہ شستہ گفتگو کرتے۔

اچھے موڈ پر یاد آیا کہ ہم اس گفتگو میں یہ تو بھول ہی گئے کہ حاجی ہوٹل کے برامدے میں حاجی ظہور الدین اور استاد رسا میں نوک جھونک ہو رہی ہے۔ استاد کہہ رہے ہیں میاں حاجی آج صبح دلّی گیٹ کے قبرستان میں بزرگوں کی فاتحہ کے لیے گیا تھا۔ جیسے ہی السلام علیکم یا اہل القبور کہا۔ وعلیکم کے بجائے ایک قبر سے آواز آئی۔ میری اجرت دلا دو، بڑی محنت سے شیروانی سی تھی۔ بھائی اس دریبہ والے درزی کے پیسے دے کیوں نہیں دیتے بے چارہ ابھی تک قبر میں تڑپ رہا ہے"۔

حاجی صاحب پہلے تو مسکراتے پھر غصہ سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ میز سے بید اٹھایا۔ استاد اس سے پہلے ہی سنبھل کر کھڑے ہو گئے" اچھا بھئی حاجی وعلیکم السلام کل ملیں گے"۔

Marfat.com

ایک روز استاد اردو بازار کے ایک تختہ پر براجمان نظر آئے ۔ علیک سلیک ہوئی میں نے پوچھا استاد یہ حاجی صاحب نے کون سے درزی کے پیسے مارے تھے ۔ استاد کھلکھلا کر ہنسے اور پھر بولے توبہ کرو بھائی ۔ یہ حاجی کسی کے پیسے مارے گا ۔ میاں ہماری تو اسی طرح چونچیں لڑتی ہیں ۔ یہ اب سے ساٹھ پینسٹھ برس ادھر کی بات ہے ۔ سبھی لڑکے بالے تھے مغل فٹ بال کلب میں کھیلتے تھے ۔ ایک مرتبہ پریڈ گراؤنڈ پر لال قلعہ کے گوروں کی ٹیم سے میچ تھا ۔ ہمارے حاجی بھائی گول کیپر تھے مگر انھیں صبح سے ہچکیاں آرہی تھیں ایسی خطرناک ہچکیاں کہ رکنے کا نام نہیں ۔ سب پریشان کہ ظہور کیسے میچ کھیلے گا ۔ کوئی علاج کارگر نہ ہوا ۔ ہمارے ٹیم کے سربراہ جبار صاحب تھے ۔ میں نے کہا اس کا علاج تو کردونگا لیکن مجھے خدشہ ہے کہ بعد میں مجھے یہ مارے گا ۔ میں دبلا پتلا اور یہ ہٹا کٹا ۔ جبار صاحب نے کہا تم اس کی فکر نہ کرو علاج کرو ۔ کچھ دیر بعد جب ٹیم کے سبھی لڑکے اکٹھے ہو گئے تو میں نے بآواز بلند کہا بھائیو ! یہ ہمارے مولانا ظہور دلّی کے رئیس زادے ہیں انھوں نے ایک مہینہ پہلے دریبہ میں شیروانی سلوائی تھی شیروانی پہن کر پرانی ہوئی مگر انھوں نے ابھی تک سلائی نہیں دی ۔" میرا اتنا کہنا تھا کہ مولانا ظہور غصہ میں سرخ ہو گئے اور چلا کر کہا کون مردود کہتا ہے میں نے پیسے نہیں دیے ۔ پھر طیش میں مجھے مارنے دوڑے میں بھاگا ۔ ہاتھ نہیں آیا ۔ بس اسی بھاگ دوڑ میں ہچکیاں بند ہو گئیں ۔ ظہور کو پانی پلایا گیا ۔ میچ شروع ہوا ۔ اور ہم جیت گئے مگر مولانا ظہور کا منہ پھولا رہا ۔ مجھے پکڑ لیا اور کہا رفیق ! ابھی سب کے ساتھ دریبہ چلو میں اس درزی کے بچے سے پوچھوں گا ۔ میں نے کہا مولانا ظہور ناراض نہ ہو ۔ میں اگر یہ حربہ استعمال نہ کرتا تو تمہاری ہچکیاں کیسے بند ہوتیں ۔ یہ تمہارا نفسیاتی علاج تھا ۔ جس کا خاطر خواہ اثر ہوا ۔" بس اس دن سے موقع ہاتھ آگیا جب کبھی تفریح کی سوجھتی ہے چھیڑ دیتا ہوں ۔

Marfat.com

بس میاں زندگی کے جتنے دن باقی ہیں اسی طرح ہنسی خوشی میں گزر جائیں۔ ورنہ اب رہ کیا گیا ہے اس زندگی میں . . .

یہ تھے بچے کھچے دلّی والے۔ دلّی کی بگڑی تہذیب میں شرافت اور وضع داری کے چراغ روشن کرنے والے۔ کہاں گئے یہ دلّی والے۔ استاد رسا بھی اللہ کو پیارے ہوئے اور ۴ اپریل ۸۲ ء کو حاجی ظہور الدین بھی مالک حقیقی سے جا ملے۔

فلک زمیں و ملائک جناب تھی دلّی
بہشت و خلا میں بھی انتخاب تھی دلّی
جواب کا ہے کو تھا لاجواب تھی دلّی
مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دلی
پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

Marfat.com

م ۔ افضل

مولانا عبدالوحید صدیقی

پرانی دہلی کے مشہور محلّے کوچہ ناہر خاں میں گلی کے دوسرے آوارہ گرد لڑکوں کی طرح میں بھی گلی ڈنڈا۔ گیند بِٹھو داری۔ گھوڑی والے گھوڑی کنے کی جیسے کھیل کھیلا کرتا تھا۔ میرے گھر سے ۲۵ - ۳۰ قدم کے فاصلے پر محلّے کے ایک مکان میں ایک نیا پڑھا لکھا خاندان آکر آباد ہوا تھا۔ محلّے کے لڑکے جب گلی میں کھیلتے کودتے اور شور مچاتے تھے۔ تو آس پاس کے گھروں میں رہنے والے بزرگ کبھی کبھی باہر نکل کر ہمیں ڈانٹ پھٹکارتے۔ اور ہم وہاں سے فوراً رفو چکّر ہو جاتے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی ہنگامہ۔ پھر وہی دھما چوکڑی۔ مگر اس خاندان میں جو بزرگ تھے۔ وہ کبھی کبھی اپنی بیٹھک کی کھڑکی میں سے جھانک کر ضرور دیکھ لیتے۔ مگر نہ ڈانٹتے۔ نہ پھٹکارتے۔ نہ ہی ہم کو شور نہ کرنے کی نصیحت کرتے۔ ان کا یہ صبر دیکھ کر ہم اور بھی شور مچاتے۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتے۔ اور ہمیں وہاں سے بھگانے کی کبھی کوئی کوشش نہ کرتے۔

یہ مولانا عبدالوحید صدیقی تھے۔ صبر و تحمّل اور قوّت برداشت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ۔ مولانا بلیماراں میں حویلی حسام الدین حیدر سے اپنا بڑا مکان بیچ کر

ایک معمولی سے کرائے کے مکان میں آکر کوچہ ناہر خاں میں آباد ہوئے تھے۔ روزنامہ "نئی دنیا" مولانا کو تمامتر تباہی سے ہمکنار کرکے بند ہوچکا تھا۔ اور مولانا اردو صحافت کی سنگلاخ زمین پر ایک آخری جوا کھیل رہے تھے۔ ہندوستان کے پہلے اردو ڈائجسٹ "ہما" کے خدوخال اس معمولی سے مکان کی بیٹھک میں ترتیب دیے جا رہے تھے۔ مولانا کے تیسرے بیٹے طارق صدیقی انجن کی طرح منہ سے سگریٹ کا دھواں اڑاتے۔ اور اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ "ہما" کی تعریف میں ان کی زبان سے الفاظ نکلتے تھے۔ نائی کی دُکان ہو یا دودھ والے کی دُکان۔ طارق صدیقی اپنے ہاتھ سے "ہما" کے پوسٹر لٹکاتے تھے۔

آخر کار "ہما" آیا اور اس نے اردو صحافت میں دھوم مچا دی۔ روزنامہ کی دنیا میں وقت کے ہاتھوں فلاپ ہو جانے والے مولانا عبدالوحید صدیقی ماہنامہ ڈائجسٹ نکال کر ہٹ ہوگئے۔ ہُما کی اشاعت تیزی سے بڑھی۔ اسی تیزی سے ان کا کاروبار بھی بڑھا۔ بُرے وقت میں انھیں چھوڑ کر چلے جانے والوں کی واپسی کا دور شروع ہوا۔ مولانا پرانی دہلی کی تنگ گلیوں کے شور شرابے والے ماحول سے نئی دہلی کے پرسکون علاقے نظام الدین منتقل ہوگئے۔

ماہ و سال کی گردش میں بچپن گزر گیا۔ اسکول کی تعلیم ختم کرکے جب دہلی کالج میں پڑھنے کے لیے میں نے داخلہ لیا۔ تو مولانا کے سب سے چھوٹے بیٹے شاہد صدیقی میرے ہم جماعت ہوتے۔ کوچہ ناہر خاں کی معمولی جان پہچان کالج میں دوستی کا سبب بنی۔ اور اس دوستی کے توسط سے میں نے مولانا کو بہت قریب سے دیکھا۔ اسی دوستی کے توسط سے میرا داخلہ صحافت میں ہوا اور اس طرح مولانا کو اور بھی زیادہ قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقعہ ملا۔

مولانا کی زندگی کے یوں تو ان گنت پہلو تھے۔ مگر میں یہاں چند مخصوص باتوں کا ذکر اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا کی زندگی کے وہ گوشے ان سے

متعلق لکھے گئے مضامین میں خال خال ہی سامنے آئے ہیں۔

بنیادی طور پر مولانا کا تعلق غازی پور سے تھا۔ انھوں نے غالباً ۲۰، ۲۵، سال کی عمر کے بعد اپنی تمام زندگی دہلی ہی میں گزاری۔ وہ پوری طرح دہلی کے رنگ میں رنگ چکے تھے۔ اس لیے میں انھیں ٹھیٹھ دہلی والا کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ فرق صرف اتنا تھا۔ کہ انھوں نے دہلی والوں کی تمام اچھائیاں اپنا لی تھیں۔ اور ان کی برائیوں کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیا تھا۔ دہلی والوں کی زبان کا چٹخارہ اور ان کی مہمان نوازی بہت مشہور ہیں۔ مولانا میں یہ دونوں باتیں موجود تھیں مختلف قسم کے عمدہ لذیذ کھانے بنوانے اور کھانے کا انھیں صرف شوق ہی نہیں تھا۔ بلکہ جنون کی حد تک وہ میزبانی کے شوقین بھی تھے۔ گو کہ یہ کھانے گھر میں ان کی اہلیہ۔ اور اعلا تعلیم یافتہ لڑکیاں پکاتی تھیں۔ مگر ان کھانوں کی اصل لذت مولانا کی ہدایتوں اور نصیحتوں میں پنہاں تھی۔

اگر کوئی مذاق میں بھی کسی وقت مولانا سے کہہ دیتا کہ مولانا آپ کے ہاں دہی کی روٹی بہت عمدہ پکتی ہے۔ تو سمجھ لیجیے۔ کہ چند روز کے اندر اندر اس کا دعوت کھانا فرض۔! کھانے کے جتنے شوقین تھے۔ اتنے ہی با اصول بھی تھے۔ میں نے کچھ عرصہ کریم ہوٹل میں کام کیا۔ ایک دن بولے۔ افضل میاں! کریم کے سیخ کباب کھلایے کسی دن — ؟ میں نے کہا شام کو لے کر حاضر ہوں گا۔ بولے میں ۷ بجے کھانا کھا لیتا ہوں۔ وقت سے لے آیئے۔ بدقسمتی سے اس روز سیخ کباب بننے میں تھوڑی سی دیر ہو گئی۔ پونے سات بجے میں نے مولانا کو فون کیا۔ اور کہا میں تھوڑی دیر میں کباب لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔ بولے۔ میں کھانا کھانے بیٹھ رہا ہوں۔ میں ۷ بجکر دس منٹ پر گرم گرم سیخ کباب لے کر ان کے گھر پہونچا تو مولانا کھانا کھا چکے تھے۔ اور کھانے کے بعد وہ ایک نوالہ بھی کسی اور چیز کا نہیں لیتے تھے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ان کی زبان میں بہت چٹخارہ تھا گرم گرم سیخ کے کبابوں سے اٹھتی ہوئی خوشبو ان کے اصول کو نہیں توڑ سکی اور انھوں نے

Marfat.com

کباب فرج میں رکھوا دیے۔

روز نامہ نئی دنیا کی تباہی کے دوران مولانا نے بہت نامساعد حالات کا سامنا کیا۔ کچھ لوگوں نے انھیں "مقروض ملّت" تک کہنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے بارے میں بہت سے لوگوں کی یہ رائے تھی کہ وہ معاملات کے صحیح نہیں تھے اور روپے پیسے کے معاملے میں ان کا ہاتھ صاف نہیں تھا۔

مگر میری رائے یہ ہے کہ مولانا ملّت کے مقروض نہیں تھے۔ بلکہ ملّت ان کی مقروض ہے۔ آزادی کے بعد اردو صحافت کے ذریعے مولانا نے ہندوستانی مسلمانوں کے حوصلے بلند کرنے ان کے مسائل اور ان کی پریشانیوں کو حکومت وقت کے سامنے رکھنے میں جو کردار ادا کیا اور اس کے صلے میں انھوں نے جو پریشانیاں اٹھائیں وہ کچھ کم نہیں تھیں۔ روزنامہ نئی دنیا پر پے در پے مقدمات۔ حوالات اور جیل نے اس اخبار کے پیر اکھاڑ دیے۔ کاتبوں سے لے کر کاغذی تک مولانا نہ جانے کتنے لوگوں کے مقروض ہو گئے۔ ساری شان وشوکت آن اور بان ختم ہو گئی۔ بے پناہ مجبوریوں نے ان کے صاف ستھرے ہاتھوں کو داغدار بنا دیا۔ ورنہ مولانا کا ہاتھ کتنا صاف تھا یہ میں نے برسوں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں پیسے کے معاملے میں اتنا ایماندار۔ معاملہ فہم اور کھرا انسان نہیں دیکھا۔

اپنے ملازمین کو پہلی تاریخ کو تنخواہ دے دینا ان کی عادت تھی اور جو اس روز ان سے تنخواہ نہ لینے پہنچے۔ وہ ڈانٹ کا مستحق۔ واوچر پر دستخط ہوتے ہی وہ رسیدی ٹکٹ کے بیس پیسے مانگنے کبھی نہیں بھولتے تھے چاہے واوچر پر دستخط کرنے والا م۔ افضل ہو۔ یا ان کا بیٹا شاہد صدیقی۔

مولانا کاغذی سے لے کر پریس والے تک تمام لوگوں کی ادائےگی جس طرح کرتے تھے وہ ان کے خلاف کیے جانے والے پروپیگنڈے سے بالکل الٹی بات تھی۔ ہزاروں روپے کا چیک تیار رہے مولانا فرماتے ہیں کاغذی کو

Marfat.com

فون ملایئے۔ پھر فون پر کاغذی کو ڈانتے ہیں کبھی آپ وقت پر آکر اپنا چیک لے لیا کریں۔ مجھ پر بوجھ سا رکھا رہتا ہے۔ کاغذی کہتا ہے مولانا آپ کے پاس پیسے رکھے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ بینک میں رکھے ہیں۔ یہ سن کر مولانا ناراض ہو جاتے ہیں۔ ارے صاحب! میں آپ کا بینک نہیں ہوں بس آپ اپنے پیسے لے جایئے۔ اور کاغذی صاحب کے کان پر پھر بھی جوں نہیں رینگتی۔ اس کے بعد بھی کئی دن بعد تشریف لا رہے ہیں۔ ڈانٹ کھا رہے ہیں کہ پیسے کیوں نہیں لیتے ہیں نے ان گنت لوگوں سے یہ تو ضرور سنا کہ مولانا پر بہت سے لوگوں کے واجبات تھے۔ مگر ایسا ایک شخص بھی مجھے آج تک نہیں ملا جو یہ کہہ سکے کہ خود اس کا ایک پیسہ مولانا پر واجب تھا۔ پتہ نہیں وہ۔ "بہت سے"، کونسی دنیا کے لوگ تھے جن کے مولانا پر واجبات تھے۔ ان میں کس قدر قوت برداشت تھی اور اپنے اصولوں کے وہ کس قدر پابند تھے۔ اس سلسلے میں صرف ایک آنکھوں دیکھی مثال بیان کروں گا طویل علالت کے بعد مولانا کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا گھر میں کہرام مچ گیا۔ مگر سب کو تسلی دینے والے اگر تھے تو صرف مولانا ہی تھے۔ اتفاق سے جس روز ان کی اہلیہ کا انتقال ہوا۔ اگلے روز ہفت روزہ "نئی دنیا" کی کاپیاں پریس جانی تھیں۔ سارا دن گزر گیا تھا۔ کچھ عزیز و اقارب کی آمد میں تاخیر کی وجہ سے رات کی بجائے صبح میں میت کی تدفین کا پروگرام طے ہوا۔ مولانا نے اپنے چھوٹے بیٹے شاہد کو بلایا۔ اور کہا۔ اخبار وقت پر نکلنا چاہیئے چاہے آپ کو ساری رات کام کرنا پڑے مجھے یاد ہے کہ گھر میں ماں کی میت رکھی تھی اور شاہد نے میں نے اور دفتر کے دوسرے ایڈیٹوریل اسٹاف نے رات بھر کام کیا اور اس عظیم سانحہ کے باوجود اخبار لیٹ نہیں ہوا۔ میں نے جب اخبارِ نو نکالا تو مولانا کے اس اصول کو گرہ میں باندھ لیا۔

مولانا دار العلوم سے فارغ التحصیل تھے۔ وہ عرصہ تک مدرس بھی رہے۔

مگر وہ کٹھ ملّا ہرگز نہیں تھے۔ میں انھیں صرف وسیع النظر ہی نہیں بلکہ آزاد خیال مولوی کہوں تو غلط نہیں ہوگا۔ کرکٹ کے بہت شوقین تھے اگر ریڈیو پر کمنٹری آرہی ہے تو ضرور سنیں گے۔ ٹی وی پر کرکٹ میچ ہورہا ہے تو ضرور دیکھیں گے خوبصورت گھڑی اور خوبصورت لائٹر ان کی کمزوری تھی۔ میں جب کبھی اپنے والدین سے ملنے پاکستان جاتا تو مولانا گھڑی یا لائٹر ضرور منگواتے۔

مولانا نے اپنے نظریات کبھی دوسروں پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی یہاں تک کہ اپنی اولاد پر بھی نہیں۔ ان کے ایک صاحبزادے نے جب اپنی مرضی سے اپنی شریک حیات کا انتخاب کرلیا اور مولانا سے شادی کی اجازت مانگی۔ تو مولانا نے اجازت دینے میں ایک منٹ کی بھی دیر نہیں لگائی۔ اس کے برعکس گھر کا ہر فرد اس شادی کے خلاف تھا۔ مگر مولانا نے سب کو سمجھا بجھا کر راضی کرلیا۔

مولانا کی عمر تقریباً سترّ برس تھی۔ جب وہ آخری بار جیل گئے۔ ان کے ہاتھ میں زبردست رعشہ تھا۔ داڑھی اور سر کا ہر بال سفید ہوچکا تھا۔ جب پولیس والے انھیں گرفتار کرنے آئے تو ایک ضعیف العمر آدمی کو گرفتار کرتے ہوئے انھیں بڑی شرم آتی تھیں۔ مولانا پہلے ان لوگوں کو چائے پلاتے۔ ان کی خاطر مدارات کرتے اور اپنی مسہری کے نیچے رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی اٹیچی اٹھاکر اُن کے ساتھ تھانے چلے جاتے۔ ایمرجنسی کے دوران مولانا کی روزمرّہ کے استعمال کی چیزوں اور پہننے کے چند کپڑوں کے ساتھ یہ اٹیچی ہر وقت ان کی مسہری کے نیچے تیار رہتی تھی۔

مولانا عبدالوحید صدیقی میں کس قدر خوبیاں تھیں ان کا مکمّل طور پر ذکر کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ وہ انتہائی خلیق۔ مہربان با اصول۔ جری اور بہادر انسان تھے۔ آنے والی نسلوں کے لیے وہ راہیں متعین کرگئے ہیں۔ مگر ان کے کردار کے ایک خاص پہلو کا ذکر نہ کرنا ان کی شخصیت کے ساتھ

ناانصافی کے مترادف ہوگا۔

مولانا صحافتی دنیا میں اپنے حریفوں کو ہمیشہ بہت ہی کمزور تصور کیا کرتے تھے اور اس سلسلے میں دوسرے کی صلاحیتوں کا بہت ہی کم اعتراف کرتے تھے۔ اپنے اخبار یا رسالے کی تعریف کرنے میں اگر وہ مبالغہ آرائی سے کام لے سکتے تھے تو دوسرے اخبار یا رسائل کی خامیاں نکالنے اور رائے قائم کرنے میں بھی وہ مبالغہ آرائی کی حد تک جا سکتے تھے۔

مولانا سے ایک شکایت مجھے بھی رہی۔ یہ کوئی ذاتی شکایت نہیں تھی۔ میری اس شکایت کو کچھ لوگ غلط بھی کہتے ہیں۔ اور کچھ لوگ صحیح بھی۔ وہ اپنے ادارے میں کام کرنے والوں سے جہاں بہت محبت کرتے تھے وہیں پر اپنے ادارے میں کام کرنے والے صحافیوں کو تنخواہ تو کمانے دیتے تھے۔ مگر ان کے نام کمانے پر بہت نظر رکھتے تھے۔ ان کے ادارے میں فرضی نام سے لکھنے کی اجازت آسانی سے مل جاتی تھی۔ مگر اصلی نام سے لکھنے کی اجازت مشکل سے ملتی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں نے ایک مضمون لکھا مولانا کو مضمون بہت پسند آیا۔ مولانا نے مجھے بلایا میرے ہاتھوں میں ایک لفافہ دیا کہا۔ یہ اس مضمون کے لکھنے کی خوشی میں آپ کا انعام۔! میں لفافہ ہاتھ میں لے لیا۔ شکریہ ادا کیا۔ مگر چلتے چلتے مولانا کے سامنے ایک گستاخی کر دی۔ میں نے کہا "اس انعام سے زیادہ بڑا انعام میرے لیے یہ ہوتا کہ اس مضمون پر میرا نام چھپ جاتا" مولانا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کو میری یہ گستاخی انتہائی ناگوار گزری تھی۔ مگر شاید ان کے دل کو میری یہ بات کچھ لگ بھی گئی اور اس کے بعد ان کے اخبار میں کبھی کبھی میرا نام چھپنے لگا۔ دراصل مولانا کا اس سلسلے میں جو رویہ تھا۔ وہ اس زمانے تک اردو صحافت کی ایک روایت تھا۔ اور دہلی کے کچھ بڑے اخبارات و رسائل آج بھی اس افسوسناک روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

یہاں میں اس بات کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا کے ادارے سے بہت سے ایسے صحافیوں کی وابستگی رہی ہے جو ملک گیر شہرت رکھتے ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے یہ شہرت وہاں سے نکلنے کے بعد حاصل کی۔ مثال کے طور پر ظ۔ انصاری صاحب کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ مولانا کی زندگی کے یہ دو پہلو اکثر و بیشتر مجھے حیرت و استعجاب میں ڈال دیتے۔

مولانا کا آخری وقت مجھے آج بھی یاد ہے۔ ان کے دماغ پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ دہلی کے پنت اسپتال میں ۸۰ سال کے اس ضعیف العمر انسان نے کئی روز تک موت سے جو جنگ لڑی وہ ان کی بہادری کا آخری نمونہ تھی۔ اور شاید وہ واحد جنگ تھی جو مولانا ہار گئے۔

Marfat.com

بیگم صدیقہ قِدوائی

دِلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

دلی ہندوستان کا دل ہے۔ اس نے بڑے بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ کبھی لُٹی، کبھی بسی، پھر لٹی پھر بسی۔ مگر اس نے اپنی رواداری اور وضع داری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ جس طرح اردو لشکری زبان ہے، اسی طرح دلی بھی مختلف زبانوں تہذیبوں، فرقوں اور قوموں کا گہوارہ رہی ہے۔ اب اس کی تمام رونقیں اِک اِک کرکے اللہ کو پیاری ہوگئی ہیں۔ پھر بھی اس میں وہ چاشنی ہے کہ جو بھی دِلّی آیا بس یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ جس نے دلّی سے دل لگایا اس نے بھی اُسے گلے لگا لیا۔

آج میں آپ کے سامنے ایک ایسی ہی خاتون کا خاکہ پیش کر رہی ہوں جن کی پیدائش گو دِلّی کی نہ سہی مگر دِلّی کی تہذیب میں رچی بسی ضرور ہیں۔ ان کی شخصیت یہیں آکر نکھری اور ابھری۔ کیا خیال ہے ان کے ملنے سے قبل راستہ میں دو چار دِلّی والیوں کے گھر میں بھی جھانکتے چلیں۔

یہ ہے گلی قاسم جان، نواب قاسم جان کا علاقہ، جہاں نوابوں کی حویلیاں سر اٹھائے کھڑی ہیں۔ اگرچہ اب ان کی وہ آن بان نہ رہی پھر بھی کچھ مِٹے مِٹے سے نقوش

Marfat.com

باقی ہیں۔ سامنے ایک بڑا سا پھاٹک ہے۔ دوہری ڈیوڑھی باہر مردانہ اندر زنانہ حصہ
بڑے بڑے دالان صحنچیاں، کشادہ صحن، بیچ میں حوض، سامنے چبوترہ۔ گرمی کا موسم
ہے دالان میں خس کے پردے پڑے ہیں۔ پانی ڈالا جا رہا ہے۔ اندر چوکیوں کا
فرش، اجلی براق چاندنی فرش پر بڑے بڑے قالین دیواروں پر قدِ آدم خاندانی
تصاویر آویزاں ہیں چوکی پر مسند گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیگم صاحبہ تشریف فرما ہیں۔
سیدھا تنگ پاجامہ، کرتے میں چوڑے چوڑے سونے کے بٹن چنا ہوا دوپٹہ،
ہاتھوں میں ڈیمل کٹ کی چوڑیاں، سامنے چاندی کی پٹاری جس پر زردوزی
گردی پڑی ہے۔ لگنی میں کرارے کرارے پرانے پان لال صافی میں لپٹے ہوئے
اور ساتھ ہی ساتھ خاصدان میں بیڑے سجے ہیں۔ لونڈیاں پنکھا کھینچ رہی ہیں۔
باندیاں اشارے پر تیار۔ کسی کو مُشک کا شربت بنانے کا حکم دے رہی ہیں تو
کسی کو خربوزے کی راحتِ جان۔ تاکہ بہو بیٹیاں اٹھیں تو ان کو ٹھنڈی ٹھنڈی
چیزیں پیش کی جا سکیں۔ لڑکیاں بالیاں اگر سو بھی نہ رہی ہوں تو وہ کونے کھدروں
میں گھُسی ہوئی ہیں۔ کیوں کہ اماں جان کا فرمان ہے کہ دوپہر کو آرام کیا جائے۔
. . . . ہر آنے جانے والے سے خندہ پیشانی سے پیش آتی ہیں۔ مگر چہرے
پر رعب و دبدبہ اور جلال ایسا کہ مجال ہے کوئی اونچی آواز میں بات کر سکے۔

آیئے ذرا برابر میں بھی جھانک لیں۔ کڑھا ہوا دوپٹہ۔ گول گھیر کا کرتہ۔ کانوں میں
پھولوں کی بالیاں۔ ہاتھوں میں چوڑیاں۔ چاروں ہاتھ پیروں میں مہندی رچی۔
آوازمیں کرارپن یہ ہیں استانی جی۔ قرآن شریف کا آموختہ دُہروا رہی ہیں۔
شاگردیں باآوازِ بلند، خانگی، پڑھ رہی ہیں۔ ذرا زیر زبر کی غلطی ہوئی اور ایک
کڑک دار آواز گونجی " مردی سپارے پر تو نظر ٹکتی نہیں۔ ہوائی دیدہ آنکھوں
میں سوئی چبھو دونگی کمبختوں پر اثر ہی نہیں ہوتا۔ آنکھوں کا پانی ڈھل گیا ہے"
ذرا رکیں اور تین بل کی چٹکی ران میں مروڑی۔ دوسری طرف ایک شاگرد ثابت
مرچیوں کا مصالحہ پیس رہی ہے؛ تو دوسری چھڑکاؤ کر رہی ہے قلعی دار کٹورہ د

Marfat.com

ہیں شربت بنانے کے لیے تخمیرہ بھیگی ہوئی ہے۔ استانی جی پڑھانے کے ساتھ ساتھ ہاتھ میں فریم پکڑے اپنا کرتہ بھی کاڑھتی جارہی ہیں۔

چلیے اب یہاں سے اٹھ کر ایک نظر بلی ماران کی حویلیوں پر بھی ڈلتے ہیں پختہ حویلی۔ لمبی ڈیوڑھی۔ دسیوں نوکر بیٹھے۔ کوئی حقّہ تازہ کررہا ہے۔ تو کوئی چلم بھر رہا ہے ایک طرف کشتہ پھونکا جا رہا ہے۔ تو دوسری جانب معجون گھونٹی جارہی ہے، دیوان خانے میں سفید چاندنی سفید گاؤ تکیہ بڑے بڑے قالین۔ دروازے پر ڈولی لگی ہے لال قند کا پردہ کیکری کا کام، نوکر چادر پکڑے کھڑے ہیں کہ بیگم صاحبہ سوار ہوں تو پردہ تانا جائے کہار ڈیوڑھی کے باہر منہ موڑے کھڑے ہیں اندر داخل ہوتے ہی چھم چھم کی آواز کان میں پڑتی ہے اوا ہو ا بہو بیگم کہیں تشریف لے جارہی ہیں۔ زیور سے لدی۔ کپڑوں سے پھندی چوبیس کلی کا فرشی پاجامہ ہابن نیٹ کا کرتہ، خوب بھاری دوپٹہ کمر بند میں چابیوں کا گچھا، دو خادمائیں پائنچے سنبھالے؛ پیچھے پیچھے انا بی کے ہاتھوں میں چاندی کی ڈبیہ بٹوہ ساس نندوں کو جھک جھک سلام کرتی دعائیں لیتی اور ناپ ناپ کر قدم رکھتیں رخصت ہورہی ہیں۔ ساس نے آیت الکرسی پڑھ کر دم کیا اور بولیں اللہ بیلی اللہ نگہبان بیٹی خیر سے اندھیرا ہونے سے پہلے واپس آجانا۔

لیجیے یہ دروازے سے کس کی آواز آئی۔ اے بی بی اللہ رکھے تمہارے بچے سلامت رہیں جگ جگ جیو اے مغلانی بی ایک گلوری تو کھلادو موا منھ کا مزہ ہی بگڑا ہوا ہے۔ اے بی کچھ اور بھی سنا تم نے وہ ڈپٹی صاحب ریٹائر ہوکر باہر سے واپس کیا آئے کہ دلی کے سب ادب و آداب بھلا دیے۔ بچیاں چھت پر چڑھی بولیاں ٹھٹھولیاں کررہی تھیں۔ اے مجھ سے تو نہ رہا گیا۔ میاں سے کہدیا میاں اب نہ دیکھوں اس طرح دن دہاڑے بچیوں کو چھت پر۔ اے یہ وہ گھرانہ ہے جہاں مردوں نے آواز بھی نہ سنی تھی اللہ مارے اب مردوئے شکل دیکھیں گے۔ جی ہاں یہ تھیں دِلّی کی پرانی حلال خوری دو وقتی کو آئیں اور دو چار خبریں بھی ساتھ لائیں۔ دلی اب بھی وہی ہے مگر۔۔۔۔

Marfat.com

خاک میں کیا صورتیں ہونگیں کہ پنہاں ہوگئیں

آیئے اب اپنی منزل کی طرف چلیں یہ ہیں شفیق الرحمٰن صاحب کی شفیق بیگم صدیقہ قدوائی۔ گورا رنگ لانبہ قد۔ چھیرا بدن۔ نرم اور میٹھی زبان لہجہ میں شیرینی انداز میں ممتا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی شفقت کی مورتی خدمت کی دیوی جنہوں نے اپنے شوہر کے ادھورے خواب کو پورا کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے اور دل وجان سے اس میں جتی ہوئی ہیں۔ ریشمی غراروں سے ناطہ توڑکر کھدر سے رشتہ جوڑا ہے۔ ایک پل چین ہے نہ ایک لمحہ آرام۔ بس کام ہی کام۔ بزرگوں کی لاڈلی۔ نوجوانوں میں مقبول بچوں کی چہیتی 'آپا جنیا' جی ہاں ان کو سب اسی نام سے پکارتے ہیں۔

آپ کی دریا دلی اور شفقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حکومت کی طرف سے جو روپیہ ملتا کبھی اپنے یا اپنے بچوں پر خرچ نہیں کیا۔ بلکہ محلہ کے غریبوں میں اس طرح بانٹتیں کہ کسی کو احساس تک نہ ہو اور مدد ہو جائے۔ کہیں چھوٹا بچہ دیکھا اس کے ہاتھ پر رکھ دیے، کسی کی نئی بہو ہے منہ دکھائی کے نام سے روپے پکڑا دیے۔ کسی کی لڑکی کی شادی ہے تو ان کی طرف سے جوڑا دیا جا رہا ہے۔ عیدی، بقرعیدی، الغرض ہر بہانہ مدد ہو رہی ہے۔ لینے والا بھی خوش دینے والا بھی خوش۔

خیرات وزکوٰۃ کی دلدادہ جدھر سے گذریں لوگوں کی ضرورتیں پوری کرتی چلیں۔ ابتداء سے ہی آدھے سر درد کی مریضہ تھیں مگر گھر میں سبھی کو ہدایت تھی کہ بیمار ہوں یا آرام کر رہی ہوں، کوئی بھی ضرورت مند آئے تو اسے ٹالا نہ جائے۔ بلکہ ہر حال میں ملاقات کرائی جائے نہ جانے لوگ کس کس طرح پریشان ہوکر آتے ہیں۔ کوئی کسی بھی وقت آئے ملاقات سے کبھی گریز نہ کیا۔ محلہ میں چھوٹے سے چھوٹے اور غریب سے غریب، سبھی کے گھر میں خود چل کر جاتی تھیں۔ سب کے حالات معلوم کرتیں۔ سب کے مسئلے ومسائل کا حل تلاش کرتیں۔ سبھی ان کو دل وجان سے

Marfat.com

چاہتے تھے۔

کل کی بھولی بھالی شرمیلی سی لڑکی نے کس طرح سماجی وسیاسی میدان میں قدم رکھا آیئے اس پر بھی ذرا روشنی ڈال لیں جی ہاں لکھنؤ کے تعلقہ دار گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ پردہ کی پابند جس نے کبھی گھر سے قدم نہ نکالا۔ اسکول کی شکل نہ دیکھی عیش و آرام میں پرورش پائی۔ ہنسنے ہنسانے والی بے فکر سی لڑکی۔ ماں کی لاڈلی بیٹی، بہنوں کی چہیتی بہن۔ اگر والدہ نے کبھی کسی کام سے آواز بھی دی تو چھوٹی بہن کو ٹہوکا دیکر کہتیں اللہ ہمارا دل نہیں چاہ رہا جلدی اٹھ جاؤ میری بھنوا امی ناراض ہوں گی اور وہ آپا جنیا کی محبت میں ڈور جاتی۔

دادا دادی نے بچپن ہی میں تایا زاد بھائی سے رشتہ طے کر دیا۔ گھر کا معاملہ اور مشترکہ خاندان کوئی مخالفت نہیں ہوئی۔ بڑے ہوکر شفیق صاحب سیاست میں پڑ گئے، تایا کی اتنی لاڈلی کہ جب شفیق صاحب جیل جاتے بھتیجی کی محبت میں بیٹے سے رشتہ توڑ دیتے۔ کہ کون اپنی بچی کو ایسے لڑکے سے بیاہے گا جس کی عمر جیل میں کٹے جب واپس آتے پھر ناطہ جڑ جاتا۔ ان کی شادی بھی عجیب دلچسپ حالات میں ہوئی۔ ایک دن شفیق صاحب مسجد میں سو رہے تھے کہ والد صاحب بمعہ قاضی کے تشریف لائے بیٹے کو جگا کر فرمایا اٹھو، اٹھو تمہارا نکاح پڑھوانا ہے۔ زمینداری اور تعلقہ داری کی بُو سمائی ہوئی۔ انکار یا مفر کی گنجائش کہاں؟ لیجیے نکاح ہوگیا گھر میں اطلاع پہنچی کہ صدیقہ تمہارا نکاح شفیق بھائی سے ہوگیا وہ بے یقینی کی حالت میں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ گھر والے حیران، بزرگ پریشان، بھلا ایسا بھی کہیں ہوتا ہے اس رہونی، پر کسے یقین آتا خوب اُدھم مچا مولویوں سے فتوے منگائے گئے۔ دکان کھلوا کر چھوہارے نکلوائے آخر دوسرے دن کچھ لوگوں کو جمع کر کے ولیمہ کیا اور سمینٹ سمٹا کر جہیز دیا گیا۔

شادی کے بعد شوہر کے ساتھ دلی آئیں۔ قرول باغ میں قیام رہا۔ انھوں نے ملک کی خدمت کی انھوں نے گھر سنبھالا زندگی خاصی کشمکش میں گزاری۔ جامعہ سے مہینوں تنخواہ نہ ملتی شفیق صاحب

Marfat.com

مفت خدمت کرتے۔ یا سیاست میں الجھے رہتے۔ مگر اس نیک بی بی کے ابرو پر بل تک نہ آیا۔ نہ کبھی شکایت نہ شکوہ جب تنگی ترشی ہوتی میکے جاتیں اور سال بھر کا اناج لے آتیں کم از کم کھانے پینے کا بوجھ تو شفیق صاحب کے ذہن پر نہ ہو اور وہ بے فکری سے اپنے کاموں میں لگے رہیں۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں شفیق صاحب کا گھر بھی زد میں آگیا۔ تمام سامان لٹ گیا۔ حد ہے کہ جان بچا کر بیگم قدوائی کو بغیر برقعہ گھر چھوڑنا پڑا۔ تب ہی سے پردہ کو خیرآباد کہا۔ کسی نے اظہارِ ہمدردی بھی کی تو یہی کہا روپیہ تو ہاتھ کا میل ہے شکر کرو (تمہارے) شفیق بھائی کی جان بچ گئی۔

شفیق الرحمٰن صاحب نے جامعہ میں تعلیم و ترقی کی بنیاد ڈالی۔ ان کا کہنا تھا اگر بچوں کو تربیت دینی ہے انھیں اچھا شہری بنانا ہے تو ماؤں کی تعلیم ضروری ہے بچوں کے ذریعے ہی ماؤں کو صحت و صفائی کی طرف راغب کیا۔ غریب محلوں میں کام کرنے ان کی حالت سدھارنے کا بے حد شوق تھا۔ اسی لیے مٹیا محل میں بالک ماتا سینٹر کی بنیاد پڑی۔

آپا جنیا نے شفیق صاحب کی زندگی میں رفاعی کاموں میں پیش قدمی نہ کی تھی مگر پردہ کے پیچھے سے ہمیشہ تعاون دیا۔ وہ ایک خاموش مجاہد تھیں۔ ان کے کام اور مشاغل پر گہری نظر رکھتی تھیں ان کی چھوٹی سی چھوٹی خواہش اور ہر کام میں برابر کی شریک۔ شفیق صاحب کے انتقال کے بعد اسی خواب کی تکمیل کے لیے دل و جان سے خدمت میں لگ گئیں۔ اس سے بڑا خراجِ عقیدت اور کیا ہو سکتا ہے۔

۱۹۵۳ء میں جب شفیق صاحب کا انتقال ہوا تو جواہر لعل جی تعزیت کے لیے تشریف لائے۔ اور دریافت کیا اب کیا کروگی۔ معصومیت سے جواب دیا "کرنا کیا ہم گاؤں چلے جائیں گے۔" پنڈت جی نے کہا "نہیں صدیقہ نہیں تم کہیں نہیں جاؤ گی" اور شیخ الجامعہ کی طرف دیکھ کر بولے یہ کام آپ کے ذمہ میں ہے ان کے لیے کچھ کیجیے پھر ہم سوچیں گے۔" پروفیسر مجیب صاحب نے جلد ہی تعلیم بالغاں کا ڈائریکٹر مقرر کردیا۔

Marfat.com

پھر پنڈت جی نے میونسپل کونسل اور اس کے بعد راجیہ سبھا کا ممبر نامزد کیا۔ جو ذمہ داری پڑی اسے بخوبی نبھایا۔ کئی خواتین کی انجمنوں کی ممبر صدر اور چیرمین بنائی گئیں۔ اس طرح شوہر کے ادھورے خواب کو پورا کرنے کا جذبہ ہی تھا کہ کمر کس کر میدان میں اتر پڑیں۔

شفیق صاحب کے انتقال کے بعد سے ہی سادہ کپڑے پہننے شروع کر دیے تھے، باہر کام کے وقت سفید کھدر کی ساڑی اور پوری آستین کے بلاوز میں ان کی باوقار شخصیت نظر آنے لگی۔ چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ لیے دھیمے دھیمے انداز میں اپنے کاموں میں جُٹی رہتی تھیں۔ اپنے سہارے کے لیے اکلوتے بھائی اور بھاوج کو دلی بلا لیا۔ بیگم حبیبہ قدوائی گھر کے ساتھ ساتھ سماجی کاموں میں بھی ان کا ہاتھ بٹانے لگیں۔ خود تو کام کرتی ہی تھیں دوسروں سے کام لینے کا فن بھی آتا تھا۔ حبیبہ باجی میں بھی یہ جذبہ پیدا کیا۔ کہ وہ سینٹر میں آنے والی عورتوں کو خود سلائی کڑھائی اور کامدانی سکھانے لگیں۔

بالک ماتا سینٹر سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اگر نیچے بھی آنے کا وقت نہ ہوتا تو چلتے پھرتے اوپر سے ہی اِک اِک حرکت پر نظر رکھتیں اور معمولی معمولی باتوں سے بھی باخبر رہتی۔ پڑھانے والی لڑکیوں کو اپنی اولاد کی طرح چاہتی تھی وہ تو وہ ان کے گھر والوں کی ضرورت کا بھی خیال رکھتیں۔ مگر کام میں کسی طرح کی لاپرواہی یا کوتاہی برداشت نہ کرتیں۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ سینٹر میں بار بار چائے کا دور چلنے لگا۔ کئی دن دیکھا نظر انداز کرتی رہیں جب سلسلہ ختم ہونے پر نہ آیا تو ایک دن خاموشی سے ایسے وقت میں اتریں جب چائے کے برتن کلاس میں پڑے ہوئے تھے۔ مسکرا کر بولیں آپ لوگ کیا بازار کی چائے پیتے ہیں جب دل چاہے اوپر جائیے اور بوا سے بنوا کر پی لیجیے۔ اس کے بعد پھر بھلا کس کی ہمت پڑتی کہ وہ تعلیم کا وقت چائے میں ضائع کرے دوسری طرف محبت کا یہ عالم کہ مجال ہے گھر میں کوئی اچھی چیز پکے اور لنچ کے وقت ٹیچرز کو نہ بھیجی جائے۔ سب کو کھلائے بغیر نوالہ حلق سے نہ اترتا۔ اگر چائے کو

Marfat.com

ڈانٹ کر منع کرتیں تو اتنا اثر نہ ہوتا جتنا اس مٹھاس کا ہوا وہ کونین بھی دیتیں تو قند میں لپیٹ کر۔

اگرچہ باقاعدہ خود اسکول یا کالج نہیں گئیں۔ مگر عورتوں کی ترقی و تعلیم کے لیے ہمیشہ کوشاں رہیں۔ مسائل پر گہری نظر تھی جو مشورہ دیتیں نہایت سلجھا ہوا ہوتا تعلیم میں دل چسپی پیدا کرنے اور سماجی برائیوں کو دور کرنے کے لیے ڈراموں اور نمائشوں کو سہارا لیتی تھیں۔ جو مرکز کے اساتذہ اور طالبات ہی پیش کرتے اور کھیل ہی کھیل میں کام کی باتیں ذہن نشین ہو جاتیں۔

اپنے بچوں سے بے حد محبت تھی۔ مگر تعلیم و تربیت سے غافل نہ تھیں۔ خاندان میں بھی ہر ایک کا خیال تھا جہاں میکے کی لاڈلی تھیں وہاں سسرال میں بھی ہر دلعزیز ہوئیں ایک رشتے کی بہن والدین سے محروم ہو گئیں تو ان کی تربیت ماں بن کر کی۔ ہرگز اپنی بیٹی سے کم نہ سمجھا۔ عید بقرعید تیج تہوار پر جو بھی کپڑے بنتے دونوں کے لیے یکساں بنا تیں تھیں۔ دوسری طرف نند کے بچے آکر رہے تو عرصے تک قریبی لوگ بھی نہ جان سکے کہ یہ ان کے اپنے بچے نہیں ہیں۔ مگر ساتھ ساتھ بزرگوں کی روایات اور خاندان کے وقار کی اتنی ہی شیدائی تھیں کہ ایک دیور کو بیٹے کی طرح رکھا اور جب اس نے اپنی مرضی سے خاندان کے باہر شادی کی اور بزرگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تو بغیر کچھ کہے سنے ہمیشہ کے لیے کنارہ کر لیا۔

جہاں ہر شخص میں اتنی اتنی خوبیاں ہوں وہاں کوئی نہ کوئی کمزوری بھی ہو گی۔ جی ہاں آپا جنیا کی کمزوری تھی "مچھلی"۔ نہیں نہیں غلط نہ سمجھیں وہ مچھلی سے ڈرتی نہ تھیں بلکہ ان کو بے حد مرغوب تھی۔ خواہ کسی وقت آئے چاہتی تھیں کہ ابھی پکا کر کھائی جائے۔ بچوں کی طرح مچھلی دیکھ کر دل مچل مچل جاتا تھا اور ان کی خواہش کے احترام میں تیار بھی کیا جاتا تھا۔ اس وقت ان کے چہرے کی طمانت اور خوشی دیکھنے کے قابل ہوتی۔ مزے لے کر کھاتیں اور خود بھی کہتی تھیں " بھئی ہم مچھلی کھا کر اس وقت تک ہاتھ نہیں دھوتے جب تک کہ خوشبو رہے" لیجیے اور سنیے کسی کو عطر پسند ہوتا ہے۔

Marfat.com

کسی کو پھولوں کی خوشبو مگر انھیں مچھلی کی بُو پسند تھی جسے "بساند" کہا جاتا ہے۔

ان کو کام کا فن آتا تھا کہ اگر کوئی غلطی بھی کرتا تو وہ کہتی شاید ہم سے ہی کچھ غلطی ہوگئی ہے۔ اگر کسی کی بات ناگوار گذرتی تو نہایت دھیمے لہجہ میں کہتی کہ یہ بات ہمیں اچھی نہیں لگی۔ کوئی کام کروانا ہوتا تو اس کی یاددہانی بار بار کرواتیں۔ پھر خود ہی کہہ دیتیں کہ بھئی ہمیں عادت ہے بار بار کہنے کی۔ بُرا مت ماننا پھر بھلا کون ایسا ہوگا جو دل و جان سے کام نہ کرے۔

دوبارہ راجیہ سبھا کی ممبر منتخب ہونے کے تقریباً دس ماہ بعد ۳ر جون ۱۹۵۸ء کو بلرام پور ہسپتال میں وفات پائی۔ ۳۱ر مئی کو پنڈت جواہر لعل نہرو سے ملنے گئیں اور فرمایا بچوں سے ملنے جارہی ہوں سلام کرنے آئی تھی پنڈت جی نے کہا ابھی نہ جاؤ صدیقہ ایک ہفتے میں ڈپٹی منسٹر انفارمیشن بنانے جارہا ہوں" بولیں آپ بھی کس جاہل کو بنارہے ہیں پنڈت جی نے فرمایا ہم خدمت کرنے والوں کو پہچانتے ہیں۔ تم جاؤ مگر ۷ر جون تک واپس آجانا۔ لکھنؤ کی سرزمین انتظار کررہی تھی بچوں تک پہنچ بھی نہ سکیں ۲ر جون کو لکھنؤ میں ایک لائبریری کا معائنہ کیا مائگرین کی مریضہ تھیں درد اٹھا۔ گھر آکر نہانے گئیں کہ وہیں ختم ہوگئیں۔ انا للہ ۔۔۔۔

شفیق صاحب کے انتقال کے بعد وہ ٹوٹ چکی تھیں۔ تھک چکی تھیں ہر وقت کہتی تھیں کہ خدا ہمیں جلدی بلالے ان کے کاموں کو پورا کرنے کی لگن اور دھن تھی جس نے ان کو پانچ سال زندہ رکھا وہ ایسی شمع تھیں جو خود جلتی رہیں گھلتی رہیں پگھلتی رہیں مگر دوسروں کو روشنی دی۔

ان کے انتقال پر بالک ماتا سینٹر میں جو تعزیتی جلسہ ہوا عورتیں ڈھاریں مار مار کر روئیں۔ کیونکہ وہ کسی کا دل نہ توڑتی تھیں کسی کو سخت بات نہ کہتی وہ سب کی اپنی تھی۔ اپنی ۔۔۔۔ ہی اپنی آپا جنیا۔

Marfat.com

PUNJAB UNIVERSITY LIBRARY
QUAID-I-AZAM CAMPUS LAHORE

Call No. ....

Accession No. ....

The book was drawn from the library on the date last marked. it can be retained for the period permitted by the rules governing the class of your membership.

***Text books** and current periodicals must be returned within three days.*

Marfat.com

DELHI-WALLAS OF OLD 'INTRODUCED'

There is often a tendency to talk about Delhi's Cultural and literary traditions without reference to the people who shaped these traditions, with the result that some of the most prominent citizens of the city are beginning to be forgotten and Delhi has come to be identified only with GHALIB and MIR.

However, Urdu Academy has taken a step towards "introducing" as it were, the old 'Delhi-Wallahs' to the new generation and the two seminars it has organised in the past two years have been fairly successful.

A whole galaxy of old and new Delhi-Wallahs come alive in the pen portraits presented on the second day of the Delhi-Urdu Academy seminar on Sunday.

Attractive personalities glittered the stage and the Character sketches provided a lively image of the departed heroes.

Judged by the audience, the seminar seems to have evoked considerable interest. Delhi culture needed a more comprehensive appreciation as a part of the total culture of region and the Urdu Academy would do well to extend its activities beyond literary personalities so as to revivify the cultural history of the capital.

—THE STATESMAN

Marfat.com

FORGOTTEN PERSONALITIES OF DELHI

Do you remember Mir Baqir Ali Dastango, the great story-teller of Delhi, or Ustad Rasa Dehlvi or Rashid-ul-Khairi or for that matter Pandit Dattatriya Kaifi ? They were the eminent sons of Delhi, whose lives and works left a distinct stamp on Delhi and Delhi Walas of yesterday. Yes, they are being forgotten.

However, the Delhi Urdu Academy and Dr. Salahuddin, a Member of the Academy, have taken the first significant step to ensure that the epoch makers of yesterday produced by this great city are not irretrievably relegated to oblivion. It is the first exercise of its kind in cultural investigation.

— THE TIMES OF INDIA

ISBN 81—7121—032—5—(Set)
ISBN 81—7121—033—3—(Vol. II)

آ کا بھائی کو بھی نظر بند کر دیا تھا۔ تقریباً ایک سال جیل میں رہنے کے بعد وہ کچھ مہینہ باہر رہ کر اگست ۴۲ ۱۹ ء میں جیل چلے گئے۔ تو ۴۵ ۱۹ء میں جیل سے باہر آئے۔ جیل میں رہ کر آ کا بھائی نے قرآن پاک اور مذہبی کتب کا مطالعہ کیا وہاں سے نکلے تو اُن کے اچھے اخلاق پر اور بھی جلا ہوگئی تھی۔ بلا تفریق مذہب و ملت اُن کو آسام والے بے حد چاہتے تھے کیونکہ وہ ہر اپنے پرائے امیر و غریب ہندو مسلمان سب کے دکھ سکھ میں برابر شریک رہتے تھے۔ کوئی قرض دار ہے۔ تو اس کی پیسے سے مدد کر رہے ہیں کسی کو قانونی نکات سمجھا رہے ہیں کسی کی جوان لڑکی کی شادی کرانے کے لیے اچھا لڑکا دیکھ رہے ہیں کوئی بیمار ہے تو اس کی عیادت کرنا ان کے لیے ضروری ہے۔ کسی ذہین نوجوان کو اعلا تعلیم کے لیے وظیفہ دلوا رہے ہیں۔ تو کہیں دو لڑنے والوں میں صلح کرانے کی فکر میں ہیں۔ غرضیکہ صبح سے لے کر رات گئے تک آ کا بھائی خدمت خلق میں مصروف رہتے تھے۔ آسام کے کبھی وزیر مال رہے کبھی ایڈوکیٹ جنرل آسام کا کوئی بھی چیف منسٹر اُن کے مشورے بغیر کوئی اہم کام نہیں کر سکتا تھا اور مرکز سے جو بھی معاملہ آسام کا ہوتا وہ آ کا بھائی کے سپرد کر دیا جاتا۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد تو اُن پر شفقت فرماتے ہی تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے بھی وہ بہت چہیتے تھے۔ پنڈت جی اُن کے تدبر اور دوراندیشی کے قائل تھے ۶۶ ۱۹ء میں اندرا جی کی وزارت میں جب وہ مرکزی وزیر بن گئے تو یکے بعد دیگرے کئی وزارتوں میں ان کا تبادلہ ہوتا رہا۔ اُن کی صلاحیت اور بہترین کارکردگی کی بدولت ہر محکمہ کی حالت سدھری۔ دلّی آکر اُن کا ادبی ذوق بھی جاگا ۶۹ ۱۹ء میں غالب صدی پورے پورے ہندوستان میں بہت

محمد کبیر الدین رازی
Marfat.com